جدید اُردو نظم کے موضوعاتی وہیئتی اشتراکات اور نظری مباحث

(تحقیقی وتجزیاتی مطالعہ)

تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ۔ ڈی(اُردو)

مقالہ نگار **نگران**
مقالہ

محمد محسن (ساحل سلہری) **ڈاکٹر**
نبیل احمد نبیل

رجسٹریشن نمبر: LM150638
اسسٹنٹ پروفیسر(اُردو)

رول نمبر:Ph.D Urdu-F15-109 یونیورسٹی آف
ایجوکیشن،لاہور

ڈویژن آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز

یونیورسٹی آف ایجوکیشن ،لوئر مال کیمپس،لاہور

سیشن:۲۰۱۵ء-۲۰۱۹ء

فہرست ابواب

کتابیات
۳۲۹

پیش لفظ

جدید اُردونظم میں تحقیقی وتنقیدی کام کی کافی گنجائش موجود ہے۔ اُردو ادب کے محققین اور ناقدین نے جدید اُردو نظم پر بہت لکھا ہے لیکن وسیع کینوس اور بے پناہ امکانات کی حامل جدید اُردو نظم کا کوئی نہ کوئی پہلو تہی دست رہا۔ کسی ایک تصنیف میں جدید اردو نظم کے کسی ایک موضوع اور پہلو کا جائزہ لیا گیا ہےیا کسی ایک عہد اور کسی ایک تحریک کے زیر اثر کی گئی نظم نگاری کو ہی ہدف تحقیق وتنقید بنایا گیا ہے۔ زیر نظر مقالہ'' جدید اُردو نظم کے موضوعاتی وہیئتی اشتراکات اور نظری مباحث'' میں جدید اُردو نظم (آغاز تا حال) کے تحقیقی وتجزیاتی مطالعہ سے موضوعاتی وہیئتی اشتراکات اور نظری مباحث سامنے لانے کی سعی کی ہے۔زیر نظر مقالے میں جدید اردو نظم نگار شعرا پر غیر ملکی ،مغربی ادب اور ایک دوسرے کے اثرات اور ردّ وقبول کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔جدید اردو نظم نگاروں نے بعض مقبول شعرا کی تقلید کرتے ہوئے اپنے پیش رو اور معاصرین کے مقبول موضوعات ،ہیئتوں اور اسالیب کو اپنایا ۔اس لیے جدید اردو نظم میں موضوعاتی وہیئتی اشتراکات ملتے ہیں۔ جدید اردو نظم نگاروں کے عہد بہ عہد اور تحریک بہ تحریک موضوعاتی وہیئتی اشتراکات اور نظری مباحث بیان کرنے کے لیے اس مقالے کو آٹھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

زیرِ نظر مقالے کے باب اوّل میں جدید اردو نظم کے بانی مبانی شعرا کی نظموں میں شامل موضوعاتی وہیئتی اشتراکات کی روایت کا تذکرہ ہے۔ اوّلین دور کے نمایندہ شعرا محمد حسین آزاد ،الطاف حسین حالی ، اسماعیل میرٹھی ،اکبر الہ آبادی ،شبلی نعمانی ،نظم حیدر طباطبائی اور شوق قدوائی کی نظموں میں انگریزی شاعری کے اثرات ،انگریزی سے ماخوذ نظمیں اور تراجم کی روایت سمیت متعدد موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ اوّلین دور کی نظم میں مناظر فطرت کی عکاسی ،حب الوطنی ،آزادی ،مذہبی ومعاشرتی اقدار کی پاسداری وبازیافت ،اخلاقی واصلاحی پہلو ،ملی و عصری آشوب ،مقامی رسوم ورواج اور دیگر موضوعات ملتے ہیں۔اس دور کے شعرا نے مثنوی ، مسدس، مخمس، مثلث ،ترکیب بند، ترجیع بند اور قطعات وغیرہ کی ہیئت میں لکھا ہے۔ باب دوم میں رومانوی دور کی جدید اردو نظم کے موضوعاتی وہیئتی اشتراکات کا کھوج لگایا گیا ہے۔ رومانوی دور کے نمایندہ شعرا میں ڈاکٹر علامہ محمد اقبال ،نادر کاکوروی ،سرور جہاں آبادی ،برج نرائن چکبست ،تلوک چند محروم، عظمت اللہ خان، جوش ملیح آبادی ،حفیظ جالندھری ، اختر شیرانی، افسر میرٹھی، احسان دانش ،ساغر نظامی، اثر صہبائی، روش صدیقی اور اختر انصاری کی نظموں میں موضوعاتی وہیئتی یکسانیت تلاش کرنے کی سعی کی ہے۔ اس دور کی شاعری میں زیادہ تر فطرت ،حب وطن، سیاسی وسماجی شعور ،ماضی پرستی ،قوم پرستی اور حسن وعشق جیسے موضوعات میں

یکسانیت پائی جاتی ہے۔ ہیئتی اعتبار سے رومانوی تحریک سے وابستہ شعرا نے پابند ،معرا،آزاد ہیئت اور قطعات میں اپنی تخلیقات پیش کی ہیں۔ انھوں نے مثنوی ،مسدس، مخمس، مثلث، غزل مسلسل، ترجیح بند،ترکیب بند، قطعات اور دیگر سانچوں میں اپنی نظموں کو ڈھالا ہے۔

زیر نظر مقالے(جدید اردو نظم کے موضوعاتی وہیئتی اشتراکات اور نظری مباحث) کے تیسرے باب میں ترقی پسند تحریک کے تحت کی گئی نظم نگاری کے موضوعاتی وہیئتی اشتراکات نمایاں کئے گئے ہیں۔ترقی پسند فکر کے حامل نمایندہ شعرا علامہ اقبال ،جوش ملیح آبادی ،ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر، اسرار الحق مجاز، فیض احمد فیض ،علی سردار جعفری، مخدوم محی الدین ، کیفی اعظمی، معین احسن جذبی، جمیل مظہری، ساحر لدھیانوی ،جاں نثار اختر، ظہیر کاشمیری، احمد ندیم قاسمی، عارف عبدالمتین، حبیب جالب، قتیل شفائی ،مصطفیٰ زیدی،احمد فراز، اختر حسین جعفری اور خلیل الرحمٰن اعظمی کی نظموں میں متعدد موضوعاتی وہیئتی مماثلتیں ملتی ہیں۔ ان شعرا نے شاعری میں نئے موضوعات شامل کیے اور مقصدیت ،افادیت ،خارجیت ،واقعیت ،صداقت اور حقیقت پسندی کی ایک مضبوط اور نئی روایت کا آغاز کیا۔ترقی پسند شعرا عشقیہ حقیقت نگاری ،رومان اور انقلاب کے امتزاج کی وجہ سے یکسانیت کا شکار ہوئے۔ ترقی پسند شعرا نے ظلم ونا انصافی ،جنگ و تباہ کاری، مایوسی و ناامیدی ،استحصال ،کسان اور مزدور کو موضوع بنایا ہے۔ ترقی پسند شعرا نے پابند نظم،نظم معرا اور آزاد نظم کی ہیئتیں استعمال کیں اور حقیقت کوفن کے پردوں میں چھپا کر استعاروں ،کنایوں ،پیکروں ،تمثیل اور علامات بیان کیا ہے۔

باب چہارم میں حلقہ ارباب ذوق کی تحریک سے وابستہ شعرا کے موضوعاتی وہیئتی اشتراکات کا ذکر کیا گیا ہے۔ حلقہ ارباب ذوق کے نمایندہ شعرا میں میراجی ،ن۔م۔راشد ،تصدق حسین خالد ،قیوم نظر ،یوسف ظفر، ضیاجالندھری، مختار صدیقی ،انجم رومانی ،الطاف گوہر ،منیر نیازی ،وزیر آغا،جیلانی کامران اور شہزاد احمد کا عام رجحان فرد کے داخلی احساسات اور تاثرات جیسا کہ نفسی بے چینی ،روحانی اضمحلال اور جنسی محرومی جیسے موضوعات کی طرف ہے۔ حلقہ ارباب ذوق کے شعرا نے روایت کو اہمیت دی انھوں نے قدما سے قوت کا خزینہ حاصل کیا اور ایک جہت ماضی کی طرف رکھی۔ چناں چہ ان کی تخلیقات میں ماضی کے روشن نقوش اپنی جھلکیاں دکھاتے ہیں۔ حلقہ کی نظمیہ شاعری نیم کلاسیکی اور نیم رومانی ہے،اس میں سیاسی ،سماجی شعور اور مختلف نظریات سما گئے ہیں۔ حلقہ کی شاعری موضوع اور ہیئت دونوں اعتبار سے اشتراکات کی کیفیت میں ڈوبی ہوئی ہے۔ مقالے کے پانچویں باب میں ان جدید نظم نگاروں کو شامل کیا گیا ہے جنھوں نے اپنے عہد کی ادبی تحریکوں سے اثر تو قبول کیا لیکن باقاعدہ طور پر کسی ادبی تحریک کا حصہ نہ بنے۔ ایسے شعرا میں فاخر ہریانوی ،مجید امجد، اخترالایمان، عزیز حامد مدنی، ابنِ انشا، منیب الرحمٰن ،عبدالعزیز خالد، عمیق حنفی، بلراج کومل اور کمار پاشی قابل ذکر ہیں۔یہ شعرا رومانوی تحریک اور ترقی پسند تحریک کی درمیانی کڑی ہیں۔ ان شعرا میں رومانوی ،ترقی پسند اور

حلقہ کی تحریکوں کے اثرات مرتب ہونے کی وجہ سے تینوں رجحانات کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان شعرانے نئے موضوعات کے اظہار کے لیے نئی ہیئتوں کو وسیلۂ اظہار بنایا۔

۱۹۷۰ء سے تا حال کی نظمیہ شاعری کو باب ششم میں شامل کیا گیا ہے۔ اس دور کے نمایندہ شعرا میں انیس ناگی ،محمد علوی، ستیہ پال آنند، شہریار، وحید اختر، ندا فاضلی، بشر نواز، زبیر رضوی، گلزار، آفتاب اقبال شمیم، محمدسلیم الرحمٰن ،ساقی فاروقی، ثروت حسین ، معین نظامی، سعادت سعید، سرمد صہبائی، عبدالرشید، ابرار احمد، علی محمد فرشی اورنصیر احمد ناصر زیادہ اہم ہیں۔معاصر شعرا کی شاعری میں فرد اور معاشرے کے انتشار ہم آمیز دکھائی دیتے ہیں۔معاصر نظم نگاروں نے آزاد نظم کا دائرہ وسیع کر کے اپنی ذات کی بازیافت کے ساتھ ساتھ اجتماعی آشوب اور خلفشاری کو بھی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ معاصر نظم نگار شعرا پر اقبال کے اثرات ،تصدق حسین خالد، میراجی اور ن م راشد کے مختلف فکری دھارے اور اسالیب بھی نظر آتے ہیں۔ معاصرجدیداردو نظم نگاروں نے مظاہر فطرت ،معاشی و معاشرتی مسائل ،ذات اور کائنات ،وقت اور موت کے نفسیاتی افعال اور رد اعمال کو بیان کیا ہے۔انھوں نے نفسیاتی افعال ،باطنی دباؤ ،گھٹن اور نا آسودگی سے شروع ہو کر کائنات کی وسعتوں کے سامنے انسانی زندگی کی بے حیثیتی اور سائنسی ترقی کی وجہ سے پھیلنے والی بے یقینی اور لایعنیت کی فضا کی عکاسی کی ہے۔

باب ہفتم میں جدید اردو نظم گو شاعرات کی شاعری میں پائے جانے والے موضوعاتی وہیئتی اشتراکات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ جدید اردو نظم کی نمایندہ شاعرات میں ادا جعفری ،ساجدہ زیدی،زاہدہ زیدی ،شفیق فاطمہ شعریٰ ،زہرا نگاہ، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض ،نورجہاں ثروت، پروین شاکراورفاطمہ حسن شامل ہیں۔ان تمام شاعرات میں خاص طور پر مماثلت نظر آتی ہے۔ان کی شاعری میں نسائی حقوق ضبط کرنے کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوتی ہے۔معاصر شاعرات کی جدید اردو نظموں میں مرد اور عورت کے معاشرتی کرداروں ،ان کی کشمکش اور محبت کونمایاں کیا گیا ہے۔انھوں نے کہیں اپنی ذات کی الجھنوں کو بیان کیا ہے اور کہیں زنانہ تجربے کو تخلیق کا حصہ بنایا ہے۔ بہت سی شاعرات نے عورت کی محرومیوں اور احساسات کی عکاسی کی ہے اور نسائی باطن کے نازک اور لطیف احساسات کو شعری پیکر عطا کیا ہے۔ خواتین نظم نگاروں نے سماجی تعصّبات ،محبت اور وفا کی خواہش ،انا کی تعمیر وشکستگی سے لے کر معاشرتی رویوں اور رجحانات کو موضوع بنایا ہے۔

باب ہشتم میں نثری نظم نگاروں کے موضوعاتی وہیئتی اشتراکات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ نمایندہ نثری نظم نگاروں میں مبارک احمد، عبدالرشید، انیس ناگی، ثروت حسین، افضال احمد سیّد، احمد ہمیش، ذی شان ساحل، ڈاکٹر جواز جعفری، زاہد ڈار، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ڈاکٹر سعادت سعید، سعید الدین، سارا شگفتہ، عذرا عباس، نسرین انجم بھٹی، کشور ناہید، تنویر انجم، یاسمین حمید اور ڈاکٹر صائمہ ارم شامل ہیں۔ ان تمام نثری نظم نگاروں میں موضوعاتی وہیئتی اشتراکات ملتے ہیں۔ نثری نظم نگاروں نے سماجی ،سیاسی اور معاشی انتشار کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورت حال کاذکر کیا ہے۔انھوں نے تنہائی ،اجتماعی جبر ،تلاشِ محبت،جنسی

بے راہروی ،ناآسودگی، داخلی کرب ،گمبھیر تنہائی اور احساسِ عدم تحفظ کو مختلف جنسی علامتوں کے ذریعے بیان کیا ہے۔نثری نظم نگارمشترکہ طور پرانسان کو صنعتی زندگی کے تنوع اور انتشار سے محفوظ رکھنے کی بات کرتے ہیں۔وہ آسیب زدگی ،ناآسودگی،معاشرے کے پست اور محروم طبقے ، صنعتی اور مشینی زندگی کے ہاتھوں پسے ہوئے طبقے کی صورت گری کر تے ہیں۔وہ مخصوص حسّی رویوں اور خارجی آشوب اور معاشرے میں پائی جانے والی ابتری ،بدامنی ،بے چینی ،نارسائی اور ناآسودگی کا ذکر کرتے ہیں۔ نثری نظموں میں انسان کی نفسیاتی کشاکش اور معاشرتی شکست وریخت کا اجتماعی شعور ملتا ہے۔نثری نظموں میں فلسفیانہ،سائنسی شعور،تہذیبی اقدار،اساطیری اور نفسیاتی نوعیت کے مضامین ملتے ہیں۔شاعرات کی نظموں میں عورت کے مسائل، جنسی مسائل ،نفسیاتی اور شکستِ ذات کے مسائل کا خصوصی اظہار ملتا ہے۔ ان کی نظموں میں جنسی تموج، دکھ ،نارسائی ،محرومی، ذات کا کرب ،تنہائی اور جذباتیت ملتی ہے۔

مَیں آخرمیں چند شخصیات کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں ،سب سے پہلے نگرانِ مقالہ جناب ڈاکٹر نبیل احمد نبیل صاحب کا بے حد شکرگزار ہوں کہ ان کی فاضلانہ رہنمائی اس مقالے میں شامل ہے۔ علاوہ ازیں میں صدرِ شعبہ اردو جناب ڈاکٹر وحید الرحمٰن خان صاحب اور دیگر مشفق اساتذہ کرام کا بھی ممنون ہوں۔ میں اپنے احباب عباس تابش ،ڈاکٹر جواز جعفری، سرورارمان ،شاہد ذکی، شہزاد نیر، زاہد محمود زاہد، ،عمران شناور اور جاوید اقبال میو کا بے حد شکر گزار ہوں ۔کتب کے حصول کے لیے ان حضرات نے میرے ساتھ کافی تعاون کیا اور مجھے بے حد برداشت کیا۔ میں اپنے بڑے بھائی محمد افضل سلہری ایڈووکیٹ کا بھی خصوصی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے میری مالی مشکلات دور کیں۔ آخر میں اپنی شریکِ زندگی فرزانہ کوثر کا بھی تہہ دل سے شکرگزار ہوں کہ اس تحقیقی کام کے کے دوران اس نے مجھے گھریلو ذمہ داریوں سے دور رکھا۔

محمد محسن (ساحل سلہری)

باب اوّل

جدید اُردو نظم کے اوّلین شعرا کے موضوعاتی وہیئتی اشتراکات

اُردو نظم میں انیسویں صدی کے وسط کے بعد پہلی مرتبہ فطرت نگاری کا رجحان رواج پانے لگا تو اس دور میں محمد حسین آزاد نے جدید اردو نظم میں فطرت نگاری سے پہلے فطرت نگاری سے متعلق تنقیدی مضامین لکھے۔انھوں نے اپنے ابتدائی مضامین میں لکھا کہ اس وقت تک جو بھی منظر کشی کی گئی ہے وہ حقیقی اور نیچرل نہیں اور نہ ہی یہ برصغیر پاک وہند سے تعلق رکھتی ہے۔ اسی طرح الطاف حسین حالی نے شعری اصول وضع

کیے اور فتویٰ دیا کہ شعرا کے لیے مطالعہ ٔ فطرت وکائنات لازم ہے۔ کائنات وفطرت کا مطالعہ ومشاہدہ شعرا کی منظر نگاری کے کام آتا ہے۔ شبلی نعمانی نے منظر نگاری کرتے ہوئے تخیّل کے بجائے محکات نگاری سے کام لینے پر زور دیا۔ ان تینو ں اکابرین نے جب فطرت نگاری اور منظر نگاری پر رائے زنی کی تو جدید اُردو نظم میں فطرت نگاری کی ایک روایت جڑ پکڑنے لگی۔آزاد اور حالی نے منظر نگاری میں دل کشی پیدا کرنے کے لیے تخیّل کا رنگ بھرنے کو ضروری سمجھا ۔آزاد و حالی کے فطرت نگاری سے متعلق بحث وتنقید کے اولین مضامین اور جدید اُردو نظم میں اسے فروغ دینے سے قبل بھی کہیں کہیں فطرت نگاری اور منظر نگاری کے نمونے ملتے ہیں۔انیسویں صدی کے آغاز سے ۱۸۵۷ء تک قدیم اُردو شاعری میں فطرت نگاری اور منظر نگاری پر ڈاکٹر اسلام سندیلوی نے ۱۹۶۸ء میں مقالہ لکھا جس میں انیسویں صدی تک کے منظر نگاری کے مختلف موضوعات زیر بحث لائے گئے ہیں۔ اس قدیم اردو شاعری میں مستعمل فطرت نگاری سے جدید اردو نظم بے حد متاثر ہوئی اور اس کے بنیاد گزاروں میں آزاد اور حالی سر فہرست نظر آتے ہیں۔ انھوں نے نیچرل شاعری کے تحت فطرت نگاری اور مناظر کشی کا باقاعدہ آغاز کیا ۔ان سے قبل قدیم اردو شاعری میں ناپختہ فطرت نگاری اصلیت اور صداقت وحقیقت سے خاصی دور تھی۔ ان دو شعرا نے پہلی بار جدید اردو نظم میں اصلی اور حقیقی فطرت نگاری کو اپنایا۔انھوں نے دکنی مثنوی اور شمالی ہند کی مثنویوں میں پائے جانے والے فطرت نگاری کے آثار کو جدید آہنگ عطا کیا ۔

آزاد اور حالی دو ایسے جدید اُردو نظم نگار تھے جنھوں نے قدیم اردو شاعری اور کلاسیکی دور کے اہم شعرا میر و سودا کے قصیدوں اور مثنویوں میں برتے گئے فطرت نگاری اور منظر کشی کے اسلوب کو جدید طرز ادا سے پیش کیا۔آزاد اور حالی نے میر حسن کی مثنوی''سحر البیان'' اور پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی ''گل بکاؤلی'' سمیت قدیم اردو شاعری اور کلاسیکی عہد کے نمایندہ شعرا قائم چاند پوری ،جرأت،انشا ،رنگین، مصحفی اور صبا کی مثنویوں میں پیش کیے گئے مناظر فطرت سے گہرا اثر قبول کیا اور اسے انگریزی و مغربی ادب کے جدید تناظر میں پیش کیا۔ انھوں نے دہلی کے سادہ طرزِ اظہار اور لکھنوی انداز بیاں کے پر تکلف طریق کار کے حسین امتزاج کو مغربی نیچرل شاعری کے آئینے میں دیکھنے کی کام یاب سعی کی۔ آزادؔ اور حالیؔ کی جدید اُردو نظم اور مغربی ادب کی مقلد نیچرل شاعری ایک تحریک کی صورت میں نمودار ہوئی۔ان سے قبل نظیر اکبر آبادی بڑے عوامی اور فطرت پرست شاعر تھے۔انھیں بلاشبہ اردو نظم میں فطرت نگاری اور وطن پرستی کا موجد کہا جا سکتا ہے۔ اس لیے آزادؔ ،حالیؔ اور جدید اردو نظم کے اولین شعرا قدیم نظم کی روایت سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی شاعری میں موضوعاتی وہیئتی اشتراکات بدرجہ اتم موجود ہیں۔

آزادؔ اور حالیؔ کے عہد سے قبل فطرت اور وطن پرستی صنف مرثیہ میں بھی نظر آتی ہے۔میر انیس نے فطرت نگاری بھی کی ہے لیکن ان کے یہاں واقعاتِ کربلا کی حقیقی مناظر کشی زیادہ ملتی ہے۔ انھوں نے طلوع آفتاب ،نسیم سحر کے خوشگوار جھونکے ،صبح کا سماں ،رات کی تاریکی اور چاندنی ، باغ اور پھولوں کا مہکنا ،سبزہ وبہار جیسے مظاہر قدرت کی

نہایت عمدگی سے منظر کشی کی ہے۔ وہ میدانِ کربلا کی منظر کشی کرتے ہوئے مناظر فطرت ہندوستانی پیش کرتے ہیں۔ مرزادبیرؔ نے انیس کی نسبت زیادہ تخیّلاتی فطرت نگاری اور منظر کشی کی ہے۔ انیسؔ ودبیرؔ کے علاوہ دیگر مرثیہ نگاروں نفیسؔ، عشقؔ،،رشیدؔ اور حسنؔ لکھنوی وغیرہ نے بھی صنف مرثیہ میں فطرت نگاری اور منظر نگاری کے عمدہ نمونے پیش کیے ہیں۔سولھویں صدی کی دکنی اور شمالی ہندی کی شاعری سے لے کر انجمن پنجاب (نظم جدید) کی تحریک ۱۸۷۴ء تک دیکھا جائے تو مثنویوں ،قصیدوں اور مرثیوں کے ناپختہ اور دھندلائے ہوئے تصور ملتے ہیں۔ انیسویں صدی کی آخری تین دہائیوں میں آزادؔ اور حالیؔ نے قدیم اردو شاعری میں پائے جانے والی اس ناپختگی اور دھندلے تصور کو پختگی اور شفافیت عطا کی۔ انھوں نے جدیدا ردو نظم میں فطرت نگاری اور جذبۂ حب الوطنی کا نیا انداز اور نیا آہنگ متعارف کرایا۔ اس بارے میں ڈاکٹر ناہید قاسمی رقم طراز ہیں:

> ’’سولھویں صدی کی دکنی اردو شاعری سے لے کر تقریباً تین سو برس بعد انیسویں صدی میں تحریک انجمن پنجاب (۱۸۷۴ء) کے آغاز سے پہلے تک کی اردو شاعری میں فطرت نگاری کے سرسری جائزے کے بعد نتیجہ یہ حاصل ہوا ہے کہ مثنویوں ، قصیدوں اور مرثیوں کے ذریعے فطرت نگاری کا ابتدائی دھندلا سا تصور ضرور قائم کیا اس سے انجمن پنجاب کی تحریک نیچرل شاعری سے نیا انداز ،نیا رنگ نمایاں ہوا اور نکھار اور پختگی کےآثار ظاہر ہونا شروع ہوئے۔‘‘(۱)

۱۸۶۴ء میں حکومت برطانیہ نے لاہور میں ایک کالج کی ضرورت محسوس کی تو گورنمنٹ کالج کا سنگ بنیاد رکھا ،کالج کے پرنسپل ڈاکٹر لائنٹز نے جامع علوم شرقیہ کے قیام کے لیے ۲۶ جنوری ۱۸۶۵ء کو انجمن پنجاب قائم کی۔اس پلیٹ فارم سے قدیم شرقی علوم و حکمت کا احیا اور دیسی زبانوں میں مغربی تعلیم کی فراہمی ،معاشرتی ،ادبی اور سائنسی مسائل پہ بحث اور تعلیم یافتہ افراد کے حکومت سے راہ ورسم کا مقصد حاصل کیا گیا۔ ازاں بعد ڈاکٹر لائنٹز کی ہدایت اور مشاورت سے خاص طرز کے مشاعروں کا ایک سلسلہ شروع کیا گیا۔اس شعری تحریک کو کام یاب بنانے کے لیے ۱۸۶۷ء میں آزاد کو انجمن پنجاب کا سیکریٹری مقرر کیا اور حالیؔ چند برس بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو کی ملازمت کے لیے لاہور وارد ہوئے ۔انجمن پنجاب میں نئی طرز کے مشاعرے ہر مہینے ہونے لگے،ان مشاعروں میں طرح مصرع کے بجائے کوئی خاص موضوع اور عنوان دیا جاتا اور سب شعرا اس دیے گئے عنوان پر طبع آزمائی کرتے۔ اس لیے اس دور کی شاعری میں متعدد اشتراکات پائے جاتے ہیں۔ لاہور میں نصابی ضرورت کے تحت ہونے والے موضوعاتی مشاعروں نے نظم جدید میں اشتراکات کا در وا کیا۔ سرکاری سرپرستی میں تخلیق ہونے والی اس دور کی نظموں میں فطرت نگاری اور حب الوطنی جیسے موضوعات عام ملتے ہیں۔ اس بارے میں ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی لکھتے ہیں:

'' نظم جدید کی تحریک ایک وسیع تر تہذیبی و تعلیمی تحریک کا نتیجہ تھی جو شمالی ہند میں نئے نظام تعلیم کے قیام واستحکام کے لیے چند علم دوست مشرق آشنا انگریز حکام کی رہنمائی میں شروع ہوئی------انجمن پنجاب کی اصلاحی کوششیں اردو کے حق میں زیادہ نتیجہ خیز ثابت ہوئیں۔ ۱۸۷۴ء میں انجمن پنجاب کے ''مناظمے'' جدید شاعری کے آغاز کا وسیلہ بن گئے''(۲)

روایت سے متاثر ہونے کے باوجود انجمن پنجاب کی نئی طرز کی نظموں کی تحریک نے اردو شاعری میں ترجمہ نگاری کے ساتھ طبع زاد نظمیں تخلیق کرنے کا رجحان پیدا کیا۔ اس دور کی نظموں میں اسلوب اور سانچے فارسی اور ہندی طرز کےتھےاور مضامین و خیالات انگریزی سے اخذ کیے گئے۔ شاعری قوم کی ذہنیت اور مزاج کی عکاس ہوتی ہے جب قوم کسی تبدیلی اور اصلاح کو اپناتی ہے تو اس کے اثرات شاعری پر بھی مرتب ہوتے ہیں۔ سرسید کی تحریک اصلاح سے قبل نظیر اکبر آبادی نے فطری اور قومی شاعری کی مگر انھیں عوام نے بہت دیر کے بعد قبول کیا۔ سرسید اور ان کے رفقا نے جب اصلاح قوم کا بیڑہ اٹھایا تو عوام اس بیڑے میں سوار ہو گئے۔تحریک اصلاح کی بیداری مہم نے اردو شاعری کو بے حد متاثر کیا۔ اس تناظر میں آزادؔ اور حالیؔ نے فطری اور قومی شاعری کا آغاز کیا اور عوام نے بھی اسی جذبے سے اسے قبولیت کا درجہ دیا۔ آزادؔ اور حالیؔ کی اورقومی شاعری پر روایت کا اثر ہے۔ ان دو شعرا نے نظیرؔ اکبر آبادی اور انیسؔ ودبیرؔ کی روایت کو نئے انداز میں آگے بڑھایا۔ نظم جدید میں فطرت سے محبت بلآخر حب وطن اور قوم کی آزادی کی محبت میں بدل گئی جسے رومانوی دور کے شعرا نے فروغ دیا۔ آزادؔ اور حالیؔ کے اہم ہم عصر شبلی نعمانی نے بھی قومی طرز کی نظمیں تخلیق کیں لیکن وہ مورخ سے آگے کوئی مقام حاصل نہ کر سکے۔علاوہ ازیں انجمن پنجاب کے ''مناظمے'' میں ادیب دہلوی ،مولانا سیف الحق ،تلمیذ غالب اور مرزا ارشد گورگانی نے حصہ لیا۔ ان شعرا میں اسماعیل میرٹھی نے زیادہ ترقی کی اور نسبتاًممتاز رہے۔ آزادؔ ،حالیؔ اور ان کے معاصرین کی شاعری میں اشتراکات اس لیے زیادہ ہیں کیوں کہ اس دور میں ہندوستان میں انگریزوں کی آمد اور سرسید کی تحریک اصلاح نے روایتی معاشرہ میں نمایاں تبدیلی برپا کی اور اس تبدیلی کو تمام شعرا نے قبول کیا۔

انسان کی فطرت ہے کہ اسے آزاد ہوتے ہوئے آزادی کی اہمیت کا احساس نہیں ہوتا جب کوئی طاقت اس کی آزادی اور بنیادی حقوق چھین لیتی ہے تو اسے آزادی کی قدر کا احساس ہونے لگتا ہے۔انسان کو اپنا گھر ،اپنا علاقہ اور اپنا وطن بہت حسین لگتا ہے اور اپنے وطن اور موسموں کی ہر ادا اسےبھلی معلوم ہوتی ہے۔نظیر اور انیس ودبیر نے اگرچہ فطری اور قومی شاعری کی لیکن یہ عدم توجہ کا شکار ہوگئی۔اس وقت ہندوستان میں انگریز قابض نہیں تھا ۔اس لیے عوام الناس کو اپنے وطن کی بہاروں ،اپنے وطن کے موسموں اور اپنے وطن کی سر زمین کی قدر نہ تھی۔ آزادؔ اور حالیؔ کے عہد میں یہاں انگریز پوری طرح قابض ہو گیا تھا اس لیے عوام اور شعرا اور اپنے وطن کا ذرّہ ذرّہ بے حد پیارا لگنے لگا اور انھیں سرزمین ہند

پہلے سے زیادہ حسین لگنے لگی،اس کے پہاڑ ،دریا، سمندر،آبشاروں، ندیوں اور موسموں کی کروٹیں خوب صورت لگنے لگیں جن کی عظمت اور خوب صورت کا احساس انھیں صدیوں سے نہ تھا۔آزادؔ، نظیرؔ کی اس روایت کو کو دوبارہ زندہ کر کے نیچرل شاعری کو فروغ دینا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے نظیرؔ کی شعری روایت کو منظم تحریک کی صورت میں از سر نو رواج دیا اور اس مقصد میں انھوں نے حالیؔ کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا اور نظم جدید کو قدیم شعری قیود سے نکالباہر کیا۔ آزادؔ،حالیؔ،اسماعیلؔ اور دیگر شعرا کی شاعری میں موضوعاتی وہیئتی اشتراکات وانسلاکات نمایاں نظر آتے ہیں چوں کہ یہ شاعری خاص عہد ،خاص مقاصد کے لیے لکھی گئی تھی اس لیے متعدد یکساں رویوں اور میلانات کا شکار رہی۔ آزادؔ اور ان کے معاصرین نیچرل شاعری کے ذریعے کائنات کا راز جاننا چاہتے تھے۔ فطرت کےبے حد قریب ہونا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے متعدد نظمیں مناظر ،موسم اور وقت کی بدلی کیفیت پر کہیں۔آزاد کی جدید اردو نظم سے متعلق ڈاکٹر گوپی چند نارنگ رقم طراز ہیں:

> ’’جدید اردو شاعری کی حد بندی آزادؔ اور حالیؔ کے کلام سے ہوتی ہے ،جدید شاعری میں آزادؔ کی اہمیت جتنی تاریخی ہے اتنی ادبی نہیں ،حالیؔ نظم کے امام ہیں۔ان سے اردوشعر اودب میں ایک خاموش انقلاب کی ابتدا ہوتی ہے۔ ‘‘(۳)

سرسید اور حالیؔ کی عمر میں اکیس برس کا فرق ہے،حالیؔ نے جب ہوش سنبھالا تو ان کے سامنے فکروعمل کا راستہ متعین ہو چکا تھا ۔ حالیؔ میں لطیف عشقیہ شاعری،قومی،وطنی اور اصلاحی شاعری کی صلاحیت موجود تھی مگر سر سید کی فکرونظر اور ترغیب دلانے سے ان کی شاعری میں میں موضوعاتی وسعت آگئی۔ حالیؔ ان شعرا میں سے تھے جنھوں نے مغلیہ سلطنت کی زوال پذیری اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ ان کے دور میں مسلمان مادی، اخلاقی اور روحانی زوال کا اس قدر شکار ہو چکے تھے کہ ان کو انگریز کا مقابلہ کرنے کے لیے ازسرنو متحد ہونے کی ضرورت تھی۔ اس لیے ان حالات کے پیش نظر حالیؒ نے بھی سرسید کی طرح انگریز کے ساتھ مفاہمت کی پالیسی اختیار کی۔انھوں نے انگریز حکومت میں رہ کر کچھ اصول وضع کیے۔ انھوں نے عوام میں سیاسی شعور پیدا کرنے کے آزادی کا خواب دکھایا۔ انھوں نے انگریزوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تعلیم حاصل کرنے پر زور دیا اور انگریزوں کے ساتھ رہ کر آگے نکل جانے کی شعوری کوشش کی۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح ہندوستان کے مسلمان کبھی نہ کبھی انگریز سے آزادی حاصل کر لیں گے۔ حالیؔ جدیداردو نظم کے پہلے شاعر ہیں جو ہندوستان کے سیاسی وسماجی حالات سے متاثر ہوئے اور انھیں ہندوستان کی غلامی پر افسوس ہوا۔ اگرچہ وہ کئی اعتبار سے انگریز حکومت کی ملازمت کی وجہ سے مفاہمت کا شکار رہے مگر ان کی نظموں میں سماجی ترقی،حب الوطنی اور آزادی کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ حالیؔ نے غلامی اور مظلومی کے درد کو اپنی شاعری کے ذریعے بیان کیا اور احساس وطنیت کوفروغ دینے کے لیے مثنوی’’حب وطن‘‘ تخلیق کی۔حالی کو وطن کے مناظر سے محبت ،مسلمانوں کے ماضی سے عقیدت اور خدمت خلق کا احساس تھا۔ انجمن

پنجاب کے مشاعرے میں پڑھی گئی حالیؔ کی تیسری نظم ''حب وطن'' اس زمانے کا عام موضوع تھا ،انھوں نے وطن کی محبت کا جذبہ بیدار کیا ہے:

پر چھٹا جب سے اپنا ملک
ودیار
جی ہوا تم سے خود بخود بے
زار
نہ گلوں کی ادا خوش آتی ہے
نہ صدا بلبلوں کی بھاتی ہے
(۴)

حالیؔ نےاردو نظم میں عام موضوعات کو شامل کیا،اس سے پہلے نظیر اکبر آبادی نے اپنی شاعری کے لیے عام موضوعات کا انتخاب کیاتھا۔ جن کا تعلق عام لوگوں کی زندگی اور سامنے کے مظاہر کے ساتھ تھا ۔سرسید کی رفاقت اور تحریک اصلاح کے زیر اثر حالیؔ نےشاعری کو مقصدیت سے متعارف کروایا اور پہلی مرتبہ ''حب وطن '' کا جذبہ شامل کیا۔ آزادؔ نے بھی اس مروجہ موضوع ''حب وطن'' پر طبع آزمائی کی ہے۔ انھوں نے ایسی نظموں میں ایرانیوں اور انگیزوں کی وطن دوستی کی تحسین کرکے ہندوستان کے عوام کے دلوں میں وطن کی محبت کا جذبہ پیدا کیا ہے۔ انھوں نے فطرت، اخلاق ومعرفت اور حب وطن جیسے موضوعات کو نظم کر کے مشرقی تہذیب وتمدن کی روایت کو فروغ دیا۔آزادؔ کے جذبہ حب الوطنی میں بھی تہذیب وثقافت کے عوامل ملتے ہیں دھوتی اور لنگی پاک وہند کی تہذیب کا حصہ ہیں۔ اگر کوئی شخص یورپ اور امریکہ جا کر بھی یہ لباس پہنے تو کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص بڑا محب وطن ہے۔ دیار غیر میں اپنے وطن کی اہمیت بڑھ جاتی ہے ۔وطن سے دور اپنے وطن کا خار بھی پھول لگتا ہے۔ آزادؔ کی جذبہ حب الوطنی سے سرشار نظم '' حب وطن'' میں جذبہ حب الوطنی کے پس منظر میں ہندوستان کی تہذیب وثقافت جھلکتی ہے۔ انھوں نے اس نظم میں جمنا کے کنارے راج گھاٹ کا منظر انتہائی عمدگی سے پیش کیا ہے:

جمنا نہیں ہے جامع مسجد جہاں
نہیں
سنتے بھی ہو میاں ہمیں جانا
وہاں نہیں
اپنے دکن کو آپ روانہ شتاب
ہوں
پر اس چمن کو چھوڑ کے ہم
کیوں خراب ہوں
(۵)

فطرت نگاری ،جذبہ حب الوطنی اور وطن کی تہذیب وثقافت میں ایک رشتہ ہوتا ہے اس لیے اولین دور کے نظم نگاروں کی نیچرل شاعری اور حب وطن کے موضوع نے ہندوستانی تہذیب وتمدن کی مکمل تصویر کشی کی ہے۔ حالیؔ کی طرح آزادؔ نے بھی مناظر فطرت ۔معاشرتی مسائل ،قومی وملی امور کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا۔آزادؔ کی فطرت نگاری ،حب وطن اور تہذیب وتمدن کے بارے میں کوثر مظہری رقم طراز ہیں:

''یہ بات مسلم ہے کہ آزادؔ کی نظموں سے ایک نیا باب کھلا اور زندگی ،فرد ،معاشرہ ،تمدن ،تہذیب وثقافت ،قومی وملی زندگی ،جذبہ حب الوطنی اور عام انسانی جذبات کو شاعری کا حصہ بنایا۔''(٦)

اسماعیلؔ نے آزادؔ اور حالیؔ کی طرح ایک مثنوی ''حب وطن'' کے نام سے لکھی ہے یوں اولین دور کے نظم نگاروں میں موضوعاتی وہیئتی اشتراک نمایاں ہے،ملاحظہ کیجیے:

دل میں اک چاشنی محبت کی
جملہ جاندار کو خدانے دی
اور وہ ملک و میوہ ہائے وطن
آسمانِ وطن ہوائے وطن

(٧)

اسماعیلؔ نے وطن کی محبت ،عقیدت اور عظمت کے بیان کے لیے ایک نظم'' کوہ ہمالہ'' کے عنوان سے بھی لکھی ہے جس میں انھوں نے ہندوستان کی سر زمین کوسلام پیش کیا ہے اور فطرت کی خوب صورتی کی عکاسی کی ہے ،بعد ازاں اقبال اور دیگر شعرا نے بھی ہمالہ پہاڑ پر نظمیں لکھی ہیں۔ اسماعیل کی نظم ''کوہ ہمالہ'' کا نمونہ ملاحظہ کیجیے:

ہے ہمالہ پہاڑ سر جیون
جس کے اوپر تلے کھڑا ہے بن
وہ جو ہے ہند کا بڑا ساگر
واں سے چلتا ہے ابر کا لشکر
(٨)

اکبرؔ بڑے محب وطن شاعر تھے۔ انھیں اس طرح اندھا دھند انگریزوں کی پیروی اچھی نہ لگی وہ اس پر بہت زیادہ کڑھتے اور اس کا اظہار اپنی نظموں میں مزاحیہ اندازمیں کرتے جو لوگوں پر بڑا اثر کرتا۔ان کا دل قومی وملی جذبات لیے دھڑکتا تھا اور وہ لوگوں کے لیے احساس درد مندی رکھتے تھے۔اکبر اپنی ملازمت کی وجہ سے اپنی بات ظرافت کے پردوں میں چھپا کر کرتے تھے۔ وہ مغربی تہذیب کی وجہ سے اپنی ملت کی اقدار کی پامالی پر مضطرب

تھے اور اپنے اس اضطراب کا اظہار انھوں نے اپنی ظریفانہ شاعری میں کیا ۔ اکبرؔ اپنا ملی تشخص کسی صورت بھی ختم ہوتا نہیں دیکھ سکتے تھے۔انھوں نے اپنے طرز احساس کو اس انداز سے تخلیقی پیرائے میں پیش کیا ہے:

سید نے آج حضرت واعظ سے کہا
چرچا ہے جا بجا ترے حاکم تباہ کا
تجھ سے ترک صوم وصلوٰۃ زکوٰۃ و حج
کچھ ڈر نہیں جناب رسالت پناہ کا
ہوتی تھی تاکید لندن جاؤ انگریزی پڑھو
قوم انگلش سے ملو سیکھو وہی وضع و تراش
بادۂ تہذیب یورپ کے چڑھاؤ خم پہ خم
ایشیا کے شیشۂ تقویٰ کو کر دو پاش پاش
(۹)

اکبر انگریزی تعلیم نہیں بل کہ انگریزی فکروتہذیب پر طنز کرتے تھے حال آں کہ خود اکبر نے انگریز حکومت میں ملازمت کی اور اپنے بیٹے عشرت حسین کواعلا تعلیم کے لیے لندن بھیجابعد میں اس کے مغربی رویے پر بھی طنز کیا۔ اکبر جدید تعلیم کی اہمیت سے آگاہ تھے اس لیے انھوں نے اپنے بیٹے کو لندن پڑھنے بھیجا ۔وہ نوجوانوں کو تلقین کر رہے ہیں کہ جن باتوں سے اقوام عالم اپنا نام اونچا کر رہی ہیں تم بھی وہ کام کرو تعلیم ،صنعت وحرفت سیکھو اور دنیا کی سیر کرو مگر اپنے دیس کی روایات اور اپنا مذہبی کلچر کبھی نہ بھولو:

وہ باتیں جن سے قومیں ہو رہی ہیں نامور سیکھو
اٹھو تہذیب سیکھو صنعتیں سیکھو ، ہنر سیکھو
بڑھاؤ تجربے اطراف دنیا میں سفر سیکھو
خواص خشک و تر سیکھو

علوم بحر و بر سیکھو
خدا کے واسطے اے نوجوانو
ہوش میں آؤ
دلوں میں اپنے غیرت کو جگہ
دو جوش میں آؤ
(۱۰)

الطاف حسین حالیؔ نے مسدس میں اسلامی تہذیب وتمدنکے انحطاط اور پستی کا انتہائی خلوص اور درد مندی سے شاعرانہ اظہار کیا ہے۔ مسدس مسلمانوں کے لیے بڑی مذہبی نظم ہے۔ اس سے حالیؔ نے قومی شاعری کی بنیاد رکھی۔ انھوں نے اس کے ذریعے پوری قوم کو آزادی کے لیے حرکت اور بیداری کا پیغام دیا۔ انگریز حکومت نے ہندوستان کے عوام کا معاشی استحصال کیا اور ظلم و جبر کا پہلو روا رکھا مگر ان کے آنے سے شاہی مطلق العنانیت کا ایک طویل باب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا اور آزادی کے وقت دونوں ممالک میں جمہوریت کا قیام عمل میں آیا۔ اس زمانے میں آزادؔ اور حالیؔ کے ساتھ ساتھ شبلی نعمانی نے سیاسی ،سماجی اور وطنی نوعیت کی نظمیں پیش کیں لیکن وہ شاعر سے زیادہ مورخ ،نقاد اور سیرت نگار ثابت ہوئے۔اس لیے انھیں نمایندہ نظم نگاروں میں وہ مقام حاصل نہیں ہو سکا جو آزادؔ اور حالیؔ کے بعداکبرؔ اور اسماعیلؔ کو حاصل ہے۔ اکبر الہ آبادی زیادہ ماضی پرست تھے وہ مغربی اثرات کی مخالفت کرتے تھے انھوں نے طنزومزاح کے انداز میں انگریزی تہذیب وتمدن کی برائیوں کا احتساب کیا ہے۔

آزادؔ اور حالیؔ نے جدید اردونظم میں فطری آثار ومناظر کو نئے انداز میں موضوع بنایا۔انھوں نے یہ تاثر قدیم شاعری سے لیا،خاص طور پر یہ شعرا نظیر اکبر آبادی سے متاثر ہوئے۔ آزادؔ اور حالیؔ نے موسموں ،پہاڑی مناظر ،دریاؤں ،چرند وپرند، پھل ،نباتات ،پھولوں ،باغات اور ہندوستان کے مقامات کی عکاسی کی ہے۔ حالیؔ سے قبل نظیر اکبرآبادی نے برسات سے متعلق نظمیں تخلیق کیں ان میں ''برسات کی بہاریں'' ،'' برسات کا تماشا'' او''ر برسات کی پھسلن'' اہم ہیں۔ بعدمیں حالیؔ نے برسات کے موضوع پر ایک خوب صورت مثنوی لکھی۔حالیؔ نے اپنی اس مثنوی میں برسات کےتمام پہلوؤں کو دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔ گرمی کی شدت سے جن وانس کی پریشانی کا نقشہ بھی انھوں نے کھینچا ہے اور برسات کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں موسم کو خوشگوار بنا دیتی ہیں یہ بھی بیان کیا ہے۔انھوں نے برسات سے جو رونق اور زندگی میں خوشگوار تبدیلی واقع ہوئی ہے کو بڑے احسن انداز میں اجاگر کیا ہے ،نمونہ ملاحظہ کیجیے:

کھم باغ میں جا بجا گڑے ہیں
جھولے ہیں کہ سو بسو پڑے
ہیں
کچھ لڑکیاں بالیاں ہیں کم سن

جن کے ہیں یہ کھیل کود کے
دن
ہیں پھول رہی خوشی سے
ساری
اور جھول رہی ہیں باری باری

(۱۱)

برسات پر مزید نظمیں آزادؔ کے کلیات ''نظمِ آزاد'' میں بھی ملتی ہیں۔''ابرِ کرم'' آزادؔ کی نمایندہ نظم ہے اس میں شاداب منظر کشی کی گئی ہے۔

بوندوں میں جھومتی ہیں وہ
درختوں کی ڈالیاں
اور سبز کیاریوں میں وہ
پھولوں کی لالیاں
گرنا وہ آبشار کی چادر کا زور
سے
اور گونجنا وہ باغ کا پانی کے
شور سے

(۱۲)

آزادؔ کی نظم ''ابرِ کرم'' میں عوام کی کیفیت اور ہندوستان کا مقامی رنگ ملاحظہ کیجیے:

جھولوں میں نوجوان ہیں پینگیں
چڑھا رہے
اور بچے آم کے ہیں پپیہے سجا
رہے
(۱۳)

حالیؔ کی ''برکھا رت'' ایک آفریں نظم ہے،ملاحظہ کیجیے:

برسات کا بج رہا ہے ڈنکا
اک شور ہے آسماں پہ برپا
ہے چرخ پہ چھاؤنی سی چھاتی

ایک آتی ہے فوج ایک جاتی
(۱۴)

حالیؔ نے یہ فطری اور منظری نظم ’’برکھا رت‘‘مثنوی کی ہیئت میں ہے ۔اس میں انھوں نے بارش سے پہلے اور بارش کے بعد شام تک اور رات کے بعد کی خوب صورت انداز میں منظر کشی کی ہے۔ انھوں نے قدیم ہیئت میں نظم تخلیق کی لیکن ان کا موضوع اور اسلوب نیا ہے۔ یہ نظم انھوں نے لاہور کے قیام کے دوران انجمنِ پنجاب کے مشاعرے کے لیے لکھی۔ حالیؔ کی پہلی نظم ’’برکھا رت‘‘ خالص ہندوستانی زبان اور فضا میں لکھی گئی ہے۔ نظم کے آخر میں حالیؔ میں محدود جذبہ حب الوطنی بیدار ہونے لگتا ہے اور وہ اپنے آبائی شہر ’’ پانی پت‘‘ کو یاد کر کے بیتاب ہوجاتے ہیں۔

بیزار اک اپنی جان و تن سے
بچھڑا ہوا صحبت وطن سے
قسمت میں یہی تھا اپنی لکھا
فرقت میں تمھاری آئی برکھا
(۱۵)

نظم ’’برکھا رت‘‘میں حالیؔ نے گرمی کی شدت کو بیان کیا ہے۔مثنوی کی ہیئت میں لکھی گئی یہ نظم داخلیت وخارجیت کاحسین امتزاج ہے۔ حالیؔ نے ان اشعار میں ’’پانی پت‘‘ کی ایک ایک چیز کو یاد کر کے انتہائی سوزوگداز والا لہجہ اپنایا ہے۔ یہ اشعار رومانوی طرزِ احساس کے قریب لگتے ہیں۔ حالیؔ نے ان اشعار کے ذریعے آنے والے شعرا کے لیے رومانوی احساس کا نمونہ فراہم کیا ہے۔ اسی موضوع پر مثنوی کی ہیئت میں لکھی اسماعیل کی نظم ’’برسات‘‘ ملاحظہ کیجیے:

وہ دیکھو اٹھی کالی کالی گھٹا
ہے چاروں طرف چھانے والی
گھٹا
گھٹا آن کر مینہ جو برسا گئی
تو بے جان مٹی میں جان آ گئی
یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا
کہ جنگل کا جنگل ہرا ہو گیا
(۱٦)

اسماعیل میرٹھی ایک دوسری نظم ’’ساون کی جھڑی‘‘ میں منظر یوں کھینچتے ہیں:

گھٹا کس سوچ میں چپکی کھڑی
ہے

برس آخر تو ساون کی گھڑی
ہے
(۱۷)

اسماعیل میرٹھی نے برسات کے موضوع پر متعدد نظمیں لکھیں ''بارش کا پہلا قطرہ''ان کی قومی نظموں میں زیادہ مقبول ہے۔اس نظم پر مقصدیت کی گہری چھاپ نظر آتی ہے:

گھنگھور گھٹا تلی کھڑی تھی
پر بوند ابھی نہیں پڑی تھی
اک قطرہ کہ تھا بڑا دلاور
ہمت کے محیط کا شناور
(۱۸)

شوق نے اپنی نظموں میں خوب صورت مناظر پیش کیے ہیں۔ روایت کااثر قبول کرتے ہوئے برسات کے موضوع پر لکھی گئی نظم ''برسات کی رات'' میں منظر نگاری کا اندازملاحظہ ہو:

دن ہے کم دیکھو ہٹا مغرب سے وہ ابر
سیاہ
کھل گئی دنیا میں آنے کے لیے کرنوں
کی راہ
(۱۹)

''موسم سرما'' کو متعدد قدیم شعرا نے بھی موضوع سخن بنایا جعفر زٹلی ،مصحفی ،جرأت اور قائم نے اس حوالے سے مثنویاں لکھی ہیں۔ نظیر اکبر آبادی کی سرما کے حوالے سے لکھی گئی نظم ''جاڑے کی بہاریں'' بڑی اہم ہے۔دور جدید میں آزادؔ نے قدیم شاعری کی فطری اور منظری روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے سردیوں سے متعلق ایک پر لطف مثنوی تخلیق کی ہے۔ انھوں نے نظیر اکبر آبادی اور دیگر فطرت نگار شعرا کی طرح جاڑے کی مختلف کیفیتوں کا نقشہ عمدہ اندازمیں کھینچا ہے۔ آزادؔ نے اس طرح فطری مناظر کی عکاسی نہایت خوب صورتی سے کی ہے کہ ایک سماں باندھ دیا ہے۔ ان کی جزئیات نگاری سے ان کے مشاہدے کی وسعت اور احساس کی باریکی کا علم ہوتا ہے۔ قدیم شاعری میں فطرت اور مناظر کی صرف جھلکیاں دکھائی گئی ہیں۔ آزادؔ اور حالیؔ نے جدید اردو نظم کو حسن فطرت اور مناظر سے بہت قریب کر دیا۔ جہاں سے کائنات صاف اور مکمل دکھائی دیتی ہے۔ آزادؔ نے مناظر ،وقت اور موسموں کی بدلتی ہوئی کیفیات کو بیان کر کے فطرت نگاری کو وسعت عطا کی۔

انجمنِ پنجاب کے اہم شعرا آزادؔ ،حالیؔ، اور ان کے معاصرین نے موسم اور وقت کی کیفیات کی حقیقی تصویر کشی کی ہے۔ آزادؔ اور حالیؔ کی کاوشوں سے جدید اردو نظم میں فطرت نگاری کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوگیا۔ آزادؔ نے پروفیسر ہالرائیڈ سے مل کر نیچرل شاعری کے ''مناظموں ''میں خاص عنوان اور نئے موضوعات باہم مشاورت سے دیے تھے۔ مناظر فطرت سے متعلق دیے گئے موضوعات میں سب سے نمایاں ''بے ضرر'' تھا۔علاوہ ازیں انھوں نے اخلاقی ،اصلاحی ،حب وطن اور رواداری کے موضوعات بھی شامل کیے۔ حالیؔ نے ان نئے موضوعات پر خوب طبع آزمائی کی اور یہ شان دار روایت پنجاب سے دہلی لے گئے۔آزادؔ اور حالیؔ نے اردو نظم میں فطرت کے عنصر کو شامل کرنے کی جدوجہد کی۔انھوں نے سانچوں کو تبدیل کرنے کا اعتراض نہ اٹھایا۔ نظیر اکبر آبادی کے بعد حالیؔ اور ان کے مقلدین ومتاثرین نے فطرت نگاری اور منظری روایت کو اپنایا۔آزادؔ موسم سرما کی منظر کشی یوں کرتے ہیں:

جاڑے کے مارے چلتے ہوئے پانی تھم گئے
اور جو تھمے ہوئے تھے وہ یخ ہو کے جم گئے
(۲۰)

آزادؔ کی موسمی منظر کشی کے بعد وقت کی منظر کشی ملاحظہ کیجیے،وہ کس طرح صبح کی آمد کو بیان کرتے ہیں:

ناگہ فلک پہ دامنِ شب خاک ہو گیا
لبریز نور سے طبقِ خاک ہو گیا
وہ گہری سبزیوں میں گلِ تر کی لالیاں
اور اوس سے بھری ہوئی پھولوں کی پیالیاں
(۲۱)

اسماعیل میرٹھی ''صبح کی آمد'' کی منظر کشی اس طرح کرتے ہیں:

خبر دن کے آنے کی میں لا رہی ہوں
اجالا زمانے میں پھیلا رہی ہوں
اٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں

(۲۲)

آزادؔ ،حالیؔ اور انکے معاصرین میں متعدد پہلوؤں پر اشتراک پایا جاتا ہے۔ان کے اہم معاصر شبلی کے یہاں بھی فطرت نگاری کے نمونے ملتے ہیں:

شعلہ زن پھر چمنستان میں ہوئی آتشِ گل
پھر صبا چلتی ہے گلشن میں بچا کر دامن
(۲۳)

شبلی نے بھی اپنی شاعری میں متعدد خوب صورت مناظر دکھائے ہیں،ایک اور نمونہ دیکھیے:

نو عروسانِ چمن کے ہیں نرالے انداز
کہ صبا گود میں لیتی ہے تو جاتے ہیں مچل
(۲۴)

حالیؔ نے آزادؔسے دوستی کی وجہ سے نیچرل شاعری میں دل چسپی ظاہر کی اور سرسید سے عقیدت کی وجہ سے قومی راگ الاپنا شروع کر دیا اس وجہ سے حالیؔ کی شاعری انقلاب آفریں ہے۔ انھوں نے اپنے اردگرد جو منظر دیکھے انھیں '' مناجات بیوہ '' ، '' برکھا رت'' ،'' حب وطن'' اور ''رحم وانصاف'' کی صورت میں پیش کیا۔ ''مناجات بیوہ'' کے مناظر میں مرکزی حیثیت مرد اور عورت کو حاصل رہی ،حالی عورت کی اہمیت سے واقف تھے۔ حالیؔ کی نظم ''چپ کی داد'' بھی اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں نہایت سادگی ،حسن اور کشش موجودہے ۔حالیؔ جدید دور کے اولین نظم گو تھے جنھوں نے مناظر فطرت کے ساتھ ساتھ حب الوطنی ،قومی ،ہمدردی ،اخلاقی، معاشرتی اور اصلاحی پہلوؤں کو بھی اپنایا ۔انھی مضامین سے متاثر ہو کر اقبال اور رومانوی دور کے دیگر شعرا نے اپنی اپنی شعری فکر کا تعین کیا۔ جس طرح ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے مسلمانوں کوحقیقت شناس کیا،اسی طرح حالیؔ نے اردو شاعری کو درباری رسم ورواج سے نکال کر عوامی مسائل کی طرف گامزن کیا۔ حالیؔ نے اپنی نظموں میں اہم اور سنگین حقائق بیان کیے۔انھوں نے فطرت نگاری کرتے ہوئے کائنات کا وسیع مطالعہ کیا اور تہذیب واخلاق انسانی سے متعلق نظمیں لکھیں۔ حالیؔ کی مناظر فطرت اور حب وطن کے نمونے دیکھیے:

اے وطن اے میرے بہشتِ بریں
کیا ہوئے تیرے آسمان و زمیں
(۲۵)

نظم جدید کے اولین شعرا میں مولانا محمد حسین آزاد سر فہرست ہیں۔انھوں نے مغربی علوم وفنون سے وابستگی اختیار کی کیوں کہ انھیں ادراک تھا کہ مغربی تہذیب نے ہندوستان کا نقشہ ہی تبدیل کر دیا ہے۔ انھوں نے انگریزوں کے مقابل آنے کے لیے مغربی علوم وفنون سے آ گہی حاصل کرنے پر زور دیا۔ حالات کی تبدیلی نے آزادؔ کو نظم جدید کی طرف راغب کیا تو انھوں نے نظم جدید کی روایت قائم کرنے کے لیے کرنل ہالرائڈ کی سرپرستی میں انجمن پنجاب کا قیام عمل میں لایا۔ ۱۸٦٤ء میں اس کا اجلاس ہوا تو آزادؔ نے افتتاحی لیکچر میں ''نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات'' کا مقالہ پڑھا۔اس کے بعد آزادؔ انجمن کے ماہانہ اجلاس میں قدیم شاعری کے عیوب اور جدید شاعری کے محاسن پر گفتگو کرتے رہے۔ آزادؔ نے فطرت نگاری اور حب وطن کے عناصر سے جدید اردو نظم میں بالکل ایک نیا اور دل کش رنگ بھر دیا،اس بارے میں عبدالقادر سروری رقم طراز ہیں:

> ''آزاد کی شاعری پر نظرڈالیں ،آپ کو محسوس ہو گا کہ قدیم شاعری کے معنوی چمن زاروں سے نکل کر آپ ایک ایسے خودرو خطے میں پہنچ گئے ہیں جہاں ہر چیز اپنی دل کشی اور رعنائی کے لیے صرف دستِ قدرت کی مرہون ہے۔''(٢٦)

آزادؔ نے معاصر شعرا کو کافی متاثر کیا۔آزادؔ کی فطرت پر مبنی نظموں میں '' صبح امید''، '' شب قدر'' ،'' وداع انصاف''،'' خواب امن'' ، ''گنجِ قناعت''اور''شرافت حقیقی'' شامل ہیں۔ یہ ساری نظمیں مثنوی کی ہیئت میں لکھی گئی ہیں۔ آزادؔ نے انگریزی زبان سے واقفیت رکھنے والے ادبا سے کہا کہ نئے انداز کے خلعت وزیور انگریزی صندوقوں میں بند ہیں انھیں کھول کر استفادہ کریں۔ جس طرح خسرو نے پہلا شعر کہا ،ولی نے پہلا دیوان ترتیب دیا۔ اسی طرح آزادؔ نے پہلی نئی نظم تخلیق کی۔انھوں نے اپنی نظموں اور انجمن کے تحت ہونے والے مناظموں میں نظم گوئی کے نئے تصورات پیش کیے اور انھیں پھیلانے میں اولیت حاصل کی۔ انھوں نے روایت میں نیا تجربہ کیا،انھوں نے مستعمل موضوعات بنا کر موضوعاتی نظمیں لکھنے کا نیا تجربہ کیا کیوں کہ ابتدائی مثنوی اور قصیدے میں ان کے باندھے ہوئے موضوعات کے نقوش ملتے ہیں۔ آزادؔ کی نظموں کو نیچرل شاعری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے کیوں کہ آزادؔ اور حالیؔ نے انجمن کے مشاعرے میں جو نظمیں پڑھیں تھیں ان میں مناظر فطرت کی تصویر کشی کی گئی تھی اور ایسا انھوں نے نظیرؔ اور انیسؔ کی روایت کو آگے بڑھانے کے لیے کیا اور ساتھ ہی انگریزی نظموں کا تتبع بھی کیا۔ ان دو زبانوں کے موضوعاتی اشتراک سے آزادؔ اور حالیؔ نے نئی نظم کا آغاز کیا۔ آزادؔ نے منظر کشی کے دل کش نمونے پیش کیے ان کی دوسری نظم'' صبح امید'' مناظر فطرت کی مصوری ہے۔ آزادؔ کی نظم ''خواب امن'' ایک تجسیمی مرقع ہے،اس میں رنگ رنگ کی تصویریں مجسم کر کے دکھائی گئی ہیں۔ آزادؔ نے بے جان اشیا کوانسانی شخصیت سے متصعب کر کے ان سے انسانی اوصاف بیان کیے ہیں،آزادؔ کے اس اسلوب کی مثال دیکھیے:

دفعتاً دیکھا کہ اک پیرہن سال آئے
پر عجب شان سے اک مرد خوش اعمال آئے
چشمِ پر نور میں پہنے ہوئے جامہ کالا
بر میں حبہ عربی سر پر عمامہ کالا
(۲۷)

آزادؔ کی یہ خصوصیات ہے کہ وہ خارجی حسن کو دیکھ کر اس کی تصویر کشی خارجی انداز میں کرتے ہیں وہ نظم ''شب قدر'' میں نظم کا مرکزی خیال رات کی مرقع کاری کرتا ہے۔ انھوں نے مزدور ،امیرزادے ،ملا ،نجومی،شاعر ،جہازران اور بچہ وغیرہ کی رات کے لمحوں کو خارجی ناظر کے انداز میں دیکھا ہے۔ انھوں نے رات کی مکمل تصویر کھینچی ہے۔آزادؔ کی مناظر فطرت کی مصوری کے بارے میں پروفیسر حامدی کاشمیری لکھتے ہیں:

''آزادؔ مناظر فطرت کی مصوری کرتے وقت کسی جذباتی رد عمل کااظہار نہیں کرتے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ خارجی نوعیت کی یہمنظر نگاری بعض جگہوں پر کامیاب اور شاعر کے احساس جمال اور شعور فن کی غماز ہے۔ ''(۲۸)

آزادؔ نے مناظر فطرت کے بیان کے علاوہ متعدد نظمیں اخلاقی موضوعات پر بھی لکھی ہیں۔ اس حوالے سے ان کی نظمیں ''اولولعزمی کے لیے کوئی سدراہ'' اور''معرفت الٰہی '' قابل ذکر ہیں۔ ان کی نظموں میں آزادؔ نے حسن فطرت سے نکل کر مبلغ اخلاق کا بھیس اختیار کر لیا ہے۔ انھوں نے نظم ''معرفت الٰہی '' میں زندگی کی بے ثباتی کا ذکر بڑا عمدگی سے کیا ہے۔ انسان اور ہر جاندار شے کو آخر موت سے ہمکنار ہونا پڑتا ہے اس نظم میں آزادؔ ایک دن غم سے گھبرا کر ایک گلزار کی جانب نکل جاتے ہیں اور ایک درخت کے سائے میں بیٹھ جاتے ہیں درخت سے ایک برگ ان کی آغوش میں گرتا ہے اور پھر وہ برگ اپنی کہانی سناتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ چمن کی بہاروں میں اپنے حسن ورنگ کا ذکر کرتا ہے اور آخر فنا ہو جاتا ہے، اس نظم کا نمونہ ملاحظہ ہو:

اک دن دل جو میرا گھبرایا
کلبۂ غم سے میں نکل آیا
(۲۹)

آزادؔ نے ۸ مئی ۱۸۷۴ء کے ایک جلسہ میں اپنی نظم ''شب قدر'' پیش کی ،یہ وہ شب قدر نہیں جو رمضان المبارک میں آتی ہے اور جسے لیلتہ القدر کہتے ہیں۔ دراصل آزادؔ نے اپنی

اس نظم میں رات کی اہمیت اور غرض وغایت بیان کرتے ہوئے تہذیب وتمدن کی عکاسی کی ہے۔ ان کی اس نظم میں یہاں کے رسم ورواج کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ انھوں نے بتایا ہے کہ رات طالب علموں کے لیے کتنی اہم ہے ۔رات کے وقت ماں کی بچے کے لیے بے قراری اور رات چوروں کے لیے کتنی اہم ہوتی ہے۔ اس نظم میں نیچر اور حقیقت ملتی ہے اس میں مشرقی اقدار نظر آتی ہیں۔ آزادؔ کی مثنوی ''خواب امن'' میں فطرت کی عکاسی کے ساتھ تہذیبی رنگ بھی ملتا ہے۔ اس نظم میں آزادؔ نے بھی حالیؔ،اسماعیلؔ اور دیگر شعرا کی طرح گرمی کے موسم ،برسات ،گھٹاؤں وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ آزادؔ کی مثنوی ''زمستان'' میں ہندوستان کے دیہاتوں کی تہذیب نمایاں ہے،جاڑے میں گاؤں کے لوگوں کا انگیٹھی اور الاؤ کے گرد بیٹھنا اور لحاف میں بیٹھ کر آگ تاپنا شامل ہے۔ جیسے دیکھو شال اوڑھے پھر رہا ہوتا ہے اور غریب سردی سے ٹھٹھر رہے ہیں۔ انھوں نے بچوں کو وماں باپ کی بغلوں میں گھستے ہوئے دکھایا ہے۔ آزادؔ نے یہاں کے جاڑے کا موسم تہذیبی تناظر میں پیش کیا ہے۔ آزادؔ کی نظم ''نوطرز مرصع'' میں بھی تہذیبی عناصر و عوامل پائے جاتے ہیں۔ اس کے تمہیدی اشعار میں ہندوستان کے دل افزا مقام شملہ کے مناظر پیش کیے گئے۔

آزادؔ کی فطرت کا مرقع نظم'' سلام علیکم'' ہے جس میں ایک طالب علم کے شب وروز دکھائے ہیں کہ کس طرح وہ دریا کنارے محو مطالعہ ہوتا ہے اور ٹھنڈی ہواؤں سے لطف اٹھاتا ہوا گھر کو چل دیتا ہے اسے راستے میں چراگاہوں سے بھینسوں اور گائے بکریوں کے ریوڑ لوٹتے ہوئے ملتے ہیں۔ گھر آ کر وہ اپنے والد کو سلام کرتا ہے ،رات کو سو جاتا ہے اور صبح چڑیوں کی چہچہاہٹ سے جاگتا ہے ۔آزادؔ نے ایک طالب علم کی مثالی زندگی کے پس منظر میں نوجوانوں کو تعلیمی،تہذیبی اور اخلاقی پیغام دیا ہے۔ یہ نظم انسانی زندگی اور معاشرت کی عکاسی کرتی ہے ،جانوروں کا شام کوچراگاہ سے گھروں کو لوٹنا دیہاتی تہذیب کا منظر پیش کرتا ہے اور ایک مہذب لڑکے کے شب وروز بھی ہندوستانی تہذیب کا حصہ ہیں:

خدا کی نظر آ رہی شان ہے
سہانا سا اک سبز میدان ہے
ہری گھاس وہ لہلہاتی ہوئی
ہوا لوٹ کر لہر کھاتی ہوئی
(۳۰)

انجمن پنجاب کے زیر اثر لکھی گئی نظمیں حالیؔ کے نئے رجحانات کی حامل ہیں اور نیچرل شاعری کی عمدہ مثال ہیں۔ ان کی منظر نگاری کے ذریعے عام انسانی معاملات کو انتہائی سادگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔حالیؔ کی نظموں میں ہندوستانی زندگی اور معاشرت کی بوباس ملتی ہے۔''رحم وانصاف'' کے مکالماتی انداز کے علاوہ بھی حالیؔ نے چند اور مکالماتی نظمیں لکھی ہیں۔ ان میں ''مناظرۂ تعصب وانصاف'' ،'' پھوٹ اور ایکے کا مناظرہ'' ،''مناظرہ واعظ وشاعر'' اور ''دولت اور وقت کا مناظرہ'' شامل ہیں۔ ''مناظرۂ تعصب وانصاف'' میں اہل وطن کی پسماندگی کا سبب تعصب کو قرار دیا گیا ہے اور تہذیب کی نئی

روش کو انصاف کہا گیا ہے۔''پھوٹ اور ایکے'' میں قوموں کی زندگی میں اتحاد ونفاق کی بات کی گئی ہے اور پھوٹ اور ایکے کے نتائج بیان کیے گئے ہیں۔ ''مناظرۂ واعظ اور شاعر'' میں حالیؔ نے روایتی شعرا اور نام نہاد واعظوں کو بے نقاب کیا ہے۔ حالیؔ نے اپنی نظم ''دولت اور وقت کا مناظرہ'' میں وقت کو دولت پر ترجیح دی ہے۔ یہ نظمیں حالیؔ کے اخلاقی ، اصلاحی اور روحانی خیالات کی مظہر ہیں۔ ان نظموں کو حالیؔ نے شعوری طور پر لکھا ہے ،''دولت اور وقت کا مناظرہ'' ملاحظہ ہو:

ایک وقت نے دولت سے کہا
سچ بتا تجھ میں ہے فوقیت کیا
تو ہے سرمایۂ عزت یا میں
تو ہے انسان کی دولت یا میں
(۳۱)

حالیؔ انیسویں صدی کے اواخر کی اصلاحی تحریکوں سے متاثر تھے مثلاً سرسید احمد خاں کی تحریک علی گڑھ سے ذہنی قربت رکھتے تھے۔ اس لیے انھوں نے بڑے مصلح کے طور پر سماجی بے انصافی جس کا شکار خاص طور سے مسلمان بھی تھے اس کے لیے آواز اٹھائی ۔حالیؔ نے عورتوں سے ہمدردی کے لیے نظمیں لکھیں۔ انھوں نے ہندوستانی معاشرے کو تہذیب وتعلیم کا گہوارہ بنانے کے لیے عورتوں کو ان کے جائز حقوق دینے پر اصرار کیا۔ انھوں نے عورت کی بے بسی ،مظلومت اور حقوق کی پامالی کے لیے آواز اٹھائی اور طبقہ نسواں کے ناگفتہ بہ حالات کا ذکر اپنی نظموں ''مناجات بیوہ'' اور ''چپ کی داد'' میں کر کے ہمدردی کے جذبات کو ابھارا۔ ان نظموں میں انھوں نے ہندوستانی عورت کی بیوگی کی دل خراش تصویر کشی کی ہے۔ نظم کا ہر لفظ درد اور تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے۔ حالیؔ نے اس نظم میں بیوہ کی حالتِ زار بیان کی ہے۔نظم''مناجات بیوہ '' میں بیوہ عورت کی زندگی کے درد وکرب اور محرومی کی عمدہ عکاسی کی ہے۔حالیؔ نے جوان بیوہ کی مصیبتوں ،کلفتوں اور جذبات و احساسات کو محسوس کیا ہے۔

اسماعیل نے حالیؔ کی طرح انجمن پنجاب کے لیے بھی تین مثنویاں لکھیں،ان میں مثنوی ''آب زلال'' اہم ہے۔ انھوں نے اتحاد، حبِ وطن اور معاشرتی مسائل کو زیادہ تر موضوع سخن بنایا ۔ انھوں نے عورتوں کے تہذیبی وتمدنی رویے بھی بیان کیے اس حوالے سے ان کی نظم ''حیا'' اہم ہے۔اکبرؔ نے بھی فطرت نگاری کی ہے،انھوں نے زیادہ تر طنزومزاح کا اسلوب اپنائے رکھا مگر کچھ نظمیں مناظر فطرت کی مصوری کے نمونے بھی پیش کرتی ہیں:

بہار آئی کھلے گی زیب صحن
میں بوستاں ہو کر
عنادل نے مچائی دھوم سرگرم

فغاں ہو کر
بچھا فرش زمرد اہتمام سبزہ تر
میں
چلی مستانہ وش باد صبا عنبر
فشاں ہو کر
(۳۲)

اکبر الہ آبادی کی رباعیوں ،قطعوں اور نظموں میں زیادہ تر تنقید ملتی ہے،جو انگریز سامراج کے خلاف ہے اور اس میں ہندوستان کے عوام کے مسائل ومصائب اور کلفتوں کی عکاسی کی گئی ہے ،تنقیدی نوعیت کی حامل ہونے کی وجہ سے اکبر کی نظموں میں تخلیقی وفور بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ اسماعیلؔ کی مظاہر فطرت کی نظموں میں مشاہدہ ،تخیل اور فکر کی آمیزش ہے۔ انھوں نے مثنوی کی ہیئت میں صبح، شام ،شفق، رات اور برسات وغیرہ کی عکاسی کی ہے۔ اسماعیلؔ کی سادہ اور دلکش انداز کی نظموں میں ''گرمی کا موسم'' ،''خشک سالی''،'' بادِ مراد''اور''شفق'' شامل ہیں۔آزاد اور حالی نے بھی برسات اور گرمی کے موسم کی بات کی ہے۔ اسماعیل ؔکی فطری منظر کشی نظم ''گرمی کا موسم'' میں ملاحظہ کیجیے:

مئی کا آن پہنچا ہے مہینہ
بہا چوٹی سے ایڑی تک پسینا
بجے بارہ تو سورج سر پہ آیا
ہُوا پیروں تلے پوچھیدہ سایا
(۳۳)

اسماعیلؔ کی حسن فطرت کی حامل نظم''خشک سالی'' ملاحظہ ہو:

نہ صحرا میں دل آویزی کا
انداز
نہ بستی میں ادائے دلکشی
نہ صحن باغ طوطی کا نغمہ
نہ شاخِ گل پہ بلبل چہچہائی
(۳۴)

انجمنِ پنجاب کے مناظموں میں نیچرل موضوعات پر نظمیں لکھی گئیں لیکن ہیئتیں اور اسالیب قدیم ہی رہے۔ اس دورکی خاص بات یہ ہے کہ ہیئتیں جامد ہی رہیں لیکن جدیدموضوعات تلاش کیے گئے۔اسماعیلؔ اس دور میں نیچرل شاعری کا سب سے بڑا حوالہ تھے۔ ان کافطری انداز بیان نظم ''خدا کی صنعت'' میں دیکھیے:

جو چیز خدانے ہے بنائی
اُس میں ظاہر ہے خوشنمائی
کیا خوب ہے رنگ ڈھنگ سب کا
چھوٹی بڑی جس قدر ہیں اشیا
(۳۵)

اسماعیلؔ نے مخمس کی ہیئت میں لکھی اس نظم میں مناظر فطرت کو نظم کرتے ہوئے خوب صورت منظر کشی کی ہے۔ ان کی شاعری پر حالیؔ کا اثر غالب ہے،اس بارے میں پروفیسر حامدی کاشمیری لکھتے ہیں:

''منظر نگاری کے نمونے سے اندازہ ہو گا کہ اسماعیلؔ کے یہاں حالیؔ کااثر صاف جھلک رہا ہے لیکن ساتھ ہی اسماعیلؔ کی نظموں پر قدرت اور مشاہدے کی اصلیت بھی جلوہ گر ہے۔''(۳٦)

شوق قدوائی ،آزاد اور حالی کے معاصرین میں سے تھے اور انھوں نے ان کی روایت کی توسیع بھی کی ازاں بعد وہ رومانوی طرز احساس اختیار کر گئے ۔ان کے شعری تصورات نے کئی تغیرات پیدا کیے ،وہ آزاد اور حالی کی شعری روایت کے پرستار تھے۔شوق قدوائی نے ''حسن بہار'' اور ''ہندوستان کی برسات'' میں نہایت عمدگی کے ساتھ فطرت نگاری کی ہے۔ وہ اپنی نظم ''حسن'' میں مظاہر فطرت کا حسن یوں بیان کرتے ہیں:

اللہ رے حسن ! تیرے نیرنگ
تو جس میں ہو ، لائی ہے وہ رنگ
گلشن کی ہوا پیام تیرا
پھولوں میں بہار نام تیرا
(۳۷)

شوق قدوائی کی یہ نظم مثنوی کی ہیئت میں لکھی گئی ہے ،اس نظم میں فطرت کی منظر کشی نمایاں ہے ان کی نظم ''سیردریا'' میں حسن فطرت دیکھیے:

نگاہ لوٹ ہے دریا کی اس روانی پر
کسی جبیں پہ شکن ہے کہ لہر پانی پر
(۳۸)

شوق قدوائی نے فطرت نگاری میں نظیر اکبر آبادی ،آزاد ،حالی اور اسماعیل میرٹھی کی تقلید کی ہے۔ شوق قدوائی کی ہیئتیں اور موضوعات انجمنِ پنجاب کے نظم نگاروں والے ہیں وہ اسماعیل میرٹھی اور اولین دور کے دیگر شعرا سے مکمل ہم آہنگ ہیں مگر ان کی نظمیں ان سے قدرے طویل ہیں،شوق قدوائی نے کوئل اور پپیہے کی آواز کو بھی نظم میں قیدکیا ہے اور چڑیوں کے زرد اور سنہری پروں کو بھی مصور کرتے ہیں ان کی نظم ''بہار'' ملاحظہ ہو:

پپہیے کو کہیں کوئل سے ہے بحثِ ہم آواز
کہیں ہے کوکلا ، کس حسن سے محوِ نوا سازی
کہیں بھنگراج دل کو کھینچتا ہے خوش نوائی
سے
کہیں مینائیں غل کرتی ہیں آپس کی لڑائی سے
ہزاروں رنگ کی چڑیاں، ہیں شکلیں خوشنماجن
کی
ادائیں دلربا جن کی ، صدائیں نغمہ زا جن کی
(۳۹)

شوق کی نظم ''چڑیاں'' ان کی فطرت نگاری کی عمدہ مثال ہے۔ نمونہ ملاحظہ کیجیے:

چڑیوں کا اِدھر اُدھر سے آنا
چھوٹے چھوٹے پھلوں کا کھانا
کچھ سبز ہیں جن کے لال سر
ہیں
کچھ زرد ، سنہری جن کے پر
ہیں
(۴۰)

اسماعیل نے بھی اسی عنوان سے ایک نظم ''چڑیا کے بچے'' لکھی ہے۔انھوں نے پہلی بار بے قافیہ نظم تخلیق کی،ان کی نظم معریٰ کی ہیئت میں لکھی ''چڑیا کے بچے'' ملاحظہ ہو:

دو تین چھوٹے بچے چڑیا کے
گھونسلے میں
چپ چاپ لگ رہے ہیں سینہ
سے اپنی ماں کے
اپنے پروں کے اندر بچوں کو

ڈھک لیا ہے
(۴۱)

شوق کی ایک اور نظم ''تتلی'' بھی اہم ہے اس میں فطرت نگاری کااچھا تاثر ملتا ہے۔ان کی نظموں میں بھی حسن فطرت کی عکاسی کی گئی ہے۔انھوں نے فطرت نگاری کی روایت حالی اور آزاد سے متاثر ہو کر تو کم ہی کی زیادہ تر انھوں نے انگریزی شعرا سے اثر قبول کیا۔انھوں نے انگریزی شاعری کا ترجمہ کرتے ہوئے خوب صورت منظر کشی کی ہے۔شوق نے دیگر نظموں میں ہندوستانی مناظر فطرت کی عمدہ مصوری کی،ا س طرح کی نظموں پر آزاد اور حالی کا اثر واضح دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے اپنے گردوپیش کے مشاہدات سے متاثر ہو کر اپنے تاثرات کی تصویری جھلکیاں پیش کی ہیں۔ انھوں نے ''آمد بہار'' ، ''جنگل'' ،'' باغ وبہار'' اور''بندھیا چل کی چاندنی رات'' میں خوب صورت منظر نگاری کے نمونے پیش کیے ہیں۔ آزادؔ انگریزی شاعری اور تنقید سے متعلق کچھ آگہی رکھتے تھے۔دہلی کالج کی تعلیم کے دوران انھوں نے میجر فلر اور کرنل ہالرائیڈ کی محبت سے فیض اٹھاتے ہوئے انگریزی نظم کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔آزادؔ نے جب انگریزی نظم کامطالعہ کیا تو چند نظمیں انگریزی نظموں کے تتبع میں لکھیں۔ آزاد نے ''مبارکباد جشن'' ،'' ایک تارے کا عاشق'' اور ٹینی سن کی نظم کا آزاد ہیئت میں ترجمہ کیا جوقابل ذکر ہے۔آزاد کی اس ترجمہ نگاری کے بارے میں مولوی میر حسن رقم طراز ہیں:

> ''ترجمہ میں انھوں (آزاد) نے آزادی سے کام لے کر انگریزی خیالات کو اردو نظم کاجامہ پہنایا۔''مجموعہ نظم آزاد'' میں ان کی ایک نظم ہے جس کاعنوان ہے''اولوالعزمی کے لیے کوئی سدراہ نہیں ہے'' یہ لارڈ ٹینی سن کی نظم ''ایکسکٹیر'' کے انداز میں لکھی گئی ہے۔''(۴۲)

حالیؔ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے انگریزی نظموں کے منظوم اور منثور ترجمے کیے ،ان ترجموں میں زمزمہ قیصری کے نام سے مسز اسٹوک کی نظم جو تین حصوں پر مشتمل ہے کے ایک پہلے حصے کا ترجمہ ہے۔ حالی نے یہ ترجمہ ۱۸۷۸ء میں کیا ایک اور نظم'' انگریزی اشعار کا ترجمہ'' کے نام سے ''دیوان حالی'' میں شامل ہے،لیکن اس میں شاعر کے نام کا ذکر نہیں کیا گیا۔ حالیؔ نے گولڈ سمتھ کی نظم ''ڈزرٹیڈویلج'' کا ترجمہ بھی کیا ،حالیؔ کی دوسری علامتی نظم ''نشاط امید'' میں وہ امید سے مخاطب ہیں اور امید کے اوصاف بیان کرتے ہیں ،وہ بزرگوں اور پیغمبروں کا حوالہ دے کر بتاتے ہیں امید نے مایوسیوں کے اندھیرے میں راہ دکھائی ہے۔ اس نظم میں انھوں نے ناامیدی اور مایوسی کی حالت کی مصوری کی ہے۔ ان کے یہاں راحت جاں بن کر ابھرتی ہے۔''نشاط امید'' میں حالیؔ کا تصور شیکسپیئر کے قریب تر ہے ،شیکسپیئر اپنے مشہور سانیٹ ''دھن ان ڈسگریس'' میں محرومیوں اور مایوسیوں میں گرے ہوئے ہیں اتنے میں انھیں اپنے محبوب کی یاد آجاتی ہے اور وہ امید اور مسرت کی کرن منور کرتی ہے۔

آزادؔ اور حالی نے’’انگریزی سے سیکھو اور اردو میں بیان کرو‘‘ کی رسم قائم کی کیوں کہ انھوں نے انگریزی زبان وادب سے استفادہ کرکے اسے اردو زبان میں بیان کیا۔۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد جب برصغیر میں انگریزی تعلیم پروان چڑھ رہی تھی تو حالیؔ نے آزادی کے موضوع پر نظمیں لکھ کر جدید اردو نظم کی تحریک کو آگے بڑھایا۔حالیؔ کی ان نظموں کا موضوع اصلاحی و قومی نوعیت کا ہے اور اس میں فطرت کی بھر پور عکاسی کی گئی ہے جو کہ انگریزی شاعری کا واضح تتبع ہے۔ حالیؔ کی ترجمہ شدہ نظم’’زمزمۂ قیصری ‘‘ میں قدیم آریہ تہذیب ،ہندوستان پر محمود غزنوی کے حملے ،مسلم تہذیب اور ہندوستانی عوام کے رواجوں کو پیش کیا گیا ہے۔نمونہ دیکھیے:

اے حصارِ عافیت اے کشورِ ہندوستاں
زیب دیتا ہے اگر کہیے تجھے سارا جہاں
اے مقدس آریہ ورتھ آئی کیا تجھ پر بلا
جس نے بزل یک دلی کو تیرے برہم کر دیا
پھر ہوا اسلام کے اقبال کا تارا بلند
جانب ہندوستاں محمود نے ہانکا بلند
(۴۳)

حالیؔ انگریزی تعلیم وتہذیب کے خلاف تو نہ تھے مگر انھیں اپنی مشرقی تہذیب و ثقافت سے زیادہ انس تھا ،انھیں ہندوستان میں رہتے ہوئے زیادہ اسلامی تاریخ وتہذیب عزیز رہی۔اسماعیل جب مدارس کے دفتر میں ملازم تھے تو انھیں انگریزی سے اردو میں کیے گئے ترجمے موصول ہوئے اس سے متاثر ہو کر انھوں نے بھی ۱۸۶۷ء میں ’’کیڑا‘‘،’’ ایک قانع مفلس‘‘،’’ محب وطن‘‘،’’ انسان کی خام خیالی‘‘،’’موت کی گھڑی‘‘ اور’’ فادر ولیم‘‘جیسے منظوم ترجمے انگریزی زبان سے اردو میں کیے یہ نظمیں پابند ہیئت میں ہیں۔ نظم’’کیڑا‘‘ میں انھوں نے مور کی خوب صورتی اور کیڑے کا موازنہ کر کے انسانوں میں ہمدردی کا جذبہ ابھارا ہے۔ مور ہندوستان کے خوب صورت پرندومیں سے ہے۔ اسماعیل بظاہر مغربی تہذیب کے مخالف تھے مگر انگریزی تعلیم اور علوم و فنون حاصل کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ انھوں نے انگریزی نظموں سے غیر مقفیٰ تراجم بھی کیے ان میں ’’تاروں بھری رات‘‘ اور ’’چڑیاکے بچے ‘‘ شامل ہیں۔نظم ’’تاروں بھری رات‘‘ کا پہلا مصرع انگریزی کی مشہور نظم ’’Twinkle Twinkle little stars‘‘ سے ماخوذ ہے۔اسماعیل کا فنی کمال یہ کہ انھوں نے انگریزی پابند نظم کو نظم معریٰ بنا دیا ہے۔ نمونہ دیکھیے:

ارے چھوٹے چھوٹے تارو
کہ چمک دمک رہے ہو
تمھیں دیکھ کر نہ ہووے
مجھے کس طرح تحیر
(۴۴)

اسماعیل میرٹھی نے انگریزی نظموں کے تراجم کیے، بعد میں رومانوی شعرا نے بھی یہ روایت ایک عرصہ اپنائے رکھی۔ اسماعیل نے انھی تراجم میں انگریزی ادب کی تقلید کرتے ہوئے نظم معریٰ کے ابتدائی نمونے پیش کیے ۔اسماعیل کی مثنوی ''بادِ مراد'' کافی اہم ہے۔انھوں نے انگریزی سے تراجم میں طبع زاد نظموں جیسی دل کشی اور خوب صورتی برقرار رکھی ہے۔ اسماعیل انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کے آغاز تک جدید شعری فضا پر چھائے رہے ۔انھوں نے نظم جدید کے تصور کو پیش نظر رکھتے ہوئےآزاد اور حالی کی قائم کی ہوئی روایت کی پاسداری کرتے ہوئے اسے وسعت عطا کی۔ انھوں نے آزاد اور حالی کی اتباع میں مناظر فطرت ،جذبات نگاری ،حب الوطنی اور قومی جوش وجذبے سے مملو شاعری کی۔اسماعیل نے آزاد اور حالی کی اتباع کرتے ہوئے انگریزی نظموں کے تراجم کیے اور پہلی بار نظم معرا کو اردو میں متعارف کرایا۔ آزاد اور حالی کے بعد جدید اردو نظم کے فروغ میں اسماعیل کا کردار قابل تحسین ہے۔ آزاد اور حالی کے معاصرین اور بعد میں آنے والے شعرا نے آزادانہ اظہار کم کیا بل کہ وہ آزاد اور حالی کی روایت ہی سے چمٹے رہے۔ اسماعیل واحد شاعر ہیں جو آزاد اور حالی کی تحریک نظم جدید سے فوری متاثر ہوئے اس لیے ان کے یہاں آزاد،حالی اور کلاسیکی عہد کے نظم نگار نظیر اکبرآبادی سے اشتراک وانسلاک پایا جاتا ہے۔ کلاسیکی دور اور آزاد وحالی سے متاثر ہو کر فطرت نگاری اور جذبہ حب الوطنی اختیار کرنے والوں میں اسماعیل زیادہ اہم ہیں اس بارے میں ڈاکٹر ناہید قاسمی لکھتی ہیں:

> ''سرسید کے کہنے پر انھوں نے فارسی کے ثقیل الفاظ کے بجائے سادہ اردو محاورے کو اپنایا۔انجمن پنجاب کی تحریک سے بھی متاثر ہوئے ،یونانھوں نے نیچرل نظمیں کہنا شروع کیں۔ ---ان کے انگریزی نظموں کے تراجم ایسے خوب صورت ہیں کہ مقامی رنگ میں رنگ کر یہیں کا حصہ بن گئے ہیں۔''(۴۵)

اسماعیل کی شاعری انجمن پنجاب کے زیر اثر ہونے کی وجہ سے مقصدیت ،افادیت اور حقیقت پسندی کی قائل رہی۔ انھوں نے موسموں ،مناظر، انسانیت کی خدمت اور محبت کے جذبے سے سرشار نظمیں لکھی ہیں۔ وہ ایک کام یاب فطرت نگار،مرقع نگاراور محب وطن شاعر ہیں۔ اکبر نے فطرت نگاری سے متعلق انگریزی نظموں کے عمدہ تراجم کیے اس حوالے سے وہ حالی ،آزاد اور اسماعیل سے گہری مماثلت رکھتے ہیں۔۱۸۹۹ء میں رسالہ ''معارف''

میں اکبر کی نظم ''رانئ آب'' شائع ہوئی یہ نظم مغربی شاعری کے اندازمیں لکھی گئی ہے اور بے حد مقبول ہوئی:

اچھلتا ہوا اور ابلتا ہوا
اکڑتا ہوا اور مچلتا ہوا
پہاڑوں پہ سر کو پٹکتا ہوا
چٹانوں پہ دامن جھٹکتا ہوا
(۴٦)

اکبر نے صنف قطعہ میں خوب صورت طنز ومزاح کے رنگ بکھیرے ہیں ان کی مکمل نظموں میں ''آب لوڈور''،''برق کلیسا''، ''امس'' ،''آمد بہار'' اور''جلوہ دربار دہلی'' اہم ہیں۔ اکبر نے ''آب لوڈور'' انگریزی شاعرسدے(SD Southey) کے تتبع میں لکھی۔سدے کی نظم زوربیان کا عمدہ نمونہ ہے اس لیے اس کا ہو بہو منظوم ترجمہ مشکل و ناممکن تھا،اکبر نے اسے سامنے رکھ کر نئی نظم تخلیق کی۔ انھوں نے سدے سے اثر قبول کیا مگر ان کی نظم انفرادی حیثیت رکھتی ہے۔اکبر نے اسماعیل کی طرح چند معرا نظمیں بھی لکھی یہ ان کی انگریزی نظموں سے واقفیت کا ثبوت ہے:

اجسام کے فنون کا کرتے ہیں
خود عمل
اجرام کے علوم کا دیتے ہیں ہم
کو درس
ہوتا ہوں معترض تو وہ کہتے
ہیں واہ واہ
میں نے تو کر دیا تیرا رتبہ بلند
تر
(۴٧)

اکبر کی بلینک ورس میں لکھی گئی نظم جس میں کاغذ پر ایک ننھے سے کیڑے کے پس جانے پر وہ حیات کی فنا پذیری کے تصور کو پیش کرتے ہیں:

چلا جاتا تھا اک ننھا سا کیڑا
رات کاغذپر
بلا قصد ضرر اس کو ہٹایا میں
نے انگلی سے
مگر ایسا وہ نازک تھا کہ فوراً
پس گیا بالکل
(۴٨)

علی حیدر نظم طباطبائی جدید نظم کے اولین دور کے نمایندہ نظم نگار تھے جو انگریزی ترجموں کی وجہ سے مقبول ہوئے۔وہ انگریزی ترجموں کی بنا پر آزاد،حالی،اسماعیل ،اکبر اور شبلی سے اشتراک وانسلاک رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے عہد کی مروجہ ہیئتوں اور موضوعی روایت کے مطابق نظم نگاری کی۔ انھوں نے انگریزی شاعر گرے کی ''ایلجی'' کا ترجمہ کیا۔ ان کا یہ منظوم ترجمہ شرر کے رسالہ''دلگداز'' میں شایع ہوا۔نظم طباطبائی نے انگریزی صنف اسٹینزا کو اصل انداز میں قائم رکھا۔طباطبائی کی مشہور نظم ''گورغریباں'' ایک طویل نظم ہے۔اس کا نمونہ ملاحظہ کیجیے:

وداع روز روشن ہے گجر شام غریباں کا
قدم گھر کی طرف شوق سے اٹھتا ہے دہقاں کا
اندھیرا چھا گیا دنیا نظر سے اٹھتی جاتی ہے
مگس لیکن کسی جا بھیرویں بے وقت گاتی ہے
(۴۹)

شاعری کا ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا بلاشبہ مشکل عمل ہے،یہی وجہ ہے کہ نظم طباطبائی اپنی نظم ''گورغریباں'' میں پوری طرح گرے کی نظم کے فنی تقاضوں ،لفظی طلسم اور فکروخیال کو مکمل پورا نہ کر سکی،نظم کے کچھ بندوں کے ترجمے میں گرے کےبنیادی تصور دور جا پڑتے ہیں اور انھوں نے ایک نیا تصور پیش کر دیا ہے۔ نظم طباطبائی کی اس ترجمے کی اہمیت کے بارے میں پروفیسر حامد کاشمیری رقم طراز ہیں:

''نظم طباطبائی کے ان ترجموں کی بڑی اہمیت ہے کیوں کہ انھوں نے جدیدنظم کو متاثر کرنے اور اسے فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا ہے۔''(۵۰)

نظم طباطبائی نے پہلی بار انگریزی صنف اسٹینزا کو اردو میں متعارف کرایا۔ ''گورغریباں '' اسٹینزا کی ہیئت میں لکھی گئی ہے،انگریزی صنف اسٹینزا کی تقلید میں نظم طباطبائی کی ایک اور نظم ''اس طرح وطن کی خیرمناتے ہیں'' بڑی اہم ہے جس میں تین مصرعے ہم وزن و ہم قافیہ ہیں اور چوتھا مصرع الگ قافیہ رکھتا ہے۔دیگر معاصرین کی طرح نظم طباطبائی بھی نظم کو قافیے کی قید سے آزاد کرنا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے ایک نظم ''بلنیک ورس کی حقیقت'' لکھی اس نظم میں انھوں نے قافیے کی قید کا مذاق اڑایا اور اسے فطری شاعری کی تخلیق میں رکاوٹ قرار دیا۔شوق قدوائی بھی انگریزی شاعری سے متاثر ہو

کر مناظر فطرت کی عکاسی کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں نسوانی حسن کی جادو آفرینی کااعتراف بھی کیا ہے۔ان کی نظموں میں ہندوستانی لڑکیوں کی معصومیت ،دوشیزگی،شوخی اور بے فکری بیان کی ہے۔انھوں نے دوشیزگئ حسن کا جو مجسمہ بنایا ہے وہ ورڈزورتھ کی ''لوسی'' کی طرح کا ہے،بعد میں اس طرح کے نمونے اختر شیرانی کی شاعری میں بھی ملتے ہیں۔ شوق قدوائی کی نظم کا یہ نمونہ دیکھیے:

سائے سے ہٹ کر اب یہ آنچل اٹھا رہی ہے
چھوٹی سی اوڑھنی سے سر کو چھپا رہی ہے
ننھی سی آرسی پر نظریں جما رہی ہے
خود منہ چڑھا رہی ہے خود مسکرا رہی ہے
(۵۱)

جدیدا ردو نظم کے اولین شعرا کی شاعری میں ایک بڑا موضوعاتی اشتراک اصلاحی نوعیت کی شاعری ہے۔ آزاد اصلاح قوم کا جذبہ رکھتے تھے اس کام کے لیے بھی وہ خدا سے دعا گو ہیں کہ ان کی شاعری میں اتنا اثر بھر دے کہ اس سے قوم کی اصلاح کاکام لیا جا سکے:

یا رب یہ التجا ہے کرم تو اگر کرے
وہ بات دے زباں پہ کہ دل میں اثر کرے

(۵۲)

برطانیہ چوں کہ اس وقت ترقی یافتہ ممالک میں شمار ہوتا تھا اس لیے حالیؔ نے وقت کی نبض پہچان کر شاعری میں مغربی موضوعات اور انداز بیان اپنایا۔ لاہور میں کچھ سال قیام کے بعد حالی کی صحت بگڑ گئی اور وہ واپس دلی چلا گئے ۔دلی میں قیام کے دوران انھیں سرسید جیسے مصلح قوم کی رفاقت نصیب ہوئی جس سے وہ گہرے متاثر ہوئے یوں حالی کی شاعری نے تیسرا موڑ لیا اور سرسید کے پیدا کردہ اصلاحی جذبے کے تحت اپنی طویل اور مشہور نظم''مسدس حالی'' لکھی۔انجمن پنجاب کے موضوعاتی مشاعروں میں شرکت اور آزاد کے بصیرت افروز لیکچروں نے حالی کی ذہنیت کو بدل دیا۔حالی نے روایتی اور دہرائے جانے والے مضامین کو رد کر دیا ،انھوں نے کہا کہ قدیم شعری موضوعات ذہنی عیاشی سے مملو

ہیں ۔زندگی کی سچائی اور انسان کے قلبی جذبات کے ترجمان نہیں۔اس لیے اب ضرورت اس امر کی ہے کہ دیگر زبانوں کے علوم وادب کوسامنے رکھ کر اردو شاعری کا معیار قائم کیا جائے۔ حالیؔ کا ناصحانہ انداز تکلم ملاحظہ کیجیے:

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو
اٹھو اہل وطن کے دوست بنو
مرد ہو تو کسی کے کام آؤ
ورنہ کھاؤ پیو،چلے جاؤ
تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر
نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
(۵۳)

حالی نے ان اشعارمینان اشعار میں وطن سے محبت کا جذبہ بیدار کیا ہے اور آپس میں بیر نہ رکھنے کی تاکید کی ہے مذہب کی بنیاد پر آپس میں منقسم رہنے سے غیر کو فائدہ ہوگا اور ہم یونہی غلام دیس کے باسی رہیں گے۔اس خیال کو بعد میں اقبال اور دیگر رومانوی شعرا نے بھی بیان کیا ہے۔ حالی نے اہل وطن کی غلامی کا سبب آپس میں نا اتفاقی کو بتایا ہے۔آپس میں نا اتفاقی کی وجہ سے جو غلامی نصیب ہوئی حالی اس طرح احساس دلاتے ہیں:

ہند میں اتفاق ہوتا اگر
کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیونکر
(۵۴)

حالی نے اہل دولت اور اہل کمال کی بے حسی اور عدم توجہی کو بھی غلامی کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ انھوں نے اہل وطن کے لیے واعظ کرتے ہوئے پندونصائح کا لہجہ اپنایا،کہیں کہیں تو انھوں نے خطیبانہ انداز اپنا لیا ہے۔ انھوں نے اچھے ہندوستانی بنانے کے لیے بچوں کے لیے نظمیں لکھیں اور اپنے وطن کی خوبیاں اور اہمیت بتائی ۔انھوں نے غلامانہ زندگی ،بیمار معاشرہ اور بے عملی سے نکل کر با عمل اور وطن دوست بننے پر زور دیا اور انھی خوبیوں کی بدولت حالیؔ جدیدا ردو نظم کے اولین محب وطن شاعر قرار پائے۔ حالیؔ کی شاعری اصلاح،نیکی ،ہمدردی اور انسانیت سے لبریز ہےحالیؔ کے محب وطن کہلانے اور مصلح کا درجہ پانے کے بارے میں عبدالقوی دسنوی رقم طراز ہیں:

''حالیؔ ،محب وطن پیدا ہوئے ،قدرت نے ان کے اندر اصلاح کی لازوال صلاحیت ودیعت کی تھی۔ان میں نیکی ،ہمدردی اور انسانیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔''(۵۵)

حالیؔ نے ہندو مسلم تعصب کو کم کرنے کے لیے ہندی الفاظ کا استعمال کیا۔انھوں نے کہا کہ اردو پر قدرت حاصل کرنے کے لیے دلی اور لکھنو کی زبان کا تتبع ضروری نہیں انھوں نے عام بول چال کے الفاظ جو اردو میں کھپ سکتے تھے انھیں استعمال کرنے پر زور دیا۔ ہندی الفاظ کا استعمال کرنا بھی دراصل حالیؔ کی حب الوطنی کا ہی ایک پہلو ہے۔ حالی محب وطن اور مصلح قوم تھے ،انھوں نے اہل وطن کو بے راہ روی سے نکالنے کی کوشش کی اور اہل وطن کو بیدار کرنے میں لگے رہے۔اس بارے میں عبدالقوی دسنوی مزید لکھتے ہیں:

> ''حالیؔ اپنے وطن ہندوستان سے محبت کرتے تھے ،ا س کی بد حالی سے پریشان تھے اور اس کی خوش حالی کے لیے فکر مند رہتے تھے ---وہ مسلسل ملک وملت کی تعمیر میں مصروف رہے۔''(۵٦)

حالیؔ بے تعصبی کے حامل تھے انھوں نے ہندو مسلم اور ہر مذہب کے افراد کو متحد رہنے کو کہا اسی نظریے کو بعد میں اقبالؔ نے بھی کچھ دیر اپنایا۔ انگریزوں نے ہندوستان میں مذہبی اور قومی تعصب پیدا کرنے کی کوشش کی جسے حالیؔ کی دانشمندانہ فکر نے ردکردیا۔ فرقہ پرستی اور تعصب سے دور رہنے کے لیے حالیؔ نے اتحاد واتفاق کی تلقین کی:

ہندو سے لڑیں نہ غیر سے بیر کریں
شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں
(۵۷)

۱۸۸۵ء کے بعد جب سیاسی شعور اور سیاسی جماعتیں مضبوط ہونا شروع ہوئیں تو حالی بھی انگریز حکومت پر نکتہ چینی کرنے لگے اور انگریزی حکومت کی پالیسیوں کو ''لڑاؤ اور حکوت کرو'' قرار دیا۔حالی نے تعلیم پر بھی زور دیا اور کہا کہ تعلیم حاصل کر کے ہی اقوام عالم کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے قوم کو تعلیم حاصل کرنے کی تلقین کی۔اسماعیل میرٹھی کی شاعری میں بھی اصلاحی پہلو ملتے ہیں، انھوں نے بھی آزاد اور حالی کی طرح متعدد نظموں میں مصلحانہ اور خطیبانہ انداز اختیار کیا۔یہ نمونہ ملاحظہ ہو:

نہر پر چل رہی ہے پن چکی
دھن کی پوری کام کی پکی
بیٹھی تو نہیں کبھی تھک کر
(۵۸)

اس نظم میں اسماعیل نے ایک مسحور کرنے والا ،گنگناتا ہوا منظر دکھایا ہے،دل کش فضا میں ''دھن'' اور''کام '' کا ذکر کیا ہے۔ اس نظم میں تاکید کی گئی ہے کہ ہر کام مسلسل محنت ،لگن اور عزم مصمم سے کرنا چاہیئے۔اسماعیل کی نظموں میں گھریلو اشیا ،پرندوں اور جانوروں کا ذکر ان کے تہذیبی شعور کا ثبوت ہے۔انھوں نے ہندوستانی روزمرہ کی زندگی کے واقعات اور آس پڑوس پائے جانے والے پالتو اور دیگر جانوروں کو موضوعات پر نظمیں لکھ کر شہری اور دیہی زندگی کی عکاسی کی ہے۔ اسماعیل نے برصغیر پاک وہند کے پرندوں اور جانوروں پر جو نظمیں لکھیں ان میں ''کوا''،'' عجیب چڑیا'' ،'' جگنو اور بچہ''،'' چھوٹی چیونٹی''،'' اونٹ''،'' گائے''اور''کتااور اس کا ہمسایہ'' اہم ہیں۔ان نظموں میں اسماعیل نے بچوں اور جوانوں کی ذہنی تربیت اور اخلا ق سازی کی ہے۔ اسماعیل نے مشرقی انسان کی تہذیبی وتمدنی زندگی کی عکاسی کی ہے۔ان کی نظم نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے کوثر مظہری لکھتے ہیں:

> ''اسماعیل کی نظموں کے محرکات میں سماجی وتہذیبی عوامل کا ہاتھ رہا ہے ۔آپسی محبت کی ترغیب ،ہمت اور محنت سے کام کرنے کا جذبہ ،صبر واستقلال ،عفودرگزر،قدرت کی اشیا کا ذکر اسماعیل میرٹھی کی نظموں کے اجزا ہیں۔''(۵۹)

معاصرین حالی کی شاعری کی ایک خاص بات اصلاحی نقطۂ نظر ہے، وہ قوم کو پسماندگی اور پسپائی سے نکال کر ہمت، عزم اور عمل کا درس دیتے ہیں اور اس کام کے لیے دعا گو ہیں ۔ان کی بیشتر نظمونمیں حالی کی طرح پندونصأئح سے متعلق مضامین ملتے ہیں۔ اسماعیل نہ صرف سرسید بل کہ حالی ،شبلی اور اکبر سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں بھی دعائیہ انداز پایا جات ہے۔ وہ ذاتی اور عصری مسائل کے لیے دعا گو ہیں:

> خدایا وہ کامل نظر دے مجھے
> کہ میں ذرہ ذرہ میں دیکھوں
> تجھے
> (٦٠)

آزاد ،حالی،اسماعیل اور ان کے معاصر شعرا کی نظموں میں ہندوستان کی تہذیب وثقافت ،مسلمانوں کے ماضی اور عروج وزوال کو بڑے والہانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ موضوعاتی نظم نگاری کی تحریک جو آزادؔ نے شروع کی اس کے زیر اثرکی گئی نظم نگاری میں تہذیب وثقافت کی تصویر کشی کی گئی ہے۔حالی نے مسلمانوں کے تابناک ماضی، روشن مستقبل اور موجودہ زبوں حالی کو موضوع بنایا اور وصل صنم ،جدائی کے آنسو اور اختر شماری سمیت قدیم روایتی موضوعات ترک کر دیے۔ اگر حالی سرسید اور آزاد کی ترغیب پر یہ کام نہ کرتے تو شاید نظم قدیم روایتی موضوعات کے تسلط سے نہ نکل پاتی۔

حالی کی نظمیں تہذیب وثقافت سے ہم آہنگ ہیں ۔حالی نے مثنوی کی صنف کے علاوہ ترکیب بند اور قطعہ کی ہیئت میں بھی نظمیں لکھی ہیں۔انھوں نے چند قصیدے اور مرثیے بھی نظم کیے ہیں۔ انھوں نے مرزا غالب کی وفات پر ''مرثیہ غالب'' اور دہلی کی تباہی پر''مرثیہ دہلی'' لکھا۔ حالی نے کشمیر سے متعلق بھی ایک نظم لکھی ہے۔''شکوہ ہند'' حالی کی مشہور نظموں میں سے ہے اس میں انھوں نے قوم کی پستی کو موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کے عروج کا پستی اور تنزلی کی جانب سفر کا نقشہ کھینچا ہے اور قوم کو نئی تعلیم وتہذیب سے بہرہ مند ہونے کی تلقین کی ہے۔ان کی نظموں میں مسلمانوں کی پستی کا رنج ،سیاسی وعصری شعور جابجا دکھائی دیتا ہے۔ حالی نے مذہبی تصورات اوراسلامی تاریخ وتہذیب کوشاعری کا حصہ بنایا ہے۔ وہ بھی قوم کوپستی اور ذلت کا شکار دیکھ کر نبیﷺ کے سامنے دعا گو ہیں:

اے خاصۂ خاصان رسل وقت دعا ہے
امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
کر حق سے دعا امت مرحوم کے حق میں
خطروں میں جس کا جہازآگے گھرا ہے
(٦١)

آزاد اور حالی کے معاصرین میں اسماعیل واحد شاعر تھے جنھوں نے ہندوستانی تہذیب وثقافت کو سب سے زیادہ موضوع بنایا لیکن ان کا انداز کچھ منفرد ہے۔ انھوں نے بچوں کے لیے نظمیں لکھ کر ہندوستانی تہذیب وثقافت کی عکاسی کی ہے۔ اسماعیل میرٹھی نے بچوں کے لیے ''ہماری گائے'' کے موضوع پر خوب صورت نظم لکھی۔ گائے ہندوستان کے ہر علاقے میں پائی جاتی ہے۔اسماعیل نے اپنی نظموں میں ہندوستانی ماحول کے مطابق الفاظ کاچناؤ کیا ہے۔ نظم ''ہماری گائے'' میں دیہاتی ماحول کے مطابق آسان اور سادہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اسماعیل نے فطرت ،گھریلو اشیا اور جانوروں کا ذکر کر کے ہندوستانی تہذیب کی جھلکیاں دکھائی ہیں۔ اسماعیل نے اپنی نظم ''آثارِ سلف'' (مشعر کیفیت قلعہ اکبر آباد) میں قلعہ اکبر آباد کے بادشاہوں ،شعرا اور بزرگان دین کی سرگرمیوں اور مغل شاہی عہد کی تصویر کشی کی ہے۔ انھوں نے مغلیہ سلطنت کی تہذیبی وثقافتی بازیافت کی ہے۔ہندوستان میں اس قلعہ کو خاص مقام حاصل ہے بڑے بڑے مشاہیر کے نام اس سے منسوب ہیں۔شاہجہاں کی عظمت وتوقیر اس سے منسوب ہے،اکبر کا نام بھی اس سے جڑا ہے۔اس نظم میں اسماعیل نے قلعے کے پس منظر میں عہد گزشتہ کی تہذیب اور شخصیتوں کے احوال پیش کیے ہیں:

ہاں دورِ گزشتہ کی مہابت کا
نشاں ہے
بانئ عمارت کا جلال اس سے
عیاں ہے
اڑتا تھا یہاں پرچم جم شاہئ اکبر
بجتا تھا یہاں کوسِ شہنشاہئ
اکبر
وہ چتر وہ دیہم وہ سامان کہاں
ہیں
وہ شاہ وہ نوئین وہ خاقان کہاں
ہیں
وہ بخشی و دستور وہ دیوان
کہاں ہیں

(٦٢)

اس رنگ محل میں مطرب خوش آواز کی ترنگیں تھیں مگر اب کچھ بھی نہیں،اب تو فوارے بھی شکستہ ہیں ، نہ وہ چلمن زرتار ہے اور نہ وہ کمخواب ہے۔ یعنی سب کچھ معدوم ہو چکا ہے ۔زنانہ حمام ،نہر،حوض،طرز عمارت ،نقاشی اور مصوری چغتائیہ گلزار کی تصویر کشی ہے۔اب ان سب پر مردنی سی چھائی ہے۔ اسماعیل کی اس نظم میں تہذیبی شعور نمایاں ہے جس کے لیے انھوں نے تاریخی شواہد اور حوالے پیش کیے ہیں۔اس نظم میں انھوں نے اپنے اسلاف کی عظمت وبزرگی کا احساس دلایا ہے۔ مجید امجد نے بھی اس طرح کی نظم ''مقبرۂ جہانگیر '' لکھی ہے دیگر رومانوی ،ترقی پسند اور حلقہ ارباب ذوق سے وابستہ شعرا نے بھی اس موضوع کو نظموں کا حصہ بنایا ہے۔اسماعیل کا تہذیبی شعور بہت وسیع اور متحرک ہے۔ اسماعیل میرٹھی کی اہم موضوعاتی نظموں مثنوی ''خدا کی صنعت''،'' ہواچلی''،''رات''،''دال کی فریاد''اور دال چپاتی'' شامل ہیں۔ ان تمام نظموں کااسلوب سادہ اور شگفتہ ہے اور ان میں مناظر فطرت کو موضوع بنا کر موضوع بنا کر تہذیبی عناصر وعوامل بھی پیش کیے ہیں۔

ہونے کو آئی صبح تو ٹھنڈی ہوا
چلی
کیا دھیمی دھیمی چال سے یہ
خوش ادا چلی
(٦٣)

اکبر نے معاصرین کی طرح ہندوستانی تہذیب اور قوم کی تنزلی ،پستی اور ماضی کی بات کی ہے لیکن ان کاانداز ظریفانہ ہے۔اکبر نے آزاد اور حالی کی طرح مثنویاں بھی لکھیں ۔آزاد ،حالی اور اسماعیل کے معاصر شعرا نے فطرت نگاری اور حب وطن پر نظمیں لکھیں ۔اس دور کے شعرا ایک دوسرے سے متاثر ہوئے۔ اکبر جدید اردو نظم کے اولین دور کے ان نظم نگاروں میں سے ہیں جو مغربی تہذیب کی تقلید کوسخت نا پسند کرتے تھے۔ان کو خطرہ تھا کہ ایسا کرنے سے مسلمانوں کی اخلاقی بے راہ روی ،معاشرتی وتہذیبی رکھ رکھاؤ معدوم ہو جائے گا۔ اکبر کا تعلق چوں کہ ایک مذہبی گھرانے سے تھا اس لیے وہ مادی اور دنیاوی ترقی کے حصول کے لیے مذہبی اور روحانی اقدار کو ترک کر دینے کے حق میں نہتھے۔اکبر کی ذہنی افتاد اور تہذیبی شعور کو واضح محسوس کیا جا سکتا ہے۔اکبر کے عہد میں یہ تہذیبی کشمکش اپنے عروج پر تھی اس لیے ان کا ذہن یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ۔اکبر نے طنزیہ انداز میں مغربی تہذیب سے دور رہنے کا پیغام دیا اور قوم کے مصلحین پر تیر برسائے۔ انھوں نے سب سے زیادہ سر سید کو مخاطب کیا ہےکیوں کہ اس دور میں سر سید اور ان کے رفقا ایک تحریک چلا رہے تھے جو ہدف تنقید بنی۔اکبر مذہبی افکار ونظریات کے حامل شاعر تھے اس لیے مشرقی تہذیب کا جو نقش ان کے ذہن میں تھا وہ مذہبی جذبے کے بغیر نا مکمل تھا۔ اکبر کے خیال میں جب تک اسلامی تہذیب وثقافت مضبوط نہ ہو گی اس وقت تک ہندوستانی قوم مستحکم نہیں ہو گی۔ ان کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

غضب ہے جب اسلام سے خالی سب کا سینہہے
یہی قومی ترقی کا ذرا سوچو تو زینہ ہے؟
مذہب ہی سے حفاظتِ قومی ہے اے عزیز
نادان ہے کواڑ ہٹائے جو چول سے
(٦٣)

اس زمانے میں مشرقی لباس ،انداز گفتگو اور طرز زندگی اور مذہبی روایات واقدار کم ہونے لگیں ۔اکبر ساری صورت حال کو بغور سمجھ رہے تھے اور وہ خیال کررہے تھے کہ سرسیدکی اس تعلیمی وتہذیبی تحریک سے اسلامی عقائد اور مشرقی روایات مسخ ہو رہی ہیں۔ اس لیے انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے مغربی تعلیم وتمدن ،طرز زندگی اور لباس کے خلاف جہاد چھیڑ دیا۔اکبر کے نزدیک مغرب پرستی الحاد پرستی برابر تھی اس لیے انھوں نے طنزیہ انداز میں قوم وملت کومغربی طرز زندگی اپنانے سے روکا،اکبر نے زیادہ تر نظمیں مسلم تہذیبی فکر میں کہی ہیں۔ اکبر کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی تنزلی اور پسماندگی صرف راہ اسلام سے دوری کے سبب ہے:

قرآن کو زبان سے دل میں
اتاریے
علمی نمونہ چھوڑ عمل کو

سنواریے

(٦٥)

اکبر بہت زیادہ ماضی اور روایت پرست تھے۔ اس لیے وہ نئی تعلیم کے ساتھ نئی تہذیب کے قائل نہ تھے ،نئی تہذیب کو انھوں نے قوم وملت کے لیے بہتر تصور نہ کیاسرسید اور ان کے رفقا نئی تعلیم سے اکتساب کرنے کے حق میں تھے مگر اکبر کہتے رہے کہ نئی تعلیم حاصل کرتے کرتے ماضی وروایات کی پاسداری بھی رکھیں۔ یہاں اکبر مذہبی اور اسلامی تہذیب کے ایک مبلغ نظر آتے ہیں۔ اگرچہ اکبر کا کوئی ٹھوس نظریہ نہ تھا ان کی شاعری میں تضادات ملتے ہیں مگر انھوں نے اسلامی ،مذہبی اور مشرقی تہذیب کی عکاسی ضرور کی ہے۔ انھوں نے کالج کے طلبا کو بھی اپنے اشعار میں مخاطب کر تے ہوئے کہا ہے کہ تعلیم حاصل کرو لیکن اسلامی تہذیب و ثقافت کو چھوڑ کر مغربی تہذیب کونہ اپناؤ۔اکبر نے بھی حالی کی طرح مذہبی اقدار اور روایات کی پاسداری کی مگر حالی کی طرح قوم کو امید کی کرنیں نہ دکھائیں ،ان کی شاعری کا نشانہ انگریزی تہذیب تھا،انھوں نے لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے طنزومزاح کا اسلوب اپنایا:

شوق لیلائے سول سروس نے
مجھ مجنوں کو
اتنا دوڑایا لنگوٹی کر دیا پتلون
کو

(٦٦)

اکبر مسلم تہذیب وثقافت کے علم برادر اور مصلح ومبلغ قوم تھے۔انھوں نے سرسید کے تعلیمی نظریات کی بساط بچانے کے لیے ہدف تنقید بنایا۔ مذہب اکبر کی شاعری میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے،عقیدہ توحید ان کی شاعری کا مرکز ہے،وہ مذہب اور مشرقی تہذیب کے علم برادر تھے ،مذہب کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر بڑا واضح ہے۔ اکبر الہ آبادی امت مسلمہ کی فلاح، بیداری اور تہذیب وثقافت کے تحفظ کے لیے دعا گو ہیں:

خدا ہی سے دعا پر تھا بھروسا
کہیں گزری نہیں عرضی ہماری
(٦٧)

شبلی نے آزاد اور حالی کے راستے پر پڑتے ہوئے اچھی نظمیں تخلیق کیں۔انھوں نے محدود موضوعات کے بجائے صرف واحد موضوع اپنائے رکھا۔ انھوں نے بھی حالی کی تقلید میں مسلمانوں کی پستی اور تنزلی کو محسوس کیا اور قوم کو بیدار کرنے کی سعی کی۔انھوں نے اپنے عہد کی سیاسی وسماجی حالات کو موضوع بنایا۔ سیاست کے علاوہ انھوں نے اسلامی تاریخ سے متعلق بھی نظمیں تخلیق کیں۔واعظ واخلاق بھی ان کاپسندیدہ موضوع رہا۔ شبلی نے بھی حالی کی طرح گھٹا ٹوپ اندھیروں میں روشنی کی۔ان کی نظم ''صبح امید'' میں قومی

ترقی اور منزل کے فرضی خاکے کے ذریعے امید ویقین دلانے کی کوشش کی ہے۔ شبلی کی شاعرانہ عظمت نظم ''صبح امید'' میں دکھائی دیتی ہے۔ یہ موضوع کے اعتبار سے حالی کی مسدس سے ملتی جلتی ہے۔''مسدس'' میں مسلمانوں کی پستی دیکھ کر حالی کا درد ایک نوحے میں ڈھل جاتا ہے،جب کہ شبلی کا درد قومی امنگوں ،جوش وولولے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔علاوہ ازیں حالی کے مقابلے میں شبلی کے یہاں شگفتگی زیادہ نمایاں ہے۔ اس اعتبار سے شبلی کی نظم ''صبح امید'' اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں مسلمانوں کی پستی کا تذکرہ ہے:

پستی نے دبا لیا فلک کو
خورشید ترس گیا چمک کو
(٦٨)

یورپی اقوام کی تلقین پر بلکان کی ریاستوں نے ترکی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔عالم اسلام کواس بات پر سخت صدمہ ہوا اور ہندوستان کے مسلمان بھی بلقان کے حملہ کی مذمت کرتے ہوئے جوش وغصہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اس واقعہ سے متاثر ہو کر شبلی نے ''شہر آشوب اسلام'' لکھی جس میں مسلمانوں کے دور تنزلی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام ونشاں کب تک
چراغ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک
مراکش جا چکا ، فارس گیا ، اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض سخت جاں کب تک

(٦٩)

شبلی نے بھی حالی کی طرح مسلمانوں کے عروج کی یاددلاتے ہوئے تنزلی کے نوحے لکھے ہیں۔انھوں نے ترکی کے مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کی تصویر کشی کی ہے۔ ۱۹۱۳ء میں کانپور میں سڑک بنانے کے لیے حکومت نے مسجد کو منہدم کر دیا اور مسلمانوں کے احتجاج پر ان پر گولیاں برسائیں۔ شبلی نے اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کیا:

کل مجھ کو لاشۂ بے جاں نظر پڑے
دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور ہیں
کچھ طفل خورد سال ہیں جو چپ ہیں خود مگر
بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں
(٧٠)

شبلی کی مقصدیت کے تحت لکھی گئی نظمیں اگرچہ فن اور شعریت سے محروم ہیں مگر جدید نظم نگاری کی تحریک میں تاریخی اہمیت کی حامل ہیں۔ان کی نظموں میں شخصی احساس واضطراب پایا جاتا ہے ۔ان کی نظمیں تاریخ اور اخلاق کے بوجھ تلے دبی سی لگتی

ہیں۔ شبلی کی نظمیں فنی تقاضوں کو پورا نہ کرنے اور شعریت سے عاری ہونے کے باوجود جدید اردو نظم میں عمدہ اضافہ ہیں۔شبلی نے اپنی نظموں کے ذریعے سیاسی،سماجی،تعلیمی اور تہذیبی حالات کو بیان کیا ہے۔ انھوں نے اپنے عہد کے انحطاط اور زبوں حالی کاذکر کیا،مسلمانوں کی تہذیب وثقافت کی پامالی کی بات کی۔شبلی جدید تعلیم اور نئی تہذیب سے آنکھیں ملا کر بات کرتے ہیں:

اب صورت ملک و دیں نئی ہے
افلاک نئے ، زمیں نئی ہے
مٹنے پہ ہے اب نشاں ہمارا
گم گشتہ ہے کارواں ہمارا
(۴۱)

شبلی کے زمانے میں قومی وملی تہذیب کی نشانیاں ناپید ہو رہی تھیں،نظم’’صبحِ امید‘‘میں شبلی امید کی بشارت دیتے ہیں۔شبلی کے سیاسی وتہذیبی ویژن کے بارے میں کوثر مظہری رقم طراز ہیں:

’’شبلی کا تاریخی ویژن(vision) حالی سے زیادہ بالیدہ تھا۔قومی وملی مسائل، اسلامی تاریخ وتہذیب کو اپنی نظموں میں پیش کرنا ان کے لیے آسان تھا‘‘ (۴۲)

شبلی مسلمانوں کو ان کے روشن ماضی کی یاد دلاتے ہیں انھوں نے برصغیر کی انیسویں صدی کی افسردہ پژمردہ تہذیبی بساط اور سماجی انتشار کو موضوع سخن بنایا۔شبلی بھی اکبر کی طرح جدید علوم وفنون سے اکتساب کرتے ہوئے اسلامی اشعار اور اپنی تہذیب کا وقار برقرار رکھنے کی تلقین کرتے ہیں۔اس میں انسانی ہمدردی ،ملی حمیت تہذیبی انتشار اور زبوں حالی کی عکاسی کی گئی ہے۔ بعد میں یہی روش اقبال نے اپنائی ۔ اقبال کی نظر بھی عالم اسلام پر تھی ۔شبلی نے نہ صرف ہندی مسلمانوں کی بات کی ہے بل کہ تمام مسلمانوں کو پسماندگی اور خستہ حالی کا ذکر لیا ہے۔ وہ وسیع النظر شاعر تھے۔ شبلی نعمانی کو اسلام سے انتہائی لگاؤ تھا وہ انیسویں صدی کے نصف آخر کے ذہن وفکر کے ترجمان ہیں۔ حالی اور دیگر معاصر شعرا کی طرح ان کے فکروعمل پر سر سید تحریک کا گہرا اثر ہے۔ ان کی شاعری میں مسلم تہذیب وثقافت کی خستہ حالی کا بیان ہے۔ آزاد ،حالی اور ان کے معاصر شعرا کی نظموں میں دعائیہ انداز بھی پایا جاتا ہے۔ کہیں وہ قوم وملت کے بہتر مستقبل کے لیے دعا گو ہیں اور کبھی وطن کی آزادی اور خودمختاری کی دعائیں کرتے ہیں۔ آزادؔ کی شاعری میں حمد،منقبت ،سلام اور دعا کی مختلف صورتیں ملتی ہیں وہ مثنوی ’’خطاب بہ قلم‘‘ میں خدا کا نام اس طرح لیتے ہیں:

اے قلم آ کے سر صفحہ لکھوں
نام خدا

جو کہ لے نام خدا اس پہ پے
انعام خدا
آنکھیں سبھوں کی لگ رہی ہیں
بادبان پر
اور جاتی ہے دعا کی صدا
آسمان پر
(۴۳)

آزاد مثنوی ''زمستان'' میں جاڑے کی سردی سے بچنے کے لیے خدا سے دعا کرتے ہیں:

میرے اللہ تو ہی اب ہے بچانے
والا
تیرے آزادؔ کو جاڑے سے پڑا
پالا ہے
(۴۴)

آزادؔنے اپنی نظموں میں دعائیہ انداز اختیار کیا ہے اور کس قدر فطری انداز میں اپنی کیفیات کا اظہار کیا ہے۔آزاد نیچرل اور رومانوی طرز احساس رکھنے والے اولین شاعر شمار ہوتے ہیں۔ حالی نے امت مسلمہ کے لیے دعا کی اور اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اصلاحی مقاصد اور تحریکوں کے ساتھ وابستہ افراد کے لیے بھی دعا گو ہیں۔ انجمن حمایت اسلام کی کامیابی کے لیے دعا گو ہیں:

دے خدا برکت ضماعت میں
تری اے انجمن
کر دیا تو نے نیا سلام کا عہد
کہن

(۴۵)

حالی کی دعائیہ شاعری معاصر شعرا سے قدرے منفرد ہے کیوں کہ ان کی دعائیہ شاعری اصلاحی نوعیت کی حامل ہے۔ انھوں نے خدا کے حضور بھی گڑگڑاکر دعائیں کیں اور نبیﷺ سے بھی دعا کی التجا کی ہے۔ حالی کی مذہبی فکر سے آنےوالے شعرا متاثر ہوئے۔ انھوں نے امت کے لیے دعا کی اور خود اپنی ذات کے لیے جس خواہش کا اظہار کیا۔دعائیہ انداز میں دعائیہ انداز میں کیا۔میرٹھی ذات باری تعالیٰ کے غضب سے پناہ مانگتے اور راہِ راست کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے یوں دعائیہ انداز اپناتے ہیں:

اگر مغفرت سے نہ پیش آئے تو
اگر رحم مجھ پر نہ فرمائے تو
تو میرا ٹھکانا نہیں پھر کہیں
نہ دنیا نہ عقبیٰ نہ ایمان و دیں
(۷٦)

اسماعیل ہندوستان میں قحط سالی اور روم وروس کی جنگ کے خاتمے کے لیے بھی دعا کرتے ہیں:

بلائے قحط ہے ہندوستان میں
ہے روم وروس میں برپا لڑائی
خدایا جلد قحط اور جنگ ہوں دور
ملے سب کو مصیبت سے رہائی
(۷۷)

اسماعیل کی نظمیں دعائیہ انداز میں سادگی کا عمدہ نمونہ ہیں ،ان کی سلاست ،شیرینی قاری کے قلب و ذہن کو کافی متاثر کرتی ہیں۔ ان کی نظمیں موضوعاتی وہیئتی اعتبار سے آزاد ،حالی اور دیگراولین دور کے نظم نگاروں سے اشتراکات رکھتی ہیں۔ اکبر کی شاعری میں دعا کی ترغیب موجود ہے،ملاحظہ کیجیے:

تسبیح و دعا میں جس نے لذت پائی
اور ذکرخدا سے دل نے راحت پائی
(۷۸)

اکبر کہتے ہیں کہ دعا کی تاثیر کے لیے بندگان خدا سے رحم دلی کو ضروری خیال کرتے ہیں۔اکبر نے لوگوں کو امید ،دعا اور صبر سے آگے بڑھنے کی تلقین کی ہے:

گھیرے ہوئے ہے کفر خدا سے پناہ مانگ
رہبر میں ہے فریب خدا سے راہ مانگ
(۷۹)

اکبر انگریزی اقتدار کی دشمنی کے باوجود اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ گورے گرجا گھروں میں جا کر اپنی دعاؤں کا خاص اہتمام کرتے ہیں اور افسوس کہ ہم اپنا عہد عروج بھول گئے، اکبر اپنے دل کی سلامتی اور سکون کے لیے بھی دعا گو ہیں:

فکر دنیا میں مرا دل کب تک
اپنی جان دے
یا الٰہی اس کو اپنا کر لے
اطمینان دے

(۸۰)

معاصر شعرا کی طرح اکبر کی شاعری میں عصری صورت حال کے پیش نظر دعائیں کی گئی ہیں،بل کہ انھوں نے دعا کی اہمیت اور ترغیب دی ہے۔ اکبر مسلمانوں کے ذہنی اور روحانی سکون کے لیے اپنے رب کے سامنے دست دعا بلند کرتے ہیں۔ شبلی نعمانی امت کے لیے دعا گو ہیں:

خالق سے دعا ہے اب کہ جاوید
روشن رہے یہ چراغ امید

(۸۱)

شبلی کی مثنوی''صبح امید'' کا لہجہ امید ورجائیت اور دعائیہ ہے ،انھوں نے جو مرثیے لکھے ان کے آخر پر دعا کی گئی ہے۔ ان کی شاعری میں امید کا ایک جہان نظر آتا ہے اور دعا کے لیے ہاتھ بے اختیار اٹھتے دکھائی دیتے ہیں۔انھوں نے ترک مسلمانوں پر بلقانوں کے ظلم وستم کو بیان کرتے ہوئے دعائیہ انداز اپنایا ہے۔

دعائے کہنہ سالاں ہے اگر
مقبول یزدانی
تو اب دست دعا ہے اور یہ
شبلی نعمانی
(۸۲)

شبلی نعمانی کی شاعری میں مذہب کوبنیادی اہمیت حاصل رہی ،یہی وجہ ہے کہ دعائیہ انداز ان کی شاعری کا حصہ ہے۔ ان کی شاعری ہیئت اور موضوع کے اعتبار سے معاصرین سے مماثلت رکھتی ہے۔ آزاد،حالی ،اکبر،اسماعیل،شوق قدوائی اور نظم حیدر طباطبائی نے قومی و اصلاحی جذبے کے زیر اثر نظم نگاری کی ہے۔ عہد آزاد اور حالی سے قبل اردو شاعری فارسی تراجم کی قید میں تھی ،ابھی اردو شاعری نے فارسی تراجم سے آزادی پائی ہی

تھی کہ آزاد اور ان کے معاصرین نے نصابی ضرورت اور مقصدیت کے تحت انگریزی تراجم مسلط کردیے۔ آزاد،حالی اور دیگر شعرا نے فطرت نگاری بے ساختگی سے نہیں بل کہ شعوری کاوش کے نتیجے میں اختیار کی۔اس حوالے سے اولین دور کے نمایندہ شعرا کی فکر ،ہیئت اور صنف میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔

اولین دور کے شعرا کی شاعری حسن وعشق کی قید سے آزاد ہو کر داخلی کیفیات کے بجائے خارجی عناصر کا بیانیہ معلوم ہوتی ہے۔ اولین دور کی نظموں میں مناظر فطرت اور حب وطن کے عناصر طبع زاد اور انگریزی تراجم سے پیدا کیے گئے۔ نظم میں انگریزی تراجم کا یہ سلسلۂ اشتراک رومانوی دور اور ازاں بعد ترقی پسند شعرا کے یہاں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ انجمن پنجاب و اولین دور کے نظم نگاروں نے رومانوی اور ترقی پسند شعرا پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس لیے تینوں تحریکوں اور ادوار میں اشتراکات وانسلاکات کڑی سے کڑی ملاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ حالیؔ اور سرسید کے رفقا کے تعقل فکر ،استدلال اور سائنٹیفک نظریات دبے دبے سے تھے اس دور میں استعارہ سے دوری اختیار کی گئی۔شاعری کو قومی فلاح کے لیے استعمال کیا گیا،تعقل پسندی کی بدولت طرز احساس میں بے رنگی اور یکسانیت سی پیدا ہونے لگی۔ آزاد،حالی اور ان کے معاصرین کی نظموں میں قومیت ،وطنیت، اخلاقی اور اصلاحی مضامین کا بیان ہے۔ آزاد و حالی کے علاوہ بھی انجمن پنجاب کے مشاعروں میں پڑھی جانے والی نظمیں ایک طرف موجودات کی عکاسی کرتی ہیں تو دوسری طرف ان میں تہذیبی وملی آشوب کا تذکرہ ملتا ہے۔

استخراجِ نتائج/موضوعاتی اشتراکات

جدید اردو نظم کا اولین دور دراصل انجمن پنجاب کا دور تھا۔ محمد حسین آزاد،الطاف حسین حالی، اسماعیل میرٹھی، اکبر الہ آبادی ، نظم حیدر طباطبائی اور شوق قدوائی اس دور کے نمایندہ شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ان تمام شعرا کی نظموں میں انگریزی شاعری کے اثرات ملتے ہیں۔اِ س دور میں انگریزی سے ماخوذ نظموں اور تراجم کی روایت نے موضوعاتی اشتراکات کو جنم دیا۔ انجمن پنجاب کے زیر انتظام ہونے والے موضوعاتی مشاعرے بھی موضوعاتی اشتراکات کا باعث بنے۔ اولین دور کے نظم نگاروں نے خاص طور سے مناظر فطرت، حب الوطنی، آزادی، مذہبی ومعاشرتی اقدار کی پاسداری وبازیافت، اخلاقی واصلاحی پہلوؤں، ملی وعصری آشوب اور ہندوستان کی مقامی رسوم ورواج جیسے موضوعات اپنی شاعری میں بیان کیے ہیں۔ان نظم نگاروں نے مثنوی ، مسدس، مثلث، ترکیب بند، ترجیح بند اورقطعات وغیرہ کی ہیئتوں میں نظم نگاری کی ہے۔ فطرت نگاری اور حب وطن اولین دور کے تمام شعرا کا محبوب موضوع ہے۔ ان شعرا نے فطرت نگاری اور جذبہ حب الوطنی کے ذریعے ہندوستانی تہذیب وتمدن کی مکمل تصویر کشی کی ہے۔ ان شعرا نے مناظر فطرت ،معاشی مسائل اور قومی وملی امور کو ایک یکسانیت اور تسلسل کے ساتھ موضوع بنایا ہے۔ ان شعرا نے اپنے عہد کے انحطاط اور زبوں حالی کا ذکر کیا ہے اور مسلم تہذیب وثقافت کی پامالی کی بات کی ہے۔

اولین دور کے نظم نگاروں نے اپنی نظموں میں اپنے وطن کی بہاروں، اپنے وطن کے موسموں اور اپنے وطن کی سر زمین کا بہت ذکر کیا ہے۔ انھوں نے بڑے خوب صورت اور دلکش انداز میں اپنے وطن کے پہاڑوں ،دریاؤں ،سمندروں، آبشاروں،ندیوں، چرند پرند، پھل ،نباتات، باغات اورمقامات کا ذکر کیا ہے۔ ان کی نظموں میں قدرتی مناظر ،موسموں اور فطرت کے موضوعات کی تکرار اور یکسانیت ملتی ہے۔ اولین دور کے نظم نگاروں نے اسلامی تہذیب وتمدن کے انحطاط اور پستی کو موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے معاشی استحصال، ظلم وجبر، سیاسی ،سماجی اور وطنی نوعیت کے موضوعات کو شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ جدید اردو نظم کے اولین نظم نگاروں کی شاعری خاص عہد اور خاص مقاصد کی وجہ سے یکساں رویوں اور میلانات کا شکار رہی ۔ اولین دور کے نمایندہ نظم نگاروں کی فکر ایک جیسی ہے اور ان کی شاعری کی اصناف ،ہیئتیں اور اسالیب میں بھی یکسانیت بدرجہ اتم موجود ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ناہید قاسمی،ڈاکٹر،جدید اردو شاعری میں فطرت نگاری،(کراچی:انجمن ترقی اردو پاکستان،۲۰۰۲ء)،ص:۱۷

۲۔ افتخار احمد صدیقی،ڈاکٹر،مقدمہ،کلیات حالی،(لاہور: مجلس ترقی ادب،بار اول۱۹٦۸ء)،ص:۵۳،۵۴

۳۔ گوپی چند ،نارنگ،ڈاکٹر،ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری،(نئی دہلی:قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،۲۰۰۳ء)، ص:۳۲۱

۴۔ الطاف حسین حالی ،کلیات نظم حالی جلد اوّل،مرتبہ،ڈاکٹر افتخاراحمد صدیقی،(لاہور: مجلس ترقی ادب،۱۹۶۸ء)،ص:۳۹۳

۵۔ محمد حسین آزاد،کلیات نظمِ آزاد،مرتبہ،ہارون قادر،(لاہور:الوقار پبلی کیشنز،۲۰۱۰ء)،ص:۴۵

٦۔ کوثر مظہری،جدیدنظم حالی سے میراجی تک،(دہلی: عرشیہ پبلی کیشنز،۲۰۱۳ء)،ص:۹۳

۷۔ اسمٰعیل میرٹھی، کلیاتِ اسمٰعیل،(لاہور :مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۰ء)،ص:۴۶

۸۔ ایضاً،ص:۵٦

۹۔ اکبر الٰہ آبادی،کلیات اکبر،(لاہور: مکتبہ شعروادب،س ن)،ص:۱۳٦

۱۰۔ ایضاً،ص:۱٦۰

۱۱۔ الطاف حسین حالی ،کلیات نظم حالی جلد اوّل،مرتبہ،ڈاکٹر افتخاراحمد صدیقی،(لاہور: مجلس ترقی ادب،۱۹۶۸ء)،ص:۳۸۰

۱۲۔ محمد حسین آزاد،مولانا،کلیاتِ نظمِ آزاد،مرتبہ، ڈاکٹر ہارون قادر،(لاہور: الوقار پبلی کیشنز،۲۰۱۰ء)،ص:۲۵۹

۱۳۔ ایضاً،ص:۲۷٦

۱۴۔ الطاف حسین حالی ،کلیات نظم حالی جلد اوّل،مرتبہ،ڈاکٹر افتخاراحمد صدیقی،(لاہور: مجلس ترقی ادب،۱۹۶۸ء)،ص:۳۷۶

۱۵۔ ایضاً،ص:۳۸۳،۳۸۲

۱۶۔ اسمٰعیل میرٹھی، کلیاتِ اسمٰعیل،(لاہور :مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۰ء)،ص:۱۶۵

۱۷۔ ایضاً،ص:۱۷۵

۱۸۔ ایضاً،ص:۲۰۱

۱۹۔ شوق قدوائی ،دیوانِ شوق،(گونڈہ(ابد):مقبول المطابع،۱۳۴۷ھ)،ص:۸۹

۲۰۔ محمد حسین آزاد،مولانا،کلیاتِ نظمِ آزاد،مرتبہ، ڈاکٹر ہارون قادر،(لاہور: الوقار پبلی کیشنز،۲۰۱۰ء)،ص:۱۲۵

۲۱۔ ایضاً،ص:۲۲۳

۲۲۔ اسمٰعیل میرٹھی، کلیاتِ اسمٰعیل،(لاہور :مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۰ء)،ص:۲۲۵

۲۳۔ شبلی نعمانی،کلیاتِ شبلی،تعارف ومقدمہ،ڈاکٹر محمد احسان الحق،(لاہور:الوقار پبلی کیشنز،۲۰۰۴ء)،ص:۹۰

۲۴۔ ایضاً،ص:۸۱

۲۵۔ الطاف حسین حالی ،کلیات نظم حالی جلد اوّل،مرتبہ،ڈاکٹر افتخاراحمد صدیقی،(لاہور: مجلس ترقی ادب،۱۹۶۸ء)،ص:۳۹۳

۲۶۔ عبدالقادر سروری،جدید اردو شاعری،(حیدرآباد دکن:انجمن امدا دباہمی،۱۹۳۲ء)،ص:۱۰۱

۲۷۔ محمد حسین آزاد،مولانا،کلیاتِ نظمِ آزاد،مرتبہ، ڈاکٹر ہارون قادر،(لاہور: الوقار پبلی کیشنز،۲۰۱۰ء)،ص:۳۳۰

۲۸۔ حامدی کاشمیری،پروفیسر،جدیداردو نظم اور یورپی اثرات،(دہلی:موڈرن پبلی کیشنز،بار اول،۱۹٦۸ء،بار دوم۲۰۱۰)،ص:۱۷

۲۹۔ محمد حسین آزاد،مولانا،کلیاتِ نظمِ آزاد،مرتبہ، ڈاکٹر ہارون قادر،(لاہور: الوقار پبلی کیشنز،۲۰۱۰ء)،ص:۳٦۰

۳۰۔ ایضاً،ص:۲٦۵

۳۱۔ الطاف حسین حالی ،کلیات نظم حالی جلد اوّل،مرتبہ،ڈاکٹر افتخاراحمد صدیقی،(لاہور: مجلس ترقی ادب،۱۹۶۸ء)،ص:۴۷۵

۳۲۔ اکبر الٰہ آبادی،کلیات اکبر،(لاہور: مکتبہ شعروادب،س ن)،ص:۱۴۴

۳۳۔ اسمٰعیل میرٹھی، کلیاتِ اسمٰعیل،مرتبہ،محمد اقبال رانا،(لاہور: برائٹ بکس،۲۰۰۳ء)،ص:۲۱۲

۳۴۔ ایضاً،ص:۲۵۰

۳۵۔ ایضاً،ص:۱۳۵

۳٦۔ حامدی کاشمیری،پروفیسر،جدیداردو نظم اور یورپی اثرات،(دہلی:موڈرن پبلی کیشنز،بار اول،۱۹٦۸ء،بار دوم۲۰۱۰)،ص:۱۵۳

۳۷۔ مخزن،لاہور،جلد۱۷،شمارہ۱۹۰۹،٦۰ء،ص:۵۷

۳۸۔ شوق قدوائی ،دیوانِ شوق،(گونڈہ(ابد):مقبول المطابع،۱۳۴۷ھ)،ص:۱۰۵

۳۹۔ ایضاً،ص:۱۱۵

۴۰۔ ایضاً،ص:۱۳۲

۴۱۔ اسمٰعیل میرٹھی، کلیاتِ اسمٰعیل،(لاہور :مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۰ء)،ص:۱۶۷

۴۲۔ میر حسن،مولوی،مغربی تصانیف کے اردو تراجم،(حیدرآباد:ادارہ ادبیات اردو،۱۹۳۹ء)،ص:۱۰۴

۴۳۔ الطاف حسین حالی، کلیات نظم حالی حصّہ دوم،مرتبہ ،ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی(لاہور: مجلس ترقی ادب،۱۹۷۰ء)،ص:۲۹۶،

۲۹۷، ۳۰۱

۴۴۔ اسمٰعیل میرٹھی، کلیاتِ اسمٰعیل،(لاہور :مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۰ء)،ص:۳۰۱

۴۵۔ ناہید قاسمی،ڈاکٹر،جدید اردو شاعری میں فطرت نگاری،(کراچی:انجمن ترقی اردو پاکستان،۲۰۰۲ء)،ص:٤٦

۴٦۔ اکبر الٰہ آبادی،کلیات اکبر،(لاہور: مکتبہ شعروادب،س ن)،ص:۱۳۷

۴۷۔ ایضاً،ص:۲۹۰

۴۸۔ ایضاً،ص:۳۲۰

۴۹۔ نظم طباطبائی،جزاول،(حیدرآباد دکن:فالکن کیفے بالٹی کھیت دارالشفا،س۔ ن)،ص: ۱۲۴

۵۰۔ کوثر مظہری،جدیدنظم حالی سے میراجی تک،(دہلی: عرشیہ پبلی کیشنز،۲۰۱۳ء)،ص:۹۸

۵۱۔ شوق قدوائی ،دیوانِ شوق،(گونڈہ(ابد):مقبول المطابع،۱۳۴۷ھ)،ص:۱۴۷

۵۲۔ محمد حسین آزاد،مولانا،کلیاتِ نظمِ آزاد،مرتبہ، ڈاکٹر ہارون قادر،(لاہور: الوقار پبلی کیشنز،۲۰۱۰ء)،ص:۲۴۳

۵۳۔ الطاف حسین حالی ،کلیات نظم حالی جلد اوّل،مرتبہ،ڈاکٹر افتخاراحمد صدیقی،(لاہور: مجلس ترقی ادب،۱۹۶۸ء)،ص:۳۹۹،۴۰۱

۵۴۔ ایضاً،ص:۴۰۱

۵۵۔ عبدالقوی دسنوی،اردو شاعری کی گیارہ آوازیں(دہلی:قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،۲۰۱۱ء)،ص:۱۹

۵۶۔ ایضاً،ص:۳۴

۵۷۔ الطاف حسین حالی ،کلیات نظم حالی جلد اوّل،مرتبہ،ڈاکٹر افتخاراحمد صدیقی،(لاہور: مجلس ترقی ادب،۱۹۶۸ء)،ص:۴۴۰

۵۸۔ اسمٰعیل میرٹھی، کلیاتِ اسمٰعیل،(لاہور :مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۰ء)،ص:۲۳۶

۵۹۔ حامدی کاشمیری،پروفیسر،جدیداردو نظم اور یورپی اثرات،(دہلی:موڈرن پبلی کیشنز،بار اول،۱۹٦۸ء،بار دوم۲۰۱۰)،ص:۱٦۷

٦۰۔ اسمٰعیل میرٹھی، کلیاتِ اسمٰعیل،(لاہور :مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۰ء)،ص: ۳۵۴

۶۱۔ الطاف حسین حالی، کلیات نظم حالی حصّہ دوم،مرتبہ ،ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی(لاہور: مجلس ترقی ادب،۱۹۷۰ء)،ص:۱۷۷،۱۸۱

۶۲۔ اسمٰعیل میرٹھی، کلیاتِ اسمٰعیل،(لاہور :مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۰ء)،ص:۳۰۶

۶۳۔ ایضاً،ص:۳۷۶

۶۴۔ اکبر الٰہ آبادی،کلیات اکبر،(لاہور: مکتبہ شعروادب،س ن)،ص:۲٦۷

۶۵۔ ایضاً،ص:۳۶۵

۶۶۔ ایضاً،ص:۲۸۹

۶۷۔ ایضاً،ص:۴۰۲

۶۸۔ شبلی نعمانی،کلیاتِ شبلی،تعارف ومقدمہ،ڈاکٹر محمد احسان الحق،(لاہور:الوقار پبلی کیشنز،۲۰۰۴ء)،ص:۱۵

۶۹۔ ایضاً،ص:۱۵۲

۷۰۔ ایضاً،ص:۲۰۸

۷۱۔ ایضاً،ص:۲۳،۲۸

۷۲۔ کوثر مظہری،جدید نظم حالی سے میراجی تک،(دہلی: عرشیہ پبلی کیشنز،۲۰۱۳ء)،ص:۱۲۷

۷۳۔ محمد حسین آزاد،مولانا،کلیاتِ نظمِ آزاد،مرتبہ، ڈاکٹر ہارون قادر،(لاہور: الوقار پبلی کیشنز،۲۰۱۰ء)،ص:۳۲۰

۷۴۔ ایضاً،ص:۱٦۵

۷۵۔ ایضاً،ص:۱۲۵

۷٦۔ اسمٰعیل میرٹھی، کلیات ِ اسمٰعیل،(لاہور :مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۰ء)،ص:۳۴۰

۷۷۔ ایضاً،ص:۲۳۰

۷۸۔ اکبر الٰہ آبادی،کلیات اکبر،(لاہور: مکتبہ شعروادب،س ن)،ص:۳۰۷

۷۹۔ ایضاً،ص:۳۴۰

۸۰۔ ایضاً،ص:۳۷۶

۸۱۔ شبلی نعمانی،کلیاتِ شبلی،تعارف ومقدمہ،ڈاکٹر محمد احسان الحق،(لاہور:الوقار پبلی کیشنز،۲۰۰۴ء)،ص:۲۳۰

۸۲۔ ایضاً،ص:۱۶۰

باب دوم

رومانوی دور کی جدید اُردو نظم کے موضوعاتی وہیئتی اشتراکات

اُردو ادب،علی گڑھ کی مقصدیت ،ٹھو س عقلیت اور جامداجتماعیت نے بے حد نتاثر کیا ۔انیسویں صدی میں تہذیب کا نیا نظام مستحکم ہونا شروع ہو گیا تھا۔سرسید احمد خاں نے انگریزی علوم وتہذیب کے ساتھ چلنے کی تاکید کی۔ اس مقصدیت و عقلیت کی تحریک کے عروج کے دور میں بھی برصغیر کے ادیبوں نے ماضی اور قدیم روایات سے تعلق نہ توڑا۔مغرب کی مادیت کو مشرق کی روحانیت نے قبول نہ کیا ۔علی گڑھ تحریک نے فلسفہ اور سائنس کے انقلاب سے لوگوں کی فلاح کا راستہ ہموار کیا۔علی گڑھ تحریک کی اس مقصدیت ،عقلیت اور حقیقت پسندی کے خلاف رومانی نوعیت کا ردِ عمل پیدا ہو گیا۔ رومانی طرز احساس کے ابتدائی نمونے عہد سر سید کے ادبا محمد حسین آزاد،حالی ،ناصر علی دہلوی، اسماعیل اور شرر کے یہاں ملتے ہیں اولین دور کی نظموں میں نیچر کا بیان ،مناظر فطرت کی عکاسی اور تخیل کی پرواز موجود ہونے کی وجہ سے یہ نظمیں رومانی طرز احساس کے قریب تو ہیں لیکن اس جمالیاتی احساس کی جھلک ان میں نظر نہیں آتی جو رومانی طرز احساس کی نمایاں خوبی ہے۔ اس بارے میں ظفر محمود رقم طراز ہیں:

> ’’دور جدید میں جب ہم اردو ادب وشاعری کے سرمائے پر نظر ڈالتے ہیں تو حالیؔ کے اصولوں میں ہمیں رومانیت کی جھلک نظر آتی ہے۔حالیؔ نے بھی پرانے اصولوں سے منھ موڑنے کی شاعروں کو صلاح دی ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ پوری طرح پرانے اصولو ں کو ترک نہیں کر سکے تھے۔آزادؔ کو بھی اسی طرح رومانوی نہیں کہہ سکتے کیوں کہ وہ بھی بندھے بندھائے اصولوں پر ہی چلے انحراف تو انھوں نے کیا مگر پوری طرح رومانیت نہیں برت سکے لیکن پھر بھی حالی

> اور آزاد کا نام اردو میں رومانیت کے سلسلے میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ انھوں نے قدیم اصولوں سے انحراف کیا اور شاعری کے نئے اصول وضع کیے جس سے تھوڑی بہت ان کی رومانوی روش کا پتا چلتا ہے۔''(۱)

رومانوی جدید اردو نظم کے فروغ میں شیخ عبدالقادر کے رسالہ''مخزن'' کا کردار قابل ستائش ہےکیوں کہ اس رسالے میں رومانوی انداز کی شاعری کو شایع کیا جاتا تھا۔''مخزن'' کا اجرا ایک طرح سے سرسید کی ٹھوس مادیت اور جامد عقلیت کا رد عمل معلوم ہوتا ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں جب ہندوستانی ادیبوں کو انگریزی ادب پڑھنے کا موقع ملا تو اردو شعرو ادب میں رومانوی انداز کو فروغ حاصل ہوا۔ اُس دور کے اُردو نظم نگاروں نے غزل کی روایتی کلاسیکیت کا غلبہ ختم کر کے شاعری میں رومانوی طرز احساس پیدا کیا۔جدید اُردو نظم میں رومانوی رجحان کے فروغ کے بارے عقیل احمد صدیقی رقم طراز ہیں:

> ''بیسویں صدی کے اوائل سے حالی کے شعری تصورات سے انحراف شروع ہو چکا تھا،ہر چند کہ یہ انحراف کمزور تھا۔۔۔اُردو نظم میں اخلاقی ،ملی ،وطنی موضوعات کو پیش کش کو بنیادی اہمیت حاصل رہی البتہ سیاسی اور معاشرتی فضا نے سرسید کی عقلیت پسندی اور حالی کی اصلیت پسندی کے برخلاف ''رومانوی رجحان'' کو فروغ دیا۔''(۲)

نظم جدیدکے ابتدائی دور میں مناظر فطرت کا بیان، گرمی کی شدت کا تذکرہ اور غریب الوطنی کے جذبات ملتے ہیں اس لیے یہ نظمیں قدیم روایت کا احساس رکھنے کے باوجود جدید تقاضا رکھتی ہیں مگر رومانی طرز احساس پر مکمل طور پر پورا نہیں اترتیں۔عہد حالیؔ کو عہد جدید نظم کہہ سکتے ہیں۔حالی نظم جدید کے بانی تو ہیں لیکن رومانی طرزِ احساس کا سرخیل اقبالؔ ہے،اس بارے میں ظفر محمود رقم طراز ہیں:

> ''جدید شاعروں میں سب سے پہلے رومانوی عنصر ہمیں اقبال کے یہاں نظر آتا ہے۔اقبال کی نظموں میں مذہبی عنصر کو بھی ہم رومانیت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اقبال مذہب کو ڈر کر اختیار نہیں کرتے انھوں نے خدا سے بھی بے باکی اور جسارت سے باتیں کی ہیں۔''(۳)

بیسویں صدی کے ربع اول میں جن نظم نگاروں میں رومانوی رجحان پایا گیا اُن میں اقبال کا نام اہم ہے۔ رومانیت کے جس زاویے کی ترویج اقبال نے کی تھی اس کے واضح اثرات جدید اردو نظم کے تشکیلی دور پر نظر آتے ہیں۔ان کی شاعری حالیؔ کے نظریہ شعر کا رد عمل ہے اگرچہ اقبالؔ کی مقبولیت میں ان کے فلسفیانہ تصورات کا دخل زیادہ ہے مگر وہ

رومانوی انداز بھی رکھتے ہیں۔ ابتدا میں حالی اور آزاد سے متاثر تھے اس لیے انھوں نےمناظر فطرت ،حب الوطنی اور قومی مسائل پر نظمیں لکھیں۔ اس دورمیں انگریزی نظموں کے ترجمے کا رواج تھا اس لیے انھوں نے بھی چند انگریزی نظموں کے ترجمے کیے۔ اقبال کی مغرب کے رومانی شعرا سے وابستگی نے انھیں بھی مزاجاً رومانی بنا دیا تھا ۔ جب وہ فلسفی شاعر نہیں تھےاس وقت رومانی تھے۔ اقبال کی نظموں کا ڈکشن روایتی ہے مگر ان کی ترکیبیں اور تشبیہات نئی ہیں۔انھوں نے اگرچہ ہیئت میں کوئی واضح تبدیلی نہیں کی ، پابند ہیئت میں نظم نگاری کی لیکن کہیں کہیں نظم کے بندوں اور مصرعوں کی تعداد اور قافیے کی تبدیلی کی ہے۔ اقبالؔ اپنے مزاج کے اعتبار سے رومانی تھے اور فطرت سے لگاؤ انھیں مغربی ادب کے مطالعہ سے ہوا،دیکھا جائے تو اقبال کا پورا آئیڈیلزم رومانی خواب ہے۔ جب وہ گردوپیش سے بیزار ہوئے تو انھوں نے فطرت نگاری کا آغاز کر دیا۔انھوں نے دنیاوی غم کے بدلے فطرت کو قبول کیا ان کی نظم ''تنہائی'' فطرت نگاری کی خوب صورت تصویرہے:

تنہائی شب میں حزیں کیا
انجم نہیں تیرے ہم نشیں کیا؟
یہ چاند یہ دشت و در ، یہ کہسار
فطرت ہے تمام نسترن زار
(۴)

اقبال اپنی تنہائی کے لمحوں میں قدرت کے حسین شہکاروں کو اپنا ہم نوا بنا لیتے ہیں،وہ اپنی تنہائی اور حزن وملال کے لمحوں میں زمین وآسمان ،چاند، تاروں،دشت وصحرا، کہساروں اور آبشاروں وغیرہ کو اپنا ہم نشیں بنا لیتے ہیں۔وہ اپنے دل کو قدرت کا ہم نفس بنا لیتے ہیں اور اپنے دل سے خود کلامی کرتے ہیں۔اقبال کی رومانی وابستگی کے بارے میں عقیل احمد صدیقی لکھتے ہیں:

''اقبال کی بیش تر ابتدائی نظموں میں مظاہر سے رومانی وابستگی کا احساس ملتا ہے۔ اس وابستگی میں گہرائی ہے، موضوعات فطرت کے ہوں، حب الوطنی کے یا قومی اتحاد موضوع ہو ،اظہار میں جذبے کی شدت ،حسن کا احساس ،نغمگی اور دھیمے پن کے علاوہ ،غنائی لہجہ(Lyrical tone) حاوی ہے۔''(۵)

نادر کی نظموں پر آزاد،حالی،اور اقبال کے واضح اثرات مرتب ہوئے،انھوں نے بھی اقبال کی طرح آزاد اور حالی کی روایت سے اثر لیا اور معاصر شعرا کی طرح اقبال کی تقلید میں بھی نظمیں لکھیں ۔اقبال کی نظم ''تنہائی'' کا ساسلوب اور موضوع نادر کی نظم ''گزرے

ہوئے زمانے کی یاد‘‘ میں دیکھا جا سکتا ہے اگرچہ ہیئتی اعتبار سے ان نظموں میں کوئی اشتراک نہیں۔ یہ نظم ٹامس مور کی نظم ’’The light of other days‘‘کا ترجمہ ہے:

اکثر شب تنہائی میں
کچھ دیر پہلے نیند سے
گزری ہوئی دلچسپیاں
بیتے ہوئے دن عیش کے
بنتے ہیں شمع زندگی
(٦)

نادر نے ٹامس مور کی نظم کا ترجمہ نہیں بل کہ ترجمانی کی ہے۔ انھوں نے اصل نظم کی جذباتی فضا کو برقرار رکھتے ہوئے اردو کے روایتی اسلوب میں بیان کیا ہے۔آزاد اور حالی نے جس نیچرل شاعری کا آغاز کیا تھا۔نادر نے اس فطری جذبات و احساسات اور دل چسپ طرز ادا کا اضافہ کر کے بیان کیا۔اقبال اور نادر میں بنیادی اشتراک یہ ہے کہ یہ دونوں شعرا روایت اور آزاد اور حالی سے متاثر تھے۔ انھوں نے شاعری کی فرسودہ روش اور بے کیف تصنع سے بیزار ہو کر نئی نہج عطا کی:

دیکھتے ہی دیکھتے آنکھیں بھی پتھرانے لگیں
تیغ قاتل ہے وہی اور رقص بسمل ہے وہی

(٧)

نادر اصل جوہر اور جذبے سے شعر کہتے تھے اور دل کی بات کا جوں کا توں ہی اظہار کر دیتے۔نادرؔ کی اقبال سے روحانی دوستی تھی ۔ان دونوں شعرا کی نظمیں ’’مخزن‘‘ میں چھپا کرتی تھیں۔ وہ ایک دوسرے سے جان پہچان بھی رکھتے تھے۔اقبال کی ایک غزل اگست ۱۹۰۳ء میں خدنگ نظر میں چھپی جس کے مطلع اور مقطع میں نادر کا ذکر کیا گیا ہے۔اقبال نے اپنے پیش رو حالی کی طرح ماضی کی طرف عبرت کے لیے نہیں دیکھا ۔انھوں نے تو اپنے ماضی اور کھوئے ہوئے کی جستجو کی ہے۔اقبال کے رومانی خواب حقیقت پسند نہ تھے ،انھوں نے نظم میں تخیل کو نیا رخ، نئی ترکیب دی، انسان کو ایک بہتر کائنات کا تصور دیا اور اسلاف کی عظمتوں کو یاد کیایہی ان کی اصل رومانیت تھی۔اقبال کی نظموں کا سب سے بڑا موضوع عشق ہے اور ان کی متعدد نظمیں وطنیت سے مملو اور فطرت کے مناظر کی عکاسی کرتی ہیں۔ان کی رومانوی نظموں میں ’’ ترانۂ ملی‘‘،’’ترانۂ ہندی‘‘،’’ہمالہ‘‘،’’نیا شوالہ‘‘اور ’’ہندوستانی بچوں کا قومی گیت‘‘ خاص طور پر اہم ہیں۔اقبال کی نظموں میں جہاں جذبے اور ایثار کی بات کی گئی ہے وہا ں فطر ت کی دل آویزی کا بہت ذخیرہ پایا جاتا

ہے۔انھوں نے اسلام ،مسلم امہ اور شریعت محمدی پرجو نظمیں لکھی ہیں،ان میں جذبہ بہت زیادہ ہے۔ اصلاحی اور فطری شاعری کو دیکھیں تو اقبال،آزاد ،حالی اور شبلی سے متاثر نظر آتے ہیں۔اقبال وطنیت ،عشق ،مردِکلامل ،تہذیب ،معاشرت،اسلام اور امت مسلمہ کی بات کرتے ہیں۔اقبال کی نظم ''ہمالہ'' خوب صورت رومانی طرز احسا س رکھتی ہے۔انھوں نے اس نظم میں فطرت کے مناظر کا بیان دل کش انداز میں کیا ہے اور بڑے والہانہ انداز میں ہندوستان کے اس بلند وبالا پہاڑ کی عظمت بیان کی ہے۔''ہمالہ''مسدس کی ہیئت میں ہے اور یہ آٹھ بندوں پر مشتمل ایک ترکیب بند نظم ہے۔ نمونے کے طور پر ایک بند دیکھیے:

اے ہمالہ! اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں
تُو جواں ہے گردشِ شام وسحر کے درمیاں
ایک جلوہ تھا کلیم طورِ سینا کے لیے
تُو تجلی ہے سراپا چشمِ بینا کے لیے
(۸)

اقبال کی نظم ''ہمالہ'' میں حب الوطنی کی بو محسوس ہوتی ہے ،اس میں منظر نگاری ،حب الوطنی پر حاوی نظر آتی ہے۔اس میں ہمالہ کی قدامت ،عظمت ،ابدی جوانی ،خارجیت ،داخلیت ،دامن کشی ،بلندی ،فطری فضا اور خاموشی کی منظر نگاری ہے۔ انھوں نے دریاؤں ،وادیوں اور کہساروں کی صورت میں قوم کی عظمت رفتہ کو علامتی طور پر بیان کیا ہے۔مثنوی کی ہیئت میں اور اسی موضوع پر حفیظ جالندھری نے بھی ایک نظم ''ہمالیہ'' کے نام سے لکھی ہے۔نمونہ دیکھیے:

یہ اونچی چوٹیاں نورانیوں کی بارگاہیں ہیں
یہ سب تنبوٹیاں برفانیوں کی کارگاہیں ہیں
(۹)

اقبال اور حفیظ جالندھری کی ان نظموں کی ہیئتیں اگرچہ الگ الگ ہیں لیکن موضوع ایک جیسا ہے۔ اقبال کی طرح مسدس کی ہیئت میں چکبست نے بھی نظمیں لکھیں۔ان کی نظم''خاک وطن'' حبِ وطن میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس نظم کی ہیئت مسدس ہےاور بندوں کی تعداد آٹھ ہے جو اقبال کی نظم ''ہمالہ'' سے موضوعاتی وہیئتی اشتراک رکھتی ہے۔نظم کا نمونہ دیکھیے:

اے خاکِ ہندتیری عظمت میں کیا گماں ہے
دریائے فیض تیرے لیے رواں ہے
ہر صبح ہے یہ خدمت خورشید پر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیا کی

(۱۰)

وطنی جذبات سے مملو شاعری میں چکبست کا کردار اہم ہے۔ ''خاکِ وطن'' میں چکبست نے ہندوستان کی عظمت دیرینہ کی عکاسی کرتے ہوئے لوگوں کی پستی اور بدحالی کا ذکر کیا ہے۔ نادر کاکوروی بھی روایت سے متاثر نظر آتے ہیں،وہ آزاد ،حالی اور اقبال سے ہیئتی اور موضوعاتی اشتراکات رکھتے ہیں۔ نادر کو بھی وطن سے بے حد محبت تھی ان کی نظم ''بہارِ ہند'' میں ہندوستان کی تعریف و تحسین کی گئی ہے۔نادر نے بھی مسدس کی ہیئت میں نظمیں لکھی ہیں ان کی نظم ''پروانہ جانسوز'' مسدس کی ہیئت میں ہے۔ اس نظم میں پروانہ اپنی جانسوز حکایت بیان کرتا ہے۔

شعلہ زن ہے میرے دل میں الفت پنہاں کی آگ
اور ہے اس آگ کو اس قالب خاکی سے لاگ
جیسے شوہر کی چتا پر اس کی دلہن کا سہاگ
جل بجھے جس طرح ققنس چھیڑ کر دیپک کا راگ
بجھ گیا دل میرا شمع دل فروز عشق سے
آشیانہ جل اٹھا بلبل کے سوز عشق سے

(۱۱)

اقبال رومانوی شعرا کے قافلے کے سالار تھے ان کے قافلے میں سرور جہاں آبادی کی آواز بلند گونجتی رہی۔ سرور اپنے معاصرین سے گہرے متاثر تھے ۔ان کی شاعری میں نئے موضوعات اور قدیم موضوعات میں بھی ایک خاص تنوع اور وسعت پائی جاتی ہے۔سرور جہاں آبادی کی شاعری میں کہیں کہیں متقدمین کا رنگ بھی نظر آتا ہے۔ وہ آزاد،حالی اور اسماعیل سے بھی اثر قبول کرتے ہیں ان شاعروں کی طرح سرور کا محبوب موضوع بھی وطن پرستی اور قوم پرستی رہا لیکن سرور کے یہاں یہ تصور مذہبی عقائد کی بنیادوں پر نہیں بل کہ قوم ووطن جغرافیائی حدود سے عبارت ہے۔ اقبال اور ان کے قافلے کے دوسرے شاعروں کے بارے میں پروفیسر منظر ایوبی لکھتے ہیں:

> ''نئی نسل میں اقبال،عظمت اللہ خاں،چکبست اور سرور جہاں آبادی کے یہاں بھی قومیت اور وطنیت کی شاعری خاص اہمیت رکھتی ہے لیکن شاعروں کی قوم پسندی اور وطن پرستی کی نوعیت تمام تر مذہبی نہیں ہے بل کہ ان کی حیثیت جغرافیائی ہے۔''(۱۲)

سرور جہاں کے یہاں وطن پرستی دوسرے رومانی شعرا کی طرح ہے لیکن وہ قوم پسندی میں تعصب نہیں رکھتے۔ وہ اقبال کی طرح اس دور میں سارے ہندوستان کو ایک وطن تصور کرتے تھے۔ان کی شاعری میں اقبال کی طرح ہندی فضا، ہندی معاشرہ ،ہندی تہذیب و تمدن اور ہندوستانی ماحول کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ سرورؔ اپنے وطن کو وقعت کی نظر سے دیکھتے تھے ،انھیں بھی اپنے وطن کا ذرہ ذرہ دیوتا لگتا ہے۔ ان کی شاعری میں برطانوی حکومت کی مذمت اور احساس غلامی نمایاں نظر آتا ہے۔ سرور کی وطنیت کی مثال ان کی نظم ''گنگا جی'' سے ملتی ہے۔

اے آبِ ردو گنگا ! اُف ری تری جوانی
یہ تیرا حسن دلکش ! یہ طرز دلربائی
جمنا تیری سہیلی گو ساتھ کی ہے کھیلی
اُس میں مگر کہاں ہے تیری سی جاں فزائی
اے نازشِ زمانہ ! اے نقشِ ناز عصمت!
بھارت کی بھاگ دیوی تو ہے ہماری مائی

(۱۳)

راوی ،چناب ،گنگا ،جمنا وغیرہ کا ذکر کم وبیش تمام شعرا کی نظموں میں ہے۔سرور جہاں آبادی نے بھی ''گنگاجی ''اور ''جمنا جی'' دو مختلف ناموں سے نظمیں لکھ کر ہندوستان سے والہانہ محبت کا ثبوت دیا ہے۔ سرور جہاں آبادی کے یہاں گنگا اور جمنا فطرت کے خوب صورت مناظر اور ہندوستان کی تہذیب کا اظہار کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جب کہ ساغر نظامی کے یہاں دریاؤں کی لہروں میں آزادی کی آرزو اور غلامی پر اضطراب پایا جاتا ہے:

سچ بتا اے مری جمنا کیا وہی جمنا ہے تو
خوف مستقبل ہے تو اندیشہ فردا ہے
کاش اک دن اس طرح غیض و غضب میں آئے
تو
جانب مغرب غلامی کو بہائے جائے تو

(۱۴)

سرو ر جہاں نے قدیم رنگ کی پیروی ضرور کی مگر انھوں نے چند نئے موضوعات پر بھی طبع آزمائی ضرور کی۔انھوں نے تاریخی واقعات پر سب سے پہلے لکھا۔ملک و قوم سے بھی انھیں بے انتہا محبت تھی ان کی ملک سے محبت اور دلی لگاؤ ان کی نظموں ''خاک وطن''، ''حسرت وطن''،'' یاد وطن''اور ''مادر ہند'' میں واضح دکھائی دیتا ہے۔سرور کی حب وطن سے مملو ایک نظم ''گلزار وطن''دیکھیے:

پھولوں کا کنج دلکش بھارت
میں اک بنائیں
حبِ وطن کے پودے اس میں
نئے لگائیں
پھولوں میں جس چمن کے ہو
بوئے جاں نثاری
حب وطن کی قلمیں ہم اُس چمن
سے لائیں

(۱۵)

سرور جہاں آبادی کی وطن کی محبت سے سرشار ایک اور نظم ''سرزمین وطن'' دیکھیے:

آہ او عفت کی دیوی او وطن کی
سرزمیں
آسماں کی او پری ! فردوس کی
او حورعیں

(۱٦)

سرور جہاں کو ہندوستان کے ذرے ذرے سے اور اس کے مناظر سے والہانہ لگاؤ تھا ان کی وطنی شاعری سیاسی نوعیت کی نہیں بل کہ جمالیاتی رنگ و آہنگ لیے ہوئے ہے۔ان کے فن کی قابل قدر بات یہ ہے کہ انھوں نے وطن کو ماں، دیوی اور محبوب کی حیثیت سے بیان کیا ہے۔ ان کے یہاں وطن کی محبت ہو یا فطرت کی یا عورت کی ہر شے حسن وشباب میں ڈبی ہوئی نظر آتی ہے۔ سرور کی رومانی طرز احساس کی اہم نظموں میں ''عروس برشگال''،'' کوئل''، ''بیر بہوٹی''،'' بسنت'' اور ''امید وطفلی''شامل ہیں۔تصور وطن کے ساتھ ساتھ سرور نسوانی حسن وجمال کی تصویر کشی کرتے ہیں۔انھوں نے فطرت نے نظاروں، ماضی پرستی اور حب الوطنی کو اتنا ہی بیان کیا ہے جتنا دیگر رومانی شعرا نے بیان کیا ہے۔ ان کی نظموں کا رنگ مقامی ہے۔ انھوں نے مغربی ادب کا مطالعہ بھی کیا لیکن ان کی شعری فضا خالص ہندوستانی ہی رہی۔ انھوں نے اردو اور ہندی کے خوب صورت الفاظ استعمال کیے ۔اقبال ،سرور اور دوسرے رومانی شعرا میں موضوعاتی اشتراکات کے بارے میں پروفیسر منظر ایوبی رقم طراز ہیں:

''اقبال کے علاوہ جن شاعروں نے قومیت اور وطنیت کو اپنی فکر کا محور بنایا ہے، ان میں سرور جہاں آبادی، چکبست ،وحید سلیم، عظمت اللہ خاں اور شوق قدوائی سر فہرست ہیں۔ چھوٹی چھوٹی بحروں ،عام فہم ارو سیدھے سادے ہندی اور اردو الفاظ ،تشبیہ ،استعارے اور اس پر کھل کر بات کہنے کا انداز ان کے کلام کو عوامی بنا دیا ہے۔ اقبال کے مقابلے میں ان شعرا کے یہاں وطن پرستی کا جذبہ جنونی کیفیت اختیار کر گیا ہے۔ ''(۱۷)

سرور جہاں آبادی کی نظموں میں قومی اور وطنی جذبہ بدرجہ اتم موجود ہے۔انھیں اپنے وطن کی فضاؤں سے بے انتہا عشق تھا ۔اقبال کی ابتدائی نظموں میں خوب صورت رومانوی طرز احساس پایا جاتا ہے۔انھوں نے دیس کی چاہت کے سہانے گیت گائے ہیں۔اقبال کی ذہنی بے چینی اور تجسس ان کی نظموں سے عیاں ہوتا ہے۔ وہ زندگی کا راز جان لینا چاہتے ہیں اس لیے وہ کہیں گل کی رنگینی کو دیکھ کر حسن کا راز معلوم کرنا چاہتے ہیں اور کبھی شمع اور شاعر کی دل دوز حکایت میں حسن وعشق کی کیفیت معلوم کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ ان کی نظموں میں ایک نصب العین اور نئے راستے کی لگن نظر آتی ہے۔اقبال نے

دیس کی چاہت میں یہ نظم ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' تخلیق کی ،یہ نظم مخمس ترجیح بند اور چار بندوں پر مشتمل ہے:

چشتی نے جس زمیں میں پیغام
حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت
کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن
بنایا
جس نے حجازیوں سے دشتِ
عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے ، میرا وطن
وہی ہے

(۱۸)

ہندوستان میں تمام مذاہب کے لوگ آباد تھے اس لیے اقبال نے مذہب کے نام پر آپس میں بیر نہ رکھنے کی تلقین کی ہے۔اسی نظریے کی ایک مثال نادرؔ کے یہاں بھی موجود ہے۔ نادر کاکوروی کی نظم ''مقدس سر زمیں''ملاحظہ ہو:

مرحبا اے مادر ہندوستاں جنت
نشاں
مرحبا اے بھارت روحانیت کی
سر زمیں
ہم کہاں جائیں گے مکہ اور
مدینہ چھوڑ کر
ساری دنیا میں ہے تیری پاک
تر بہتر زمیں

(۱۹)

سرور جہاں بھی بڑے محب وطن شاعر تھے۔انھیں اپنے وطن ہندوستان سے والہانہ لگاؤ تھا ،جذبہ ء حب الوطنی اور ماضی پرستی ان کی نظموں کا محبوب موضوع ہے۔ سرور جہاں آبادی نے بھی عظمت اللہ خاں اور حفیظ جالندھری کی طرح ہندی الفاظ استعمال کیے ہیں،ان کی نظموں میں نغمگی کا عنصر نمایاں ملتا ہے۔ انھوں نے اپنی نظم ''چتوڑ کی گزشتہ عظمت'' میں ہندوؤں کی تاریخ اور ''پدمنی کی چتا'' میں چتوڑ کی رانی پدمنی کی وفا شعاری

کی تعریف وتحسین بیان کی ہے۔اس نظم میں یہ بتایا گیا ہے کہ پدمنی نے کس طرح وفا نبھائی اور آگ میں کود پڑی۔ان کی اس نظم کے مطالعہ سے کیٹس کے حزن کی یاد آتی ہے۔سرور کی نظم ''چتوڑ کی گزشتہ عظمت'' میں ہندوستان کی تاریخ اور ہندو ازم نمایاں ہے۔ وہ ان تاریخی کرداروں کے ذریعے اپنے دیس سے محبت کا اظہار کرتے ہیں، ان کے شعری رجحان میں وطنیت پرستی کو اہمیت حاصل ہے۔

اقبال کی طرح سرور بھی تاریخی کردار اور تاریخی عمارات و واقعات بیان کرتے ہیں۔وہ عروج و زوال کی مکمل قصہ خوانی کرتے دکھائی دیتے ہیں،انھوں نے بھی اقبال ،جوش اور دیگر رومانی شعرا کی طرح دریاؤں اور جھیلوں پر نظمیں لکھی ہیں،ان کی نظم ''دریائے گنگا کے نام'' اس حوالے سے اہم۔اقبال ''ہمالہ'' کو ہندوستان کی تہذیبی سر بلندی اور عظمت کا انشان سمجھتے تھے جب کہ سرورؔ ''گنگا'' کو ہندوستان کی تہذیبی سر بلندی اور خوش حالی کی علامت سمجھتے ہیں۔سرور نے متعدد نظموں میں اردو کے نمایندہ رومانی شعرا کی طرح جذبات کا اظہار کیا ہے۔ان کی نظموں میں آزادی اور جمہوریت کے تصورات ملتے ہیں۔ اقبال سے پہلے وطنیت پرستی اور قومی اتحاد ویک جہتی کے واضح تصورات سرور کے یہاں ملتے ہیں۔ اقبال کئی جگہوں پر سرور سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کی بھی اقبال کی طرح کی ایک نظم ''ہندوستاں ہمارا'' حب وطن کی حامل ہے۔ سید مجاور حسین،سرور اور اقبال میں پائے جانے والے اشتراکات کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''وطنی شعور اور قومی یک جہتی کے تصورات کو مضبوط بنانے میں اس دور میں اقبال کے علاوہ کوئی سرور کا مد مقابل نظر نہیں آتا۔انھوں نے شاعری کی وہ شاہراہ تعمیر جو چکبست ،جوش اور بعد کے شعرا کے لیے نشان راہ بن گئی۔''(۲۰)

سرور حقیقی ہندوستانی شاعر تھے ،ان کی شاعری میں مذہبی تعصب اور تنگ خیالی نظرنہیں آتی،اسی بات کو اقبال کے یہاں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔اقبال نے بھی مذہب ،قوم و ملت اور مذہب کی بنا پر آپس میں ''بیر''نہ رکھنے کا کہا ہے۔ سرور اتحا واتفاق میں ہندوستان کی خوشحالی سمجھتے تھے جب کہ اقبال نے آزاد ہندوستان کے لیے یہی خواب دیکھے تھے۔سرور نے بنگال کی تقسیم پر عوام کے انگریزوں کے خلاف غصے اور نفرت کی ترجمانی کی،بعد میں جوش نے بھی اسی طرح کا رد عمل پیش کیا،اقبال نے اس دور میں سرور کی مکمل ہم نوائی کی،سرور کی نظموں میں وطن کے روشن مستقبل کے لیے خواب ملتے ہیں۔ سرورؔکی شاعری میں خاک وطن کا بیان ،عظمت ہند اور مناظر فطرت کی عکاسی ملتی ہے۔ان کی نظم ''نسیم سحر''ملاحظہ ہو:

گھونگٹ الٹ الٹ کے رخ
نازنیں سے تو
کرتی ہے چھیڑ سلسلۂ عنبریں

سے تو
ہونے کو ہمکنار گل و یاسمیں
سے تو

(۲۱)

محرومؔ کی منظری نظموں میں ''بندابن کی ایک شام''،''شام سرما''،''وقت سحر''،''تصویر بہار''،''شام شفق'' اور''بہاد بہار چلی'' اہم ہیں-ان کی یہ منظر ی نظمیں تازگی اور حیات نو ر کا احساس دلاتی ہیں،''وقت سحر''کا نمونہ دیکھیے:

چمکتا ہے سورج، دمکتی ہے
دنیا
لپکتی ہیں موجیں ، جھمکتے
ہیں دریا

(۲۲)

اسی عنوان کی ایک نظم حفیظ جالندھری کے یہاں بھی ملتی ہے ۔حفیظ انگریزی شعرا کی طرح دیہات کے معصوم حسن سے والہانہ وابستگی رکھتے تھے،وہ اپنے جذبات کا اظہار''جلوۂ سحر'' میں یوں کرتے ہیں:

کسان اٹھ کھڑے ہوئے مویشیوں
کو لے چلے
کہیں مزے میں آ گئے
تو کوئی تان اڑا گئے

(۲۳)

محروم ''شام سرما''میں سردیوں کی شام کی عکاسی یوں کرتے ہیں:

دشت وصحرا کوہسار خموش
موج دریا و رود بار خموش
باغ میں مرغ نغمہ بار خموش
شہر میں اہل کاروبار خموش
چل رہی ہے ہوا مگر چپ چاپ
کانپتی ہے فضا مگر چپ چاپ

(۲۴)

محروم کی اسی ہیئت میں لکھی گئی ایک اور نظم''شفقِ شام'' میں بھی شام کی رنگینی کی عکاسی کی گئی ہےمحرومؔ نے اپنی مختصر نظموں''تصویرِ بہار''اور''بادِ بہاری''میں بہار کے شاداب لمحوں کی نہایت عمدہ انداز میں عکاسی کی ہے۔ان کی منظر ی نظموں میں داخلی احساسات نمایاں ہیں۔ ان کی اس نوع کی نظموں میں ترنم کا پہلو بھی پایا جاتا ہے۔ان کی مخمس کی ہیئت میں لکھی نظم ''بادِ بہاری چلی'' دیکھیے:

گلشن آفاق میں پھول کھلاتی
ہوئی
ناچتی گاتی ہوئی
جلوۂ فردوس کا رنگ جماتی
ہوئی
عطر اڑاتی ہوئی
بادِ بہاری چلی

(۲۵)

محروم کی نظموں میں احساس غم جھلکتا ہے یہ احساس غم ان کی دیگر نظموں ''دل سے دو دوباتیں'' ،''کبھی کی یاد''اور''کنار راوی''میں بھی نمایاں ہے۔ اقبال کی نظموں میں فطرت کے حسن اور اسلامی و ملی جذبات کی فراوانی ہے۔ اقبال صرف حسن فطرت کے عاشق نہیں تھے بل کہ تمام بنی نوع انسان کی بات کرتے تھے،وطن پرست تھے،وطن کا ہر ذرہ انھیں دیوتا دکھائی دیتا تھا۔ وہ مذاہب کی باہمی پیکار کو مٹانا چاہتے تھے۔ اقبال نے آغاز میں حسن و عشق اور مناظر فطرت پر نظمیں لکھیں اور صبح و شام کے مناظر انتہائی دلکش انداز میں پیش کیے۔ان کی اس طرح کی نظمیں'' ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' ،''نیا شوالہ''اور''ترانۂ ہندی '' قابل ذکر ہیں۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں
ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی ، یہ گلستاں
ہمارا

(۲٦)

نادر کی نظم''دھرتی ماتا'' میں اپنے وطن کی زمین کی تعریف وتحسین ملتی ہے:

اے مری دھرتی ماتا مائی
اے سارے سنسار کی دائی
بوڑھے بچے پالنے والی

(۲۷)

روش صدیقی کی نظمیں اپنے وطن کی محبت سے سرشار ہیں۔ وہ اپنے وطن کے انسانوں اور اس کی فضاؤں سے بے حد محبت کرتے ہیں ان کی نظم ''اے کشورِ ہندوستاں'' کا نمونہ ملاحظہ کیجیے:

اونچا رہے تیرا نشاں اے کشورِ ہندوستاں
اے خلد سے لائی ہوئی رنگیں بہاروں کے وطن
کوثر ہے جن پہ موجزن آبشاروں کے وطن

(۲۸)

افسر ؔنے اپنی متعدد نظموں میں اپنے وطن کی فضاؤں کی دلکش انداز میں عکاسی کی ہے۔انھیں اپنے وطن کے ذرے ذرے میں مہتاب دکھائی دیتا ہے۔بچوں کی نظموں میں بھی انھوں نے ہندوستان کے موسموں کی بات کی ہے۔ وہ پھول، بہاروں اوربرسات وغیرہ کو بیان کرتے ہیں۔ اقبال بھی اس وقت ہندوستان کو سارے جہاں سے اچھا قرار دیتے رہے۔ اس کے بعد آنے والے رومانی شعرا بھی اپنے وطن کی فضاؤں سے والہانہ لگاؤ رکھتے ہیں۔ایسی کئی مثالیں ہمیں افسر کی شاعری میں دیکھنے کو مل سکتی ہے۔ان کی شاعری روحانی مسرت اور راحت کا ذریعہ ہے۔ افسر کی اس نوع کی نظموں میں '' وطن کا راگ''زیادہ اہم ہے۔ اس میں جذبۂ حب الوطنی انتہائی اوج پر دکھائی دیتا ہے۔ ''وطن کا راگ''چکبست نے بھی لکھی ہے۔افسر میرٹھی کی اس رومانی کیفیت کا انداز دیکھیے:

بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے
ہر رُت ہر اک موسم اس کا کیسا پیارا پیارا ہے
کیسا سہانا کیسا سندر پیارا دیش ہمارا ہے
سارے جگ کے پہاڑوں میں بے مثل پہاڑ ہمالہ ہے
پربت سب سے اونچا ہے یہ پربت سب سے نرالا ہے

(۲۹)

اردو کے رومانی نظم نگاروں میں کئی قدریں مشترک ہیں ان میں فطرت نگاری،ماضی پرستی ،حب الوطنی اور بچوں کا ادب زیادہ اہم ہیں۔ ان کا اصلاحی ،اخلاقی ،سیاسی وسماجی شعور یکساں ہے۔ اس اعتبار سے افسر میرٹھی دوسرے رومانی شعرا کی روایت سے جڑے ہوئے اور جوڑے ہوئے ہیں۔ ان کی بچوں کے لیے لکھی ہوئی جذبۂ حب الوطنی سے معمور نظموں میں ''جیسا میرا دیش ہے افسر ایسا کوئی دیش نہیں''اہم ہے۔ان کی لکھی ہوئی نظم ''ہمارا وطن''دیکھیے:

یہ ہندوستاں ہے ہمارا وطن
چمن زار جنت ہے سارا وطن

(۳۰)

جغرافیائی حد بندیوں ،رنگ ونسل کے امتیازات اور مادہ پرستی نے انسان کو تنگ نظر بنا دیا اور انسانی ہمدردی سے دور کر دیاتھا۔ اقبال کی نظموں میں انسانی ہمدردی ،روحانی اور اخلاقی مسائل کا بیان ملتا ہے۔ وہ ہندوستان کو امن کا گہوراہ بنانا چاہتے تھے۔ اس لیے انھوں نے قومیت کا راگ چھوڑ کر ملت کا راگ گانا شروع کر دیا۔ اقبال کی نظموں میں فطرت اور اسلام سے عشق کا ذکر ملتا ہے ان کی رومانی نظموں میں ''چاند''بڑی اہمیت کی حامل ہے۔جوشؔ شاعر حسن اور شاعرِ فطرت ہیں۔ وہ حسن پرست اور فطرت پرست ہیں۔ جوش کی نظم '' بدلی کا چاند'' بھی اسی موضوع کی حامل ہے۔ اس میں بھی اقبال کی نظم ''چاند'' کی طرح فطرت کی عکاسی اور زندگی کی حقیقت واضح نظر آتی ہے۔جوشؔ کی متعدد نظموں کے موضوعات اقبال اور دیگر معاصر رومانوی شعرا سے ملتے ہیں۔ اقبال نے بھی چاند کی خوب صورتی کو بیان کیا ہے اور جوش نے بھی چاند کے جمال کو بے نقاب کیا ہے۔جوش بہت جذباتی انسان تھے ان کی شاعری شدتِ جذبات سے لبریز ہے۔ اسی موضوع پر حفیظ نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔ حفیظ کی نظم ''عید کا چاند'' رومانوی انداز کی ہے۔ انھوں نے اقبال اور جوش کی طرح چاند اور چاندنی کو موضوع بنایا ہے۔انھوں نے اقبال اور جوشؔ کی طرح چاند اور چاندنی کو موضوع بنایا ہے۔

افسر میرٹھی کے نغمات میں شامل اسماعیل میرٹھی کی نظموں اور دیہاتی زندگی کی فضا اور جذبۂ حب الوطنی اسماعیل کے اثرات قبول کرنے کا نتیجہ ہے۔اقبال ایسے رومانی شاعر تھے کہ ان سے ہر شاعر نے اثر قبول کیا ہے اسی طرح افسر میرٹھی بھی اپنے عہد کے عظیم رومانی شاعر اقبال سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کی متعدد نظمیں اقبال کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہیں۔افسر کی شاعری اقبال کے رنگ میں ہے اور اس پر حفیظ جالندھری کے اثرات بھی ملتے ہیں۔افسر میرٹھی کو مناظر فطرت سے بے حد دلچسپی تھی کیوں کہ ان کا بچپن دہرہ دوں اور منصوری میں گزرا ان مقامات پر مناظر فطرت کی بہتات ہے۔ افسر کو رات اور اس کے تاروں سے عشق تھا کبھی وہ موسم برسات میں جنگل کی منظر

کشی کرتے ہیں تو کبھی ان کی نظموں میں کیف آور ستارے جھلملاتے ہیں۔ افسر نے بھی ''چاند'' کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے:

تم ندی پر جا کر دیکھو
جب ندی میں نہائے چاند
ڈبکی لگائے غوطے کھائے
ڈر ہے ڈوب نہ جائے چاند

(۳۱)

افسر حسن فطرت ،بیتے ہوئے دنوں اور حبِ وطن کے نغمے الاپنے پر مجبور ہو گئے۔ان کے دل پر تینوں موضوعات کے گہرے نقش ثبت ہوگئے۔اقبال سے پہلے حالی،آزاد اور اسماعیل اور اقبال کے بعد جوش ،حفیظ،اختر اور افسر سمیت دیگر رومانی شعرا نے ان موضوعات پر اچھی نظمیں لکھیں۔احسان دانش نے بھی چاندنی کے موضوع پر ایک نظم لکھی ہے اس کا نمونہ دیکھیے:

راس نہ آئی کچھ بھی چاندنی
بن گئی سر بسر تشنگی چاندنی
تیرگی تھی نظر میں افق تا افق
چاند ابھرا تو ہر سو کھلی
چاندنی

(۳۲)

احسان دانش کی یہ نظم جذبات واحساسات میں ڈوبی ہوئی ہے ،یہ رومانی طرز احساس کی عمدہ مثال ہے۔احسان اس حوالے سے دیگر رومانی شعرا سے اشتراک رکھتے ہیں کہ ''چاند''اور ''چاندنی'' کو کم وبیش تمام رومانی شعرا نے موضوع سخن بنایا ہے۔احسان دانش نے اس نظم میں مناظرہ فطرت اور مظاہر قدرت کی بڑے دلکش انداز میں عکاسی کی ہے۔اقبال سچے محب وطن تھے انھوں نے متعدد نظمیں نوجوانوں کے لیے لکھیں ،انھوں نے قوم کی غیرت کو للکارا ان کی نوجوانو سے متعلق ایک نظم''خطاب بہ نوجوانانِ اسلام''اس بات عمدہ مثال ہے:

کبھی اے نوجواں مسلم ! تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا
مگر وہ علم کے موتی ، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں اُن کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے
سیپارہ

(۳۳)

اقبال قوم کے نوجوانوں میں وطن کی فطری محبت کا جذبہ بیدار کرنے اور انھیں جوش دلانے کے ساتھ ساتھ ان کو اسلاف اور عظمت رفتہ بھی یاددلاتے ہیں تاکہ مسلمان اپنے ماضی کی روایات سے سیکھ کر اپنے موجودہ عہد کو بہتر بنا سکیں اور اپنا کھویا ہو اوقار پھر سے حاصل کر کے دنیا کی ترقی کی دوڑ میں شامل ہو جائیں۔اقبال کی طرح محروم نے بھی پنجاب کے نوجوانوں کو بیدار کرنے کے لیے ایک نظم''نوجوانوں سے خطاب'' کے عنوان سے لکھی بعد میں جوش اور دیگر شعرا بھی اس عنوان سے نظمیں لکھیں۔ محروم نے نوجوانوں کو ہمت و حوصلہ عطا کر کے پنجۂ غیر سے نجات حاصل کرنے کے لیے ترغیب دی ہے۔محروم کی اس نظم میں قومی جذبات نمایاں ہیں:

نوجوانان کشور پنجاب
نونہالان گلشن شاداب
ذلت مادر وطن پر تم
جائے حیرت ہے ، یوں رہو گم
سم

(۳۴)

محروم کی مذکورہ نظم اقبال کی نظم ''چاند'' کی ہیئت میں لکھی گئی ہے۔ محروم نے اپنی نظموں سے امید اور یقین کی شمع کو روشن کیا قوم کو ''شعاع امید'' دی ۔انھوں نے اقبال کی طرح نوجوانوں کو للکاراور جدوجہد آزادی میں شمولیت کے لیے ان کے جذبات کو ابھارا۔انھوں نے ''ہمت کرو جوانو''،''بڑھے چلو ''،''فغاں کیے جاؤ'' اور''نوجوانانِ وطن سے گزارش ''جیسے واضح الفاظ سے منزل کی طرف بڑھنے کا حوصلہ دیا۔ محروم کی نظم ''بزمِ نو''ملاحظہ کیجیے:

بھارت کے نوجوانو ! اک بزمِ
نو بنائیں
حبِ وطن کی شمعیں ، اُس بزم
میں سجائیں
ہو بزمِ نو ہماری خجلت رہِ
گلستاں
بلبل سے بڑھ کر چہکیں ، گل
ہو کے کھلکھلائیں

(۳۵)

محروم کی شاعری میں حالی اور اقبال کی طرح پند ونصائح کے قصے بھی ملتے ہیں۔اس موضو ع پر ان کی نظموں میں''بچوں کا ہفتہ''،''سیر گلستاں''،''استاد''،''دورنگی زمانہ''،''حسن اور زیور''اور''جگانے کی گھڑی''اہم ہیں۔ محروم نے مرثیے ،نوحے اور چند قصیدے بھی نظم کیے،محروم نے ان نظم نگاروں میں سے ہیں جنھوں نے بیسویں صدی اور رومانوی تحریک کے آغازمیں جدید اردو نظم کی روایت کو فروغ دیا۔ انھوں نے ابتدا ہی میں ہندوستان کے سیاسی وسماجی حالات پر نظمیں کہیں ،انھوں نے نوجوانی میں جبرواستبداد کے خلاف آواز اٹھائی اور انگریزوں کے خلاف فلک شگاف نعرے لگائے اور ملک کے نوجوانو ں کو ترغیب دی۔

ساغر نظامی نے اقبال کی طرح اپنی قوم کو بیدار کرنے میں وعظ وتبلیغ کا انداز اپنایا۔ انھوں نے غلامی کا طوق گلے سے اتارنے کے لیے نوجوانوں کو ایک جوش وجذبہ عطا کیا۔ وہ اپنے بیٹے کو مخاطب کر کے وطن کے تمام نوجوانوں کو درس دیتے ہیں۔ اس حوالے سے ساغر ،اقبال سے گہری مماثلت رکھتے ہیں۔اختر کے عہد میں برصغیر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مذہبی ،تہذیبی ،اصلاحی اور آزادی کی تحریکیں عروج پر تھیں۔ اس لیے اختر بھی کچھ نظموں میں مسلمانوں سے مخاطب ہوئے۔ اس دور میں قومی یکجہتی کے تصورات ہر خاص وعام میں تھے۔اختر بھی قومی یک جہتی کے تصورات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ان کی شاعری میں قومی یکجہتی کی گونج سنائی دیتی ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کا قومی شعور بیدار کیا۔ ان کی نظم ''علی گڑھ کے طلباسے'' ایک مکمل ملی شعور کی آئینہ دار ہے یہ نظم اختر نے علی گڑھ مشاعرہ میں شرکت کے وقت لکھی۔اختر بھی علی گڑھ کے طلبا کو وہی تلقین کرتے ہیں جو ایک زمانے میں اقبال نے لوگوں کو درس دیا تھا۔انھوں نے کہا کہ غلامی کی زنجیریں توڑنے کے لیے ضروری ہے کہ جواں مردی اور عزم مصمم کے ساتھ جدوجہد کی جائے۔وطن کی محبت سے کسی کو ا نکار نہیں لیکن وہ خیال کرتے تھے کہ ساری زمین اللہ تعالیٰ کی ہے اور ہم اللہ کو ماننے والے ہیں۔ اس لیے ساری زمین ہمارا گھر ہے۔سارا چین وعرب مسلمانوں کا ہے اس لیے وہ''ترانۂ ملی'' میں یوں گویا ہوئے:

چین و عرب ہمارا ، ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم ، وطن ہے سارا جہاں ہمارا
توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام ونشاں ہمارا

(۳٦)

اقبال کی طرح چکبست نے بھی ہندوستاں کے روشن ماضی کو بہت یاد کیا ہے۔ جب ہندوستان دنیا پر عظیم ملک تھا انھوں نے کشمیر کو جنت نظیر کہا ہے اور وہ دریائے گنگا کی شوکت کو سلام کرتے ہیں اور غمگین لہجے میں کہتے ہیں:

برسوں سے ہو رہا ہے برہم سماں ہمارا
دنیا سے مٹ رہا ہے نام ونشاں ہمارا
علم وکمال و ایمان برباد ہو رہے ہیں
عیش و طرب کے بندے غفلت میں سو رہے ہیں

(۳۷)

اس نظم میں چکبست نے وطن کے ساتھ انتہائی محبت کا اظہار کیا ہے۔ اقبال نے بھی اسی طرح کی ایک نظم لکھی ہے۔ چکبست کی یہ نظم جذبہ حب الوطنی سے سرشار ہے۔چکبست اور اقبال میں موضوعاتی اشتراکات پائے جاتے ہیں۔ چکبست نے ہندو ہو کے بھی ہندوستان کی ضرورت اور جذبات کی بلا تفریق مذہب ترجمانی کی ہے جب اقبال بھی آپس میں بیر نہ رکھنے کا کہتے ہیں اقبال کی نظم ''نیا شوالہ'' مذہبی تنگ نظری نہ رکھنے کی عمدہ مثال ہے،ہندوستان میں مختلف نسلوں اور مذاہب کے لوگ آباد ہیں اقبال کے مطابق ان کا مذہب،رنگ اور نسل کوئی بھی ہو یہ سب ہندوستانی ہیں۔اقبال اپنے دیس سے بے پناہ محبت رکھتے تھے۔نظم ''نیا شوالہ''دیکھیے:

سچ کہہ دوں اے برہمن ! اگرتُو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سیکھایا واعظ کو بھی خدا نے

(۳۸)

اقبال نے ''نیا شوالہ'' میں ہندوستان کے لوگوں کو آپس میں پیار محبت اور رواداری سے رہنے کی تلقین کی ہے۔کوئی کسی کے مذہب کے بارے میں برا بھلا نہ کہے ،یہ ہمارا وطن ہے ہم نے اس میں امن سے زندگی بسر کرنی ہے۔اقبال کی نظم''نیا شوالہ'' اور محرومؔ کی نظم''پیام صلح کل'' میں فکر ونظری اشتراک پایا جاتا ہے۔محروم ساری زندگی جبرواستبداد کے خلاف رہے ۔آزادی کی منزل کے حصول کے لیے اقبال کی ابتدائی دور کی طرح محروم نے بھی ہندو مسلم اتحاد پر بہت زور دیا۔انھوں نے قوموں کے درمیان پھوٹ ،نفاق،تنگ نظری ،تعصب اور فرقہ واریت کی نہایت سخت الفاظ میں مذمت کی۔انھوں نے سماج دشمن عناصر کے سدباب کے لیے اپنی شاعری کو آلہء کار بنایا۔محروم کی قومی اتحاد ویگانگت سے لبریز نظموں میں ''آئینہ دل''،'' پھر بھی لڑتے ہو''،''قافلے یوں بھی تلف

ہوئے‘‘،’’انقلاب دہر‘‘،’’ باد اتحاد‘‘اور ’’اہل وطن کی خدمت میں‘‘شامل ہیں۔محروم نے نظم ’’پیام صلح کل‘‘ میں ہندو اور مسلم افتراق کا ماتم کیا ہے وہ سمجھتے تھے کہ ایسا کر کے لوگ اپنی ذلت وبربادی کو دعوت دے رہی ہیں۔ہندو مسلم باہمی فسادات پر محروم اور قبال دونوں رنجیدہ ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہندو اور مسلمان مذہب کی بنیاد پر آپس میں بیر نہ رکھیں۔تلوک چند محروم اپنی نظم’’اہل وطن کی خدمت میں‘‘ میں ہندوؤں اور مسلمانوں سے مخاطب ہیں:

ہند کے ہندوؤ مسلمانو!
عقل سے کام لو کہا مانو
یہ نہ مذہب ، نہ سیاست ہے
بربریت ہے اور وحشت ہے

(۳۹)

محروم کی اسی فکر کی ایک اور نظم ’’انقلابدہر‘‘بھی اہمیت کی حامل ہے۔ محروم نے ہندو مسلم کو آپس میں اتحاد سے رہنے کی تاکید کی ہے اگر وہ آپسی تنازعات میں پڑے رہے اور فرقہ بندی نہ چھوڑی تو غلامی سے نجات حاصل کرنا نا ممکن ہوگا اور غیر ملکی حکمران ہم پر مسلط ہی رہیں گے:

لڑتے رہیں گے کب تک یہ شیخ اور برہمن
کب تک رہیں گے یونہی اک دوسرے کے
دشمن
دو شہریوں میں کب تک باقی رہے گی ان بن

(۴۰)

رومانوی شاعر اپنے عہد سے بیزار ہوتا ہے۔اس کی شاعری میں ماضی پرستی،جذبہ پسندی، انفرادیت،فطرت پرستی،وطن پرستی، انسان دوستی، روایت شکنی،آزادی اور مساوات جیسی اقدار ہوتی ہیں وہ تخیل سے تخلیق کی ہوئی شاعری پر یقین رکھتا ہے۔ وہ اپنے اضمحلال ،کرب اور غم وآلام کا برملا اظہار کرتا ہے۔ مثال کے لیے اقبال کی نظم’’ابرِ کوہسار‘‘ ملاحظہ کیجیے:

ہے بلندی سے فلک بوس نشیمن میرا
ابرِ کوہسار ہوں گل پاش ہے دامن میرا
کبھی صحرا ، کبھی گلزار ہے مسکن میرا

(۴۱)

اقبال فطری رجحان پر "ابرِ کوہسار" لکھتے ہیں جب کہ جوش فطری رجحان پر''برسات کی ایک شام''اور''برسات کی چاندنی'' لکھتے ہیں جوش کی نظم ''برسات کی ایک شام''دیکھیے:

خنک ہواؤں میں اٹھتی جوانیوں کا خرام
کنارِ دشت میں برسات کی گلابی شام
زمیں کے چہرۂ رنگیں پر آسماں کی ترنگ

(۴۲)

اقبال کی نظم ''ابرکوہسار'' مسدس کی ہیئت میں ہے جب کہ جوش کی نظم ''برسات کی شام'' مثنوی کی ہیئت میں لکھی گئی ہے۔اگرچہ یہ دونوں نظمیں ہیئتی اعتبار سے الگ الگ ہیں لیکن ان کا موضوع اور اسلوب ایک جیسا ہے۔اقبال کی نظموں میں بھی ماضی پرستی کے کئی پہلو نظر آتے ہیں انھوں نے یہ اثر انگریزی شاعری سے قبول کیا ہے۔اقبال کی ماضی پرستی پر بچوں کے لیے لکھی نظم ''پرندے کی فریاد''کافی اہم ہے:

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ
وہ باغ کی بہاریں ، وہ سب کا چہچہانا

(۴۳)

ماضی اور یاد کا موضوع محروم کی نظموں میں بھی ملتا ہے۔''یاد'' کا موضوع انگریزی شعرا کا محبوب موضوع رہا اس لیے اردو کے تمام جدید شعرا نے بھی یاد کو موضوع سخن بنایا ہے۔محروم کی نظم''کبھی کی یاد ''اور''یادِ ایام'' پر بیسیوں صدی کے آخری شاعر ٹینی سن کے اثرات ملتے ہیں:

یادِ ایام کامرانئ دل
در حقیقت ہے نوحہ خوانئ دل

(۴۴)

ماضی کی یاد تکلیف کا باعث بنتی ہے محروم کی شاعری حزن و یاس سے لبریز ہے کیوں کہ انھیں زندگی میں متعدد محرومیاں اور ناکامیاں دیکھناپڑیں،ان کی سب سے بڑی محرومی ان کی جوان بیوی جو ایک نچی کو جنم دے کر انتقال کر گئی اور ازاں بعد بچی بھی چل بسی،جس کا صدمہ انھیں زندگی بھر رہا، اس لیے کیٹس کی طرح ان کی نظموں میں بھی حزن کا عنصر زیادہ ہے۔اقبال''پرندے کی فریاد'' میں ماضی کے دنوں کو یاد کرتے ہیں جب

کہجوش کی ماضی پرستی ان کی نظم''بیتےہوئے دن'' میں نمایاں نظر آتی ہے۔ملاحظہ کیجیے:

کیا حال کہیں اس موسم کا
جب جنسِ جوانی سستی تھی
جس پھول کو چومو ،کھلتا تھا
جس شے کو دیکھو ، ہنستی
تھی

(۳۵)

جوش اپنے بچپن ،جوانی اور بڑھاپے کو ایک روداد کی صورت میں قلم بند کرتے ہیں۔ ان کی نظمیں ،حقیقت دل ،پرانی تصویر ،اترتے ہوئے چہرے ماضی کی یاد دلاتے ہیں۔نظم ''اترے ہوئے چہرے'' میں جذبات نگاری کے عمدہ مناظر پیش کیے گئے ہیں۔''ماں جائے کی یاد'' بھی جوش کی بچپن کی یادوں پر مبنی نظم ہے۔ وہ بھائی ،بہن کے جھگڑوں ملن اور آپسی محبت کی داستان شعری صورت میں بیان کرتے ہیں۔اقبال نے اس طرح کی ایک نظم ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' لکھی ہے۔ جو ماضی کی یادوں پر ہے۔جوش کی نظم ''ماں جائے کی یاد''ملاحظہ کیجیے:

میں دیس میں اور تم وطن سے
باہر
اے بھائی بہن نثار تم پر
انگنائی میں ہو رہا ہے غوغا
ساون کی ہے رُت ہوا ہے پروا

(۳٦)

جوش کی یہ نظم نہایت جذباتی ہے جوش کو اپنا بچپن یاد آتا ہے ،بہن بھائیوں سے کھیلنے کودنے اور لڑنے جھگڑنے کے وہ دن یاد آتے ہیں ،انھوں نے اپنی نظم ''پرانی تصویر'' میں بھی اپنے بچپن کی یادوں کا نقشہ کھینچا ہے۔ جوش نے زندگی کے کئی اہم پہلوؤں پر نظمیں لکھیں ۔انھوں نے اقبال کے بعد جذبات نگاری کی ایک نئی روایت قائم کی بعد میں اسی رویت کو اختر شیرانی اور دوسرے رومانوی شعرا نے قبول کیا۔اس جذبات نگاری کی بنا پر جوش معاصر شعرا میں اہم مقام رکھتے ہیں ۔ان کی نظموں میں ماضی سے لگاؤ محبوب کی جدائی کا غم ،دل کا درد والم پایا جاتا ہے۔ اقبال کامزاج عاشقانہ تھا وہ اپنے مذہب، ملت اور انسان دوستی کی بات کرتے ہیں۔ وہ آزاد انسان اور آزادی کی بات کرتے ہیں۔اقبال کی شاعری میں ایک ولولہ ،جوش اور رومانوی انقلاب نظر آتا ہے۔اقبال اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہیں

تو اپنے بیٹے کے لیے نظم لکھتے ہیں۔ اقبال نے طلبہ علی گڑھ کے نام ،عبدالقادر کے نام، اپنے بیٹے جاوید کے نام نظمیں لکھیں۔حفیظ جالندھری نے ''عصمت'' کے نام سے ایک نظم اپنی اولین دختر ارشاد بتول کی ولادت پر لکھی،اقبال نے بھی اپنے بیٹے اور والدہ کے لیے نظمیں لکھیں ،یوں ان دو شعرا میں موضوعاتی اشتراک پایا جاتا ہے۔جس طرح اقبال جاوید کے نام لکھتے ہیں ،جوش ''سجاد سے''میں اپنے بیٹے کو مخاطب کرتے ہیں:

قبر میں روح پدر کو شاد کرنے کے لیے
سر کٹانا ہندکو آزاد کرنے کے لیے

(۴۷)

اقبال اور ان کے معاصرین کی نظمیں اخلاقی اور اصلاحی ہیں ۔ان میں اپنی تہذیب پر قائم رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اقبال کے شعری مجموعہ''بانگ درا'' میں وطنیت کی علامات نمایاں ہیں۔ ان کی اہم علامتوں میں شمع وپروانہ، جگنو ،شاہین،لالہ، مردِ مومن اور قلندر ہیں۔ انھوں نے پرانی علامات ساقی اور قلندر کو نئے انداز میں برتا ہے۔ اقبال ابلیس کو شر کی علامت سمجھتے تھے ،ان کی علامت نگاری کے بارے میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری لکھتے ہیں:

> ''اقبال کی علامتیں الہیاتی نظام ہی سے تشکیل پاتی ہیں ،اس میں اخلاقی اقدار بھی ہیں اور حسن ونیکی اور روشنی اور علم کے تصورات بھی اقبال کے انسان کامل کی علامت میں جلابی خوبیاں بھی ہیں مگر وہ صرف باطل قوتوں کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔''(۴۸)

اقبال اور دوسرے رومانوی شعرا پرانگریزی شاعری کے اثرات ملتے ہیں ۔اقبال فارسی اور اردو پر قدرت رکھنے کے باوجود مغربی افکار کا سرمایہ رکھتے تھے ۔اس لیے ان کی شاعری میں انقلاب ،حریت کے ساتھ ساتھ روحانیت اور رومانیت نظر آتی ہے۔ انھوں نے حقیقت کو نمایاں کرنے کے لیے بھی فطرت کے نظاروں کو اپنے تخیل سے پیش کیا ۔انگریزی شعرا وطن پرست،فطرت پرست اور ماضی پرست تھے اس لیے اقبال کی شاعری میں یہ خصوصیات انگریزی رومانوی شعرا کے زیر اثر پیدا ہوئیں۔ اس بارے میں خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں:

> ''اقبال کے سامنے انگریزی شاعری کے نمونے موجود تھے انگریزی شاعری آزاد قوم کی شاعری ہے ،یہ قوم انقلاب سے گزری ہے اس کی تاریخ میں شروع سے آخر تک حریت نظر آتی ہے۔''(۴۹)

اقبال نے آزادی اور جمہوریت کی راہ میں قوم کی راہنمائی کی ،ان کی شاعری آزادی وجمہوریت کے فلسفے اور سیاسی افکار سے معمورہے۔اقبال آزادی کو انسان کا بنیادی حو الہ سمجھتے ہیں اور ملوکیت کو معاشرے کے لیے خطرناک قرار دیتے ہیں۔ اختر شیرانی آزادی کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہیں۔ ایک حسن پرست اور عشق پرست شاعر کے یہاں ایسی نظمیں ہیں جن میں جنگ و پیکار کا ذکر اور آزادی کے نعرے گونجتے ہوں دیکھ کر حیرت سی ہوتی ہے۔اس ضمن میں نظم ''عشق وآزادی'' دیکھیے:

عشق و آزادی بہار زیست کا سامان ہے
عشق میری جان ، آزادی مرا ایمان ہے
عشق پر کر دوں فدا میں اپنی ساری زندگی
لیکن آزادی پہ میرا عشق بھی قربان ہے

(۵۰)

آزادی سے قبل کے شعرا میں ساغر نظامی نمایاں نظر آتے ہیں۔ انھوں نے آزادی کی طلب و تمنا عوام میں پیدا کی۔وہ لوگوں کو غلامی کا احساس مسلسل دلاتے رہے۔وہ بڑے محب وطن شاعر تھے ۔وہ وطن کو ہر صورت آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔وہ اپنی نظم'' آفتاب''میں آزادی حاصل کرنے کا اظہار کرتے ہیں۔ساغر نظامی کی نظم ''آفتاب'' ملاحظہ کیجیے:

غنچہ و گل ہو رہا آشیاں آزاد ہو
بلبلیں آزاد ہوں اور گلستاں آزاد ہو
ایشیا آزاد ہو ، ہندوستاں آزاد ہو
پنجہ ظلم وستم سے کل جہاں آزاد ہو

(۵۱)

اقبا ل کی نظم ''سلطنت'' بھی اسی نوعیت کی ہے۔انھوں نے اپنی نظم ''طلوع اسلام '' میں مشرق کے مسلمانوں کو مغرب کے طلسم سے چھٹکارہ پانے اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کا کہا ،وہ ملت کو رنگ ونسل کے امتیاز سے نکل کر صداقت ،عدالت اور شجاعت کا درس دیتے ہیں:

سبق پھرپڑھ صداقت کا ،
عدالت کا ،شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا
کی امامت کا

(۵۲)

اقبال ایسے فلسفی شاعر تھے جو مشرق ومغرب کے تمام انقلابی نظریات سے مکمل آگاہی رکھتے تھے۔ان کے مشاہدہ میں ملکوں اور قوموں کا عروض وزوال بھی تھا،اس لیے انھوں نے بر صغیر کے مسلمانوں میں قوت نمو پیدا کی اور غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کا جوش و ولولہ پیدا کیا۔ وہ ملوکیت اور شہنشاہیت کو سخت نا پسند کرتے تھے۔اقبال مغرب پسند جمہوریت کے حامی نہ تھے وہ اسلامی طرز جمہوریت کے قائل تھے۔جوش نے اپنی نظموں میں آزادی اور انقلاب کا جو نظریہ پیش کیا وہ بھر پور جذباتی ہے۔ وہ آزادی اور آزاد ملک کا خواب دیکھتے ہیں۔اقبال نے بھی غلام ہندوستان سے خطاب کیا ہے۔جوش کی بھی ایک نظم ''غلاموں سے خطاب''دیکھیے:

اکسائے میرا شعراگر جذبہ ہائے
جنگ
پیدا ہو آبگینے کے اندر مزاج
سنگ
خرمن میں میرا شعر اگر کج
کرے کلاہ
خس تند بجلیوں سے لڑانے
لگے نگاہ

(۵۳)

روش صدیقی نے اپنے معاصرین کی طرح جذبات و احساسات سے لبریز نظمیں تخلیق کی ہیں۔ ان میں کہیں جذبۂ حب الوطنی کے ترانے ہیں تو کہیں جذبۂ آزادی اور جذبۂ حریت کے نغمے بلند آہنگ لیے ہوئے ہیں۔ ان کا جذبۂ آزادی ان کی نظم ''زبورحریت''میں نمایاں ہے:

ایک ذرہ بھی نہیں مہر درخشاں
کا غلام
ایک تنکا بھی نہیں رنگ گلستاں
کا غلام

ایک لمحہ بھی نہیں گردشِ
دوراں کا غلام

(۵۴)

روش صدیقی نے اس نظم کے ذریعے قوم میں جذبہ حریت پیدا کیا ،وہ آزادی کی طلب وتمنا رکھتے ہیں۔ انھوں نے اقبال کی طرح قوم کے ضمیر کو جھنجھوڑا۔وہ آزادی کے بغیر زندگی کو حیوانوں کی زندگی قرار دیتے تھے۔ان کی نظم ''بیداریٔ مشرق''میں آزادی کی بات کی گئی ہے۔جوش نے بھی اس خاص بلند آہنگی سے ہندوستان کو غلامی کی زنجیریں پہنانے والی حکومت کو للکارا اور اپنی انقلابی شاعری سے آزادی کی تحریک کو جذبہ عطا کیا۔جوش کی نظم''شکست زنداں کا خواب''آزادی کی تڑپ اور ہندوستان کے مظلوم و مغلوب عوام کے جذبات نمایاں کرتی ہے۔

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے گونج رہی ہیں
تکبیریں
اُکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑے ہیں
زنجیریں

(۵۵)

جوش نے اپنی نظم ''آثارِ انقلاب'' میں ہندوستان والو ں کو بیدار کیا ہے،وہ آزادی کے لیے یوں لکھتے ہیں:

اٹھو ، وہ صبح کا غرفہ کھلا
زنجیرِ شب ٹوٹی
وہ دیکھو پو پھٹی ، غنچے
کھِلے پہلی کرن پھوٹی!

(۵٦)

جو ش نے جب ''ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے''،''تلاشی''،''بغاوت''،''ترانۂ آزادی وطن'' اور''نظام نو'' جیسی نظمیں لکھیں تو ان کی نظموں کی دھوم پورے ہندوستان اور اقوام عالم میں مچ گئی،ان کی نظمیں لوگ گلی گلی گنگنانے لگے،اسی دوران حکومت برطانیہ نے ان کی نظم ''نعرۂشباب '' ضبط کر لی۔جلیاں والا باغ سانحہ کے بعد جو ش اپنے مزاج میں تبدیلی لے آئے۔اس سانحے نے جوش کو شاعر رومان سے شاعر انقلاب بنا دیا۔جوش کی اس دور کی نظمیں سیاسی وسماجی حالات کی مظہر ہیں۔ ان کی نظمیں قوم پرستی، وطن

پرستی، احساس غلامی ،آزادی کی تڑپ اور دیگر حالات سے معمور ہیں۔جوش نے ایک نظم ''کسان '' کے عنوان سے بھی لکھی ہے،نمونہ دیکھیے:

جھٹپٹے کا نرم رو دریا ، شفق کا اضطراب
کھیتیاں ، میدان ، خاموشی، غروبِ آفتاب
پارہ پارہ ابر ، سرخی ،سرخیوں میں کچھ دھواں
بھولی بھٹکی سی زمیں ، کھویا ہوا سا آسماں
یہ سماں اور اک قوی انساں یعنی کاشتکار
ارتقا کا پیشوا ، تہذیب کا پروردگار

(۵۷)

جوش بیداریٔ عوام اور آزادی وطن کے گیت گاتے ہیں۔ ان کے موضوعات میں بے حد تنوع، وسعت اور ہمہ گیری پائی جاتی ہے۔ جوش کے بارے میں وسیم عباس گل رقم طراز ہیں:

''جوش ملیح آبادی اپنے معاشرے سے کڑھنے والے شاعر نہ تھے ،بلکہ وہ علامہ اقبال کی طرح حساس طبیعت اور مفکرانہ ذہن کے مالک تھے۔ وہ ملک و قوم کی زبوں حالی پر کڑھتے تھے اور اپنی شاعری کے ذریعے معاشرے میں خاص قسم کی تبدیلیاں چاہتے تھے۔''(۵۸)

جوش ملیح آبادی وطن کی آزادی،حریت اور فطرت پرستی کے نغمے الاپتے ہیں۔ان کی شاعری میں آزادیء وطن کا خواب اور تعبیر کے جو ہر ملتے ہیں۔وہ فطرت پرست،حسن وعشق کے جذبات اور احساسات بھی رکھتے تھے۔انھوں نے سیاسی ہنگامہ آرائیوں سمیت زندگی کے ہر پہلو کو شعری پیکر عطا کیا۔انھوں نے اس زمانے کے واضح رجحانا ت اور عصری میلانات کو نظری انداز نہ کیا اور حسبِ استعداد مسائل پر خامہ فرسائی کی۔ انھوں نے اپنی فلسفیانہ شاعری کی بدولت رومانی تنگ دامانی کو کشادگی عطا کی۔ جوش کے معاصر شاعر اختر شیرانی کی شاعری میں بھی اصلاحی اور سماجی نوعیت کے مضامین ملتے ہیں۔ اختر سے پہلے اردو شاعری میں سماجی اور اصلاحی مضامین رواج پا چکے تھے اس لیے وہ روایت سے کنارہ کشی اختیار نہ کر سکے۔انھوں نے ہندوستانی معاشرے کو کھلی آنکھ سے

دیکھا اور روحانی اقدار اور سماجی و تہذیبی اقدار کی پامالی پر نوحہ کناں ہیں۔ وہ ہمیشہ اشتراکی نظریے کے حامل رہے انھوں نے غریب اور امیر کے امتیازات کو محسوس کیا اور نظم ''امیروغریب'' تخلیق کی۔

دنیا کاہر آرام امیروں کے لیے
ہے
پھر کون سی شے ہے جو
فقیروں کے لیے ہے

(۵۹)

اختر مزاحیہ اور طنزیہ انداز میں سرمایہ دار طبقے کی سفاکی بیان کرتے ہیں کہ ہمارے ملک میں ذخیرہ اندوزی ہے جسے کوئی پسند نہیں کرتا دراصل اختر نے مظلوم ومحکوم طبقے کی بات کی ہے۔ وہ ایسا معاشرہ چاہتے ہیں جہاں کوئی امتیازی خلیج حائل نہ ہو۔ سب انسان برابر ہیں اور ان کے معاشی وسائل بھی مساوی ہوں۔ اختر شیرانی، جوش کی طرح مزدور اور کسان طبقے کی بات بھی کرتے ہیں انھوں نے کسان کی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ مزدور اور کسان انتہائی محنت کش طبقے کے افراد ہیں۔ان کی زندگی عیش وطرب سے نا آشنا ہے۔کسان ہمارے سماج میں ایک تعمیر وترقی کی علامت ہے،اختر کی نظم ''کسان''دیکھیے:

رگ رگ میں جوش، محنت و
ذوقِ عمل لیے
کھیتوں سے آ رہا ہے کسان اپنا
ہل لیے
دنیائے ہست وبود پہ احسان اس
کا ہے
خدمت کرے زمانے کی ، ایمان
اس کا ہے

(٦٠)

جوش اور اختر شیرانی کی کسان کے عنوان سے لکھی ہوئی نظموں کا موضوع بھی ایک ہے اور ان دو نوں نظموں کی ہیئت بھی ایک ہے۔دونوں نظمیں مثنوی کی ہیئت میں لکھی گئی ہیں۔اقبال نے اپنی نظموں''مسجد قرطبہ''،''ساقی نامہ''اور'' ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں اپنے عہد کے سیاسی وسماجی مسائل کا فلسفیانہ انداز میں اظہار کیا ہے۔ ''مسجد قرطبہ'' میں اس طرز حکومت کی یادتازہ کی ہے جسے اولین دور میں مسلمان حکمرانوں نے پیش کیا تھا۔ اقبال دور اول والا عدل اور مساوات کا نظام چاہتے تھے،انھوں نے لوگوں کی حقیقی آزادی

اور اسلامی جمہوریت کی راہنمائی کی۔ اقبال بھی دوسرے رومانوی واصلاحی شعرا کے ساتھ گہری مماثلت رکھتے ہیں۔ان کی نظموں میں سرسید ،حالی اور شبلی کی فکر بھی موجود ہے۔نظم''مسجد قرطبہ'' میں ہسپانیہ کے مسلمانوں کی طرز تعمیر کو بیان کیا گیا ہے اور اس وقت کا تعین بھی کیا گیا ہے ایک وہ وقت تھا جب مسلمان حکمران تھے اور ایک یہ وقت ہے کہ مسلمانوں پستی اور شکست کا شکار ہیں۔یہ نظم مسلمانوں کے عروج وزوال کی تصویر کشی کرتی ہے۔اس نظم میں مسلم شاہی طرز تعمیر اور تہذیب کی بھی عکاسی کی گئی ہے۔ بعد میں آنے والے شعرا بالخصوص میراجی،مجید امجد،ساحرلدھیانوی اور اخترالایمان بھی اقبال سے متاثر ہو کر اس طرح کی نظمیں لکھتے ہیں۔میراجی کی ''اجنتا کے غار''،مجید امجد کی''مقبرۂ جہانگیر''،اخترالایمان کی ''مسجد'' اور ساحر لدھیانوی کی ''تاج محل'' بھی اسی نوع کی نظمیں ہیں۔ان نظموں میں مسلمان شہنشاہوں کی بادشاہت کے جاہ وجلال اور شکست وریخت کے ساتھ ساتھ وقت کی بدلتی ہوئی قدروں اور طرز تعمیر کے لحاظ سے مماثلت پائی جاتی ہے۔ محروم اور دیگر رومانوی شعرا نے عظیم یادگاروں اور کرداروں پر جو نوحے لکھے ہیں وہ براہ راست انھوں نے انگریزی شعرا سے اکتساب کیے ہیں۔ کیوں کہ حزن ویاس رومانوی شاعری کا نمایاں عنصر اور تہذیب وتاریخ سے لگاؤ انگریزی رومانوی شعرا کا شوق تھا۔ ورڈزورتھ کو فرانس خوب صورت لگتا تھا جب کہ کیٹس ،بائرن اور شیلے یونا ن کو پسند کرتے تھے۔روم ان سب کے لیے مقدس تھا۔اقبال کی نظم ''مسجد قرطبہ'' کی طرز پر محروم نے بھی ''نورجہاں کےمزارپر''کے نام سے ایک نظم لکھی۔

نادرؔ اور سرورؔنے حالی اور اقبال کے درمیان ایک کڑی کاکام کیا۔انھوں نے آزاد اور حالی کی "نیچرل شاعری" سے اثرات لے کر اردو شاعری کو فطری جذبات ومشاہدات عطا کیے اور رومانوی طرز احساس اپناتے ہوئے مشاہدات فطرت ،قومی ، وطنی اور انفرادی جذبات کو نظم میں بیان کیا ہے۔نادر اور سرور کی کاوش کے بارے میں ممتاز حسن ''جذباتِ نادر''کے مقدمہ میں رقم طراز ہیں:

> ''سرور اور نادر ،حالی اور اقبال کی درمیانی کڑی بن گئے۔ سرور اور نادر دونوں کی شاعری مشاہدات فطرت اور قومی اور انفرادی جذبات سے مالامال ہے مگر سرور کے یہاں جذبہ زیادہ ہے اور نادر کے یہاں سادگی۔''(٦١)

نادرؔ نے خوب صورت انگریزی تراجم بھی کیے اور انگریزی شاعری کے لطیف مذاق کو اردو میں پیدا کرنے کی کامیاب سعی کی۔ انھوں نے انگریزی شعرا ٹینسن ،بائرن اور ٹامس مور کی نظموں کے تراجم کیے۔انھوں نے مور کی ایک طویل نظم ''لالہ رخ'' کے حصے ''لائٹ آف دی حرم'' کا ترجمہ ایک طویل مثنوی کی ہیئت میں کیا۔ نمونہ دیکھیے:

وہ منظر شہر عرش منزل
آئینہ وہ جھیل کا مقابل

ہر چیز پہ محویت کا عالم
ہر شے سے خوشی کا خیر مقدم

(٦٢)

نادر نے اصل سے معنوی مطابقت قائم کرنے کی کوشش کی ہے مگر کہیں کہیں ہندوستانی تہذیب کی وجہ سے انحراف بھی کیا ہے۔ ٹامس مور نے طائفہ کی کمر میں گھونگھرو باندھ کے ناچنا نظم کیا ہے جب کہ نادر نے اسے پاؤں میں باندھا ہے کیوں کہ ہندوستان میں گھونگھرو کمر سے باندھنے کا رواج نہیں ہے۔نادر نے جدید اردو شعرا کی طرح انگریزی نظموں کا ترجمہ کرتے ہوئے زیادہ تر مظاہر ہندوستانی ہی رکھے ہیں۔انھوں نے ترجمے کے ذریعے سے اردو زبان کو موضوعاتی و ہیئتی وسعت دی ۔ان کی ترجمہ کی گئی نظموں میں ''شاعر کا دل'' ، '' مرحومہ کی یاد میں''اور''گزرے ہوئے زمانے کی یاد'' اہم ہیں۔انھوں نے "رات کے پچھلے پہر" اور ''الفت دیرینہ'' کا استعمال کر کے ترجمہ کی گئی نظموں میں اصل میں تخیل کا اضافہ کیا ہے۔نادر نے اکبر کی طرح ظریفانہ نظمیں بھی لکھی ہیں اس وجہ سے ان کا کلام ''اودھ پنچ'' میں شایع ہوتا رہا۔ انھوں نے اپنی متعدد نظموں کے عنوان انگریزی کی مشہور نظموں سے لیے ہیں۔ اس کی مثال ایک نظم''رات کے بے چین گھنٹے''اس نظم سے ملتی جلتی ایک انگریزی نظم''A Night Piece'' اور'' Night Thought'' ہیں۔ نادر کی اس نظم پر ورڈزورتھ کے اثرات ہیں:

دنیا تمام غفلت کی نیندسو رہی
تھی
اور شورش جہاں تک خاموش
ہو رہی تھی
سناٹا کل فضا کے عالم میں
چھا چکا تھا
پچھلے پہر کا گھنٹہ بارہ بجا
چکا ہے

(٦٣)

نادر کاکوروی کے یہاں حسن فطرت اور رومانوی طرز احساس میں ڈوبے ہوئے عنوان ملتے ہیں جیسے ''پچھلے پہر کی کوئل'' نادر اور دیگر شعرا میں یہ بات ہے کہ کوئل ایسا پرندہ ہے جو ہر شاعر کے یہاں موجود ہے۔ نادر کی یہ نظم ورڈز ورتھ کی نظم '' To The Cuckoo''سے ماخوذ ہے۔ وورڈزورتھ اپنی نظم''Revival of Poetry'' میں فطری شاعری کے ذریعے جذبہ واحساس کو دوبارہ زندہ کر دینا چاہتے تھے جب کہ نادرکاکوروی نے بھی ان سے متاثر ہو کر اردو نظم کو جذبات و احساسات کا ترجمان بنایا ہے۔آزاد اورحالی

نے جس نیچرل شاعری کی تحریک پیدا کی ،نادر نے اس میں فطری جذبات واحساسات کا دل چسپ اضافہ کیا۔ انھوں نے فرسودہ شعری روایت سے بیزار ہو کر انگریزی رومانوی شعرا کے انداز میں نظم نگاری کی۔ ان کی ایک نظم''شعاع امید'' ہے۔اسی موضوع پر کیٹس کی ایک نظم ''The Hope''اسی طرح ورڈزورتھ کی نظم''APoet,s Epitaph'' ہے اس کی طرح نادر نے نظمیں ''چاک مزار'' اور''شاعر کی قبر '' تخلیق کیں۔ انھوں نے ورڈزورتھ کی طرح ان نظموں میں فنا اور موت کا خیال پیش کیا ہے۔نادر نے ورڈزورتھ کی نظم'' The River Dudden'' کی طرز پر ''دریا'' کے عنوان سے ایک نظم لکھی جس میں دریا کو پرانی اور نئی تہذیب کا مظہر قرار دیا ہے۔دریا میں بحری جہاز سفر کرتے ہیں:

کارواں دریا ترا ، اب یہ گیا اور
وہ گیا
ایڑیاں اب تو رگڑتا ہے یہاں
پیچھے پڑا
ریل پر اب جاتری کہتے ہیں
گنگا کی جے
دور ہی سے تیری پالاگی ہے
اور ڈنڈوت ہے

(٦٣)

نادرؔ نے اپنی نظموں میں ہندوستانی ماحول ،تہذیب ،موسم اور مظاہر فطرت بیان کیے،انھوں نے اپنی نظموں میں انگریزی شاعری کے اثرات کو مشرقی انداز میں پیش کیا ان کی اہم نظموں میں'' خواب نوشیں '،''پروانہ وشمع''،''اے ہم صفیر میرے سینے میں دل نہیں''،''دوتصویریں''شامل ہیں۔ انھوں نے اپنے جاندار اور منفرد تخیل کے ذریعے شاعری میں سادگی اور بے تکلفی پیدا کر دی ہے۔ اس کی مثال کے لیےنادرؔ کی نظمیں'' ایک مرحوم دوست کی تصویر''،''بہارِ ہند''،''پروانۂ جانسوز''،''سوزِ عشق''اور''سیردریا''شامل ہیں۔ سرور جہاں آبادی نے انگریزی رومانی شاعری ٹینی سن کی نظم'' The Death the Old Year'' ٹامس مور کی نظم''The Last Rose of Summer'' اور لارڈلٹن کی نظم '' The Blind Flower Girl Song''کا ترجمہ کیا ہے۔ انھوں نے اقبال اور دیگر رومانی شعرا کی طرح انگریزی رومانی شعرا کا گہرا مطالعہ کیا اور ان کی طرزِ فکر کو اردو شاعری کا حصہ بنایا۔ ان کے کلام میں انگریزی علم وادب کی وہی فضا محسوس ہوتی ہے جو اس زمانہ کے رومانی شعرا کے مزاج میں رچی بسی تھی۔

سرور جہاں آبادی کی شاعری میں ماضی سے لگاؤ ،مناظرِ فطرت کی عکاسی، عشق محبت کے مضامین کے علاوہ موسموں ،پرندوں ،پھلوں اور پھولوں کا ذکر ملتا ہے۔ یہی خصوصیات اردو کے دوسرے شعرا کے کلام میں بھی موجود ہے۔سرور ،ورڈز ورتھ سے

گہرے متاثر تھے ،اسماعیل،اقبال اور عظمت اللہ خاں کی طرح سرور بھی فطرت کے ہم نوا تھے۔سرور کی نظموں''لالۂ صحرائی''اور''پھول اور پیام'' میں فطرت کے نغمے سنائی دیتے ہیں۔ فطرت نگاری کرتے ہوئے انھوں نے تہذیبی پس منظر ہندوستانی ہی رکھے۔ جس طرح ورڈزورتھ کی نظم ''To A Butterfly''،''To The Cukkoo''، ''To The Daisy'' میں فطرت کے مظاہر انگریزی ماحول سے مطابقت رکھتے ،اسی طرح سرور کی نظموں میں فطرت کے مظاہر میں ہندوستان کا ماحول اور پس منظر نظر آتا ہے۔ سرور کی نظمیں ،''بھنورے کی بے قراری ''اور''بیربہوٹی'' میں ہندوستانی رومانوی رنگ اور فضا ہے۔

محروم نے اولین دور کے شعرا آزاد،حالی اور اسماعیل سمیت رومانوی تحریک کے بڑے شعرا نادر،سرور ،اقبال اور چکبست وغیرہ کی طرح بڑی تعداد میں انگریزی نظموں کے تراجم کیے۔ انھوں نے انگریزی شاعری کے مضامین بڑی کامیابی کے ساتھ اردو کے قالب میں ڈھالے۔وطن، فطرت اور ماضی پرستی سے سرشار انگریزی نظموں اور شیکسپیئرکے ڈراموں کے اقتباسات کو بڑی تعداد میں اسٹینزا کی ہیئت میں ترجمہ ترجمہ کیا۔ انگریزی ادب کےترجمہ کے حوالے سےمحروم اپنے پیش رو اور معاصر شعرا سے گہرا اشتراک رکھتے ہیں۔محروم نے حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہو کر متعدد نظمیں لکھیں،انھوں نے والٹر اسکارٹ کی ایک مشہور نظم سے متاثر ہو کر ''حب وطن'' کے نام سے ایک نظم لکھی ہے۔ والٹر اسکارٹ نے اپنی نظم سکارٹ لینڈ کی محبت کے نغمے الاپے ہیں اور محرومؔ نے اپنی نظم میں ہندوستان سے والہانہ محبت کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے مشہور انگریزی شاعری ورڈزورتھ سے متاثر ہو کر نظمیں لکھیں اور انگریزی شاعری سے کچھ مضامین اخذ کیے اور کچھ براہ راست ترجمہ کیا۔محروم نے طبع زاد نظموں کے علاوہ بچوں کے لیے انگریزی نظموں کا ترجمہ کر کے بھی نظمیں لکھیں،ان میں ''اندھا لڑکا''،''نیک بنو''،''ٹکرائے جا سر اپنا''،'' چمکیلا اجالا''اور ''نرم گفتاری '' شامل ہیں۔محروم نے بھی برسات،دریا اور اہم مقامات کا ذکر کیا ہے۔ اقبال اور سرور وغیرہ نے دریاؤں پر نظمیں لکھیں۔ ورڈزورتھ نے بھی فطرت کا بیان کرتے ہوئے دریا کی تصویر کشی کی ہے۔ ورڈزورتھ نے اپنی نظموں '' To The River Greta Near Keswick'' اور''To The River Derwen'' کا ذکر کرتے ہوئے روم کی تاریخ نظم کی ہے۔ورڈزورتھ کی طرح محرومؔ نے بھی اپنے شعری مجموعہ''گنج معانی''میں ''یادرفتگاں ''کے عنوان سے ایک حصہ نظم کیا۔ اس حصہ میں انھوں نے زیادہ تر نوحے اور مرثیے لکھے ہیں۔ اس حصہ میں ''غم نادر ''اور ''ماتم گرامی'' جیسی حزنیہ نظمیں لکھیں۔ نادر جوانی میں انتقال کر گئے اور گرامی کی وفات بھی اردو شاعری کے نقصان کا باعث بنی ۔نادر نے اپنی شاعری کے شباب کے دنوں میں انتقال کیا۔ اس لیے محروم نے ان دونوں شعرا کے نوحے لکھے۔انگریزی کے مشہور رومانوی شاعر بائرن نے اپنے عزیزوں کے لیے ''Epitaph'' لکھے اور اپنی قبر کے لیے''My Epitaph'' اور'' Substitute for on Epitaph'' لکھا اور ورڈز ورتھ نے''Epitaphs ana Eleqtac Pieces'' کے نام سے نظمیں لکھیں۔ان انگریزی شعرا سے متاثر ہو کر محروم نے نوحے نظم کیے ان کے حزن کے بارے میں سر شیخ عبدالقادر "گنج معانی" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''ایک اور چیز جو ان (محروم) کے کلام میں پائی جاتی ہے۔وہ کیفیت گم ہے ۔بہار ہو یا خزاں ،قدرت کے ہر منظر کو دیکھ کر ان کے دل کا کوئی نہ کوئی زخم تازہ ہو جاتا ہے۔''(٦٥)

تلوک چند محروم کے مجموعہ''گنج معانی'' میں جو نظمیں انگریزی سے ترجمہ کی گئیں ان میں''ایام غم''،''خاندان کی قبریں''،''سپاہی کا خواب''،'' ترانۂ عشق''،''حسرت پرواز''،پ''یمان وفا''،''نرم گفتاری''اور ''موت کا موسم'' اہم ہیں۔ شیکسپیئر کے ڈراموں کے اقتباسات کا منظوم ترجمہ کرتے ہوئے انھوں نے قناعت،وصل محبوب،نیرنگ تخیل،بادشاہوں کے مصائب،دوست کی پہچان،چاند،نغمہ آسمانی،تقدیس نغمہ،شبنم،عروج وزوال،عشق، اقسام غم،تلقین صبر اور زوال حسن کے عنوان دیے ہیں۔علاوہ ازیں محروم نے ورڈزورتھ کی نظم''اے سلمبر ڈڈمائی سپرٹ ''کاترجمہ کیاہے۔ ہوڈ کی نظم''سانگ'' کا ترجمہ ''بقائے محبت''،مسز ہمین کی نظم ''دی چائلڈس فسٹ گریف ''کا بچے کا پہلا احساس غم''اور سروالٹر اسکارٹ کی نظم ''لوآف کنٹری''کا حب وطن کے عنوان سے ترجمہ کیا،محروم نے انگریزی کا گہرا مطالعہ کیا انھوں نے اچھے اچھے ترجمے کیے مگر ان سے متاثر ہو کر طبع زاد نظمیں کم لکھیں۔انھوں نے طبع زاد نظموں میں پندونصائح کے دفتر کھولے دیگر شعرا سے اشتراک کے بارے میں پروفیسر حامدی کاشمیری لکھتے ہیں:

''ان کی نظموں میں دلکشی وہاں پیدا ہوتی ہے جہاں وہ سرور،برق اور اقبال کے تتبع میں منظری شاعری کے کچھ نمونے پیش کرتے ہیں۔ ''(٦٦)

محروم نے ایک انگریزی نظم کا ترجمہ''موت کا موسم'' کے عنوان سے کیا ،اس نظم کا نمونہ دیکھیے:

موسمِ خاص میں ہوتے ہیں شجر برگ فشاں
پھول مرجھاتے ہیں ، جب جب باغ میں آتی ہے خزاں
صبح ہونے پہ ہوتے ہیں ستارے پنہاں
لیکن اے موت! مقرر ہے ترا وقت کہاں

(٦٧)

مناظر فطرت کے موضوعات کا چناؤ محروم کے یہاں نہایت دلکش انداز میں ملتا ہے۔ عظمت اللہ خاں کی شاعری میں آزادؔ ،حالیؔ،شبلیؔ اور اقبال جیسا اصلاحی عنصر پایا جاتا ہے۔ عظمت پر مغربی ادبیات کا بھی بہت برا اثر ہوا مگر انھوں نے اسے زیادہ تر مشرقی بنا کر پیش کیا ہے۔قوم پرستی اور وطن پرستی کے جذبے نے ان کے مزاج میں ہیجانی کیفیت بیدار کر دی۔ ان کی شاعری میں رومانیت کا اہم سبب انگریزی شاعری کے تراجم بھی بنے۔

اقبال،چکبست،سرور جہاں آبادی،عظمت اللہ خاں اور دیگر رومانوی شعرا کے یہاں یہ اشتراک پایا جاتا ہے کہ ان سب نے ورڈزورتھ ،کولرج،کیٹس،بائرن،شیلے،بلیک اور والٹر سکاٹ کی نظموں کے تراجم کیے۔ اقبال نے ورڈزورتھ کی نظم'' The Nightingale and The Glow''کا ترجمہ ''بلبل اور جگنو'' کے نام سے کیا ہے جب کہ عظمت اللہ خاں نے'' To The Cuckoo''کو ''کوئل'' کا عنوان دیا ہے۔ ''we are seven''کو '' ہم سات ہیں'' کے نام سے لکھا ہے۔

ورڈزورتھ کی نظموں میں مناظرِ فطرت کی عکاسی بڑی عمدگی سے کی گئی ہے اس سے اثر قبول کر کے اردو شعرا نے مظاہر فطرت کو بیان کرنے کے لیے اردو میں ورڈزورتھ کے نظریات کو فروغ دیا ہے۔ عظمت کے رومانی خیالات میں سکون کا عنصر نمایاں ہے۔ انھوں نے لارڈ بائرن کی نظم''Isles of Greece''کا ترجمہ ''یونان کے جزیرے''کے نام سے کیا ہے۔ عظمت نے سکول کے زمانہ میں ہنٹ لی کی نظم''ابو بن ادھم ''کا ترجمہ کیا۔علاوہ ازیں انھوں نے رابرٹ براؤنگ کی نظم ''A pretty woman'' کا ترجمہ''چھیل چھبیلی'' اور شیکسپیئر کے سانیٹ ''To Die to sleep''کا ترجمہ''گر موت بن خواب کی نیند ہو'' شامل ہیں۔ حسن کی تلاش میں اختر ،ورڈزورتھ کے بہت قریب آجاتے ہیں۔ورڈزورتھ کی Solitary Reaperاور اختر کی'' جوگن'' میں یکسانیت اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔اختر کی نظم ''جوگن'' کا نمونہ دیکھیے:

یہ موہنی بنی ہے کس کی لگن
میں جوگن
یہ سیلِ درد کس کے غم میں بہا
رہی ہے
ہاں شاید اس کی ننھی معصوم
آتما میں

(٦٨)

فطرت کے جمال اور رومانی لگاؤ میں اختر انگریزی رومانی شعرا اور اردو شعرا سے متاثر نظر آتے ہیں۔کہیں وہ ورڈزورتھ کی طرح حسن کے متلاشی ہیں تو کہیں جوش کی طرح انقلابی اور کہیں حفیظ کی طرح غنائیت سے معمور دکھائی دیتے ہیں۔تخیل کے مختلف انداز اور ہیئتیں اختر شیرانی کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں۔ اختر شیرانی نے بھی پھول،پہاڑ،پرندوں اور وادیوں کی عکاسی کی ہے۔ ان کے یہاں مظاہر کائنات میں محبت کا جذبہ غالب ہے۔ انھوں نے ورڈزورتھ کی نظم''To the Cloud'' اور شیلے کی نظم '' The Cloud'' سے متاثر ہو کر نظم ''بادل'' میں بادل کا نظارہ اس طرح کیا ہے:

دھوم سی مچ گئی ،کس دھوم سے آئے بادل
ساری دنیا کی فضاؤں پہ ہیں چھائے بادل

(٦٩)

اختر کی فطرت پرستی میں محبت اور خلوص دکھائی دیتا ہے۔ان کی نظم ’’نغمۂ سحر‘‘ ورڈزورتھ کی نظم’’A Morning Exercise‘‘ سے گہری مماثلت رکھتی ہے۔ حفیظ جالندھری براہ راست انگریزی شعرا کا مطالعہ تو نہ رکھتے تھے لیکن ان کے عہد مین انگریزی شعرا کے اثرات اردو شاعری پر واضح موجود تھے۔ اس لیے وہ بھی انگریزی شعرا سے متاثر ہوئے۔ انگریزی شعراکا یہ تاثر انھوں نے اقبال سے لیا۔ وہ بھی انگریزی شعرا کی طرح فطرت پسند ہیں اور شہروں کی زندگی سے دور بھاگتے ہیں وہ دیہاتی زندگی سے بہت قریب ہیں، اس لیے وہ ذرا جذباتی انداز میں اسی منظر کی عکاسی کرتے ہیں۔حفیظ کی شاعری پر انگریزی شعرا کے اثرات کے بارے میں نگہت ناہید ظفر لکھتی ہیں:

’’حفیظ اگرچہ انگریزی رومانوی شعرا سے براہ راست تو واقف نہ تھے مگر حفیظ کے دور میں ان شعرا کے نمایاں رجحانات اردو شاعری میں واضح شکل اختیار کر چکے تھے۔یہی وجہ ہے کہ "نغمہ زار" میں ورڈز ورتھ کی طرح قدرت کی گوناگوں دل پذیر یاں اپنے اصلی رنگ میں جلوہ نما ہیں۔خاص طور پر تاروں بھری رات ہمیں ورڈزورتھ کی فطرت پرستی یاددلاتی ہے۔حفیظ کی شاعری میں دیہاتی زندگی کی منظر کشی بھی ورڈزورتھ کی "Rural Architecture" اور"Lucy Gray" کی طرح بڑی کشش رکھتی ہیں۔‘‘(٧٠)

افسر میرٹھی نے قدیم موضوعات اور رسمی تغزل کو یکسر رد کر کے نئے موضوعات اور اسالیب کو اپنایا۔ وہ انگریزی شاعری کا مطالعہ تو رکھتے تھے مگر ان پر زیادہ اثرات اپنے ہم عصر شعرا سے دکھائی دیتے ہیں اگرچہ انھیں ورڈزورتھ کی طرح دیہاتی زندگی کی عکاس کہا جاتا ہے۔ ان کی اس انداز کی نظموں’’بہار کے دن‘‘،’’چاند‘‘،’’ابرِبہار‘‘اور’’سکوتِ شام‘‘ قابل ذکر ہیں۔ان نظموں میں اقبال کی چاشنی، اختر کی شادابی اور کیف و مستی اور حفیظ کا سا ترنم پایا جاتا ہے۔ افسر کی نظم’’بہار کے دن‘‘ ورڈزورتھ کے خیالات ،اسلوب اور سادگی کی عمدہ مثال پیش کرتی ہے:

کیسی دلچسپ چاندنی ہے
چادر اک نور کی تنی ہے

(۴۱)

اقبال کی طرح چکبست نے بھی بچوں کے لیے نظمیں لکھیں''ہمارا وطن دل سے پیارا وطن'' اور''وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک'' بچوں کے لیے ہیں۔ان نظموں میں حسن فطرت کی عکاسی کی گئی ہے ،بچوں کی وطن سے محبت پیدا کرنے کے لیے فطری عناصر پھل،پھول، ساون کی کالی گھٹا،برسات کی ہلکی پھوار کا ذکر کیا ہے۔ محروم نے بھی ایک نظم"بہار طفلی"بچوں کے لیے لکھی۔چکبست نے فطرت اور وطنیت کا نیا تصور پیش کیا ،انھوں نے مثنوی کی ہیئت کے ساتھ دوسرے ہیئتی تجربے بھی کیے ہیں۔ ان کی شاعری حالی اور اقبال سے متاثر لگتی ہے۔ اس بارے میں عبدالقوی دسنوی لکھتے ہیں:

''چکبست حالی اور اقبال کی درمیانی کڑی تھے ان کی حب الوطنی، اصلاح پسندی اور درد مندیکو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔''(۴۲)

چکبست نےبھی "برسات" کو موضو ع سخن بنایا ہے۔ محروم نے بھی بچوں کے لیے لکھی اصلاحی نظموں میں برسات کو موضوع بنایا ہے۔ اس انداز کی دوسری نظموں میں''پھول''،''محنت'' اور''تندرستی ہزار نعمت ہے''اہم ہیں۔محروم نے بھی بچوں کے لیے نظمیں لکھی ہیں ان کی بچوں کے لیے لکھی گئی ایک نظم''بچوں کی موت پر'' دیکھیے:

آہ ہنستے کھیلتے خاموش ہو جاتے ہیں یہ
جس سے پھر اٹھتے نہیں وہ نیند سو جاتے ہیں یہ
اپنے بیگانوں کا دل رہتا ہے جن سے باغ باغ
دیکھیے ان کے جگر جن کو یہ دے جاتے ہیں داغ

(۴۳)

چکبست کے واحد شعری مجموعے'' صبح وطن'' میں دعائیہ لہجے کی حامل نظمیں موجود ہیں۔ان کی دعاؤں کا مرکز ومحور وطن اور وطن سے وابستہ تحریکیں اور معاملات ہیں۔ ان کی دعائیہ نظموں میں''وطن کا راگ''اور''آوازۂ قوم'' اہم ہیں۔حالی،آزاد،اسماعیل اور اقبال کی شاعری اور برصغیر کے سیاسی وسماجی حالات نے محرومؔ کے وطنی جذبے کو ابھارا۔محروم کی وطن کی محبت میں سرشار نظموں میں''سوز وطن''،''حال وطن ''اور''بھارت ماتا کیوں روتی ہے''اہم ہیں۔ نیاز فتح پوری ،محرومؔ کی وطن پرستی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ان (محروم)کی شاعری محض ماتم ملک وملت نہیں بلکہ
مکمل داستان ہے۔ ان کے درد مند احساسات اور خود ان کے
نفسیات وبطون کی جس سے انکار ممکن نہیں۔''(۷۴)

محرومؔ کی دعائیہ نظمیں سیاسی،انسانی ہمدردی،ایثار اور صداقت کے جذبے سے معمور ہیں۔ ''ہندوستانی نوجواں کی دعا''ان کی دعائیہ انداز کی ایک نظم ہے۔حفیظ کے اپنے رب کو پکارتے ہوئے اسلامی تاریخ نظم کرتے ہوئے''شاہنامہ اسلام'' میں دعائیہ انداز اختیار کیا ہے۔اختر شیرانی کے شعری مجموعے ''نغمۂ حرم'' کا آغاز بھی دعا سے ہوتا ہے۔اختر کی آخری دور کی نظموں میں بے مائیگی اور تہی دامنی کا احساس نمایاں ہے اور وہ اپنی بے عملی پر خدا کے سامنے دعا گو ہیں۔ عرصہ دراز کی بے عملی کا زنگ اتارنے کے لیے اختر نے دعائیہ انداز اختیار کیا ہے۔ کہیں کہیں انھوں نے رومانی انداز کی شاعری میں بھی دعائیہ انداز اختیار کیا ہے۔ان کی شاعری میں وطن عزیز کے لیے بھی دعائیں نکلتی ہیں ایک عزیزہ کی شادی پر سسرال جاتے ہوئے بھی دعا گو ہیں اور طبقہ نسواں کے لیے بھی دع کرتے ہیں۔''مدرسے کی لڑکیوں کی دعا''اختر کی نظم ہے۔

عظمت اللہ خاں نے نظم کو ہندی لہجہ اور آہنگ عطا کیا۔انھوں نے اردو شاعری میں ہندی کے لطیف الفاظ اور احساسات شامل کیے۔ ان کے یہانیہ شیرینی ،گھلاوٹ اور ترنم یکسر ہندی الفاظ کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ عظمت اللہ خاں کی نظمیں مقبول ہونے کے بعد حفیظ جالندھری ،ساغر نظامی اور افسر میرٹھی جیسے شعرا نے ان سے اثر قبول کیا۔ ان شعرا نے غنائی لہجہ عظمت اللہ خاں ہی سے مستعار لیا ہے۔ عظمت بڑی عمدگی سے جذبات نگاری کرتے تھے،ان کی جذبات نگاری ان کی نظموں''موہنی مورت''،''اندھرا دیس کی سندر پتری''،''وہ پھول ہوں جس کا کوئی پھل نہیں''اور''مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا''زیادہ اہم ہیں۔ انھوں نے اردو نظم اور گیت کے عروض وہیئت کی طرف توجہ دی۔عظمت کا شعری نمونہ دیکھیے:

مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ
ملا
مجھے عیش کا یاں کوئی پل نہ
ملا
مرے تایا کے پوت تھے تم ، سبھی ہم
مرے باپ نے عمر جو پائی تھی کم

(۷۵)

حفیظ جالندھری کا ہندی لہجہ اور پریت کا جذبہ ان کی نظم''پریت کا گیت'' میں ملاحظہ کیجیے:

اپنے من میں پریت
بسا لے
اپنے من میں پریت
من مندر میں پریت بسا لے
اور مورکھ او بھولے بھالے

(٤٦)

عظمت کا ایک اور ہندی انداز دیکھیے:

کامنی کویل تھی تو---حسن
رسیلا تھا
کوکتی کویل تھی تو ---شبد
سریلا تھا
اندھرا دیس کی سندر پتری کالی
کویل سی کالی
بال کھولے کالے گھنگھور گھٹا

(٤٤)

حفیظ نےاسی موضوع اور انداز کو نظم ''دل ہے پرائے بس میں ''میں اس طرح برتا ہے:

آم پہ کوئل کوک اٹھی ہے
سینے میں اک ہوک اٹھی ہے

(٤٨)

عظمت اللہ خاں نے ہندوستانی رسم ورواج اور مقامی پرندوں کو اپنی نظموں کا حصہ بنایا ہے۔ افسر میرٹھی نے ''نیم ''کے درخت کا ذکر کیا ہے۔ جب کہ عظمت نے ''پیپل'' کو موضوع بنایا ہے۔ پیپل کا درخت ہندوازم میں مقدس علامت ہے۔نیم کا پیڑ بھی برصغیر میں ہمیشہ سے قائم ودائم ہے۔عظمت اللہ خاں ہندوستانی تہذیب اور ماحول سے متاثر رہے، انھوں نے دھرتی کے اس تہذیبی سرمایے کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔عظمت کی شاعری کا ترنم حفیظ کی شاعری میں بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں اختر شیرانی بھی عظمت

سے متاثر نظر آتے ہیں۔عظمت نے''سریلے بول'' میں ایسے گیت لکھے جو فرسودہ ہندی تراکیب سے آزاد تھے۔ان کے گیت ہندی فضا سے ہم آہنگ ہیں ،ان میں عورت اور مرد کے معاشقے اور جذباتی بلکہ جسمانی پہلو واضح نظر آتے ہیں۔عظمت کے بعد اردوگیت نے عورت کے بجائے مرد کی زبان سے اظہار عشق کیا۔عظمت کے ایک گیت کا نمونہ دیکھیے:

ہائے وہ صورت پیاری پیاری
بڑی بڑی آنکھیں کالی
چکنے چکنے بال بھی کالے
ستھری ستھری میٹھی میٹھی

(۷۹)

عظمت کے گیتوں میں گھنگھور گھٹا، بانسری کی رسیلی آواز،گدرے جامن،آم کا جسم، کوئل کی آواز، ناگن کی سی آنکھیں، مہندی رنگے ہاتھ اور اس طرح کے دوسرے مظاہر ملتے ہیں جو خاص ہندی فضا کی عکاسی کرتے ہیں۔حفیظ کے گیتوں اور گیت نما نظموں کا مطالعہ کریں تو کئی اعتبار سے عظمت اللہ خاں اور اختر شیرانی سے اشتراک رکھتے ہیں۔گیت کو اردو کےمزاج کے قریب لانے کا آغاز عظمت اللہ خاں نے کیا مگر اس کو فروغ اختر شیرانی اور حفیظ جالندھری نے دیا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر وزیرآغا رقم طراز ہیں:

''گیت کو اردو کے مزاج کے قریب تر کرنے کی روش کا آغاز تو عظمت اللہ خان سے ہوا لیکن اسے فروغ اختر شیرانی اور حفیظ جالندھری نے فنی بالیدگی کا ثبوت دیا اور فارسی الفاظ کی آمیزش کے باوصف اسے نرم ونازک ہندوستانی فضا کو قائم رکھا جو گیت کی بقا کے لیے بے حد ضروری تھی۔''(۸۰)

حفیظ جالندھری کے یہاں عظمت اور اختر کے گیتوں سے زیادہ موضوعاتی تنوع ملتا ہے۔ حفیظ کے یہاں محبوب خالق حقیقی کی علامت ہے۔ حفیظ کچھ گیتوں میں عظمت اللہ خان کے بڑے قریب نظر آتے ہیں ایک گیت''سپنا'' اس کی عمدہ مثال ہے:

ہستی کیا ہے میٹھا سپنا
سپنا کیا ہے میٹھی پریت
میٹھی پریت ہے میرا گیت
میرے میٹھے گیتوں میں بستی
ہے ساری بستی

(۸۱)

حفیظ جالندھری گیت نگاری میں عظمت اللہ خاں اور اختر شیرانی جیسے ہیں انھوں نے اپنے گیتوں کا زماج ہی خالص ہندوستانی رکھا مگران کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے فارسی عربی آمیز زبان میں بھی گیت نگاری کی اگرچہ یہ زبان گیت کے مزاج کے لیے مناسب نہیں،ان کے فارسی عربی آمیز گیت کی سب سے بڑی مثال ان کا لکھا ہوا ا،پاکستان کا قومی ترانہ ہے۔اختر شیرانی کے گیت موسیقی کی کئی ہیئتوں کے پابند ہیں۔اختر کی کئی نظموں میں ہندی الفاظ اس قدر استعمال ہوئے ہیں کہ ان پر گیت کا گمان گزرتا ہے۔ اس حوالے سے ان کی نظم ''جوگن'' دیکھیے:

یہ موہنی بنی ہے کس کی لگن
میں جوگن

(۸۲)

عظمت اللہ خاں اور اختر شیرانی میں گہری مماثلت پائی جاتی ہے ،دونوں شعرا نے اپنی اپنی نظموں میں ہندی الفاظ کا بہت زیادہ استعمال کیا ہے اور نظموں میں غنائیت پیدا کر کے گیتوں کے قریب کر دیا ہے۔ اختر اپنے گیتوں میں زیادہ تر نسوانی جذبات کو پیش کیا ہے۔ اختر شیرانی نے اپنی نظموں''جوگن''اور''اے عشق کہیں لے چل''میں عظمت اللہ خاں کی طرح ہندی الفاظ استعمال کیے ہیں۔

جوش ملیح آبادی کی اہم رومانوی نظموں میں''کون اٹھا ہے شرماتا''،''کوہستان دکن کی عورت''،''گنگا کے گھاٹ پر''،''جنگل کی شہزادی''،''جوانی کی رات''اور''آج کی رات'' شامل ہیں۔نظم''کوہستان دکن کی عورت''میں انھوں نے مزدور عورتوں کے جواں جسموں کا حسن بیان کیا ہے۔جوش نے اس نظم کا انداز رومانوی رکھا ہے مگر بات غریب اور مزدور طبقے کی ہے۔ہمارے جاگیردار اور سرمایہ دار مزدور کا استحصال کرتے ہیں۔ جوش نے اس بات کی خوب مذمت کی ہے اور اس طرف اشارہ بھی کیا ہے کہ عورتوں سے سخت کوش کام نہ لیا جائے۔اقبال اور جوش میں متعدد موضوعاتی اشتراکات ملتے ہیں۔ مثلاً اقبال نے ایک نظم''کنارِ راوی''لکھی ہے تو جوش نے اسی طرح کی نظمیں''گنگا کے گھاٹ پر'' اور''جمنا کے کنارے''لکھی ہیں۔دونوں نے اپنے وطن سے والہانہ محبت کا اظہار کیا ہے اقبال اگر سچے محب وطن ہیں ان کے دل میں ملک وقوم کا جذبہ بھرا ہوا ہے تو جوش بھی وطن کے عشق میں مست نظر آتے ہیں۔اقبال اور جوش کی اس طرح کی نظموں میں ہیئتی اشتراک بھی ملتا ہے۔

حفیظ کی شاعری میں اقبال اور جوش کی طرح فطرت کے حسن کی منظر نگاری ملتی ہے انھوں نے اقبال اور جوش کی طرح مشہور دریاؤں پر نظمیں لکھی ہیں ان کی نظم ''چناب'' بڑی اہم ہے۔حفیظ نے ''ہمالیہ''اور ''لاہور'' کو بھی موضوع بنایا ہے۔اقبال نے بھی ''لاہوروکراچی'' کے نام سے ایک نظم لکھی ہے۔اقبال ''ترانۂ ہندی''اور ''ترانۂ ملی'' لکھ کر

وطن اور ملت کی محبت کا جذبہ ابھارتے ہیں جب کہ جوش ’’ترانۂ بہار‘‘ لکھ کر نیچر سے محبت اور وابستگی کا اظہار کرتے ہیں۔جوش عشق کو عبادت تصور کرتے ہیں ،انھوں نے عشق وعاشقی کے موضوع پر متعدد نظمیں لکھی ہیں ۔ان کی عشقیہ نظموں میں شادمانی کی کیفیت بدرجہ اتم موجود ہے۔وہ عشق کے ذریعے زندگی کی کامیابیاں سمیٹنا چاہتے ہیں۔ ان کی رومانوی نظموں’’حسن اور مزدوری‘‘،’’جامن والیاں‘‘،’’ مالن‘‘،’’نغمہ سرا‘‘،’’سیر گردوں‘‘،’’برسات کی پہلی گھٹا‘‘،’’بدلی کا چاند‘‘،’’البیلی صبح‘‘،’’بہار آنے لگی‘‘،’’برسات کی شفق‘‘،’’منھ اندھیرے‘‘،’’شام کی بزم آرائیاں‘‘ اور ’’برسات کا پچھلا پہر‘‘ شامل ہیں۔جوش نے ان نظموں میں اپنے فکری رجحانات،رومانوی ،انقلابی ،سرمایہ داری اور آزادی کے تصورات علامت کی صورت میں پیش کیے ہیں۔جوش کی شاعری میں فطری مناظر کی پرکیف فضا ملتی ہے ،ان کی شاعری بولتی ،گاتی،جذبات کو ابھارتی اور خیالات کو جنم دیتی ہے۔ڈاکٹر ہلال نقوی جوش کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ’’جوش مشاہدۂ فطرت میں روحانی قدروں کے دروازے سے داخل ہوں یا زندگی کی مادی ضرورتوں کا احساس رکھتے ہوئے آگے بڑھیں ،وہ کہیں بھی مناظر فطرت اور دست قدرت کی نقاشی ونقش گری کو پس پشت نہیں ڈالتے۔‘‘(۸۳)

حفیظ کی نظموں ’’زندگی‘‘ اور ’’آزادی‘‘ میں اقبال کا اثر ملتا ہے۔ حفیظ کی یہ مثنوی جس بحر میں ہے اس بحر میں اقبال کی نظمیں ’’تصویردرد‘‘،’’محبت‘‘،’’خطاب بہ نوجوانانِ اسلام‘‘اور’’طلوع اسلام‘‘بھی لکھی گئی ہیں۔حفیظ کے دل میں ٹیگور اور اقبال کے لیے خاص جگہ تھی ۔حفیظ کی رومانیت مناظر فطرت، تاریخی احساسات ،قومی جذبات اور جذبۂ عشق کی حامل ہے۔حفیظ کو مناظر قدرت سے سچی محبت ہے،ان کی نظموں میں لطافت ونزاکت رقص کرتی ہوئی ملتی ہے۔ ایسی نظموں میں ’’جلوہ سحر‘‘،تاروں بھری رات،تصویرکشمیر، برسات، راوی میں کشتی،شام رنگین ،‘‘صبح وشام کہسار’’اور‘‘بنجارہ پربت‘‘ اہم ہیں۔حفیظ کی نظم’’ شام رنگیں‘‘ منظریہ جزئیات کے ساتھ ساتھ جمالیاتی طرز احسا س سے معمور ہے۔ اس نظم میں ان کی منظر نگاری اور لفظی پیکر تراشی اپنے کمال تک پہنچی ہوئی ہے:

پچھم کے در پہ سورج بستر
جما رہا ہے
رنگین بادلے میں چہرہ چھپا رہا
ہے
کرنوں نے رنگ ڈالا بادل کی
دھاریوں کو
پھیلا دیا فلک پر گھوٹے
کناریوں کو
اوڑھے سیہ دوپٹے سرسبز

وادیوں نے
زیور اتار ڈالے گلزار زادیوں
نے

(۸۴)

حفیظ نے اقبال اور جوش کی طرح پابندنظموں میں کلاسیکی ہیئتوں یعنی، قطعہ،مثنوی، مسدس،مخمس اور مسمط وغیرہ میں لکھا ،انھوں نے ایک آدھ نظم آزاد ہیئت میں بھی لکھی ہے۔حفیظ جالندھری کے رومانوی مضامین میں ان کے گردوپیش کا حسن شامل ہے۔ ان کی نظموں میں فطرت کا جمال ایک نغمہ بن جاتا ہے۔ حفیظ کے رومانی طرز احساس کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید رقم طراز ہیں:

''حفیظ کی رومانیت کا عمدہ ترین اظہار ان کی غنائیت میں ہوا ہے۔ انھوں نے بحروں کے انتخاب اور الفاظ کی ترتیب سے آہنگ نغمہ پیدا کیا اور منظر کی رقصندہ کیفیت کو بھی نظم کی بنت میں شامل کر دیا۔حفیظ نے جس خوب صورتی سے ہندوستان کے رسم ورواج میلوں ٹھیلوں اور مناظرِ فطرت سے والہانہ وابستگی کا مظاہرہ کیا ہے۔''(۸۵)

حفیظ اور دوسرے رومانوی شعرا میں جو بات مشترکہ طور پر پائی جاتی ہے ،ان میں دیہات اور شہر کا ماحول،ہندوستانی فضا،روزمرہ کی زندگی ،موسم، صبح وشامکی رنگینیاں،برسات،برکھا رت،بسنت بہار،ساون،بھادوں،وغیرہ ہر شاعر کا موضوع بنا رہا۔حفیظ کی نظموں میں چھوٹی اور مترنم بحروں میں رس گھولنے والے اور سیدھے سادے آسان فہم الفاظ ملتے ہیں۔اس حوالے سے ان کی نظمیں ''رقاصہ'' اور ''جاگ سوز عشق'' اہم ہیں۔جوش نے قصائد اور سلام بھی لکھے ہیں جب کہ حفیظ کا سلام''شہسوار کربلا''بھی وہی طرز احساس رکھتا ہے جو جوش کا اسلوب ہے۔ حفیظ کا جذبہ حب الوطنی ان کی نظم''اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے''میں دیکھیے:

اپنے وطن میں سب کچھ ہے
پیارے
رشکِ عدن ہے
باغِ وطن ہے
گل بھی ہیں موجود
گل پیرہن بھی

(۸۶)

حفیظ جب یورپ گئے تو انھوں نے مغربی تہذیب کو بہت قریب سے دیکھا تو ان کو اپنا وطن یاد آیا۔ برصغیر پاک وہند ساری دنیا سے خوب صورت ہے اور یہاں ہر طرح کے خزانے پائے جاتے ہیں۔انھوں نے مغربی رہن سہن کے بارے میں جو محسوس کیا وہ اپنی نظم"نیرنگ فرنگ" میں رقم کر دیا۔ یہ نظم مغربی تہذیب وتمدن کی مکمل عکاس ہے۔حفیظ مغربی تہذیب پر کڑی تنقید کرتے ہیں اور اسے سخت ناپسند کیا ہے۔ اقبال نے بھی اپنی نظموں میں فرنگی نظام کا خوب ذکر کیا ہے اور اسے برا محسوس کیا ہے۔اس طرح حفیظ اقبال سے نظریاتی حوالے سے قریب ہیں۔''تصویر کشمیر'' ایک طویل نظم ہے،یہ مسدس کی ہیئت میں لکھی گئی ہے ۔حفیظ ،اقبال سے اس قدر متاثر تھے کہ انھوں نے اقبال کی طرح مخمس،مسدس اور مثنوی کی ہیئت میں زیادہ لکھا ہے۔انھوں نے اقبال کی طرح طویل نظمیں بھی لکھی ہیں۔ حفیظ نے اشتراکی نظریات کی بھی حمایت کی ہے انھوں نے اپنے شعری مجموعے''تلخابۂ شیریں'' میں''شیروں کی آزادی'' کے عنوان سے ایک نظم لکھی جس میں انھوں نے آواز اٹھائی کہ آزادی کا یہ مطلب نہیں کہ شیر چیتے ،بھیڑوں اور بکریوں کو بدستور چیرتے پھاڑتے رہیں گے۔ سرمایہ دار اور اہل جاگیر اپنے زیردستوں اور مزدوروں کا خون چوستے رہیں گے۔ حفیظ کی انقلابی شاعری کے بارے میں پروفیسر محمد منور رقم طراز ہیں:

> ''حفیظ نے اہل قلم کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر ملک میں رواج پذیر بے انصافی ،غربت ،عدم مساوات،بے دینی اور بے اصولی کی طرف متوجہ کیا گیا کہ وہ اس پریشان کن صورتِ حال کی اصلاح کی جانب متوجہ ہوں اور متوجہ کریں۔''(۸۷)

حفیظ نے اپنی نظموں''جوانوں کا اقبال'' اور''جس کی یہ تصویر ہے''میں سیدھی راہ سے ہٹنے کی طرف اشارہ کیا ہے۔اختر شیرانی اپنے دیس سے محبت کرتے ہیں ،وہ اپنے دیس کی فضاؤں کی منظر کشی کرتے ہیں اور اس کے مقامات اور مکینوں کو یاد کرتے ہوئے ان سلماؤں اور ریحاناؤں کی بات بھی کرتے ہیں جو ان کے دیس میں رہتی تھیں۔ وہ دیس کی منظر کشی کرتے ہوئے دوسروں کو بھی لطف اندوز کرتے ہیں اختر کی نظم ''اودیس سے آنے والے بتا ''ملاحظہ کیجیے:

او دیس سے آنے والے بتا
او دیس سے آنے والے بتا کس حال میں ہیں یارانِ وطن
آوارہ غربت کو بھی سنا کس رنگ میں ہیں کنعانِ وطن
وہ باغِ وطن ،فردوسِ وطن، وہ سروِ وطن ،ریحانِ وطن

(۸۸)

اختر شیرانی نے جس طرح جان دار اور مرئی اجسام کی تصویر کشی کی ہے اسی طرح موہوم اور غیر مرئی اشیا کو بھی مجسم کر کے دکھایا ہے۔ختر شیرانی اپنے دیس کی فضاؤں کو یاد کرتے ہوئے اپنی ایک خوب صورت نظم''جہاں ریحانہ رہتی تھی'' میں رومان انگیز منظر کھینچتے ہیں۔افسر میرٹھی کی شاعری میں درج بالا خوبیوں کو اگر دیکھا جائے تو وہ اختر شیرانی سے خاصے اشتراکات رکھتے ہیں۔ انھوں نے زندگی کو راحت اور مسرت سے معمور بتایا ہے۔ ان کے یہاں روحانیت ایک نظریے کی صورت اختیار کر لیتی ہے ۔ان کے یہاں جذبہ حب الوطنی کا وہی انداز ہے جو اقبال ،جوش ،حفیظ اور اختر کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔یہ بھی دیگر رومانی شعرا کی طرح اپنے وطن سے شدید لگاؤ رکھتے ہیں،اس ضمن میں نظم ''سارے جہاں پر ہے سکّہ مرے وطن کا''دیکھیے:

پھولوں سے بھی سوا ہے کانٹا
مرے وطن کا
ہے آفتاب مجھ کو ذرہ مرے
وطن کا
دل میں جما ہوا ہے نقشا مرے
وطن کا

(۸۹)

اختر شیرانی نے اپنی نظمونمیں ہندوستان کی تہذیب کو الفاظ کا پیکر عطا کیا ہے، ہندوستان کے دریاؤں ،پہاڑوں،آبشاروں،گلزاروں اور موسموں کی بات کرتے ہوئے پنگھٹ پر پانی بھرتی ہوئی پنہاریوں کو بھی یادرکھتے ہیں اور ایک نقشہ کھینچتے ہوئے انھیں گاگر اور گھونگھٹ بھی اٹھائے ہوئے دکھاتے ہیں۔اختر ان رومانی شعرا میں سے ہیں جنھیں زندگی اور کائنات سے بے حد لگاؤ ہے۔ ان کی نظم "نغمۂ زندگی" میں زندگی کے بارے میں اشعار ملتے ہیں۔اختر کے نزدیک حسن اور معصومیت ہم معنی ہیں ،حسن کو ہوس بنانا وہ ہرگز پسند نہیں کرتے۔ان کی شاعری میں پری زادے،حوریں،فرشتے اور بچے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ سب معصومیت اور حسن کی علامت ہیں ۔وہ اپنے بچپن کو بڑا یاد کرتے ہیں اس لیے عہد طفلی ان کا بڑا دلآویز لگتا ہے۔ اس حوالے سے ان کی نظم''ارواح معصوم''بڑی اہم ہے۔ انگریزی رومانی شعرا ورڈزورتھ ،کولرج اور بلیک نے بھی اپنے بچپن کے ایام کو بہت یاد کیا ہے۔ اردو کے پہلے رومانی علم بردار اقبال بھی عہد طفلی کو اپنی شاعری کا موضوع بناچکے ہیں۔اختر کو اس مادی دنیا سے بوئے وفا نہیں آتی اس لیے خیای دنیا میں آباد رہتے ہیں۔اس بارے میں ڈاکٹر یونس حسنی لکھتے ہیں:

''اختر اپنے ذہن میں دنیا کے ایک ایسے رومانی تصور کی پرورش کی تھی کہ سنگ وخشت کی مادی اور حقیقی دنیا ان کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ عشقیہ زندگی میں جب وہ تلخ حقائق

سے دوچار ہوتے ہیں تو ان کے رومانی تصور کائنات کا طلسم
ٹوٹ جاتا ہے۔''(۹۰)

اختر کی رومانی معصومیت کا انداز اور جذبہ بڑا طفلانہ ہے ،وہ ایک الگ جہان کی بات کرتے ہیں نظم ''مجھے لے چل''اس کی عمدہ مثال ہے۔

جہاں رنگیں بہشتیں کھیلتی ہیں سبزہ زاروں میں
جہاں حوروں کی زلفیں جھومتی ہیں شاخساروں
میں
جہاں پریوں کے نغمے گونجتے ہیں کوہساروں
میں
جوانی کی بہاریں تیرتی ہیں آبشاروں میں
مری سلمیٰ مجھے لے چل تو ان رنگیں بہاروں
میں

(۹۱)

خوابوں کے جزیروں میں بسے اس شاعر اختر شیرانی کی شاعری میں انقلاب پسندی اور ماضی پرستی کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ وہ سماجی مسائل اور ناہمواریوں کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ اختر نے قومی،اخلاقی،اصلاحی ،مذہبی، سیاسی ،سماجی اور دیگر مسائل پر حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر اختیار کیا ہے۔نوجوانوں کو اپنے ماضی سے توانائی حاصل کر کے بہتر مستقبل کے لیے کمر بستہ ہونا چاہیئے ۔اختر کا ''اسلام کا شکوہ''اقبال کے ''شکوہ'' اور''جوابِ شکوہ'' کی یاددلاتا ہے۔ اقبال کے اس شکوہ نے شاید اختر کو شکوہ لکھنے کے لیے اکسایا ہو۔اختر نے بھی مسلمانوں کو ان کے شان دار ماضی کا احساس دلایا ہے۔حفیظ جالندھری کی طرح اختر جب بچوں کے لیے نظمیں لکھتے ہیں تو بچوں کی ذہنی سطح ،نفسیات اور ذوق ومذاق کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ ان کی نظمیں'' شریر لڑکا'' اور'' قانون کی عزت'' بڑی اہم ہیں۔اختر کی شاعری میں ولولہ انگیز ترنم پھیلا ہوا ہے انھوں نے غنائی لہجہ سے غیر معمولی دلچسپی کی وجہ سے ہیئتی تجربات کیے لیکن آزاد اور غیر مقفیٰ نظمیں تخلیق نہ کیں۔ کیوں کہ قافیہ اور ردیف کے بغیر کلام میں موسیقیت پیدا نہیں ہوتی۔

اختر شیرانی کے یہاں ہیئت کا استعمال مختلف انداز کا ہے ۔انھوں نے کچھ نئی ہیئتیں بھی ایجاد کی ہیں، ان کے کلام میں نظم(مسمط) اور اس کی تمام شکلیں ترکیب بند اور ترجیح بند ،غزل ،رباعی،قطعہ ،فردیات،گیت،سانیٹ اور ماہیے شامل ہیں۔ اس طرح کی ہیئتیں ہمیں اقبال ،جوش اور حفیظ جالندھری کے یہاں بھی ملتی ہیں لیکن حفیظ اور اختر نے گیت نگاری کی ہے جب اقبال اور جوش کے یہاں ہمیں گیت نگاری نہیں ملتی۔اختر کی زیادہ نظمیں غزل مسلسل کی ہیئت میں ہیں۔اقبال کی متعدد نظمیں غزل مسلسل کی ہیئت میں نظر آتی ہیں۔ انھوں

نے نظم کی مروجہ ہیئت مثنوی میں بھی کم نظمیں نہیں لکھیں۔ اقبال، جوش اور حفیظ کے یہاں بھی مثنوی کی ہیئت استعمال ہوئی ہے۔احسان دانش اقبال سے ہیئتی اشتراک رکھتے ہیں ان کی متعدد نظمیں غزل کی ہیئت میں ہیں۔اس کی مثال نظم’’انتظار وصال‘‘ دیکھیے:

جسم کی الجھن سے باہر جانِ زار آنے کو ہے
بے قراررری راستہ دے دے، قرار آنے کو ہے

(۹۲)

ساغر نظامی کی نظموں میں بھی وہی موضوعات اور ہیئتیں ملتی ہیں جو دوسرے رومانی شعرا کے یہاں پائے جاتے ہیں۔ان کے یہاں بھی آزادی وطن کا وہی تصور ملتا ہے جو اقبال،جوش اور حفیظ کے یہاں ملتا ہے۔ انھیں اپنے وطن کی فضاؤں میں آزدانہ سانس لینا پسند تھا ،وہ غلامانہ زندگی سے سخت بیزار تھے ،وہ اپنی نظم’’ساقی نامہ اقوام‘‘میں قوم کی آزادی کی بات اس طرح کرتے ہیں:

گلسن ہندوستان آزاد ہو
جنت برباد پھر آباد ہو
ہو مرتب اک نیا قانون گل
اک نئی رسم چمن ایجاد ہو

(۹۳)

ساغر نظامی نے آزادی اور جمہوریت کے لیے متعدد نظمیں لکھی ہیں ان میں بعض نظمیں طویل ہیں ،ان میں جذبۂ حریت بڑی چابک دستی کے ساتھ ملتا ہے۔ آزادی کا جذبہ ان کی شاعری سے پھوٹ رہا ہے:

وہ آزادی جو انسانوں کی
عظمت کو بڑھاتی ہے
وہ آزادی غلامی جس کے آگے
تھرتھراتی ہے

(۹۴)

"آزادی" ساغر نظامی کی ایک طویل نظم ہے جس میں انھوں نے آزادی کا ولولہ قوم کو دیا ہے۔ انسان آزاد پیدا ہوتا ہے اس کو آزاد رہنا چاہیئے پرندے جس طرح چمن میں آزادانہ اڑتے ہیں ہم بھی اس وطن میں آزادانہ زندگی بسر کریں۔انھوں نے اپنی نظم"طفلک آزاد" میں بھی آزادی کا نغمہ گنگنایا ہے۔انھوں نے شاعری میں نرم زبان اور دلفریبی پیدا کی ہے۔ ان کے

کلام میں ہندی الفاظ اور بے ساختہ پن ہے،ان کی شاعری شباب سے سرشار ہے۔ ان کا تمام طرز عمل رنگینیوں میں ڈوبا ہوا ہے۔ انھوں نے مناظر قدرت کے جلوے اور نغمہ وسرود کی سحر آفرینیاں بکھیری ہیں ساغر نظامی کی شاعری کے بارے میں ڈاکٹر اے وحید رقم طراز ہیں:

''ساغر صاحب نے جدید اردو شاعری میں زبان کی نرم اور دلفریب شیرینی پیدا کی ۔جس میں ہندی الفاظ بے ساختگی کے ساتھ بغیر کسی تصنع کے فارسی منظومات کی مشکل تر مقررہ بندشوں میں گھل مل جاتے ہیں۔ ''(۹۵)

ساغر نظامی کی نظموں میں فطرت کی عکاسی، حب وطن ،حب قوم اور یاد ماضی جیسے موضوعات ملتے ہیں،ان کی نظم"پجارن" مثنوی کی ہیئت میں لکھی گئی ہے۔انھوں نے حیات وسماج کے مسائل کو بھی اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے سیاسی،سماجی اور وطنی نظمیں کہیں ،ان کی نظموں میں حسن وعشق کا رنگ نمایاں ہے۔ ان کی نظم''ہندوستان'' جذبۂ حب الوطنی سے لبریز ہے۔انھوں نے ہندوستان کے دریاؤں ،پہاڑوں اور دوسرے مقامات کا ذکر کیا ہے۔ساغر نے غلامی کے زمانے میں کانگریس کے اسٹیج پر کھڑے ہو کر نظمیں پڑھیں اور عوام میں آزادی کا جذبہ ابھارا۔ انھوں نے اقبال اور جوش کی طرح قوم کو بیداری کا پیغام دیا۔ ۔سرور جہاں آبادی ،چکبست اور دیگر شعرا کی طرح ان کی شاعری میں بانسری، جمنا کی لہر،ہولی،دیوالی کی خوشیاں اور رنگ سب دکھائی دیتے ہیں۔ساغر کی نظموں میں ایک مخصوص سرشاری اور ترنم کی کیفیت ملتی ہے۔عظمت اللہ خاں ،حفیظ جالندھری اور اختر شیرانی کی طرح انھوں نے گیت نما نظمیں لکھی ہیں اور ہندی الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ا س حوالے سے ان کی نظم''پریم جھرنا'' اہمیت کی حامل ہے۔ساغر نظامی اور عظمت اللہ خان میں کافی مماثلت پائی جاتی ہے ،نظم''پنگھٹ کی رانی ''دیکھیے:

آئی وہ پنگھٹ کی دیوی وہ
پنگھٹ کی رانی
دنیا ہے متوالی جس کی اور
فطرت دیوانی
ماتھے پر سیندور ٹیکا رنگیں
اور نورانی
سورج ہے آکاش میں جس کی
ضد میں پانی پانی

(۹٦)

ساغر نظامی کی نظمیں نرگسیت کا شکار نظر آتی ہیں۔ ان کی شاعری میں رومانیت کی وہ تما م کرنیں موجود ہیں ۔ساغر نظامی ایک محب وطن اور وطن پرست شاعر تھے انھوں نے وطنی اور قومی نظموں میں عمدہ فطرت نگاری کی ہے۔ انھوں نے حسن فطرت کی کیفیات کو محسوس کیا اور''تتلی کی آرزو''،بادہ کا نغمہ،نہر نے مجھ سے پوچھا،جب بادل مجھ سے نیچےاور''شفق کی پیش گوئی''جیسی فطری اور منظری نظمیں لکھی ہیں۔ ساغر نظامی نے جوش اور حفیظ کی پیروی کی ہے اس بارے میں ڈاکٹر ناہید قاسمی رقم طراز ہیں:

''وہ(ساغر) جوش اور حفیظ کی پیروی کرتے ہوئے رومانیت اور وطن پرستی کو اپناتے ہیں ان کی شاعری میں ترنم ہے۔وہ موسیقیت سے لبریز الفاظ کا انتخاب کرنے میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔''(۹۷)

احسان دانش نے بھی دیگر شعرا کی مناظر فطرت کا ذکر کیا ہے،انھوں نے فطرت کے دل کش مناظر کی تصویر کشی کی ہے۔وہ''ڈل جھیل''میں یوں فطرت نگاری کرتے ہیں:

وادی کشمیر اور پھر ڈل پہ یہ ہنگام شام
کشورِ تنویر میں ہے ظلمتوں کا اہتمام
چھن رہا ہے آنچلوں سے ابر کے ریگ سیاہ

(۹۸)

اثر صہبائی کی شاعری اقبال کی شخصیت اور کلام سے فیض یاب دکھائی دیتی ہے۔ انھوں نے فکروتدبر کو اپنی نظموں میں متنوع رنگوں سے ہم آمیز کیا۔انھوں نے تحریک پاکستان میں بھی بھر پور حصہ لیا اور اقبال وجوش کے بعد قوم کو اپنی شاعری کے ذریعے بیدار کیا۔ ان کی نظموں میں آزادی کی تڑپ واضح ملتی ہے۔ انھوں نے وطنی جذبے،مذہبی اور ملی اقدار کو موضوع بنایا۔ انھوں نے مناظر فطرت کی عکاسی بھی اپنی نظموں میں کی ہے۔ انھیں وطن کے موسموں،دریاؤں،پہاڑوں،درختوں اور کھیت کھلیانوں سے بے حد لگاؤ تھا۔ انھوں نے وطن کی تہذیب ومعاشرت کی سچی عکاسی کی ہے۔روش صدیقی نے بھی اپنی نظموں میں رومانی انداز اپنایا ایک مثال دیکھیے:

کس نے جھانکا ہے شفق رنگ جھروکے سے مجھے
صبح کے چاک گریباں کو خبر ہو شاید
زندگی فرش قدم بن کے بچھی جاتی ہے
آگہی حسرت دیدار ہوئی جاتی ہے

(۹۹)

روش صدیقی کی نظمیں آزادی اور جمہوریت کے جوش وولولہ سے معمور ہیں۔ان کی شاعری قوم کے دل میں حب وطن اور آزادی وجمہوریت کی حرارت پیدا کرتی ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے خارجی مناظر کی تصویر کشی بھی کی ہے۔ انھیں بھی مظاہر فطرت سے بڑی دلچسپی تھی اور وادئ کشمیر سے خاص لگاؤ تھا۔ اس حوالے سے ان کی نظمیں''اعتراف''اور''اے حسین وادی مجھے تجھ سے محبت ہے'' اہم ہیں۔اختر انصاری کی نظمیں رومانیت اور ترقی پسندی کا حسین امتزاج ہیں۔ ان کی نظموں میں غم دل اور غم کائنات دونوں طرح کے مضامین ملتے ہیں۔ وہ زیادہ تر داخلی کیفیات کے شاعر ہیں۔ ان کی داخلیت سلگتی ہوئی چنگاری کی طرح ہے ۔ان کی شاعری احساس وجذبات سے لبریز ہے۔اختر انصاری کی شاعری میں مناظر فطرت اور مظاہر قدرت جلوہ گر ہے۔ وہ جذبات میں بہہ جاتے ہیں اور تناسب قائم نہیں رکھتے ان کی نظم''شام'' میں یہ کیفیت بہت زیادہ ہے۔ وہ خزاں کا ذکر کرتے ہوئے رخصت بہار کا سوگ مناتے ہیں۔ اختر انصاری کی اس نوع کی دوسری اہم نظموں میں ''ہلال عید''،''غم محبت'' اور''امنگ''شامل ہیں۔موسم بہار کے مناظر انھیں بھولے ہوئے دنوں کو یاد کر کے مغموم کر دیتے ہیں اور بسا اوقات وہ انھیں یاد کر کے مسرت بھی حاصل کرتے ہیں۔

جدید اردو نظم جب عصر اصلاح سے عصر مخزن میں داخل ہوئی تو اس میں رومانیت کا آغاز ہو گیا،اس دور میں فطرت نگاری کو عروج حاصل ہوا،ا س دور کی شاعری پر انجمنِ پنجاب کے اثرات بھی مرتب ہوئے۔ رومانوی تحریک سے وابستہ شعرا کے کلام میں موضوعاتی وہیئتی اشتراکات و انسلاکات نمایاں نظر آتے ہیں۔ ایک عہد اور ایک سماج سے تعلق ہونے کی بنا پر تمام شعرا میں یکسانیت اور تکرار کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ شعرا کے یکساں رویوں کا ادراک بھی ان کی نظموں سے لگایا جا سکتا ہے۔ رومانوی دور کے شعرا نےاولین دور کے شعرا سے بھی اثرات قبول کیے اور انگریزی شعرا کی تقلید میں بھی نظمیں لکھیں۔ اس دور کے شعراکی نظمونمیں زیادہ تر فطرت ،حب وطن،سیاسی وسماجی شعور،ماضی پرستی،قوم پرستی اور حسن وعشق کے جیسے موضوعات میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ہیئتی اعتبار سے اس تحریک سے وابستہ شعرا نے پابند،معرا اور قطعات میں اپنی تخلیقات پیش کی ہیں۔ انھوں نے مثنوی،مسدس،مخمس،مثلث ،ترجیح بند،ترکیب بند اور دیگر سانچوں میں اپنی نظموں کو ڈھالا ہے۔اقبال سے لے کر اختر انصاری تک رومانوی تحریک سے وابستہ شعرا میں ہر دو اعتبار سے گہری مماثلت اور اشتراکا ت پائے جاتے ہیں۔

استخراجِ نتائج/موضوعاتی اشتراکات

رومانوی دور کے نمایندہ شعرا علامہ اقبال، نادر کاکوروی، سرور جہاں آبادی، برج نرائن چکبست، تلوک چند محروم ، عظمت اللہ خاں، جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، اختر شیرانی، افسر میرٹھی، احسان دانش، ساغرنظامی، اثر صہبائی، روش صدیقی اور اختر انصاری کی نظموں میں موضوعاتی اشتراکات پائے جاتے ہیں۔ان شعرا نے فطرت، حبِ وطن، سیاسی وسماجی مسائل، ماضی، قوم اور حسن وعشق کو ایک یکسانیت کے ساتھ موضوع بنایا

ہے۔ ہیئتی حوالے سے ان شعرا نے پابند، معرا ،آزاد اور قطعات وغیرہ میں نظم نگاری کی ہے۔انھوں نے مثنوی ،مسدس، مخمس، مثلث، غزل مسلسل، ترجیح بند، ترکیب بند، قطعات اور دیگر اصناف میں نظم نگاری کی ہے۔ ان شعرا نے آزاد، حالی اور اسماعیل سے بھی اثرات قبول کیے ہیں۔ اقبال اور ان کے قافلے کے دوسرے شعرا کی قومیت اور وطنیت کی شاعری خاص اہمیت کی حامل ہے۔

سرور جہاں آبادی اور دیگر شعرا کامحبوب موضوع بھی وطن اورقوم پرستی رہا۔ ان کے یہاں یہ تصور مذہبی عقائد کی بنیاد پر نہیں بل کہ قوم ووطن اور جغرافیائی حوالے سے ہے۔ یہ شعرا بھی اقبال کی طرح سارے ہندوستان کو وطن تصور کرتے تھے۔ رومانوی دور کے ان شعرا نے وطن کی چاہت میں سہانے گیت گائے ہیں۔ ان کی شاعری میں مذہبی تعصب اور تنگ خیالی نظر نہیں آتی۔ ان شعرا نے مشترکہ طور پر اتحاد واتفاق میں ہندوستان کی خوشحالی سمجھا اور آزادی کے سہانے خواب دیکھے اور عوام میں انگریزوں کے خلاف پائے جانے والی نفرت اور غصے کی ترجمانی کی ہے۔ ان نظم نگاروں کی نظموں میں خاک وطن کا بیان ،عظمت ہند اور مناظر فطرت کی عکاسی ملتی ہے۔

رومانوی دور کے شعرا نے فطرت نگاری ،ماضی پرستی، حب الوطنی اور بچوں کے ادب کو یکساں موضوع بنایا ہے۔ ان کے یہاں اصلاحی ، اخلاقی، سیاسی وسماجی شعور بھی یکساں ہے۔ ان شعرا نے آزاد اور حالی کی ''نیچرل شاعری'' کی تحریک سے متاثر ہو کر اردو شاعری کو فطری جذبات و مشاہدات عطا کیے اور رومانوی طرز احساس اپناتے ہوئے مشاہدات فطرت ،قومی ،وطنی اور انفرادی جذبات کو نظم میں بیان کیا ہے۔انگریزی شاعری کی فضا بھی رومانوی شعرا کے مزاج میں رچی بسی ہے۔ انھوں نے مشترکہ طور پر انگریزی شاعری کے مضامین اردو کے قالب میں ڈھالے ہیں۔ انھوں نے بڑی تعداد میں انگریزی نظموں کے تراجم کیے ہیں اور کچھ مضامین اخذ کیے ہیں۔ انھوں نے بچوں کے لیے جو نظمیں لکھی ہیں ان میں کچھ نظمیں انگریزی نظموں کا ترجمہ ہیں۔

حوالہ جات

١۔ ظفر محمود،جوش ملیح آبادی شخصیت اور فن،(دہلی: قومی کونسل برائےفروغ اردو زبان،١٩٨٨ء،٢٠١٣ء)،ص:٦٦،٦٥

٢۔ عقیل احمدصدیقی،جدید اردو نظم نظریہ وعمل،(لاہور: بیکن بکس،٢٠١۴ء)،ص:٣٢

٣۔ ظفر محمود،جوش ملیح آبادی شخصیت اور فن،(دہلی: قومی کونسل برائےفروغ اردو زبان،١٩٨٨ء،٢٠١٣ء)،ص:٦٦

۴۔ محمد اقبال،علامہ،کلیات اقبال اردو،(لاہور:الحمد پبلی کیشنز،مارچ١٩٩٩ء)،ص:١٠٨

۵۔ عقیل احمدصدیقی،جدید اردو نظم نظریہ وعمل،(لاہور: بیکن بکس،٢٠١۴ء)،ص:٣٨

٦۔ نادرکاکوروی،جذبات نادر،(کراچی: سندھ اردو اکیڈمی،١٩٦١ء)،ص:٢١٢

۷۔ ایضاً،ص:١١٢

٨۔ محمد اقبال،علامہ،کلیات اقبال اردو،(لاہور:الحمد پبلی کیشنز،مارچ١٩٩٩ء)،ص:٢١

٩۔ حفیظ جالندھری،کلیات حفیظ جالندھری،تحقیق وترتیب، خواجہ محمد زکریا،(لاہور:الحمد پبلی کیشنز،٢٠٠۵ء)،ص:٢۵۴

١٠۔ چکبست،کلیاتِ چکبست،(بمبئی:ساکار پبلشرز،١٩٨١ء)،ص:١٢٣

١١۔ نادرکاکوروی،جذبات نادر،(کراچی: سندھ اردو اکیڈمی،١٩٦١ء)،ص:٢۵٦

١٢۔ منظر ایوبی ،پروفیسر،اردو شاعری میں نئے موضوعات کی تلاش،(کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان،٢٠١٠ء)،ص:۵٣

١٣۔ سرور جہاں آبادی،خُم کدہ،(اعظم گڑھ:اعظم اسٹیم پریس،س ن)،ص:۵٦

١۴۔ ساغر نظامی ،کلیاتِ ساغرنظامی،جلد دوم،مرتبہ،ڈاکٹر مظفر حنفی،(دہلی: موڈرن پبلشنگ ہاؤس،١٩٩٨ء)،ص:۴٨

١۵۔ سرور جہاں آبادی،خُم کدہ،(اعظم گڑھ:اعظم اسٹیم پریس،س ن)،ص:١٢٢

۱۶۔ ایضاً،ص:۶۷

۱۷۔ منظر ایوبی ،پروفیسر،اردو شاعری میں نئے موضوعات کی تلاش،(کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان،۲۰۱۰ء)،ص:۵٦

۱۸۔ محمد اقبال،علامہ،کلیات اقبال اردو،(لاہور:الحمد پبلی کیشنز،مارچ۱۹۹۹ء)،ص:۷۲

۱۹۔ نادرکاکوروی،جذبات نادر،(کراچی: سندھ اردو اکیڈمی،۱۹۶۱ء)،ص:۲۳۷

۲۰۔ مجاور حسین،اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر،(لکھنو:اردو اکیڈمی،۱۹۷۵ء)،ص:۲۵۵

۲۱۔ سرور جہاں آبادی،خُم کده،(اعظم گڑھ:اعظم اسٹیم پریس،س ن)،ص:۱۴۵

۲۲۔ تلوک چندمحروم،گنجِ معانی،(نئی دہلی:محروم میموریل لٹریری سوسائٹی،تیسرا ایڈیشن ۱۹۹۵ء)،ص:۲۳۲

۲۳۔ حفیظ جالندھری،کلیات حفیظ جالندھری،تحقیق وترتیب خواجہ محمد زکریا،(لاہور:الحمد پبلی کیشنز،۲۰۰۵ء)،ص:٦۳

۲۴۔ تلوک چندمحروم،گنجِ معانی،(نئی دہلی:محروم میموریل لٹریری سوسائٹی،تیسرا ایڈیشن ۱۹۹۵ء)،ص:۲۱۵

۲۵۔ ایضاً ،ص:۲۶۳

۲۶۔ محمد اقبال،علامہ،کلیات اقبال اردو،(لاہور:الحمد پبلی کیشنز،مارچ۱۹۹۹ء)،ص:۶۹

۲۷۔ نادرکاکوروی،جذبات نادر،(کراچی: سندھ اردو اکیڈمی،۱۹۶۱ء)،ص:۱۱۵

۲۸۔ روش صدیقی,دہلی:رسالہ صبح روش نمبر،۱۹۷۱ء،ص:۱۳۷

۲۹۔ افسرمیرٹھی،حامد اللہ،پیام روح، سن ن،ص:۱۷۲

۳۰۔ ایضاً،ص:۱۲۵

۳۱۔ ایضاً،ص:۳۹

۳۲۔ احسان دانش،زنجیر بہاراں،(لاہور:خزینہ علم وادب،۲۰۰۰ء)،ص:۸۴

۳۳۔ محمد اقبال،علامہ،کلیات اقبال اردو،(لاہور:الحمد پبلی کیشنز،مارچ۱۹۹۹ء)،ص:۱۵۰،۱۴۹

۳۴۔ تلوک چندمحروم،گنجِ معانی،(نئی دہلی:محروم میموریل لٹریری سوسائٹی،تیسرا ایڈیشن ۱۹۹۵ء)،ص:۲۶۵

۳۵۔ ایضاً،ص:۲۸۵

۳۶۔ محمد اقبال،علامہ،کلیات اقبال اردو،(لاہور:الحمد پبلی کیشنز،مارچ۱۹۹۹ء)،ص:۱۳۰

۳۷۔ چکبست،برج نرائن،کلیاتِ چکبست،(بمبئی:ساکار پبلشرز،۱۹۸۱ء)،ص:۲۵

۳۸۔ محمد اقبال،علامہ،کلیات اقبال اردو،(لاہور:الحمد پبلی کیشنز،مارچ۱۹۹۹ء)،ص:۷۳

۳۹۔ تلوک چندمحروم،گنجِ معانی،(نئی دہلی:محروم میموریل لٹریری سوسائٹی،تیسرا ایڈیشن ۱۹۹۵ء)،ص:۲۰۹

۴۰۔ ایضاً،ص:۱۵۵

۴۱۔ محمد اقبال،علامہ،کلیات اقبال اردو،(لاہور:الحمد پبلی کیشنز،مارچ۱۹۹۹ء)،ص:۲۶

۴۲۔ جوش ملیح آبادی،دیوانِ جوش، منتخب کلام،ترتیب،امرؔ،(لکھنو:اترپردیش اکادمی،س ن)،ص:۱۴۱

۴۳۔ محمد اقبال،علامہ،کلیات اقبال اردو،(لاہور:الحمد پبلی کیشنز،مارچ۱۹۹۹ء)،ص:۳۴

۴۴۔ تلوک چندمحروم،گنجِ معانی،(نئی دہلی:محروم میموریل لٹریری سوسائٹی،تیسرا ایڈیشن ۱۹۹۵ء)،ص:۱۴۹

۴۵۔ جوش ملیح آبادی،دیوانِ جوش، منتخب کلام،ترتیب،امرؔ،(لکھنو:اترپردیش اکادمی،س ن)،ص:۱۴۷

۴۶۔ ایضاً،ص:۲۸۱

۴۷۔ افکار جوش نمبر،کراچی،اکتوبر،نومبر۱۹۶۱ء،ص:۳۳۲

۴۸۔ تبسم کاشمیری،ڈاکٹر،جدید اردو شاعری میں علامت نگاری،(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۷۵ء)،ص:۲۳

۴۹۔ خلیفہ عبدالحکیم،ڈاکٹر،فکر اقبال،(لاہور: بزم اقبال،۲۰۰۵ء)،ص:۳۷

۵۰۔ اختر شیرانی،کلیات اختر شیرانی،(لاہور: الحمد پبلی کیشنز،۲۰۱۷ء)،ص:۲۰۳

۵۱۔ ساغر نظامی،بادۂ مشرق،(لاہور:مکتبۂ اردو،س ن)،ص:۳۵

۵۲۔ محمد اقبال،علامہ،کلیات اقبال اردو،(لاہور:الحمد پبلی کیشنز،مارچ۱۹۹۹ء)،ص:۲۲۵

۵۳۔ جوش ملیح آبادی،جوش کی انقلابی نظمیں ،مرتبہ،وسیم عباس گل،(اسلام آباد: پورب اکادمی،۲۰۱۵ء)،ص:۱۷۳

۵۴۔ روش صدیقی،دہلی:رسالہ،صبح روش نمبر،۱۹۷۱ء،ص: ۱۳۵

۵۵۔ جوش ملیح آبادی،جوش کی انقلابی نظمیں ،مرتبہ،وسیم عباس گل،(اسلام آباد: پورب اکادمی،۲۰۱۵ء)،ص:۳۳

۵۶۔ ایضاً،ص:۴۹

۵۷۔ جوش ملیح آبادی،دیوانِ جوش، منتخب کلام،ترتیب،امرؔ،(لکھنو:اترپردیش اکادمی،س ن)،ص:۲۶۵،۲۶۶

۵۸۔ وسیم عبا س گل،جوش کی انقلابی نظمیں،(اسلام آباد: پورب اکادمی،۲۰۱۵ء)،ص:۱۳،۳

۵۹۔ اختر شیرانی،کلیات اختر شیرانی،(لاہور: الحمد پبلی کیشنز،۲۰۱۷ء)،ص:۵۷۳

۶۰۔ ایضاً،ص:۵۷۱

۶۱۔ ممتاز حسن ،مقدمہ،جذبات نادر،(کراچی:اردو اکیڈمی سندھ،۱۹۶۱ء)،ص:۳،۴

۶۲۔ نادرکاکوروی،جذبات نادر،(کراچی: سندھ اردو اکیڈمی،۱۹۶۱ء)،ص:۲۸۱

۶۳۔ ایضاً،ص:۱۲۶

۶۴۔ ایضاً،ص:۵۶

۶۵۔ سر عبدالقادر،دیباچہ،گنج معانی،(دہلی: محروم میموریل لٹریری سوسائٹی،اشاعت سوم ۱۹۹۵ء)،ص:۱۳

۶۶۔ حامدی کاشمیری،پروفیسر،جدیداردو نظم اور یورپی اثرات،(دہلی: موڈرن پبلشنگ ہاؤس،اشاعت اول۱۹۶۸ء،دوم۲۰۱۰ء)، ص:۲۲۱

۶۷۔ تلوک چندمحروم،گنجِ معانی،(نئی دہلی:محروم میموریل لٹریری سوسائٹی،تیسرا ایڈیشن ۱۹۹۵ء)،ص:۹۲،۹۳

۶۸۔ اختر شیرانی،کلیات اختر شیرانی،(لاہور: الحمد پبلی کیشنز،۲۰۱۷ء)،ص:۵۶

۶۹۔ ایضاً،ص:۲۹۸

۷۰۔ نگہت ناہید طفر،انگریزی رومانوی شعرا کے اردو شاعری پر اثرات،(لاہور: پاکستان رائٹر کوآپریٹو سوسائٹی،۲۰۱۵ء) ،ص:۲۷۵

٧١۔ افسر میرٹھی،حامد اللہ،پیام روح، سن ن،ص:۱۵

٧٢۔ عبدالقوی دسنوی،اردو شاعری کی گیارہ آوازیں،(دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردوزبان،۲۰۱۱ء)،ص:٦۵

٧٣۔ تلوک چندمحروم،گنجِ معانی،(نئی دہلی:محروم میموریل لٹریری سوسائٹی،تیسرا ایڈیشن ۱۹۹۵ء)،ص:۵۶۲

٧۴۔ نیاز فتح پوری،ڈاکٹر،تلوک چند محروم، کاروانِ وطن،(دہلی: مطبع ندارد بار اول ۱۹٦۰ء)،ص:۲۳

٧۵۔ عظمت اللہ خان،سریلے بول،(کراچی:اردو اکیڈمی سندھ،۱۹۵۹ء)،ص:۴۵

٧۶۔ حفیظ جالندھری،کلیات حفیظ جالندھری،تحقیق وترتیب خواجہ محمد زکریا،(لاہور:الحمد پبلی کیشنز،۲۰۰۵ء)،ص:۲۸۰

٧٧۔ عظمت اللہ خان،سریلے بول،(کراچی:اردو اکیڈمی سندھ،۱۹۵۹ء)،ص:۶۴

٧٨۔ حفیظ جالندھری،کلیات حفیظ جالندھری،تحقیق وترتیب خواجہ محمد زکریا،(لاہور:الحمد پبلی کیشنز،۲۰۰۵ء)،ص:۲٧۵

٧٩۔ عظمت اللہ خان،سریلے بول،(کراچی:اردو اکیڈمی سندھ،۱۹۵۹ء)،ص:۴۶

٨٠۔ وزیر آغا، ڈاکٹر،اردو گیت امانت سے حفیظ تک،مشمولہ ،بیسویں صدی کا شعری ادب،مرتبہ بدر منیر الدین، (لاہور: پولیمر پبلی کیشنز،۱۹۸۸ء)،ص:۱٦۰

٨١۔ حفیظ جالندھری،کلیات حفیظ جالندھری،تحقیق وترتیب خواجہ محمد زکریا،(لاہور:الحمد پبلی کیشنز،۲۰۰۵ء)،ص:۲۸۴

٨٢۔ ایضاً،ص:۵٦

٨٣۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر،جوش ملیح آبادی شخصیت اور فن،(اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان،۲۰۰٧ء)،ص:٦۱

٨۴۔ حفیظ جالندھری،کلیات حفیظ جالندھری،تحقیق وترتیب خواجہ محمد زکریا،(لاہور:الحمد پبلی کیشنز،۲۰۰۵ء)،ص:۲۴٧

٨۵۔ انور سیدید ،ڈاکٹر،اردو ادب کی تحریکیں،(کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان،۱۹۸۵ء)،ص:۴۳٦

٨٦۔ حفیظ جالندھری،کلیات حفیظ جالندھری،تحقیق وترتیب خواجہ محمد زکریا،(لاہور:الحمد پبلی کیشنز،۲۰۰۵ء)،ص:۴۹٦

۸۷۔ محمد منور،پروفیسر،چراغ سحر،،کلیات حفیظ،(لاہور: الحمد پبلی کیشنز،۲۰۰۵ء)،ص:٦۳۲

۸۸۔ اختر شیرانی،کلیات اختر شیرانی،(لاہور: الحمد پبلی کیشنز،۲۰۱۷ء)،ص:۱۷۷

۸۹۔ افسرمیرٹھی،حامد اللہ،پیام روح، سن ن،ص:۱۱۸

۹۰۔ یونس حسنی ،ڈاکٹر،اختر شیرانی اور جدید اردو ادب،(کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان،اشاعت اول۱۹۷٦ء)،ص:۲۰۳

۹۱۔ اختر شیرانی،کلیات اختر شیرانی،(لاہور: الحمد پبلی کیشنز،۲۰۱۷ء)،ص:۳۷۲

۹۲۔ احسان دانش،زنجیر بہاراں،(لاہور:خزینہ علم وادب،۲۰۰۰ء)،ص:۴۲

۹۳۔ ساغرنظامی،بادۂ مشرق،(لاہور:مکتبۂ اردو،س ن)،ص:۷۵

۹۴۔ ایضاً،ص: ۱۰۲

۹۵۔ اے وحید،ڈاکٹر،جدید شعرائے اردو،(لاہور: فیروز سنز،سن۔ن)،ص:٦٦۲،٦٦۱

۹٦۔ عظمت اللہ خان،سریلے بول،(کراچی:اردو اکیڈمی سندھ،۱۹۵۹ء)،ص:۵۶

۹۷۔ ناہید قاسمی،ڈاکٹر،جدید اردو شاعری میں فطرت نگاری،(کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان ،۲۰۰۲ء)،ص:۳۴۸

۹۸۔ احسان دانش،زنجیر بہاراں،(لاہور:خزینہ علم وادب،۲۰۰۰ء)،ص:۷۲

۹۹۔ روش صدیقی،دہلی:رسالہ ،آج کل،جنوری ۱۹۵۸ء،ص:۳۵

باب سوم

ترقی پسند جدید اُردو نظم کے موضوعاتی وہیئتی اشتراکاات

جدید اُردو نظم ۱۹۳۵ء کے بعد ترقی پسند تحریک کی صورت میں نمودارہوئی،اس تحریک کے زیر اثر نظم نگاروں نے زندگی کی جدلیاتی اور مادی حرکات کو موضو ع بنایا۔شعرا نے اپنے افکار وخیالات اور خارجی عناصر کو شامل کیا اور معاشرتی واقعات و حالات پر قلم اٹھایا۔ترقی پسند نظریات کے حامل شعرا نے شاعری کا رشتہ بنی نوع انسان سے جوڑنے کو اپنا نصب العین بنایا۔انھوں نے شاعری کو ایک آلۂ کار کے طور پر استعمال کر کے طبقاتی ،سرمایہ داری ،جاگیرداری نظام کے خاتمے کی کوششیں کیں اور ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل پرزور دیا۔ اردو شاعری میں رجحان پہلے بھی موجود تھا لیکن برصغیر کے سیاسی ،سماجی اور اقتصادی حالات ۱۹۳۵ء کے بعد اس رجحان کو ایک تحریک کی صورت عطا کی۔ترقی پسند تحریک کو مستحکم اور فروغ دینے میں جوش ملیح آبادی ،علی سردار جعفری،داکٹر ایم ڈی تاثیر ،اسرار الحق مجاز، فیض احمد فیض، مخدوم محی الدین،ساحر لدھیانوی، احمد ندیم قاسمی، کیفی اعظمی، معین احسن جذبی اور جاں نثار اختر کا کردار زیادہ اہم ہے۔ترقی پسند نظم نگاروں نے شاعری میں نئے موضوعات شامل کیے۔ انھوں نے مقصدیت، افادیت، واقعیت،صداقت اور حقیقت پسندی کی ایک مضبوط اور نئی روایت کا آغاز کیا جو بعد میں آنے والے شعرا کے لیے مشعلِ راہ بنی۔ان شعرا نے موضوع اور مضامین کو ہیئت ،اسلوب اور فن پر فوقیت دی۔انھوں نے مقصدی،اور شعوری عمل کے دوران کئی جگہوں

پر شاعری کی جمالیاتی اقدار کو بھی نظر انداز کر دیا۔ ترقی پسند قبیل کے شعرا نے اس اعتبارسے شاعری کو خطابت ،صحافت اور پروپیگنڈہ کے قریب تر کھڑا کر دیا۔

اردو شاعری میں حقیقت نگاری کی روایات توپرانی ہے مگر اس کی پہلی باضابطہ اور شعوری کاوش ترقی پسند تحریک کے پلیٹ فارم سے ہوئی۔قدیم ومروج اشارے، کنائے ،تشبیہات واستعارات ،صنائع بدائع اور علائم سے شاعری میں رمز وایمائیت پیدا نہیں کی جا سکتی تھی اس لیے ترقی پسند شعرا نے ان مروج ہیئتوں اور اظہار وبیان کے مروج اسلوب کو غیر ضروری سمجھا اور شاعری کی اس قدیم روایت سے بغاوت پر اتر آئے۔جس کے نتیجے میں زبان وبیان،طرزِ ادا،اسلوب اور نئی ہیئتوں کے تجربات ہوئے۔اس کام کے لیے بعض شعرا نے انگریزی اصنافِ شاعری کو بھی اپنایا،بعض نے انگریزی کے تراجم،ہندی کے مترنم الفاظ اور بحروں کو مستعار لے کر عشقیہ حقیقت نگاری اور واقعہ نگاری کی روایت قائم کی۔ترقی پسند تحریک کا اثر جدید نظم پر یہ ہوا کہ پہلی مرتبہ شعوری طور پر آزاد اور نظمِ معرا کا آغاز ہوا اگرچہ میراجی ،راشد اور خالدؔسے پہلے شررؔ اور اسماعیل میرٹھی ان ہیئتوں کی ابتدا کر چکے تھے مگر ان ہیئتوں کو قبولیت عطا کرنے انھیں فروغ دینے اور اس تجربے کو کام یاب بنانے میں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر نظم نگاروں کا کردار اہم ہے۔یہ شعرا اگر نئے موضوعات کو نظم کے فرسودہ مروج سانچوں میں نہ ڈھالتے تو شاید اس قدر کام یابی حاصل نہ ہوتی۔ اس لیے وہ نظم کی ہیئت ،اظہار وبیان پر تجربے کرنے کی طرف مائل ہو گئے۔

۱۹۳۶ء سے آزادی پاک وہند کا زمانہ ترقی پسند رجحان کے عروج کا دور ہے۔ ان چند برسوں میں ترقی پسند فکر کے شعرا نے جدید اردو نظم کو بے حد وسعت عطا کی۔ انھوں نے اپنے فکر وفلسفہ کی بنیاد اشتراکی اصول ونظریہ پر رکھی۔ انقلاب روس کے بعد ہندوستان میں بھی اشتراکی اصولوں کو فروغ ملا۔ بیسیوں صدی کی تیسری دہائی میں ہندوستان کے شعرا نے مزدوروں اور کسانوں کو بیدار کیا اور انھیں مضبوط کیا تا کہ وہ استحصالی اور سامراجی طاقتوں سے نبرد آزما ہو سکیں۔ترقی پسند تحریک موضوع اور ہیئت دونوں میں تبدیلی کے ساتھ واقع ہوئی کیوں کہ نیا موضوع اپنے ساتھ نیا آہنگ اور اظہار وبیان کا نیا پیمانہ بھی ساتھ لاتا ہے۔ ترقی پسند تحریک سے جڑے ہوئے نظم نگاروں نے سماجی زندگی کی کیفیات اور واردات کو نئی ہیئت ،نیا اسلوب اور نیا آہنگ دیتے ہوئے ترتیب وتوازن کا خاص خیال رکھا اس تحریک کے اہم شعرا نے نظموں کی تخلیق میں جمالیاتی اقدار کا لحاظ بھی رکھا۔ کچھ رومانوی نظم نگاروں کے یہاں بھی ترقی پسند فکر نمایاں ملتی ہے۔اقبال ترقی پسند فکر کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے پہلی بار جدید اردو نظم میں کسان اور محنت کشوں کی بات کی ہے۔انھوں نے ا س پسے ہوئے طبقے کا درد محسوس کیا اور ان میں ایک امنگ اور ولولہ پیدا کیا۔ اقبال ترقی پسند تحریک کے پیش رو ثابت ہوئے۔اقبال اسلامی جمہوری نظام کا نفاذ چاہتے تھے جو سب کو رشتہ انسانیت میں پروتا ہے،اس نظام میں حاکم ومحکوم ،آجر واجیر،مالک ومزدور اور امیروغریب سب برابر ہیں۔اقبال مزدوروں کو سرمایہ دار کے حیلے بہانوں اور فریب سے آگاہی دیتے ہیں۔اقبال پہلے شاعر ہیں جنھوں نے سرمایہ دار اور مزدورکو اپنی نظموں کا موضوع بنایا۔اس ضمن میں نظم’’خضرِ راہ‘‘کا یہ ٹکڑا ملاحظہ کیجیے:

مکر کی چالوں سے بازی لے
گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا
مزدور مات
اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی
انداز ہے
مشرق ومغرب میں تیرے دور
کا آغاز ہے
(۱)

"خضرِ راہ" پہلی نظم ہے جس میں ہندوستان کے محنت کش طبقے کا درد نمایاں ہوا ہے۔ اس نظم میں مزدور اور نچلے طبقے کو بیداری اور عمل کا پیغام دیا گیا ہے۔رومانی شعرا کے یہاں ترقی پسند فکر اور انقلابی شاعری کے بارے میں پروفیسر منظر ایوبی رقم طراز ہیں:

''اقبال کی ''خضرِ راہ'' ہی سے دراصل انقلابی شاعری کا آغاز ہوتا ہے یہیں سے وہ سوتے پھوٹتے ہیں جو جوش سے گزرتے ہوئے ترقی پسند تحریک کے نوجوان شعرا تک پہنچتے ہیں۔''(۲)

اقبال کی ایک اور نظم ''فرشتوں کا گیت''میں محنت کشوں کی ترجمانی کی گئی ہے:

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے خوشۂ گندم کو جلا دو
(۳)

اسرا رالحق مجاز نے بھی "مزدور" کو موضوع بنایا ہے۔رومانوی شاعر احسان دانش کا بھی محبوب موضوع "مزدور" ہے۔ مجازؔ "مزدور" سے بہت ہمدردی رکھتے تھے،انھیں نچلے طبقے کے مسائل کا اندازہ تھا ۔وہ مزدور کی حمایت اور سرمایہ دار کی مذمت کرتے ہیں۔ اقبال سےمجاز کا موضوعاتی اشتراک ،مجاز کی نظم ''نوجوان سے ''میں ملاحظہ کیجیے:

شراب کھینچی ہے سب نے غریب کے خوں
سے
تو اب امیر کے خوں سے شراب پیدا کر
(۴)

فیض احمد فیض کی شاعری میں رات،صبح،سحر،اجالا،روشنی اور امید وغیرہ کی علامتیں استعمال ہوئی ہیں۔نظم "ملاقات" میں بھی خوب صورت علامتیں استعمال ہوئی ہیں۔ اس نظم میں رات مرکزی علامت ہے اور ستارے ،مہتاب ،نور ،سیاہی اور نہر خون جیسے تلازمات بھی رات کی معنوی حیثیت کا اظہار ہیں۔ فیضؔ اس علامتی اظہار سے سرمایہ دارانہ نظام کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور مزدور ونچلے طبقے سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں:

بہت سیہ ہے یہ رات لیکن
اسی سیاہی میں رونما ہے
وہ نہرِ خوں جو مری صدا ہے
(۵)

اردو شاعری میں دراصل ترقی پسند تحریک کا آغاز جلیاں والا باغ کے سانحے سے ہوتا ہے۔اس سانحے پر اقبال کا دل بھی رویا۔ اس کھلی جارحیت اور ظلم کے خلاف جوش ملیح آبادی کی فکر بھی ''جلیاں والا باغ'' کے سانحے کے بعد اقبال سے مل جاتی ہے۔آغاز میں انھوں نے ہلکی پھلکی نظمیں تخلیق کیں مگر بعد میں انھوں نے ہندوستان کی سماجی ومعاشی پیچیدگیوں اور سیاسی وقومی دشواریوں کو اپنے باغیانہ مزاج میں رنگ کر نظمیں تخلیق کیں۔انھوں نے اپنے عہد کے سیاسی وسماجی حالات،احساس غلامی،خواب آزادی،قوم پسندی اور وطن دوستی جیسے موضوعات پر قلم اٹھایا۔ انھوں نے آزادی وطن کے راگ الاپنے کے ساتھ ساتھ بیداری عوام میں اقبال کی فکر کو اپنے شانہ بشانہ کیا:

کیا ہند کانپ رہا ہے گونج رہی ہیں تکبیریں
اُکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑے ہیں زنجیریں
کیا ان کو خبر تھی ہونٹوں پر جو قفل لگایا کرتے تھے
(٦)

جوش نے اپنی نظم''آثار انقلاب''میں ہندوستاں والوں کو بیدار کیا ہے۔وہ آزادی کی بات کرتے ہیں۔ظہیر کاشمیری کی عہد شباب کی چند نظمیں ''لالہ رخ''اور''رخصت'' رومان پرور ہیں باقی ان کی نظمیں اشتراکی نظریے کی حامل ہیں۔ان کی شاعری میں طبقاتی تقسیم کے نتیجے میں لوگوں پر ڈھائے جانے والے مظالم،محنت کشوں کے عزم ویقین اور انسانی ہمدردی ،مساوات اور امن عالم کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ ظہیر کاشمیری نے اپنی نظم "انقلاب روس" میں روسی انقلاب کو حیاتِ نو کے مترادف قرار دیا ہے۔اسرار الحق مجاز کے دل میں آزادی کی تڑپ موجود ہے اور وہ آزادی حاصل کرنے کے بعد نئے نظام کی بات کرتے ہیں،وہ ملک میں آزاد اور جمہوری نظام کے آرزومند ہیں۔ انقلاب وآزادی کے بارے میں ان کی نظم''جشنِ آزادی'' دیکھیے:

بہ صد غرور ، بصد فخر و ناز آزادی
مچل کے کھل گئی ، زلفِ دراز آزادی
مہ و نجوم ہیں نغمۂ طراز آزادی
وطن نے چھیڑا ہے اس طرح ساز آزادی
(۷)

مجاز کی شاعری رومان وانقلاب کا حسین امتزاج ہے،ا س لحاظ سے وہ جوش کے ہم خیال لگتے ہیں،ان دوشعراکی شاعری میں موضوعاتی اشتراک پایا جاتا ہے۔ ان کے رومان میں بغاوت کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔مجازؔ کے بارے میں ڈاکٹر یعقوب خاور رقم طراز ہیں:

''ترقی پسندوں میں چند شاعر ایسے بھی ہوئے ہیں جنھوں نے ملک کے سیاسی اتار چڑھاؤ اور تحریک آزادی کی عملی سرگرمیوں اور ہنگامہ آرائیوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی اپنی شاعری کو وقتی مسائل اور نعرہ بازی سے محفوظ رکھا۔''(۸)

اقبال کی شاعری کا مرکزی فلسفہ اسلامی تعلیمات پر مبنی ہے اس لیے اس میں دعائیہ لہجے کا ستعمال زیادہ ہے۔ ان کی متعدد نظموں میں خدا کو مخاطب کیا گیا ہے اور خدا سے التجا کی ہے۔اقبال اپنی نظم "بچے کی دعا" میں انسان کی فلاح وبہبود کے لیے دعا گو ہیں۔اقبال کی حب الوطنی میں بھی دعائیہ عنصر نمایاں ہے وہ اہل وطن کی بے حسی ،جمود اور دنیا کے رنج وغم سے اکتا کر بھی خدا کے سامنے دست دعا بلند کرتے ہیں۔اس ضمن میں نظم ''ایک آرزو'' ملاحظہ کیجیے:

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو
(۹)

اقبال قوم کی بھلائی کی فکر اور رہنمائی کرتے ہوئے خدا کو پکارتے ہیں۔ان کی دعاؤں کا محور نوجوان ہیں۔وہ اپنی قوم کو کھویا ہوا وقار واپس دلانے کے لیے دعا کرتے ہیں:

جوانوں کو مری آہ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال وپر دے
خدایا! آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے

(۱۰)

اقبال نے کچھ دعائیں اپنی ذات کے لیے بھی کیں ہیں۔ انھوں نے مغربی تہذیب وتمدن کو پروان چڑھنے کے خلاف دعا کرتے ہوئے امت مسلمہ کو خدا کے حضور کھڑا کیا ہے۔ا ن کی دعائیہ لب ولہجے کی سب سے اہم نظم''شکوہ'' ہے جو ایک شخص کی ذاتی فریاد ہے۔وہ مشکلات میں گھری قوم کے لیے دعا کرتے ہیں:

یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑ پا دے

(۱۱)

اقبال کی شاعری میں متنوع دعائیہ انداز ملتے ہیں وہ کبھی خدا کے سامنے دعا کرتے ہیں تو کبھی سرور کائنات سے ملتجی ہیں۔انھوں نے مسلمانوں کی ناگفتہ بہ حالت کو دیکھ کر دعائیہ لہجہ اختیار کیا ہے۔اقبال کے بعد فیض احمد فیض کی شاعری میں بھی دعائیہ نظمیں موجود ہیں۔ اس ضمن میں فیض کی نظم ''دعا''ملاحظہ کیجیے:

آئیے ہاتھ اٹھائیں ، ہم بھی
ہم جنھیں رسم دعا یاد نہیں

(۱۲)

یاس کے وقت جب دل ودماغ پرسارے راستے بند ہو جاتے ہیں تو انسان اپنے خالق کو مدد کے لیے پکارتا ہے۔فیض اپنی کربناک کیفیات کو نظم ''یاس'' میں بڑھتے ہوئے یاس کی گھڑی میں ربِ کریم سے دعا گو ہیں۔فیض نے دعائیہ انداز کو انقلابی معنویت سے روشناس کرادیا ہے۔ دعائیہ انداز سے مملو انقلابی نظم''تین آوازیں''کافی اہم ہے جو حق وباطل کی کشمکش میں تخلیق ہوئی ہے فیض اس کیفیت میں خدا سے متفسر ہیں:

یا خدا یہ مری گردانِ شب وروز و سحر
یہ مری عمر کا بے منزل و آرام سفر
وہ یہ کہتے ہیں تو خوشنود ہر اک ظلم سےہے
وہ یہ کہتے ہیں کہ ہر اک ظلم ترے حکم سے
ہے

(۱۳)

جدید اردو شاعری میں فیض کی دعائیہ موضوعات کی حامل نظمیں انفرادیت کا شکار نظر آتی ہیں ان کے انقلابی انداز نے دعاؤں کو نئی معنویت عطا کی ہے۔تاثیر کی نظمیں بدلتے ہوئے حالات اور اقدار کی عکاسی کرنے کے ساتھ ساتھ دعائیہ لہجے کی حامل بھی ہیں۔ ان کی طویل نظم'' مناجات'' مذہبی وابستگی اور دعائیہ انداز کی ہے۔ اس نظم میں ماضی کی عظیم

ہستیوں اور تاریخی واقعات کی طرف اشارہ کر کے خدا کے حضور شکوہ وشکایت کی گئی ہے۔ اس نظم میں اقبال کی طرح شکوہ اور جواب شکوہ کا عنصر نمایاں ہے۔احمد ندیم قاسمی اپنی متعدد نظموں میں خدا سے مخاطب اورد عا گو ہیں۔ ان کی شاعری میں وطن کی محبت کا متاثر کن احساس ابھرتا ہے،وہ ''ارض پاک'' کی بقا اور ترقی کے لیے دعا گو ہیں:

خدا کرے کہ مری ارض پاک پر اترے
وہ فصلِ گل جسے اندیشۂ زوال نہ ہو
خدا کرے کہ نہ خم ہو سرِ وقار وطن
اور اس کے حُسن کو تشویش ماہ وسال نہ ہو

(۱۴)

احمد ندیم قاسمی کے دعائیہ انداز اور وطن سے جذباتی وابستگی کا احساس اقبال،فیض اور دیگر شعرا سے مماثلت رکھتا ہے وہ وطن کی محبت میں یوں دست دعا بلند کرتے ہیں:

یارب مرے وطن کو اک ایسی بہار دے
جو سارے ایشیا کی فضا کو نکھار دے

(۱۵)

دعائیہ لب ولہجے کی جھلک ہمیں قتیل شفائی کی مختلف نظموں میں بھی نظر آتی ہے کہیں ان میں ذاتی دعائیہ انداز ہے تو کہیں شکوہ وشکایت اور کہیں استفہامیہ دعا کرنے سے انسان میں تحفظ کا احساس پیدا ہوتا ہے خصوصا ماں کی دعا ایسی دعاؤں میں اہم ہے۔قتیل شفائی کا دعائیہ لب ولہجہ طرب کوشی،فرحت،تروتازگی اورشادابی کا احساس دلاتا ہے۔ ا نھوں نے محرومیوں ،تشدد اور نا انصافیوں کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے دعائیہ انداز اپنایا ہے:

ضرورت مند بندوں پر جو
کرتے ہیں خدائی
زمیں کے ان خداؤں سے خدا
محفوظ رکھے

(۱٦)

قتیل شفائی کی دعاؤں میں ذاتی دعاؤں کا تذکرہ بھی ہے''سناٹا'' انھوں نے اپنی بیٹی کی سماعت محروم ہونے پر لکھی۔ایک اور نظم انھوں نے اپنی اہلیہ کے لیے بھی لکھی۔قتیل شفائی کی نظمیں عصری مسائل کے علاوہ مذہبی فلسفہ،اسلامی تہذیب وثقافت اور عالمی امن

کی ترجمان ہیں۔ وہ انسان دوست شاعر ہیں اور اس زمین پر امن اور محبت کی فراوانی کے لیے خدا کے حضور دعا گو ہیں۔

کھلا کھلا ہو یہ جہاں
دھلا دھلا سماج ہو
تری زمیں پر اے خدا
محبتوں کا راج ہو
(۱۷)

قتیل شفائی انسانیت کی محبت اور وفاداری میں سرحدوں سے بے نیاز ہیں اور پیغام اور ہمہ گیر آسودگی کے خواہاں ہیں:

کسی وطن میں بھوک کا
رہے نہ کوئی مسئلہ
نگر نگر، ڈگر ڈگر
اناج ہی اناج ہو

(۱۸)

حبیب جالب عوام کے بنیادی مسائل ان کے حقوق کی پامالی اور استحصالی نظام کو بدلنے کا تصور پیش کرتے ہیں تو اس معاملے میں وہ عملی طور پر بھی شریک ہوئے ،اس پاداش میں انھوں نے قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں۔جبروتشدد کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے وہ خدا سے دعا گو ہیں۔نظم ‘‘خدایا یہ مظالم بے گھروں پر’’ کا یہ نمونہ دیکھیے:

خدایا یہ مظالم بے گھروں پر
کوئی بجلی گرا فتنہ گروں پر

(۱۹)

حبیب جالب عوامی شاعر ہیں انھیں عوام کی محرومیوں اور جبروتشدد نے احتجاج پر مجبور کیا یہی دعائیہ انداز انھوں نے خدا کے حضور بھی اپنایا ہے۔فراز کی نظمیں حسن وعشق کی منازل سے گزر کر انقلاب کی للکار بنتی دکھائی دیتی ہیں چوں کہ انسانی جذبوں کی گہرائیوں سے واقف ہیں اس لیے ان کی انقلابی آواز اثر رکھتی ہے۔ انھوں نے نعرہ زنی نہیں بلکہ سلیقہ مندی سے اظہار کیا ہے۔ان کی نظمیں عشق محبت کے احساس ،ظلم وجبر ،سیاسی آمروں اور سماجی ناانصافی کے خلاف احتجاج سمجھی جاتی ہے۔فراز کو رومانوی اقدار سے لگاؤ تھا لیکن انھوں نے سیاسی ،سماجی قدروں اور ظلم وجبر کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے اور انسان کی عظمت کی برابری کے لیے خدا سے دعا کی ہے:

اے دائمی حکمتوں کے پیمبر/کہ انسان سارے برابر ہیں/ان میں کوئی کم نسب کوئی برتر نہیں ہے(۲۰)

فراز نے نام نہاد مذہبی رہنماؤں کی برتری تسلیم نہیں کی وہ جابر قوتوں کے خلاف جہاد کا عزم رکھتے ہیں اور یوں دعا گو ہیں:

مجھے حوصلہ دے/کہ میں ظلم کی قوتوں سے/اکیلا لڑا ہوں/کہ میں اس جہاں کے جہنم کدے میں(۲۱)

فراز نے معاصر شعرا کی طرح وطن کی خوشحالی اور تابندگی کے خواہاں ہیں اور اس کے لیے دعا گو ہیں۔ فراز نے زیادہ تر آزاد ہیئت کو ہی وسیلہ اظہار بنایا۔ اسی طرح اختر حسین جعفری نے بھی آزادہیئت ہی میں دعائیہ نظمیں لکھی ہیں۔ وہ آقائے نامدار کی بارگاہ میں اپنے لفظوں کی پذیرائی کے لیے دعا گو ہیں۔انھوں نے انسان کے کرب اور داخلی کیفیات کو بھی نظموں میں پیش کیا ہے۔وہ آمریت ،فساطیت اور مطلق العنانیت کے خلاف تھے انھوں نے مسائل کو اجاگر کرنے کے لیے آواز بلند کی ہے۔وہ ماضی کے وقعات کو پیش کرنے کے لیے تلمیحی پیرائے میں بات کرتے ہیں۔

ترقی پسند شعرا کی فطرت نگاری کے حوالے سے بات کریں تواقبال کا نام سب سے پہلے آتا ہے وہ ابتدائی نظموں میں رومانوی وجمالیاتی فطرت نگاری کرتے ہیں اور بعد میں ان کی فطرت نگاری نئے اسالیب میں ڈھل جاتی ہے۔اقبال نے پہلی مرتبہ فطرت کو ترقی پسند موضوعات میں برتا۔انھوں نے مناظر فطرت کے ذرعیے اپنا فلسفہ بیان کیا۔ ان کی ترقی پسند فطرت نگاری کی حامل نظم''الارض للہ'' بڑی اہم ہے۔ اس زمین پر جو بھی محنت کرے گا وہی اچھی فصل کاٹے گا ۔ضروری نہیں کہ زمیندار اور جاگیردار پھل پائے۔اقبال نے اپنے شعری مجموعہ"ضرب کلیم" میں فطرت نگاری کم کی ہے پھر بھی متعدد نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ فطرت کی عکاس نظم''زمانۂ حاضر کا انسان''ملاحظہ کیجیے:

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزر گاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

(۲۲)

اقبال کی نظم"روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے"،جدید انداز فطرت نگاری کی عمدہ مثال ہے۔اس نظم میں انھوں نے حضرت آدمؑ کا فطرت سے تعلق بیان کیا ہے۔اقبال کی فلسفیانہ فطرت نگاری ومنظر کشی ملاحظہ ہو:

کھول آنکھ ،زمیں دیکھ ،فلک
دیکھ ،فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے
سورج کو ذرا دیکھ
ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل ،
یہ گھٹائیں
یہ گنبد افلاک ، یہ خاموش
فضائیں

(۲۳)

اقبال کی نظمیں ''بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو''اور''سلطان ٹیپو کی وصیت''جدید انداز فطرت نگاری کی اعلا مثالیں ہیں۔ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر نے بھی اپنی نظموں میں فطرت کی تصویر کشی کی ہے ۔انھوں نے رومانی شعرا کی طرح فطرت کے مناظر میں سے صرف حسن کو نمایاں نہیں کیا بل کہ حقیقی منظر کشی کی ہے۔ انھوں نے زندگی کے ہلے پھلکے پہلوؤں کی منظر کشی عمدہ انداز میں کی ہے۔انھوں نے ہیئتی تجربات کرتے ہوئے بھی مناظر فطرت کی عکاسی کی ہےنظم''یدِ بیضا'' تاثیر کی فطرت نگاری کی ایک مثال ہے۔

افق پہ شفق آلودہ بادلوں کا ہجوم
مصور نے لگائے ہیں نقش
رنگ برنگ

(۲۴)

احمد ندیم قاسمی کی فطرت نگاری ملاحظہ ہو:

ابر کو جس قدر برسنا تھا/دھیرے دھیرے برس کے چھٹنے لگا/صبح کے زرنگار چہرے سے/بادلوں کا حجاب ہٹنے لگ(۲۵)

ہندوستان کی آزادی کی امید پر احمد ندیم قاسمی بہت خوش ہوئے اور امید ظاہر کی کہ اب آزاد وطن میں تمام معاملات ٹھیک ہو جائیں گے انھوں نے فطرت کے مناظر علامتی انداز میں دکھائے ہیں۔اس حوالے سے ان کی نظم''کھری کھری''اہم ہے:

صبح کو جب سر کوہسار شفق پھوٹتی ہے
لوگ کہتے ہیں کہ پل بھر میں سویرا ہو گا
کون جانے کہ یہ لالی ہے عناصر کا مذاق
اور سورج کا گھٹاؤں میں بسیرا ہو گا

(۲٦)

جوش نے اقبال کی طرح رومانیت کا طویل سفر طے کرنے کے بعد ترقی پسند فکر کو منزل بنایا۔ان کی نظمیں''جنگل کی شہزادی''اور''نعرہ شباب'' میں مناظر فطرت کی عکاسی کے ذریعے اشتراکی فلسفہ بیان کیا گیا ہے۔نعرہ وللکار کی گونج کم وبیش تمام ترقی پسند شعرا کے یہاں سنائی دیتی ہے ،کسی کے یہاں للکار دھیمے لہجے میں ہے اور کسی کے یہاں للکار شوخ ،تیز وتند اور تلخ انداز میں ہے۔ اس کا ایک نمونہ جوش کی نظم''نظام نو'' میں ملاحظہ کیجیے:

کھیل اے نوعِ انسان ان سیہ راتوں سے کھیل
آج اگر تو ظلمتوں میں پا بہ جولاں ہے ، تو کیا
مسکرانے کے لیے بے چین ہے صبحِ وطن
اور چندے ظلمتِ شامِ غریباں ہے ، تو کیا

(۲۷)

مخدوم محی الدین بھی غربت ،افلاس اور غلامی سے عوام کو نجات دلانا چاہتے تھے، وہ نئے نظام اور نئےرجحان کا خواب دیکھتے ہیں،اسی موضوع پر ان کی نظم''جہانِ نو'' کے یہ مصرعے دیکھیے:

ایسا جہان جس کا اچھوتا نظام ہو
ایسا جہان جس کا اخوت پیام ہو
ایسے جہان نو کا تو پروردگار بن

(۲۸)

مخدوم محی الدین نے نیا نظام تشکیل دیا ہے۔ وہ جمہوریت کے بغیر کسی نظام حکومت کو پسند نہیں کرتے اور اس آزادی کو بھی مکمل آزادی تصور نہیں کرتے جس میں مزدور حکمرانی نہ کرتے ہوں۔وہ نظامِ کہنہ کو بدلنے کے خواہش مند ہیں اور نظام نو کے لیے پرعزم ہیں۔کیفی اعظمی نے بھی آزادی اور وطن کی محبت کو موضوع بنایا ہے اور نئے نظام کی تشکیل کا مطالبہ کیا ہے۔ان کی ایک نظم ''نئی جنت'' اس موضوع کی حامل ہے:

نئے ہندوستان میں نئی جنت بسائیں گے
تڑپ دے کر خس و خشاک کو بجلی بنائیں گے
کوئی آواز دے دے آتش افشاں چاند تاروں کو
کہ اب خاکِ وطن کے جھلسے ذرے جگمگائیں
گے

(۲۹)

اسرار الحق مجاز بھی اسی انداز میں نوجوانوں سے مخاطب ہو کر ان کے شباب کو للکارتے ہوئے نظر آتے ہیں:

جلالِ آتش و برق وسحاب پیدا کر
اجل بھی کانپ اٹھے وہ شباب پیدا کر
ترے خرام میں ہے زلزلوں کا راز نہاں
ہر ایک گام پر اک انقلاب پیدا کر

(۳۰)

اقبال نے ترقی پسند تحریک سے قبل علامتوں کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا بعد میں اس رجحان کوتمام ترقی پسند شعرا نے اپنایا۔اقبال نے اپنی نظم''شعاع امید'' میں استعاراتی لہجہ برتا ہے۔اقبال کے بعد سب سے زیادہ علامتی اظہار فیض احمد فیض نے کیا ہے۔ ان کے شعری عمل میں رات ،سحر،ظلمت،سویرا،پرچم اور شفق وغیرہ بنیادی رجحانات کی علامتیں ہیں۔ اقبال کی طرح انھوں نے بھی ان علامتوں کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے،انھوں نے رات کو پرانے نظام اور سحر کو مستقبل اور خوابوں اور امیدوں کے لیے استعمال کیا ہے۔اقبال کے بعد جوش نے سماجی ،معاشی زندگی سے جوڑ دیا ۔ا س بارے میں آلِ احمد سرور رقم طراز ہیں:

’’جوش ایک عرصہ تک پھولوں کی سیج پر محبوبہ کی انگڑائیاں دیکھنے میں مست رہے۔ انھیں مدتوں کسی میخانے سے باہر نہیں دیکھا ہر عورت ان کے نزدیک ابلتی ، جگمگاتی ،جاگتی دعوت تھی۔ لیکن اس کے ساتھ وہ سرمایہ داروں کی چیرہ دستیوں ،کسانوں کی زبوں حالی ،غداروں کی سیاست ،نازک اندماں کانچ کی نسائیت ،نصرانیت کی طرف اقدام مولویوں کی ریاکاری معاشرے میں روپے کی کارفرمائی برداشت نہ کر سکے اور چیخ اٹھے۔‘‘(۳۱)

جوش نے ملک کو غلام بنانے والی قوتوں کو للکارا۔انھوں نے اپنی انقلابی نظموں سے تحریک آزادی کو تازہ ولولہ دیا اور قوم کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ جوش فرنگی نظام اور سامراجی طبقے سے نجات دلانے کے لیے میدان میں آگئے۔اس زمانے میں انھوں نے ’’شکستِ زنداں کا خواب‘‘،ایسٹ ا نڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب،بغاوت،ترانہ آزادی وطن،نعرہ شباب ،شریک زندگی سے خطاب،’’سجاد سے‘‘اور’’بیدار ہو بیدار‘‘ جیسی انقلابی نظمیں تخلیق کیں۔جوش ملیح آبادی کی شاعری کی ’’صدائے باز گشت ‘‘ہمیں علی سردار جعفری اور اسرار الحق مجاز اور دوسرے شعرا کی نظموں میں سنائی دیتی ہے۔ علی سردار جعفری کی نظمیں موضوع اور ہیئت کے حوالے سے بڑی اہم ہیں۔ ان میں کچھ ایسی ہی گھن گرج ہے جو جوش کی نظموں میں ملتی ہے۔ان میں وہی جوش کا سا حوصلہ ،مصمم ارادہ،امید کا پہلو اور باغیانہ انداز ملتا ہے۔ علی سردارا جعفری کی نظمیں’’ جنگ اور انقلاب‘‘ ،’’انقلاب روس‘‘اور’’تعمیر نو‘‘ بڑی اہم ہیں۔ان میں آزادی اور خودمختاری کی نغمہ سرائی کی گئی ہے اور ظلم وبربریت کے خلاف عوام میں ہمت وحوصلہ پیدا کیا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں لوگوں کی کشمکش ،زیست اور امنگوں کی عکاسی کی ہے۔ علی سردار جعفری کی نظمیں جوش کی طرح انقلابی رنگ میں رنگی ہوئی ہیں۔ان کے کلام میں جہاں نعرہ بازی ،للکار،انقلاب ،احتجاج ،بغاوت،توپوں اور ٹینکوں کی آواز سنائی دیتی ہے،وہیں رومانیت کے میٹھے اور سریلے نغمے بھی گونجتے ہیں۔

ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر نے بھی زندگی کے متعدد پہلوؤ ں کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔ ان کی نظموں میں شدت کا احسا س بھی اور جذبے کی فراوانی بھی ہے۔ ان کی نظموں میں رومانیت اور حقیقت کو بڑے خوب صورت انداز میں آمیز کیا گیا ہے۔تاثیر نے زندگی کے تلخ حقائق کو ہلکے پھلکے انداز میں پیش کرتے ہوئے ہیئت کے تجربے کیے ہیں،تاثیر کے شعری مجموعہ ’’آتش کدہ‘‘ میں شامل نظموں میں رومانیت ،اشتراکیت ،قومیت اور وطنیت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ڈاکٹر تاثیر کی شاعری میں جذبات اور عشق کی کیفیات سمیت غریب اور نچلے طبقے کے ساتھ ہونے والے امتیازی سلوک کا ذکر ملتا ہے۔تاثیر کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عنبرین منیر رقم طراز ہیں:

''ایم ڈی تاثیر کی شاعری میں جوانی کے جذبات ،عشق کی کیفیات اور جبلی خواہشات کی داخلیت اور ہندوستانی معاشرے کے پسے ہوئے طبقے کی لاچاری ،بھوک ،جنسی ومعاشی استحصال کے خلاف انقلاب آفریں حربے واضح نظر آتے ہیں۔''(۳۲)

تاثیر نے اپنی نظموں میں سماجی مسائل اور نا ہمواریوں کا ذکر کیا ہے۔وہ انسان پرست ،انقلابی سوچ اور انسان کے اقتصادی مسائل کا رمز شناس ہے۔انھوں نے مزدوروں اور آجر کے آپسی تعلقات ،کشمکش اور تصادم کو بھی پیش کیا ہے۔ انھوں نے مزدور مرد ہی نہیں بل کہ مزدور عورتوں کو بھی اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔انھوں نے ہیئتی تجربے کرتے ہوئے آزاد نظم کے اچھے نمونے پیش کیے ہیں۔ان کی نظم''کارزار'' میں خارجی اور داخلی زندگی کی جھلمل ہے ۔نظم ''سائے''اور''راہرو''میں تنہائی کے لرزتے اور سرسراتے ہوئے سائے علامت کی صورت میں ابھرے ہیں۔ نظم ''غریبوں کی صدا''میں غریبوں کی بغاوت کی آواز بلند کی ہے ،نظم سرمایہ داری میں اشتراکی تصورات پھلنے پھولنے اور سرمایہ داری نظام کے خاتمے کا ذکر ملتا ہے۔ اور نظم ''سنہری دنیا'' میں رمزیہ انداز میں اشتراکی تصورات پیش کیے گئے ہیں۔

اسرار الحق مجاز نے غلامی کے احسا س کو اپنی نظموں میں پیش کیا ہے۔ وہ وطن کے نوجوانوں کو پکار کر فرسودہ نظام کو جڑ سے اکھاڑنے کا کہتے ہیں۔ ان کی نظمیں''ایک جلا وطن کی واپسی''اور''اندھیری رات کا مسافر'' نوجوانوں کے ابلتے ہوئے جذبات کی آئینہ دار ہیں۔مجاز کی نظم ''جلا وطن کی واپسی''دیکھیے:

اپنا پرچم کچھ اس انداز سے لہراتا ہے
رنگ اغیار کے چہروں سے اڑا جاتا ہے
کوئی شاداں ، کوئی حیراں ،کوئی شرماتا ہے
کون یہ ساحل مشرق پہ نظر آتا ہے

(۳۳)

مجاز نے اپنی شاعری میں جمہوریت اور آزادی کی بات کی ہے۔ انھیں وطن سے بے حد محبت ہے۔ وہ ظلم وناانصافی اور سامراج کے خلاف ہیں ۔ان کی نظم ''اندھیری رات کا مسافر''کا نمونہ دیکھیے:

جوانی کی اندھیری رات ہے ظلمت کا طوفاں ہے
مری راہوں سے نورِ ماہ وانجم تک گریزاں ہے
خدا سویا ہوا ہے ، اہرمن محشر بداماں ہے

مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا
ہوں

(۳۴)

فیض صاحب نے ظلم وناانصافی اور سامراج کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے مگر ان کی شاعری میں دیگر شعرا کی طرح نفرت،دشمنی اور انتقام نہیں ملتا بل کہ انھوں نے اس کی مذمت کے لیے بڑا مہذب لب ولہجہ اپنایا ہے۔ انھوں نے آزادی وجمہوریت کی بات کی ہے۔وہ غلامی کے عہد کو قید وبند، زنجیر وسلاسل اور مجبوری ومحرومی کا دور قرار دیتے ہیں۔ نظم''چند روز اور مری جان'' اسی نوع کی نظم ہے:

چند روز اور مری جاں! فقط چند ہی روز
ظلم کی چھاؤں میں دم لینے دے پہ مجبور ہیں
ہم

(۳۵)

فیض کے سینے میں انسان کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے وہ اس درد کو اپنا درد خیال کرتے ہیں اور اپنی حسرتوں اور نا آسودہ خواہشوں کا خوب ذکر کرتے ہیں۔ انھوں نے ظلم کی چکی میں پسے ہوئے اور درد میں ڈوبے ہوئے انسان کی ترجمانی کی ہے۔ ان کی نظم''ہم لوگ'' میں ظلم ودرد سے سسکتے اور تڑپتے ہوئے انسانوں کے چہرے نظر آتے ہیں۔ فیض نے نظم''موضوع سخن ''میں ظلم وناانصافی اور جہالت کو موضوع بنایا ہے۔مجاز اور فیض کی نظمیں اگرچہ ہیئتی اعتبار سے مختلف ہیں لیکن ان میں موضوعاتی اشتراک بدرجہ اتم موجود ہے۔ترقی پسند شعرا نے فطرت،ماضی پرستی ،حب وطن اور قوم پرستی کے محدود تصور کو پس پشت ڈال کر کسان اور زمیندار،مزدور اور سرمایہ دار،آجر اور اجیر،غلام اور مالک،بھوک ،افلاس،بیماری،مساوات اور مسائل کی یکساں تقسیم کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔مجاز نے محض قومیت،وطنیت ۔آزادی اور حریت کے نغمے الاپنے کے بجائے زبان ،رنگ اور جغرافیائی تقسیم کے بغیر انقلاب اور نئےدور کی بات کی۔مجاز کی انقلابی نظمیں ''سرمایہ داری ''اور''انقلاب'' کسانوں،مزدوروں،انقلاب ،پیام آزادی اور نئے دور کا ترانہ سنا رہی ہیں۔مجاز اور فیض کی رومانی شاعری بھی دلکش اور دل گداز ہے اور ان کی نظریاتی شاعری بھی بے نظیر ہے۔ پروفیسر منظر ایوبی ،جوش،مجاز اور فیض کی شاعری میں پائے جانے والے موضوعاتی وہیئتی اشتراک کے بارے میں لکھتے ہیں

''مجاز اور فیض دونوں رومانیت کی سرسبز شاداب وادیوں سے گزر کر وقت کی ترقی پسند راہگزاروں پر گامزن ہوئے تھے لہٰذا دونوں کے یہاں جذبات واحساسات کی وہی شدت اور

وہی تیزی ملتی ہے جو کسی تحریک سے وابستہ ہونے پر شروع شروع میں کسی فنکار کے یہاں پائی جاتی ہے۔ مجاز کے یہاں یہ تیزی وتندی فیض کے مقابلے میں زیادہ ہے،کیوں کہ مجاز نے جوش کا براہ راست اثر قبول کیا ہے اور مدتوں جوش کی صحبتوں سے فیض یاب ہوئے ہیں۔''(۳٦)

مجاز کی نظم''اعتراف'' حیاتِ انسانی کے تلخ حقائق کے گرد گھومتی ہے۔ ان کی نظم''آوارہ'' میں ہندوستان کے تمام طبقوں کی ترجمانی کی گئی ہے۔ یہ نظم مجبور،مظلوم ومحکوم اور بے روزگار تعلیم یافتہ طبقے کی پکار ہے۔ترقی پسند شاعری میں دوسری زبانوں کا ترجمہ کرنا اور اس سے متاثر ہونے کی وجہ سے بھی کچھ اشتراکات ملتے ہیں۔ ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر کی بات کریں تو انھوں نے منظوم ترجمے کیے ہیں۔ انھوں نے جرمنی کے شاعر بائنے کی ایک نظم''مگر اے دل'' اور ترکی کے شاعر خلیل کی نظم کا ترجمہ''دور حیات'' کے نام سے کیا ہے۔ تاثیر کی نظمیں ''رس بھرے ہونٹ'' اور ''کارزار ''موضوعاتی اعتبار سے بائنے سے مماثلت رکھتی ہیں۔ ان کی متعدد نظمیں موضوع اسلوب کے حوالے سے مغربی شاعری سے متاثر ہیں۔ تاثیر کی نظموں میں ورڈزورتھ،کیٹس اور ڈبلیو بی ییٹس کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کی نظمیں''دہقانی بول''،''دہقاں کا مستقبل ''اور''عندلیب'' وغیرہ اس حوالے سے اہم ہیں۔ ورڈزورتھ نے دیہاتی لڑکی لوسی اور چرواہوں کے گیت کو مرکز بنایا ہے۔ اسی طرح تاثیر نے ''دیوداسی'' میں ہندوستانی تہذیب ومعاشرت کو نئے انداز میں پیش کیا ہے۔ اس نظم کی غنائیت شیلے کی سی معلوم ہوتی ہے۔ اسرار الحق مجاز نے بھی انگریزی رومانوی شعرا کا اثر قبول کیا اور اردو کے رومانی اور انقلابی شعرا سے بھی متاثر ہوئے ۔انھوں نے فیض اور شیلے کی غنائیت کا گہرا اثر قبول کیا ۔کہیں کہیں ان کی رومانیت اختر شیرانی اور حفیظ جیسی بھی لگتی ہے۔ اس ضمن میں نگہت ناہید ظفر رقم طراز ہیں:

''اسرار الحق کی غنائیت اردو شاعری میں فیض اور انگریزی میں شیلے کی غنائیت کا اثر لیے ہوئے ہے۔مجاز رومانیت اور انقلاب کا امتزاج اور مجاز کی رومانیت کبھی کبھی اختر شیرانی سے مماثلت دکھائی دیتی ہے اور کبھی جوش سے مجاز کی رومانیت ملتی ہے۔''(۳۷)

مجاز شیلے کی طرح فرسودہ نظام سے باغی اور بیزار نظر آتے ہیں ،وہ سرمایہ داروں اور اونچے طبقے کے فریب اور جھوٹے دعوؤں کو بے نقاب کرتے ہیں۔محبت اور انقلاب ان کا دھرم ہے۔ مجاز کا انقلابی انداز شیلے کا سا لگتا ہے اور رومانی حزن وملال میں وہ کیٹس کے مقلد نظر آتے ہیں۔ مجاز کی نظم''نورا''کیٹس کی نظم''فینی'' جیسی ہے اس لیے وہ اختر سے بھی متاثر لگتے ہیں کیوں کہ اختر کی سلمیٰ بھی کیٹس کی فینی لگتی ہے یا مجاز کی نورا اختر کی سلمیٰ لگتی ہے۔فیض پر بھی بائرن اور شیلے کا گہرا اثر پڑا کیوں کہ وہ انگریزی کے طالب علم تھے۔ فیض کی نظم ''حسینۂ خیال سے'' رابرٹ براؤننگ کی نظم کا ترجمہ ہے اور

فیض کی نظم ’’مرگِ سوزِ محبت‘‘ ییٹس کی نظم ’’ The Lover Mourns for the Loss of Love‘‘ اور ’’مری جاں اب بھی اپنا حسن واپس پھیر دے مجھ کو‘‘ ییٹس کی نظم’’ He Remembers forgotten Beauty‘‘ ہی کا عکس ہے۔ انگریزی رومانوی شعرا میں سب سے زیادہ شیلے نے فیض کو متاثر کیا کیوں کہ فیض کی متعدد نظموں کی رومانوی فضا شیلے کی سی ہے۔اس طرح کی نظموں میں’’انتظار‘‘ ،’’تہِ نجوم‘‘،’’سرودِ شبانہ‘‘اور ’’میرے ندیم‘‘شامل ہیں۔ شیلے کی نظم Memoryاور فیض کے اس قطعہ کا رنگ ایک جیسا ہے:

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے

(۳۸)

فیض کے بعد شیلے کی نظم Memoryسے احمد ندیم قاسمی نے بھی اکتساب کیا ہے،ندیم کی نظم ’’یاد‘‘ دیکھیے:

رات کے وقت ، میرے دل پہ تری یاد کا ہاتھ
اتنی نرمی سے اترتا ہے کہ جیسے شبنم
اک چٹکتی ہوئی نورستہ کلی پر اترے

(۳۹)

فیض کی شاعری میں سکوت،چاندنی،تاریکی اور نیم شب بائرن کی طرح کی ہیں،فیض کا جمالیاتی احساس اور غنائیت دلکش ہے شاید انھوں نے یہ اثر انگریزی سے لیا ہو،ان کی نظم ’’تنہائی‘‘ملاحظہ ہو:

پھر کوئی آیا دلِ زار نہیں کوئی
نہیں
راہرو ہوگا ،کہیں اور چلا
جائے گا

(۴۰)

اس نظم میں الم اور حزن وملال کیٹس جیسا ،اس کی غنائیت شیلے کی سی اور اس کی تخیلاتی دنیا ییٹس جیسی ہے۔ڈاکٹر آغا سہیل ،فیض کی شاعری کے بارے میں رقم طراز ہیں:

’’فیض کی رومانی شاعری ایک ایسی قوم کی آزادی کا خواب ہے جو جبر اور استعماریت میں جکڑی ہوئی ہے اور ان کی زنجیروں کو توڑ کر آزاد فضا میں سانس لینا چاہتی ہے۔‘‘(۴۱)

فیض کی رومانوی المیہ پسندی اور جمالیاتی احساس ان کی نظموں''مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ''،''اے روشنیوں کے شہر''اور''نثار میں تری گلیوں کہ جہاں'' میں نمایاں ہے۔احمد ندیم قاسمی بھی انگریزی شعرا سے متاثر دکھائی دیتے ہیں۔انھوں چاند اور تارے کی علامت سب سے زیادہ استعمال کی ہے۔ ان کی نظمیں''چاند گھبرا گیا''،''ابھی چاند نکلا نہیں''،''چاند''،''ستارۂ شام''اور''یہ ستارے'' پر شیلے کے اثرات ہیں۔کیوں کہ شیلے کی پسندیدہ علامات بھی چاند اور تارے ہیں۔ ندیم کا انداز دیکھیے:

گنجان صنوبروں کے پیچھے
اک چاند ہزار چاند بن کر
تاروں کی طرح بکھر گیا

(۳۲)

شیلے کی ''Love Philosophy''اور''Ode to west Wind'' کے اثرات ندیم کی نظموں ''ترک صحبت'' اور ''دو دائرہ'' پر دکھائی دیتے ہیں۔ ترقی پسند شعرا کی شاعری میں ہیئت کی بات کریں تو مجاز کی نظمیں پابند ہیئت میں ہیں۔ان کی زیادہ تر نظمیں غزل کی فارم میں ہیں اور کچھ مثنوی وغیرہ میں بھی ہیں۔ انھوں نے قطعات بھی لکھے ہیں۔ انھوں نے صرف چند نظمیں آزاد ہیئت میں لکھی ہیں۔ مجاز نے اقبال اور جوش کے یہاں پائی جانے والی ہیئتیں استعمال کی ہیں۔ مجاز ،علی سردار جعفری ،جاں نثار اختر ،کیفی اعظمی اور ساحر لدھیانوی نے طویل نظمیں بھی لکھی ہیں۔علی سردار کی ''نئی دنیا کو سلام''اور ساحر لدھیانوی کی''پرچھائیاں''موضوعاتی اعتبار سے اشتراک رکھتی ہیں۔

ترقی پسند شعرا کی شاعری میں موضوعاتی وہیئتی اشتراکات اس لیے عام ہیں کیوں کہ اس میں ایک سے ڈکشن کی باربار تکرار کے ساتھ ساتھ ایک سے سیاسی ومعاشرتی حالات کا سامنا رہا ہے۔ ترقی پسندوں نے سیاسی اور انقلابی نظمو ں میں خطیبانہ اور عوامی ڈکشن استعمال کیا ۔ایک سے ڈکشن کے حامل ترقی پسندوں نے لوگوں میں دشمن،سامراجی،سرمایہ داری اور جاگیرداری طاقتوں کے خلاف نفرت اور بغاوت پیدا کی اور مظلوم نچلے اور مزدور طبقے کے لیے ہمدردی،رحم اور حمایت کا اعلا ن کیا ہے۔انھوں نے فرسودہ اور روایتی نظام جس نے معاشرے کو تباہ کر دیا اس کو بدلنے پر آمادگی دلائی۔ان شعرا کے ڈکشن پر پرشکوہ ،بھاری بھرکم الفاظ اور فارسیت کا غلبہ ہے۔ ترقی پسند شعرا نے محبت،عداوت،نفرت،بغاوت،ہمدردی ،صلح اور اخوت جیسے جذبات ابھارنے کی کوشش کی۔ مجاز کی نظموں میں استعمال ہونے والے الفاظ اور مخدوم ،علی سردار جعفری اور جاں نثار اختر کی نظموں میں استعمال ہونے والے الفاظ میں یکسانیت ہے۔

مجاز کی نظم"اندھیری رات کے مسافر" میں الفاظ اور ڈکشن اس طرح ہے،اندھیری رات،ظلمت کا طوفاں،غم وحرماں کی یورش، مصائب کی گھٹائیں، پرزور آندھی، موت کے

تاریک سائے، تخریب، لٹیرے، لشکرِ ظلمت، قیامت خیز طوفاں، تلاطم خیز دریا، آگ کا میدان ،گرجتی آندھیاں، تباہی کے فرشتے، جبر کے شیطان ، دیواستبداد کا خنجر، سیاست کی سنانیں، خون آشام شمشیریں، کدال،توپ،بندوقیں،نیزے،سلاسل،بیڑیاں، پھانسی کے تختے، جنگ کا خونی ستارہ اور اجل کے قہقہے شامل ہیں۔مخدوم کی نظم"زلفِ چلیپا" کا ڈکشن اور الفاظ میں سرمایہ داری،بربادی،آندھیاں،شعلہ بداماں، خون کی برسات، بوئے آتش وبارود، مندروں ،معبودوں،کلیساؤنمیں موت، زرگری کا رقص، مرگِ ناگہاں کا رقص، برہمی، موت کا لبریز ساغر، عصرِ حاضر کے غلام، سرخ پرچم اور بغاوت وغیرہ شامل ہیں۔ علی سردار جعفری نے اپنی نظم "آگے بڑھیں گے" میں بجلی، شعلہ،شرارہ ،جنوں،بغاوت،توپیں،دھل،کدالوں کے پھل،آندھی زدہ،چٹانوں میں راہ بنانا،کمانیں جھکانا، افق اور سحر جیسے الفاظ اور ڈکشن ملتا ہے۔ساحر لدھیانوی نے نظم"پکارے" میں افق ،سرخ ،مشعل،لہو،بادل،گرج،طیارۂ جنگ، تاریک فضا،بجلی شمشیر،ڈھال،کدال،افلاس،انتقام کی پیاس، خشمکیں،آگ،خون کی جھاگ اور انقلاب کا راگ جیسے الفاظ استعمال کیے ان ترقی پسند شعرا کی نظموں کے ڈکشن اور الفاظ کے استعمال سے وہ عوام کی توجہ حاصل کرنے اور انھیں سامراج ،حاکم ،ظالم،سرمایہ دار اور جاگیردار طبقے کے خلاف نفرت ،بغاوت ،غم وغصہ دلانے میں خاصے کامیاب ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنے مخصوص ڈکشن اور الفاظ کے استعمال سے عوام تک آواز پہنچائی ہے۔

مجاز کی نظم''انقلاب'' اس حوالے سے اہم ہے۔ انھوں نے اپنی نظم ''بول اری او دھرتی بول'' میں آزادی کا خواب دیکھا ہے۔آزادی کا یہ خواب ہمیں فیض کی نظموں میں بھی ملتا ہے۔فیض نے ہم عصر شعرا کو بھی آزادی کی فکر دی ہے۔ وہ اپنی مقبول نظم''بول'' میں آزادی اظہار وخیال کا پرچم بلند کرتے ہیں۔ اب فیض کی نظم میں آزادئ اظہار کا پہلو دیکھیے:

بول ، کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول ، زباں اب تک تیری ہے

(۴۳)

فیض کی اس نظم میں آہن گر کی دکان،سرخ آہن، تند شعلے ،قفلوں کے دہانے، زنجیر کا دمان مزاحمتی علامات ہیں۔ یہ نظم فیض نے اس وقت لکھی جب تحریک آزادی عروج پر تھی ۔آہن گر کی دکان ،برطانوی سامراج کی علامت ہے اور دیگر علامات ان کے مظالم کو ظاہر کرتی ہیں۔ فیض کی نظموں میں استعمال ہونے والی علامات میں بغاوت کا رجحان ،مزاحمت ،قید وبند اور غلامی وآزادی کے تصورات کا اظہار ہے۔فیض کی نظموں میں عوام دوستی، سماجی شعور،آزادی کی کسک اور انسان کا درد پایا جاتا ہے۔ان کی شاعری کا کینوس بہت وسیع ہے ان کو عوام کا درد اپنا درد محسوس ہوتا ہے۔ان کی شاعری میں جغرافیائی حدود کی کوئی اہمیت نہیں۔فیض نے قنوطیت کے مقابلے میں رجائیت کا پہلو پیش کیا ہے۔ انھوں نے افسردگی ،مایوسی،پستی،ناامیدی، اندھیروں میں ،پرعزم ،پر امیدی،حوصلہ مندی اور بانکپن کا چراغ جلایا ہے۔فیض کی نظم "سیاسی لیڈر کے نام" ایک علامتی نظم ہے۔فیض علامتی اور

سنجیدہ انداز میں بات کرتے ہیں جب کہ حبیب جالب اشاروں کنایوں میں حکمران طبقے پر تنقید کرتے ہیں لیکن ان کا لہجہ زیادہ تلخ ہے۔ فیض کی طرح کی ایک نظم''یہ وزیران کرام''حبیب جالب نے بھی لکھی ہے:

کوئی ممنون فرنگی ، کوئی ڈالر
کا غلام
دھڑکنیں محکوم ان کی لب پہ
آزادی کا نام
ان کو کیا معلوم کس حالت میں
رہتے ہیں عوام

(۴۴)

ترقی پسند شعرا میں سے اکثر آغاز میں عشقیہ نظمیں لکھتے رہے ان کی ابتدائی شاعری داخلی کیفیات کی ترجمان ہے۔اکثر شعرا پر اختر شیرانی کا تصوراتی اثر دکھائی دیتا ہے۔ اختر کے اس تصوراتی رومان کا اثر قبول کرنے سے متعلق عقیل احمد صدیقی لکھتے ہیں:

''ترقی پسند شاعروں میں سے بیش تر اپنے شعری سفر کے آغاز میں ہلکی پھلکی عشقیہ نظمیں لکھتے رہے۔ ان نظموں پر اختر شیرانی کے تصوراتی عشق کا پورا پرتو رہا ہے۔ مجاز ،مخدوم،کیفی،جاں نثار اختر اور فیض بھی اختر شیرانی سے متاثر رہے ہیں۔''(۴۵)

ان ترقی پسند شعرا نے ایسی نظمیں تخلیق کیں جس میں انھوں نے اپنے محبوب سے پہلے جیسا پیار اور پہلے جیسی وفاداری ،محبت اور توجہ نہ مانگنے کا کہا ہے۔ ان کے دل میں غم جاناں سے بڑھ کر غم دوراں کا درد پیدا ہوگیا۔ شعرا نے اپنے محبوب سے جن نظموں میں معذرت کی ان میں علی سردار جعفری کی ''انتظار نہ کرنا''،سلام مچھلی شہری کی''شرائط''،اسرارلحق مجاز کی''نوجوان خاتون سے''جاں نثار اختر کی''زندگی''اور فیض احمد فیض کی ''مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ''اہم ہیں۔ان تمام نظموں میں انقلاب کی وابستگی کا الھڑ پن اور جوش دکھائی دیتا ہے۔اسرار لحق مجاز اور جاں نثار اختر نے ایک ہی عنوان اور ایک ہی موضوع(نوجوان خاتوں سے) پر خوب صورت نظمیں تخلیق کی ہیں۔ اسرار الحق کی نظم ''نوجوان خاتون سے'' کا نمونہ دیکھیے:

حجابِ فتنہ پرور اب اٹھا لیتی تو اچھا تھا
خود اپنے حسن کو پردہ بنا لیتی تو اچھا تھا
ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن

تو اس آنچل سے ایک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

(۳٦)

جاں نثار اختر کی نظم''نوجوان خاتون سے''کا نمونہ ملاحظہ کیجیے:

یہ قفس سازِ حرم کی چلمن
یہ حجابات یہ برقعوں کے کفن
مرگ آسا ہیں قدامت کے چلن
تو بھی جاگ زمانہ جاگا
اب یہ طوفانِ ادا رہنے دے
یہ محبت کی بلا رہنے دے
تیرے آنچل میں ہزاروں پرچم

(۳۷)

جاں نثار اختر نے اپنا انقلابی عشق اور تصور محبوب پیش کیا ہے۔ ان کی اس طرح دوسری اہم نظموں میں''کون سا گیت سنو کی انجم''،'' ایک خاتون سے'' اور''حواکی بیٹی''شامل ہیں۔ مجاز نے نوجوان خاتون کو اپنے آنچل سے پرچم بنانے کا کہا ہے جب کہ اختر نے اپنی محبوب عورت کو بغاوت کا بھرم کہا ہے انھوں نے خاتون کے آنچل سے ہزاروں پرچم بنائے ہیں۔فیض کی دوسری جن نظمونمیں محبوب سے معذرت ،محبت سے رست گاری اور پہلے جیسا عشق طلب نہ کرنے کا کہا گیا ہے ان میں ''میرے ہمدم میرے دوست''،''مرگِ سوز محبت''،''رقیب سے'' اور''چند روز اور مری جان'' شامل ہیں۔فیض کی نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ''میں عاشق اپنے محبوب سے مخاطب ہے۔ساحر لدھیانوی کی نظم''کسی کو اداس دیکھ کر'' کا عاشق بھی اپنی محبوبہ سے ایسے ہی مخاطب ہوتا ہے:

فیض کی نظم کا نمونہ دیکھیے:

لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجیے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن ، مگر کیا کیجیے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا

(۳۸)

اب ساحر کی نظم کا نمونہ دیکھیے:

تمھارے غم کے سوا اور بھی تو غم ہیں
مجھے
نجات جن سے میں اک لحظہ پا نہیں سکتا

(۴۹)

مجاز اور جاں نثار اختر کی طرح کیفی اعظمی بھی عورت کو محض حسن کا پیکر نہیں سمجھتے اور اس کا سراپا بیان کرنے کے بجائے اسے شریک زندگی قرار دیتے ہیں کہ وہ بھی انقلابی جدوجہد میں مردوں کا ساتھ دے۔انھوں نے نظم''عورت''میں عورت کو بیدار کر کےاسے حوصلہ دیتے ہیں اور زندگی کی تلخیاں اور حقیقت کا آئینہ دکھاتے ہیں۔

حسن اور عشق ہم آواز و ہم آہنگ ہیں آج
جس میں جلتا ہوں اسی آگ میں جلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان! مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

(۵۰)

عورت فرسودہ نظام اور رسم ورواج کے خلاف آواز بلند کر سکتی ہے اور اس کے خاتمے کے لیے اہم کردار ادا کر سکتی ہے ۔قدرت نے اس قدر اسے صلاحیت بخشی ہے کہ وہ کئی کارہائے نمایاں سرانجام دے سکتی ہے۔کیفی نے اس نظم میں ہندوستان کی عورتوں کو ہمت وحوصلہ دیا ہے۔ترقی پسندوں نے رومانویوں کی طرح عورت کو ماورائی مخلوق بنا کر پیش نہیں کیا بل کہ معاشرے میں عورت کی حیثیت بڑی اہم قرار دی ہے۔کیفی نے عورت کو کہا ہے کہ وہ سماجی مسائل کے حل کے لیے مردوں کے شانہ بشانہ چل کر تبدیلی لانے کے لیے سعی کریں۔ کیفی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے فیض احمد فیض رقم طراز ہیں:

''غم جاناں کا ذکر ہو کہ غم دوراں کا ،بوسۂ لب کی بات ہو کہ بوسۂ زنجیر کی،کیفی بات ہمیشہ کھری کرتے ہیں۔جیسی سفاک اور بے رحم زندگی ہمارے گردوپیش موجود ہے اسی کی بے کم وکاست منظر کشی کیفی کا مسلکِ شعر ہے۔''(۵۱)

سیاسی ومعاشی مسائل کے ساتھ ساتھ جنسی جذبے کا اظہار بھی ترقی پسند شعرا کے یہاں ملتا ہے۔ان کے خیال میں جنسی گھٹن اور ناآسودگی کا سبب بورژوا معاشی نظام ہے۔ساحر کی نظمیں آزادی کی امید لیے ہوئے ہیں۔ ان کی نظم''شعاع فردا'' پر فیض کے اثرات نمایاں ہیں۔ ان کی نظم ''امید'' بھی اہم ہے۔ ساحر انسانی عظمت کے شاعر ہیں ان کے نزدیک دنیا کی آسائشوں سے زیادہ اہم ناداروں اور غریبوں کی زندگی ہے۔ وہ بڑے حساس دل انسان ہیں ،فاقہ کش لوگوں اور بچوں کو دیکھ کر پریشان ہو جاتے ہیں۔ وہ محض شعلہ نوائی یا نغمہ سرائی

نہیں کرتے ،ان کے سامنے سماجی تہذیب کی برہنگی ہے،ساحر کی نظم ''مرے گیت'' ملاحظہ کیجیے:

مرے سرکش ترانے سن کے دنیا یہ سمجھتی
ہے
کہ شاید مرے دل کو عشق کے نغموں سے
نفرت ہے
مجھے ہنگامہ جنگ و جدل میں کیف ملتا ہے
مجھے انسانیت کا درد بھی بخشا ہے قدرت نے

(۵۲)

ساحر نے کسانوں،مزدوروں اور محنت کشوں کی حمایت اور ظلم وجبر کی طاقتوں کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ رومانیت کے اہم موضوعات دیگر ترقی پسندوں کی نسبت فیض اور ساحر کے یہاں معراج پر ہیں۔ ان دو شعرا نے رومانی طرز احساس غیر روایتی طریقے سے اپنا کر اپنی نظمیں تخلیق کی ہیں۔ لگتا ہے فیض نے اقبال کے عشق اور اختر شیرانی کے رومان کے اشتراک سے اپنی شاعری تخلیق کی ہے اور ساحر نے اپنے جذباتی آہنگ سے اپنے رنگِ سخن میں انفرادیت پیدا کر دی ہے۔ فیض اور ساحر کی طرح علی سردار جعفری کی نظم"مزدور لڑکیاں" رومان واشتراکیت کی حسین مثال ہے جب کہ جاں نثار اختر کی نظم''مزدور عورتیں''ترقی پسند فکر کی عمدہ مثال پیش کرتی ہے۔علی سردار جعفری نے مزدور اور سرمایہ دار طبقے کا تقابلی جائزہ رومانوی فضا میں لیا ہے۔ انھوں نے مزدور لڑکیوں کی زبوں حالی کی تصویر کشی کے بعد ان کے مقابلے میں سرمایہ دار لڑکیوں کی عیش وعشرت کو بیان کیا ہے۔جان نثار اختر نے اپنی نظم میں مزدور عورتوں کی غربت،افلاس اور بدحالی کا ذکر کیا ہے۔انھوں نے غربت کی سطح سے نیچے زندگی گزارنے والے انسانوں کی زندگیوں کی عکاسی کی ہے۔

علی سردار جعفری نے بغاوت ،انقلاب،احتجاج ،ظلم واستبداد کے لیے پر جوش نظمیں لکھی ہیں مگر ان کی شاعری میں حسن و عشق کے فلسفے بھی ملتے ہیں۔علی سردار جعفری کی شاعری میں رومانیت کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ اس طرز احسا س کی نمایندہ نظموں میں ''محبت کا خوں''،''ایک خط کا جواب''،''حسن ناتمام''،''لکھنو کی ایک شام''،''محبت کا فسوں''اور ''فراموش کردند عشق''اہم ہیں۔نظم ''حسن ناتمام'' کا نمونہ دیکھیے:

کس قدر شاداب و دلکش ہے وہ حسن ناتمام
جس کی فطرت غنچگی ، دوشیزگی ہے جس کا
نام
جس طرح پچھلے پہر کا صاف وپاکیزہ افق

(۵۳)

مخدوم محی الدین نے آغاز میں عشقیہ نظمیں لکھیں ،ان میں احساس وخلوص اور ذاتی کیفیات کی ترجمانی کی ہے۔ مخدوم کی رومانی انداز کی نظموں میں’’انتظار‘‘،سجدہ،طور،جوانی،یاد ہے،’’لمحۂ رخصت‘‘ اور’’نامہ حبیب‘‘ شامل ہیں۔’’طور‘‘ میں محبت کی کیفیت پائی جاتی ہے (یہ نظم روایتی ہیئت مخمس میں لکھی گئی ہے)جب کہ ’’انتظار‘‘ میں شب انتظار کی کیفیت پائی جاتی ہے۔نظم ’’سجدہ‘‘میں محبوب کے پیکر حسین ودلکش کی مصوری کی گئی ہے۔مخدوم کی رومانوی انداز کی نظم ’’آج کی رات نہ جا‘‘ ملاحظہ کیجیے:

زندگی لطف بھی ہے آزار بھی ہے
ساز و آہنگ بھی زنجیر کی جھنکار بھی ہے
زندگی دید بھی ہے حسرت دیدار بھی ہے

(۵۴)

اختر شیرانی کا رومان اور حفیظ کے گیتوں نے مخدوم پر اپنے اثرات مرتب کیے۔مخدوم کی رومانی طرز احساس کی نظمیں بھی روایتی رومانی نظموں سے یکسر مختلف ہیں۔ان میں جذبے کی پاکیزگی اور روحانیت پائی جاتی ہے۔کہیں بھی سطحی پھوہڑپن اور عریانیت نظر نہیں آتی۔ مخدوم کی شاعری میں پیار ومحبت کا جذبہ بڑا پاکیزہ ،ارفع واعلا ہے۔ ان کی محبت کی پاکیزگی کی ایک مثال ان کی نظم ’’تلنگن‘‘ہے۔مخدوم کی رومانوی طرز احساس کی دیگر اہم نظموں میں’’ساگر کے کنارے‘‘ میں شاعر نے اپنے محبوب کے وصال کی تمنا کی ہے۔ان کی نظمیں"محبت کی چھاؤں " اور" برسات" بھی تصور جاناں میں ڈوبی ہوئی ہیں۔مخدوم محی الدین نے آزاد ہیئت میں بھی نظمیں لکھیں ہیں ان کی ایک آزاد نظم’’چارہ گر‘‘ اشتراکی رومانیت کی عمدہ مثال ہے:

اک چنبیلی کے منڈوے تلے/مے کدے سے ذرا دور اُس موڑ پر/دوبدن/پیار کی آگ میں جل گئے(۵۵)

مخدوم کی آخری دور کی نظمیں آزاد ہیئت میں لکھی گئی ہیں ان میں علامتی اظہار زیادہ تہہ داری سے کیا ہے۔ ان نظموں میں ’’بلور‘‘،’’ملاقات‘‘،’’بےدرد مسیحا‘‘اور’’ خواہش‘‘ شامل ہیں۔مخدوم کی ایک اور آزاد نظم ’’وصال ‘‘ دیکھیے:

دھنک ٹوٹ کر سیج بنی/جھومر چمکا/ سناٹے چونکے/ آدھی رات کی آنکھ کھلی (۵۶)

مخدوم موضوعاتی اشتراکات کے بعد ہیئتی حوالے سے بھی فیض کے ساتھ گہرا اشتراک رکھتے ہیں۔مخدوم کی آخری دور کی نظموں میں بھی فیض کی آخری دور کی نظموں

کی طرح آزاد ہیئت کی نظمیں زیادہ ہیں۔ دونوں شعرا کی نظموں کے اسلوب و اظہار میں رومانوی آہنگ نمایاں ملتا ہے۔ اس حوالے سے قمر رئیس لکھتے ہیں:

''مخدوم کی آزاد نظموں کا رنگ و آہنگ فیض کی نظموں سے قریب تر ہے بل کہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ رومانوی فکر کی رنگینی ان کی نظموں میں زیادہ نمایاں رہتی ہے اور اسی وصف میں ان کی انفرادیت کا حسن پنہاں ہے۔''(۵۷)

مخدوم سے ہیئتی اشتراک کی ایک مثال فیض کی نظم''یہ فصل امیدوں کی ہمدم''میں ذات کی شکستگی کی علامت ملتی ہے۔اس نظم میں انھوں نے شکست اور ناکامیوں کے بعد نئی جستجو کا جذبہ پیدا کیا ہے:

سب کاٹ دو/بسمل پودوں کو/بےآب سسکتے مت چھوڑو/سب نوچ لو/بےکل پھولوں کو/شاخوں پہ بلکتے مت چھوڑو(۵۸)

فیض کے یہاں جو علامتیں ملتی ہیں ان میں طبقاتی تقسیم اور سماجی کشمکش نظر آتی ہے انھوں نے راستے کی رکاوٹوں اور پابندی کو علامت کے روپ میں بیان کیا ہے۔ فیض کی نظم ''منظر'' بھی آزاد ہیئت میں لکھی گئی ہے۔کیفی اعظمی کی رومانوی طرز احساس کی نظمیں لطیف کیفیتوں اور دل کی دھڑکنوں سے معمور ہیں ،یہ نظمیں عشق و محبت میں ڈوبی ہوئی کیفی کی داخلی کیفیتوں کی آئینہ دار ہیں۔رومانوی جذبے کی نظموں میں ''تجدید''،پامسٹ، تصور،نغمگی ،ٹرنک کال،حوصلہ،نیا حسن،تم،تاج محل،''برسات کی ایک رات''اور ''دوشیزہ مالن'' اہم ہیں۔ تاج محل کے عنوان سے ساحر لدھیانوی نے بھی نظم لکھی ہے اور مالن کے موضوع پر دیگر شعرا نے بھی طبع آزمائی کی ہے،کیفی کی ایک نظم''اندیشے'' بڑی اہم ہے۔کیفی کا رومانوی انداز دیکھیے:

وہ چاند جس کی تمنا تھی میری راتوں کو
تمھیں وہ چاند ہو اس چاند سی جبیں کی قسم
وہ پھول جس کے لیے میں چمن چمن میں گیا
تمھیں وہ پھول ہو رخسارِ احمریں کی قسم

(۵۹)

کیفی اعظمی کو ترقی پسندانہ نظموں سے شہرت تو ملی لیکن رومانوی نظموں نے بھی انھیں زندہ رکھا ہوا ہے۔ کیفی کی رومانوی نظمیں اختر شیرانی کی رومانیت کے زیر اثر ہیں۔ ایسی نظموں میں''تجدید''،ملاقات،تم ،''نقش ونگار'' اور'' پشیمانی'' شامل ہیں۔ڈاکٹر معین احسن جذبی کی نظم''طوائف'' کوئی نیا موضوع نہیں ہے لیکن انھوں نے اپنی شاعرانہ گدازی سے ایک نئی دلکشی پیدا کر دی ہے۔ اس نظم میں انھوں نے طوائف کا احساس کم

تری،مایوسی،حسرت اور محبت کے جذبات کو بے نقاب کیا ہے۔جذبی نے اپنی رومانی فطرت کو ترقی پسندی کے باوجود بھی دور نہیں ہونے دیا وہ ملک ہند کو ایسا گل سمجھتے ہیں جو بے مثال ہے۔انھوں نے ملک کو گل اور حسینہ کی طرح جمال حسن،ادائے ناز،محبوبیت اور سادہ لوحی کا پیکر بنا کر پیش کیا ہے۔جذبی کی نظم ''راز ونیاز'' میں اپنے محبوب کی تعریف بیان کی ہے۔

جمیل مظہری رومان وانقلاب کا حسین امتزاج ہیں،ان کی پہلی نظم''شاما''اختر شیرانی کے رسالہ''رومان'' میں شایع ہوئی۔جمیل مظہری کی نظم''یہ حسینہ جیتی جاگتی'' خالص ہندوستانی پس منظر میں لکھی گئی ہے اس میں پیش کی گئی حسینہ کا روپ ایک ہندوستانی عورت کا ساہے۔ اس میں ہندوستان کی سرزمین کا سوندھا پن اور سنگھار نمایاں ہے۔ ان کی مثنویوں میں عاشق اور محبت کے جذبات کی عکاسی تو کی گئی ہے مگر محبوب کے خدوخال کم ابھرے ہیں۔جمیل کی نظم''حسینوں کی عید'' ملاحظہ کیجیے:

پنی گھونگھٹ میں چھپائے ہوئے جنت ہر پھول
زلف مشکیں کی چرائے ہوئے نکہت ہر پھول
نشۂ وصل سے جھکتی ہوئی مغرور آنکھیں
رُسمسائی ہوئی ، جاگی ہوئی مخمور آنکھیں

(٦٠)

ان اشعار میں جمیل نے پیرہن اور خدوخال کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔انھوں نے اختر کی سلمیٰ اور عذرا کے روپ میں ہندوستانی عورت کا سراپا بیان کیا ہے۔جمیل کی عشقیہ نظموں میں ایک حسین سی کسک اور ایک شیریں اور رقص کرتی ہوئی خلش پائی جاتی ہے۔جمیل مظہری کی اختر اور مجاز سے مماثلت رکھتی ہوئی نظم''یہ کیا ہوا تم کو''ملاحظہ کیجیے:

یہ کیا ہوا مری عذراؔ ، یہ کیا ہوا تم کو
نظر اٹھاؤ خدارا ، یہ کیا ہوا تم کو
یہ کیوں بدل گئی دنیا یہ کیا ہوا تم کو

(٦١)

جمیل مظہری کی رومانی طرز احساس کی نظموں میں ''دوشیزہ بنگال ''،''نقوش ماضی''،''حسینوں کی عید''اور''کہتے ہیں اسی کو محبت'' شامل ہیں۔ ان کی نظم ''فاصلے'' بھی اہم ہے۔ اس میں ایک معمر حسینہ کو دیکھ کر بوڑھے شاعر کے جذبات بیان کیے گئے ہیں۔ دوسری نظم ''یاد ماضی'' ہے جس میں بوڑھے عشق کی بوڑھی کہانی بیان کی گئی ہے۔شاعر نے مدتوں بعد عذرا کو دیکھا تو بے اختیار اپنے جذبات کا اظہار کر دیا۔ جمیل

مظہری کے شعری مجموعے ''عکسِ جمیل'' کی ایک نہایت اہم نظم''بھوک لگی ہے بھوک'' طبقاتی تقسیم کے تناظر میں لکھی گئی ہے اور انداز بیان رومانوی ہے۔

ساحر لدھیانوی کی نظم''فن کار'' رومانیت اور ترقی پسندیت کے امتزاج میں ایک خوب صورت اضافہ ہے۔ انھوں نے اس نظم میں زندگی کیا یک تلخ حقیقت کی عکاسی کی ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ غربت انسان سے کیا کیا کراتی ہے ،انسان کو پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے کس طرح اپنے خوابوں اور اپنی خواہشوں کو بیچنا پڑتا ہے۔شاعر رومان کے پس منظر میں ایک سچائی بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اے میری محبت میں تجھے افلاس کی وجہ سے نہ اپنا سکا تو کسی زردار کا مقدر بن گئی۔میں نے جو تیری یاد کے خاکے بنائے تھے وہ بھی اپنے پاس نہیں رکھ سکا کیوں میں روزی روٹی کے چکر میں انھیں بھی بیچ دیا ہے۔اس طرح ساحر کا رومانوی رجحان جلد ہی کائنات اور سماج کا ترجمان بن جاتا ہے۔ اس اسلوب اور نظریہ کی حامل نظموں میں ''تاج محل'' اور''نورجہاں کا مزار'' کافی اہم ہیں۔ساحر کی یہ دونوں نظمیں مغل شہنشاہوں کی طرز تعمیر جاہ وجلال کی یاد دلاتی ہیں۔اقبال کی نظم''مسجد قرطبہ''،مجید امجد کی ''مقبرۂ جہانگیر''میراجی کی ''اجنتا کے غار''اور اخترالایمان کی نظم''مسجد'' بھی اسی نوع کی نظمیں ہیں۔ ساحر کے علاوہ بھی شعرا نے تاج محل پر نظمیں لکھیں مگر انھوں نے اس میں سطوتِ شاہی ،مغلوں کی عظمت وجلال ،فنِ تعمیر کی ستائش بیان کی ہے ۔ساحر نے پہلی مرتبہ تاج محل کا تاریک رخ دکھایا ہے۔ انھوں نے اس نظم میں نہ تو تاج محل کا مذاق اڑایا ہےاور نہ ہی اس عاشق کا جس نے اپنی محبوبہ کے لیے اس کوتعمیر کرایا۔ بل کہ انھوں نے تاج محل کی علامت میں اس جاگیردار اور سرمایہ دار نظام کا مذاق اڑایا ہے جہاں غریب کا استحصال ہو رہا ہے۔ اور اس کی محبت کا کوئی نام ونشان نہیں۔ ساحر کہتے ہیں کہ یہ امتیازی اور طبقاتی نظام ایسا ہے کہ امرا وروسا اپنی موت کے بعد بھی اپنی محبت کی نشانیاں چھوڑ جاتے ہیں جب کہ غریب کی محبت گم نام مر جاتی ہے۔

ساحر نے دراصل ''تاج محل'' کے ذریعے جاگیردار اور سرمایہ دار کی مذمت کی ہے۔ موضوع وہی ترقی پسندوں والا ہے مگر نظم کی تکنیک اچھوتی اور نئی ہے۔ساحر لدھیانوی کی طویل نظم ''پرچھائیاں'' لطیف جذبات و خیالات کی عمدہ مثال ہے۔ اس نظم میں دو محبت کرنے والے اپنی محبت کی بھینٹ چڑھا کر نئے محبت کرنے والوں کی سلامتی کے لیے دعا گو ہیں۔ساحر نے امن وتہذیب کے تحفظ کی بات کی ہے۔ انھوں نے اس ذلیل زندگی اور اس کے نظام کو بدلنے کے لیے ایک ولولہ انگیز پیغام دیا ہے۔''پرچھائیاں''عالمی امن کی تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے مدد دیتی ہے اور انسانوں کے دلوں میں محبت اور امن وامان کے چراغ روش کرتی ہے۔''پرچھائیاں'' کے بارے میں علی سردار جعفری لکھتے ہیں:

> ''ساحر نے ایک سادہ سی کہانی جو بار بار ہم نے سنی ہے اور دیکھی ہے اور محسوس کی ہے اور نظر انداز کی ہے،اپنی رنگین بیا نی اور آتش بیانی سے پرکیف بنا دیا ہے۔ اس کی سادگی اس کے موضو ع اور مواد میں اور پرکاری اس کی

تکنیک میں جو شاعر نے استعمال کی ہے۔"پرچھائیاں" ساحر کی بیش تر نظموں کی طرح محکات کا ایک اچھا نمونہ ہے۔''(٦٢)

ساحر کی طویل نظم رومان کے تصور اور رومانوی اسلوب سے معمور ہے،بظاہر یہ رومانوی سی نظم لگتی ہے مگر اس میں ظلم واستبداد اوراستحصال جیسے اہم پہلوؤں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ساحر کی طویل نظم''پرچھائیاں'' دیکھیے:

جوان رات کے سینے پہ دودھیا آنچل
مچل رہا ہے کسی خوابِ مرمریں کی طرح
حسین پھول ، حسیں پتیاں ، حسیں شاخیں
تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں
(٦٣)

ہندوستان میں جب برطانوی راج قائم ہوا تو دھیرے دھیرے یہاں کے مقامی نوجوانوں کو فوج میں بھرتی کیا جانے لگا،جب نوجوان ،بچے اور بوڑھے فارغ وقت میں چوپال میں بیٹھا کرتے تھے تو گاؤں میں بہت رونق ہوتی تھی اب چوں کہ گاؤں کے سجیلے جوان برطانوی فوج کا حصہ بن گئے ہیں تو گاؤں گاؤں میں وحشت ناچ رہی ہے اور اب گاؤں جنگل کا منظر پیش کرنے لگے ہیں۔برطانوی سامراج کے قابض ہونے سے ہندوستانی تہذیب پر اور بھی کئی اثرات مرتب ہوئے ہیں جنھیں کمال تخیل دے کر ساحر نے اپنی نظم میں بیان کر دیا ہے۔ساحر اس اجڑی تہذیب پر افسردہ ہیں ۔ساحر نے ''پرچھائیاں'' میں کسانوں، مزدوروں ،مفلسوں اور غریبوں کی بات بھی کی ہے اور خالص ہندوستانی تہذیب کی جھلکیاں بھی دکھائی ہیں۔ساحر نے غیر ملکی حکومت کے برے اثرات کو بھی بیان کیا ہے۔اس نظم میں انھوں نے محبت،امن اور اعلا اقدار کو فروغ دینے کی خواہش ظاہر کی ہے جو آزادی کے ذریعے کی ممکن ہے۔ فرنگی استعماروں نے ہندوستانی معاشرت کو کثافتوں اور آلودگیوں سے معمور کر دیا ہے۔ ساحر نے اس طبقاتی کشمکش ،تفریق اور آلودگی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے۔

احمد ندیم قاسمی کی نظموں میں عشق وحسن جیسی مجرد تصویریں نظر آتی ہیں ان کی حقیقت پسند فکر کے باوجود بھی ان کا رومانوی مزاج ان کی شاعری کا حسن ہے۔ رومانوی انداز کی حامل نظموں میں''ایک اداس لمحے کی نظم'' ،''سمے اک جادو''،''بہار''،''شام فراق''،''خشک پتے'' ،''یاد'' ،''لمحے''اور'' صدیاں''شامل ہیں۔ ندیم کی ابتدائی رومانوی نظموں میں جذبات کا حسن اور رنگینی نمایاں ہے ہجرزدہ شبوں کی کسک اورو صال کا خواب لیے "جدائی کی پہلی رات" کا منظر دیکھیے:

نہ چاند ڈوبتا ہے اور نہ تارے ٹوٹتے ہیں
نہ سمتِ مشرق سے انوار صبح پھوٹتے ہیں
نہ جاگنے کی ہوس نہ نیند آتی ہے

بس اک خلش سی کلیجے میں سرسراتی ہے

(۶۴)

اسی نوع کی جاں نثار اختر ایک نظم ''پچھلی ریت''ملاحظہ کیجیے:

ہوا جب منہ اندھیرے پیت کی بنسی بجاتی ہے
کوئی رادھا کسی پنگھٹ کے اوپر گنگناتی ہے
مجھے اک بار پھر اپنی محبت یاد آتی ہے
(۶۵)

ابتدائی دور کی رومانوی نظموں کے بعد احمد ندیم قاسمی کی شاعری کا نیا رخ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہونے کے بعد ملتا ہے نظم ''کروٹیں'' اور ''راستے کا موڑ'' اشتراکی فکرواحساس کی قابل ذکر نظمیں ہیں۔ظہیر کاشمیری کی شاعری میں زندگی کی تلخیاں بیان کی گئی ہیں۔انھوں نے نچلے طبقے، جہالت،مفلسی اور تشدد کے واقعات کو شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ انھوں نے اپنے سینے کی غیر بیانی گھٹن کو بھی بیان کیا ہے۔ انھوں نے اپنے کچے جذبوں میں بھی تفکر کی کمی نہ آنے دی ابتدا میں انھوں نے عشقیہ مضامین بھی باندھے ۔''لالہ رخ''ظہیر کاشمیری کی اہم رومانوی نظموں میں سے ایک ہے۔

علی سردار جعفری نے غلام ہندوستان کی معاشی اور اقتصادی بدحالی کا نقشہ اپنی آزاد ہیئت کی نظموں میں بھی کھینچا ہے۔ اور غریب لوگوں اور محنت کشوں کی تصویر کشی یوں کی ہے۔ مخدوم محی الدین کی نظم ''چاند تاروں کا بن'' بھی آزاد ہیئت میں ہے۔

موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کے تن/رات بھر جھلملاتی رہی شمعِ صبحِ وطن/رات بھر جگاتا رہا چاند تاروں کا بن(۶۶)

مخدوم کی نظموں میں مشرقی تہذیب کا رچاؤ اور رکھ رکھاؤ پایا جاتا ہے۔ مخدوم نے اپنے معاصر ترقی پسند شعرا کی طرح آزاد ہیئت میں بھی نظم نگاری کی ہے۔ ان کی اس ہیئت میں لکھی گئی نظم''چارہ گر''میں مشرقی تہذیب کی پاکیزگی نمایاں ہے۔ انھوں نے آزاد ہیئت میں بھی روانی اور غنائیت پیدا کر دی ہے ۔مخدوم نے غریب کی جھونپڑی کی تاریکی کو اپنی آزاد نظم ''اندھیرا''میں بڑے خوب صورت انداز میں پیش کیا ہے۔مخدوم کے یہاں سماجی امور،کسان،مزدور، انقلاب اور بغاوت جیسے موضوعات ملتے ہیں۔ مخدوم کی شاعری میں تہذیبی عوامل وعناصر ملتے ہیں ،ہندوستان کی دھرتی،موسم،کھیت،مندر ،دہقان کی تان، لڑکیوں کا گاگر لیے ساگر کنارے جانا جیسے عوامل تہذیب وثقافت کی عکاسی کرتے ہیں۔مخدوم کی نظم''حویلی'' میں ایک عام انسان کی زندگی پر سرمایہ دار مسلط دکھایا گیا ہے اور شاہی خاندان کے عروج وزوال کی داستان رقم کی گئی ہے۔مخدوم جب عظمت انسانیت کو کچلتے ہوئے دیکھتے ہیں تو انھیں یہ سماج اور اس کا نظام ایک بوسیدہ حویلی کی طرح لگتا ہے:

ایک بوسیدہ حویلی یعنی فرسودہ سماج
لے رہی ہے نزع کے عالم میں مردوں سے
خراج

(٦٧)

مخدوم ماضی کی تاریخ وتہذیب بیان کرتے ہوئے دور نکل جاتے ہیں،وہ سمجھتے ہیں کہ مشرقی روایات اور تہذیب و ثقافت کی نشانیاں ناپید ہوتی جا رہی ہیں ۔ان کی نظموں میں مشرقی تہذیب اور اسلامی تاریخ کے حوالوں سے دیکھیں تو وہ اقبال سے مماثلت رکھتے ہیں۔ اس بارے میں کوثر مظہری رقم طراز ہیں:

''مخدوم، علامہ اقبال سے معنوی اعتبار سے بہت قریب تھے
مگر عقیدے میں انتشار ہی رہا ورنہ اقبال کے تصور عشق اور
عقل سے وہ بہت متاثر تھے۔''(٦٨)

مخدوم محکومی و مجبوری کی زندگی کو نا پسند کرتے تھے ان میں حصول آزادی کے لیے بڑا جوش وجذبہ تھا ،ان کی آزاد ہیئت کی نظم ''جنگ آزادی'' دیکھیے:

یہ جنگ ہے جنگ آزادی/آزادی کے پرچم تلے/ سارا سنسار ہمارا ہے/پورب،پچھم اتر دکھن/لو سرخ سویرا آتا ہے/آزادی کا آزادی کا(٦٩)

اس نظم میں مخدوم نے آزادی کی شمع روشن ہونے کی بشارت دی ہے کہ جلد آزادی کا سورج طلوع ہوگا اور فرنگی سامراج اپنے انجام کو پہنچ جائے گا۔ظہیر کاشمیری نے بھی آزاد ہیئت میں ایک نظم '' آزادی ''آزادی کے موضو ع پر لکھی ہے۔آزادی کے عنوان سے ایک نظم کیفی اعظمی کی شاعری میں بھی موجود ہے۔

جبیں سے نور برساتی
چلی آتی ہے آزادی
مچلتی ، جھومتی ،گاتی

(٧٠)

کیفی اعظمی نے آزادی سے متعلق جو نظمیں لکھیں ان میں انسانی نفسیاتی پہلوؤ نکو بڑے واضح انداز میں بیان کیا ہے۔ڈاکٹر معین احسن جذبی کی نظم ''نیا سورج'' ہندوستان کی آزادی کے موضوع پر لکھی گئی ہے۔معین احسن جذبی بڑے ہی دل گرفتہ انداز میں ایک امیر سے مخاطب ہو کر کہہ رہے ہیں کہ تو کائنات کی رنگینیوں میں کھو کر اپنے آس پاس کے مفلسوں کو بھول گیا ہے تو کائنات کے حسن کو سراہتے ہوئے بادہ خوانی میں مصروف ہے۔ مفلس کے یہ سارے حالات تجھ کو دکھائی نہیں دیتےتمھارے ہاں تو بس مہ پاروں کی اہمیت

ہے کسی مزدور کی نہیں،وہ زندگی کے دن کیسے بسر کرتا ہے تو بس اپنی آسائش اور تفریح میں مگن ہے۔یہ اشعار دیکھیے:

وہ لاکھ ہلالوں سے بھی حسین ،کیسی زہرہ ، کیسی پروین
اک روٹی کا ٹکڑا جو کہیں مل جائے مجھے بازاروں میں
جب جیب میں پیسے بجتے ہیں جب جیب میں روٹی ہوتی ہے
اس وقت یہ ذرہ ہیرا ہے ، اس وقت یہ شبنم موتی ہے

(۴۱)

جذبی نے یہ نظم طنزیہ انداز میں بیان کی ہے جس میں ابقاتی تقسیم کا ذکر کیا گیا ہے۔ جمیل مظہری کے یہاں بھی مزدور کا روایتی اور رومانی انداز ملتا ہے۔ انھوں نے کسی حکمراں کی تلوار کا قصیدہ کبھی نہ لکھا ہمیشہ کسان کی ہل کو ہی مشق سخن بنایا۔ انھوں ن ے اپنی نظموں میں وسائل کی مساوی تقسیم کی بات کی ہے،ان کی ایک نظم''مزدور کی بانسری ''ملاحظہ کیجیے:

مزدور ہیں ہم ،مزدور ہیں ہم، مجبور تھے ہم ،مجبور ہیں ہم
انسانیت کے سینے میں رستا ہوا اک ناسور ہیں ہم
دولت کی آنکھوں کا سرمہ بنتا ہے ہماری ہڈی سے
مندر کے دیے بھی جلتے ہیں ہماری چربی سے
(۴۲)

کیفی نے دیکھا کہ غریب ،کمزور اور مزدور کا ہر موڑ پر استحصال ہوتا ہے ۔اس نچلے طبقے کی حالت دن بہ دن ابتر ہوتی گئی۔ ان کی نظم ''آوارہ سجدے''دیکھیے:

اک یہی سوزِ نہاں کل مرا سرمایہ ہے
دوستو میں کسے یہ سوزِ نہاں نذر کروں
(۴۳)

کیفی کے شعری مجموعے ''آخر شب'' کی نظموں میں ان کی ذاتی معاملہ بندی کے علاوہ انسانی ہمدردی اور بے لوث جوان مردی ،حوصلہ ،ہمت وجرات اور خدمت خلق نمایاں ہے۔ پاک وہند کی تقسیم کے کرب ،انسانی فلاح وبہبو د سے معمور نظموں میں ''نئے خاکے''،یلغار،کرن،سوویت یونین اور ہندوستان،فتح برلن، تلاش،منظر خلوت،احتیاط،ملاقات،''ناقص بھرتی"اور ''سروجنی نائیڈو '' شامل ہیں۔کیفی کی ان نظموں کے مطالعہ سے انسانیت کے لیے ہمدردی اور خلوص و محبت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ پورے عالم کی مخلوق کا محافظ بن جاتا ہے۔ کیفی کی نظمیں آدمی کو انسانیت کی معراج تک لے جاتی ہیں۔ ڈاکٹر شائستہ نوشین اس ضمن میں لکھتی ہیں:

> ''کیفی نے بھی رومان کے دھندلکوں سے نکل کر انقلاب کی وادی میں قدم رکھا اور جنگ آزادی کی سرگرمیوں سے ان کو دلچسپی ہوئی تو قوم پرستی اور آزادی کے نغمے بکھیرے گئے۔''(۴۷)

جب کیبنٹ کمیشن واپس ہوا توجگہ جگہ فسادات برپا ہو گئے تو اس وقت کیفی نے مثنوی کی ہیئت میں ایک خوب صورت نظم"خانہ جنگی" لکھی۔ اس نظم میں انھوں نے ہندوومسلم اتحاد پر زور دیا ہے تا کہ غیر ملکی آقاؤں سے نجات حاصل کی جائے۔جمیل مظہری ہیئتی اعتبار سے بھی کیفی اعظمی سے اشتراک رکھتے ہیں انھوں نے بھی اسی موضو ع کی حامل مثنوی کی ہیئت میں ایک نظم ''غریبوں کی عید'' کے عنوان سے لکھی ہے۔ جس میں غریبوں،محنت کشوں اور چھوٹے طبقے کے لوگوں سے ہمدردی کی گئی ہے۔ ان دونوں میں کچھ فرق بھی ہے کیفی کی نظم میں آزادی کا عنصر زیادہ ہے جب کہ جمیل کی نظم محض طبقاتی تقسیم کا بیان ہے۔کیفی کی نظم''آزادی'' کے بعد نظم''آخری مرحلہ'' میں بھی اہل وطن کو غلامی کی زنجیریں توڑنے کا مشورہ دیتے ہیں۔کیفی نے علی سردار جعفری کی طرح روس کی ستائش میں نظمیں لکھی ہیں،ان میں ''فتح برلن''اور''ہم آگے ہی بڑھتے جا رہے ہیں'' زیادہ اہم ہیں۔ انھوں نے اہم مسائل پر اپنے معاصرین کی طرح گرم اور تیز لہجہ اختیار کیا ہے۔ کیفی نے ایک نظم''کلکتہ'' لکھی اس میں انگریزی سرکار کی بے حسی ،بدانتظامی کی سخت مذمت کی۔ انھوں نے غلام ہندوستان کو صلح وبھائی چارے اور اتحا دواتفاق سے رہنے پر زور دیا ہے۔

جذبی ایک ایسے نظام کے قائل تھے جس میں سب کے ساتھ انصاف ہو ،وہ انقلابی ضرور تھے لیکن شر انگیزی یا شدت پسندی ان کے یہاں بالکل نہیں ملتی۔ انھوں نے ہندوستان کی آزدای،قومی یکجہتی ،سرمایہ دارنہ نظام کے مظالم وافلاس جیسے مسائل کو بیان کیا ہے،جذبی کی نظموں میں ملک کے لیے جدوجہد اور غریب طبقہ کے حقوق کی حفاظت کے موضوعات شامل ہو گئے۔ جذبی کی اہم نظموں میں ''گل'' ،فطرت ایک مفلس کی نظر میں،ہلال عید ،چشم سوال،خواب ہستی،اے کاش،موت،منزل تک،احساس،میرے سوا،تقسیم،''آج کی شام'' اور''اے دوست'' شامل ہیں۔جذبی کی نظموں میں غربت وافلاس،سرمایہ دارانہ نظام

پر احتجاج ،محرومی اور مساوات جیسے موضوعات ملتے ہیں۔ جذبی نے زیادہ نظمیں پابند ہیئت میں لکھی ہیں اس حوالے سے وہ جوش ،فیض،مجاز ،ساحر سمیت دیگر ترقی پسند معاصرین سے گہرا اشتراک رکھتے ہیں۔

جمیل مظہری کی شاعری اہم سیاسی وسماجی موضوعات کی آئینہ دار ہے ان کی دیگر سیاسی وسماجی نظموں میں ''کنگال نہ بن''،تاریخ فریبوں سے، اے اندرارانی،شردھانجلی،عیدِ امروز،''بھوک لگی ہے بھوک''اور'' کچھ کڑوی کچھ میٹھی''اہم ہیں ،انھوں نے آزادی کے موضوع پر بھی نظمیں لکھی ہیں ان میں''جشنِ آزادی'' اور ''یوم آزادی'' اہم ہیں۔جمیل مظہری نے پابند ہیئت میں شاعری کی ہے البتہ ان کے کلیات میں نظم معرا کا تجربہ بھی نظر آتا ہے۔انھوں نے ''نکہت ورنگ'' کے عنوان سے ایک معرا نظم تخلیق کی ہے۔ساحر لدھیانوی کی تمام نظمیں ترقی پسند محور کے گرد گھومتی ہیں مگر اسلوب کے حوالے سے انھوں نے بھی فیض کی ہی اتباع کی ہے۔ان کی نظم ''خون پھر خون ہے'' اس حوالے سے اعلا مثال ہے۔انھوں نے ''پھر وہی کنج قفس''شملہ کانفرنس کی ناکامی پر ایک نوحے کی صورت میں لکھی۔ساحر نے سماجی اور انقلابی نظمیں لکھتے ہوئے غم انگیز اور طنزیہ لہجہ اپنایا ہے۔نظم''یہ کس کا لہو ہے'' میں ہندوستانی سیاسی رہنماؤں پرطنز کے نشتر برسائے ہیں۔

جوش کی نظموں ''حسن اور مزدوری'' میں مزدوری کرتی ہوئی عورتوں کا کردار،''کسان''میں ایک کسان کا کردار،''مہاجن اور مفلس '' میں ایک مفلس شخص کا کردار ،مجاز کی نظموں''مزدور کا گیت''،میں مزدوروں کا کردار،احمد ندیم قاسمی کی نظموں''محنت کش لڑکیاں'' اور'' طوائف'' ،کیفی کی نظم''بے کار مزدور''،جذبی کی نظم''فطرت ایک مفلس کی نظر میں''،موضوعاتی حوالے سے ساحر کی نظموں ''طلوع اشتراکیت''،''چکلے''،''فنکار'' وغیرہ سے گہرا اشتراک رکھتی ہیں۔سماجی ناہمواریوں کے حوالے سے ساحر کی نظم''چکلے'' دیکھیے:

یہ کوچے یہ نیلام گھر دلکشی کے
یہ لٹتے ہوئے کارواں زندگی کے
کہاں ہیں کہاں محافظ خودی کے
ثنا خوانِ تقدیس مشرق کہاں ہیں
(۷۵)

سحر نے غیر اخلاقی عمل پر رہبروں کی توجہ دلائی ہے۔ ظہیر کاشمیری نے بھی جسم فروشی اور طبقاتی تقسیم کی مذمت کی ہے،اس حوالے سے ان کی نظم''ناچ رہی رقاصہ''کافی اہم ہے۔ ان کے شعری مجموعہ''چراغ آخر شب''میں ''بنتِ بنارس'' ،''جمیلہ''اور ''سلطانۂ جمال'' جیسی نظمیں ملتی ہیں۔ انھوں نے نظم ''نرتکی'' میں ایک طوائف کا پیکر ہی سامنے لا کر رکھ دیا ہے۔ساحر لدھیانوی نے چند ایک نظمیں آزاد ہیئت میں بھی لکھی ہیں۔ جاں نثار اختر نے روایتی ہیئت مثنوی میں بھی لکھا ہے۔ ان کی نظم ''ستاروں کی صدا'' مثنوی کی ہیئت میں

ہے۔ساحر کی نظم ''چکلے'' اور جاں نثار اختر کی نظم''حوا کی بیٹی'' موضوعاتی یکسانیت کی اعلا مثال ہے۔ جاں نثار اختر نے پابند ،نیم پابند اور آزاد ہیئت میں نظمیں تخلیق کی ہیں۔''بند گھڑی''جاں نثار اختر کی آزاد ہیئت کی نظم ہے ،ملاحظہ کیجیے:

میز پر رکھی گھڑی/مدتوں سے بند ہے/میں نے سوچا ، اس طرح وقت تو تھمتا نہیں/ لمحہ تیری موت کا کیسے تھم کر رہ گیا(٤٦)

جاں نثار اختر نے مشہور شاعر پشکن کی ایک نظم کا آزاد ہیئت میں ''آزادی '' کے عنوان سے ترجمہ کیا ہے۔اس نظم میں انھوں نے وطن سے دوری اور وطن کی محبت کو موضوع بنایا ہے۔احمد ندیم قاسمی نے وطن کی محبت میں ایک نظم''وطن'' لکھی ۔احمد فراز نے بھی وطن کی محبت میں ترانے اور نغمے لکھ کر مشرقی پاکستان کی علاحدگی کی مذمت کی ،فراز کی نظم''اے مری ارض وطن'' میں وطن سے بے حد محبت کا اظہار ہے۔ فراز کی نظموں میں وطن کی مٹی کی خوشبو آتی ہے۔انھوں نے پاکستان کو دوحصوں میں تقسیم ہوتا دیکھ کر اس کی مذمت کی ،اس حوالے سے ان کی نظم''میری آنکھیں مرا چہرہ لاؤ'' دیکھیے:

آج کے دن/مرا چہرہ مری آنکھیں لاؤ/کہ میں آئینوں کو تکتا ہوں/تو رو دیتا ہوں(٤٧)

احمد ندیم قاسمی اور احمد فراز نے پاکستان اور ہندوستان کے درمیان ہونے والی جنگوں کو بھی موضوع بنایا ہے۔انھوں نے وطن کی عقیدت اور محبت میں متعدد نظمیں لکھیں۔فراز کی اپنے وطن کی سرزمین کے لیے لکھی گئی نظم''یہ کھیت یہ کھلیان'' ملاحظہ کیجیے:

یہ کھیت ہمارے ہیں یہ کھلیان ہمارے
پورے ہوئے اک عمر کے ارمان ہمارے
ہم وہ ہیں جو کڑی دھوپ میں جسموں کو
جلائیں
ہم وہ ہیں کہ صحراؤں کو گلزار بنائیں
(٤٨)

احمد فراز کا شعری مجموعہ"شب خون" وطن کی محبت کے نغموں سے معمور ہے، اس کی کم وبیش بیس نظمیں وطن کی محبت میں ڈوب کر لکھی ہیں۔١٩٦٥ء میں بھارت کی جانب سے ان کے آبائی علاقے کوہاٹ پر وحشیانہ بمباری کی گئی اس تناظر میں انھوں نے نظم''اے مرے شہر'' لکھی ،اور کشمیر اور تحریک آزادی کشمیر کے لیے دو نظمیں''پرچمِ جاں''اور''نیا کشمیر'' لکھیں۔فراز کی طرح فیض بھی مشرقی پاکستان کی علاحدگی اور ١٩٦٥ء اور ١٩٧١ء کی جنگوں میں بھارتی جارحیت پر تلملا اٹھے۔اس سلسلے میں ان کی نظم''ڈھاکہ سے واپسی پر''خاصی اہم ہے۔فیض کی نظم کا نمونہ دیکھیے:

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی ملاقاتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا کتنی مداراتوں کے بعد
کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے
بعد

(۷۹)

احمد ندیم قاسمی اس قدر وطن سے محبت کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنی شاعری سے ملک کی نظریاتی اور جغرافیائی حدوں کی حفاظت کی ہے۔ انھوں نے اپنی نظم''٦ستمبر'' میں ٦ستمبر١٩٦٥ء کی جنگ کی ہولناکیاں بیان کی ہیں۔ندیم اس نظم میں بھارت کی جارحیت ،سفاکیت اور خون آشام کارروائیوں کا ذکر کرتے ہیں۔انھوں نے اپنی نظموں''سرفروشانِ وطن''اور''شہیدوں کا لہو''میں مجاہدین اسلام اور افواج پاکستان سے والہانہ محبت کا اظہار کیا ہے اور انھیں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ جذبہ حب الوطنی سے سرشار ندیم کے یہ مصرعے دیکھیے:

چرخِ ایثار کے تابندہ ستارے ہو تم
وطنِ پاک کی عظمت کے سہارے ہو تم

(۸۰)

احمد ندیم قاسمی نے اس نظم میں افواج پاکستان کی عظمت کے گن گائے ہیں اور انھیں اپنے نغموں سے بھی پیارا کہا ہے،ندیم نے ١٧دسمبر ١٩٧١ء کو بھارتی جارحیت اور مشرقی پاکستان کی علاحدگی پر آزاد ہیئت میں لکھا ہے۔ فراز نے جنگ آزادی ١٨٥٧ء کو بھی یاد کیا ہے۔ فراز ملک دولخت ہونے پر سخت احتجاج کرتے ہیں۔ ان کی نظم ''اب کس کا جشن مناتے ہو'' دیکھیے:

اب کس کا جشن مناتے ہو
اُس دیس کا جو تقسیم ہوا
اب کس کا گیت سناتے ہو
اُس تن من کا جو دونیم ہوا
(۸۱)

علی سردار جعفری کے شعری مجموعے ''پیراہن شرر'' میں ہندوستانی بٹوارے کی مرثیہ خوانی و نوحہ گری ہے۔اس مجموعے میں ١٩٤٧ء اور ١٩٦٥ء کی جنگوں کا حال بھی بیان کیا گیا ہے۔ ان کی اسی مجموعے میں شامل ایک نظم''صبح فردا'' ١٩٦٥ء کی جنگ کی تباہ کاریوں کے تناظر میں لکھی گئی ہے۔عارف عبدالمتین نے اپنی آزاد ہیئت کی نظموں میں

معاشرے کے مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ ان پر حلقہ ارباب ذوق اور ترقی پسند تحریک کے اثرات ملتے ہیں۔ ان کی نظموں میں رومانوی اور ترقی پسند دونوں پہلو موجود ہیں۔ وہ معاشرتی استحصال کی مذمت کرتے ۔انھوں نے سامراجی طبقے اور اس کے گماشتوں پر طنزیہ مصرعے کسے ہیں۔عارف کی نظموں میں حسن وعشق کے مضامین کم ہیں زیادہ تر انھوں نے سیاسی ،سماجی اور اشتراکی حقیقت پسندی کو بیان کیا ہے۔انھوں نے پابند،معرا،آزاد،نثری اور یک مصرعی ہیئتوں میں نظم نگاری کی ہے۔نمونے کے طور پر ان کی نظم''ادھوری رفاقت'' کے یہ مصرعے دیکھیے:

میں کروٹ پہ کروٹ بدلتا چلا جا رہا ہوں/مرے دل کے آنگن میں نیند اپنے رنگین خوابوں کی بارات لے کر اترتی نہیں ہے/میں بے کیف سنگین مسائل کی دنیا سے لڑتے الجھتے ہوئے تھک گیا ہوں(۸۲)

اس نظم میں عارف نے ایک مزدور اور غریب کی کہانی بیان کی ہے کہ غربت کا یہ عالم ہے کہ میں شام کو گھر لوٹتے ہوئے اپنی جیبوں سے خول ہی نکالتا ہوں اورمیرے بچے مجھے خالی ہاتھ دیکھتے ہیں۔ عارف کی ایک اور نظم''بازیافت'' دیکھیے:

آؤ پھر ایک شب کے لیے اجنبی بنیں
عہدِ وفا کے پہلے تاثر میں پھر ڈھلیں!
تم آج پھر میرے لیے گل پیرہن بنو
جوڑا سہاگ رات کا پہنو ، دلہن بنو
گردن جھکا کے بیٹھو چھپر کھٹ پہ اس طرح
(۸۳)

عارف عبدالمتین کی یہ نظم پابند ہیئت میں ہے اس میں انھوں نے ساحر لدھیانوی اور مجید امجد سا اسلوب اپنایا ہے۔ مجید امجد کی نظم ''بندا'' بھی اسی طرح کی نظم ہے اور ساحر کی''چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں'' بھی اسی طرز کی نظم ہے۔حبیب جالب اپنی شاعری میں انسانی طبقوں میں وسائل کی مساوی تقسیم ،سامراج دشمنی،شخصی آزادی اور جمہوریت کا پرچار کرتے ہیں۔ انھوں نے حکمرانوں کی غلط پالیسیوں کے خلاف بھر پور احتجاج کیا۔ ماضی میں استعاروں اور علامتوں میں بات کی جاتی رہی لیکن حبیب جالب نے سیدھے اور بے باک انداز میں بات کی ۔ پاکستانی ادب میں حبیب جالب کو فیض کے بعد اہم مقام حاصل ہے ان کی مزاحمتی شاعری فیض سے بھی زیادہ بے باک نظر آتی ہے۔حبیب جالب مظلوم طبقے کے نمایندہ شاعر تھے اور ملک میں مستحکم جمہوری نظام کے خواہاں تھے اس حوالے سے ان کی نظم''جمہوریت'' اہم ہے۔حبیب جالب چاہتے تھے کہ وسائل کی تقسیم اگر یکساں کی جائے تو کوئی غربت اور بھوک سے نہ مرے ان کی ایک نظم ''بیس گھرانے'' بڑی اہم ہے۔ان کی شاعری آمروں ، ظالموں اور انسانی حقوق کی پامالی کرنے والوں کے لیے پیامِ مرگ ثابت ہوئی۔ ان کی آواز محروم طبقے کی آواز بن گئی وہ کہتے ہیں کہ مراعات یافتہ

طبقے نے عوام کے حقوق چھنیے ہیں اور ان کو مساوی حقوق دلانا سیاسی جماعتوں اور سیاسی اکابرین کی ذمہ داری ہے۔حبیب جالب نے پابند،معرا اور آزادہیئت میں نظم نگاری کی ہے۔ان کی آزاد ہیئت کی نظم''رخشندہ زویا سے''کوٹ لکھپت میں ایّام اسیری کے دوران لکھی گئی ہے۔نظم ملاحظہ کیجیے:

کہہ نہیں سکتی پر کہتی ہے/مجھ سے میری ننھی بچی/ابو گھر چل/ابو گھر چل/اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا/کیوں نہیں ساتھ میں اُس کے چلتا/کیسے ننھی کو سمجھاؤں/گھر بھی تو زنداں کی طرح ہے(۸۴)

حبیب جالب کی شاعری کہنہ نظام بدلنے کی ترغیب دیتی ہے۔ انھوں نے عوامی شعور بیدار کیا اور جبرواستبداد کے خلاف اپنے گریبان کا پرچم بلند کیا۔حبیب جالب فرسودہ نظام کی بات کرتے ہیں وہ آمریت کے دور میں جمہوریت کی بحالی اور جمہوریت کے دور میں انسانی حقوق کی بات کرتے ہیں۔انھوں نے کیفی اعظمی کی طرح متعدد نظموں میں ہنگامی موضوعات پر نظمیں لکھیں''کراچی میں جب صاحبِ جاہ نے جھونپڑے جلائے''،شہربدر طلبا کے نام،امریکہ کے اجنٹوں سے،امریکہ نہ جا،امریکہ یاترا،لبنان چلو،ریفرنڈم،''آرمیناکے لوگوں کا نوحہ''اور '' ہم لڑیں امریکہ کی جنگ کیوں'' جیسی ہنگامی نظمیں ہیں۔قتیل شفائی نے انسان کی بے چارگی اور مظلومیت کا ذکر اپنی نظموں میں کیا ہے۔ غریب کی کمائی اور پسینے سے امیر کی زرداری قائم ہے ۔قتیل کی شاعری میں سماجی تنوع پایا جاتا ہے۔ ''آج اورکل''ان کی اسی نوع کی نظم ہے۔قتیل شفائی نے ملکی سیاست سے متعلق بھی چند نظمیں لکھی ہیں ،اس حوالے سے ان کی نظم ''جشنِ آزادی'' ہے۔ ان کی کچھ نظمیں جدید دور کے درد وکرب کے احساس کی مظہر ہیں۔ان میں ''آپ بیتی''،''اکتاہٹ''،''منزل منزل''،''کچھ غم جاناں اور کچھ غم دوراں'' قابل ذکر ہیں۔قتیل کی نظم ''عورت'' میں ساحر لدھیانوی کی طویل نظم ''پرچھائیاں'' کا سا اسلوب اور آہنگ ہے۔ اس میں انھوں نے رومانوی طرز اظہار اپنا کر عورت کے حسین پیکر میں معاشرتی حقیقت کو بیان کیا ہے:

تو کہ بازار میں پہلی سی تری قدر نہیں
اتنی ارزاں ہے مگر پھر بھی خریدار کہاں؟
تیرے ہونٹوں سے ہے عنقا وہ تبسم کی مٹھاس
تیری آواز میں وہ جھنکار کہاں؟

(۸۵)

قتیل شفائی کی شاعری میں سماجی مسائل کا ذکر بھی انفرادی اسلوب میں ملتا ہے۔ انھوں نے تراکیب وتشبیہات سے معنوی شعور پیدا کیا ہے۔ ان کے یہاں نغمگی ،شفاف اندھیرا ،شعلہء زرتاب،شفق رنگ خطوط جیسے گنگناتے ہوئے الفاظ ملتے ہیں اور شاخ ماضی اور سیاہ پوش خیال جیسی تراکیب ملتی ہیں۔ ان کی داخلی نغمگی اور خارجی کیفیت بڑے خوش

آہنگ اسلوب میں ملتی ہے ۔ان کی اشتراکی فکر کی حامل نظموں میں '' جنگ ابھی تک جاری ہے''،'' لہو کا رنگ ایک ہے''،''زندگی کا گیت''اور''اے زندگی''اہم ہیں۔قتیل اپنی نظم''لہو کا رنگ ایک ہے'' میں آدمی کی عزت ،عظمت اور جان ومال کے تحفظ کی بات کرتے ہیں ،شاعر کہتا ہے کہ انسانیت کا خون ایک ہے خواہ وہ کسی مذہب ،کسی خطے یا ملک سے تعلق رکھتے ہوں۔قتیل شفائی نے انسان کو گلاب قرار دیا ہے کہ گلاب تو گلاب ہے وہ کسی بھی چمن کا ہو اس کو مسلیں گے تو خوشبو کا قتل ہو گا۔پیار کی نظر میں شاہ غلام سب ایک ہیں ۔قتیل عالم انسانیت کی بات کرتے ہیں کہ انسان کسی بھی ملک کا ہو وہ پاکستان کا ہو یا ہندوستان کا ہمیں سب کی زندگی عزیز ہے۔ قتیل کی وطن کی محبت سے مملو نظم''قومی نغمہ''بڑی اہم ہے۔

قتیل شفائی اور ساحر لدھیانوی میں کافی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ ان دوشعرا کے شعری رویوں میں بڑی ہم آہنگی پائی جاتی ہے ۔انھوں نے پابند،معرا اور آزاد ہیئت میں نظمیں لکھی ہیں۔ ان کی آزاد ہیئت کی ایک نظم''جہانگیر عادل'' اس حوالے سے اہم ہے۔ قتیل شفائی کی ساحر لدھیانوی کے آہنگ میں لکھی ہوئی آزاد نظم ''یہ میری غزلیں، یہ میری نظمیں''دیکھیے:

یہ میری غزلیں، یہ میری نظمیں/جو میں نے تجھ سے بچھڑ کے لکھیں/انھیں کوئی چھاپتا نہیں ہے/میں جب بھی تیرے فراق کا نوحہ لکھوں گا/(۸٦)

قتیل شفائی نے عام زندگی کے بارے میں جو کردار زیادہ موضوع سخن بنایا وہ ایکٹرس ،طوائف اور داشتہ کا ہے۔ ان کی نظم ''راستے کا پھول'' میں ایک طوائف کا دکھ مضمر ملتا ہے۔ساحر لدھیانوی نے بھی اپنی نظم ''چکلے'' میں اسی طرح کا طرز سخن اپنایا ہے اس حوالے سے قتیل ،ساحر سے موضوعاتی اور اسلوبیاتی ہم آہنگی رکھتے ہیں۔ان کی یہ نظم معاشرے کی ایک تلخ حقیقت کی ترجمانی کرتی ہے۔ قتیل کی اس نوع کی دیگر نظموں میں شمع انجمن،ایک عورت ایک ایکٹرس،مغویہ،عمرپوشی،سترھواں سنگار،نائیکہ،تماشبیں، شعرا اور موسیقی اور فرماں بردار شامل ہیں۔مصطفیٰ زیدی نے بھی خالص سماجی موضوع پر نظمیں لکھی ہیں ان کی نظموں میں''نوروز،اقوام متحدہ،میں امن چاہتا ہوں،اور''دسہرہ''زیادہ اہم ہیں۔ ''میں امن چاہتا ہوں'' آزادہیئت میں لکھی گئی ہے۔یہ نظم ساحر کی نظموں سے مماثلت رکھتی ہے۔ یہ موضوعساحر کے یہاں بھی اسی پیرائے میں ملتا ہے۔ مصطفیٰ زیدی نے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے شاعری کو نعرہ،آگ،بجلی،موت،آندھی وغیرہ نہیں بننے دیا۔ مصطفیٰ زیدی کی نظموں میں سماجی مسائل کو محسوس کیا جا سکتا ہے ان کی نظموں کی جڑیں آسمان سے نہیں بل کہ دھرتی کے بطن سے پھوٹتی ہیں۔ان کی نظموں میں حسن وعشق کی خالص صورتیں ملتی ہیں۔

زیدی نے سرمادارانہ نظام اور اقتصادی بدحالی کو محسوس کیا ہے۔ انھوں نے آسمان زرد تھا،صحراؤں ،ریت کی دستاریں ،دیواریں ہی دیواریں اور ریگ صحرا جیسی علامات

استعمال کی ہیں۔احمد فراز نے زیادہ تر آزاد ہیئت میں لکھا ہے اس لیے وہ مصطفیٰ زیدی اور دیگر ترقی پسند شعرا سے ہیئتی اشتراک رکھتے ہیں۔ ''چلو اس بت کو رو لیں''اور''قلم سرخرو ہے'' آزدا ہیئت کی اہم نظمیں ہیں۔فراز کے شعری مجموعہ ''جاناں جاناں'' کی نظم ''یہ میری غزلیں،یہ میری نظمیں''،قتیل اور ساحر کی نظموں جیسی ہے۔احمد فراز کی معرا ہیئت میں لکھی ہوئی نظموں کا رنگ وآہنگ فیض کا سا ہے۔فراز کی پوری شاعری ظلم وجبر کے خلاف ہے۔ انھوں نے طبقاتی تقسیم کو یکسر رد کر دیا اور مساوی حقوق کا نظام قائم کرنے کے لیے کوشش کی ۔وہ اشتراکی حقیقت نگار تھے ۔انھوں نے معاشرتی ،معاشی اور سیاسی مسائل کو خاص طور پر اپنی نظموں کا موضوع بنایا ۔فراز ایسے شاعر ہیں جنھوں نے فیض اور حبیب جالب کی طرح حق اور سچ کی آواز بلند کی اس سلسلے میں انھیں متعدد مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔

اختر حسین جعفریکی شاعری میں فارسی کی توانا روایت نظر آتی ہے ان کے استعارے اور علامتیں اپنی تہذیب سے جڑت کا احساس دلاتے ہیں،انھوں نے معاصر حالات اور تہذیب وثقافت کی عکاسی کے لیے مانوس علامتوں کو استعمال کیا ہے۔ ان کی شاعری کے ایک ایک مصرعے میں روحِ عصر نظر آتی ہے۔آزاد ہیئت میں نظم نگاری کی وجہ سے وہ فراز سمیت دیگر شعرا سے ہیئتی اشتراکات رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کی ایک آزاد نظم ''سالنامہ'' اہم ہے۔اختر حسین جعفری کی شاعری میں معاصر ترقی پسند شعرا کی طرح سماجی ،سیاسی اور معاشی شکست وریخت کو موضو ع بنایا گیا ہے۔خلیل الرحمن اعظمی کی شاعری میں علی سردار جعفری،فیض احمد فیض اور مجاز کے لہجہ کی نشان دہی کی جا سکتی ہے اور ہیئتی اعتبار سے بھی وہ ان شعرا سے اشتراک رکھتے ہیں۔ چھوٹی بحر میں لکھی ہوئی نظم''آخری رات'' میں بے چین ذہن اور بھٹکی ہوئی روح کی عکاسی کی گئی ہے۔یہ نظم فیض کی نظم''تنہائی'' سے کافی مماثلت رکھتی ہے۔خلیل الرحمن اعظمی نے فنی وہیئتی تجربے کیے ہیں،انھوں نے پابند،نیم پابند،معرا اور آزاد ہیئت میں نظمیں کہی ہیں۔

۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۶ء تک جہاں جدید اردو نظم نئے ہیئتی تجربوں سے آشنا ہوئی وہاں نئے موضوعات اور فطرت کے جھونپڑوں میں داخل ہوئی۔ ترقی پسندوں نے اشارے ،کنائے میں فطرت کی منظر کشی کی۔ ترقی پسند فکر سے قبل روحانی اور جمالیاتی طرز احساس رکھنے والے صرف مناظر فطرت میں ''حسن'' اور پراسراریت کو نمایاں کرنا ہی فطرت نگاری خیال کرتے رہے ۔ترقی پسند رجحان کے حامیوں نے فطرت نگاری کا تصور بھی نیا پیش کیا۔ترقی پسند شعرا نے ظلم وناانصافی ،جنگ وتباہ کاری اور مایوسی وناامیدی کے لیے ''رات'' کے مناظر سے فطرت نگاری کی اور امید وخوشحالی اور امن وترقی کے لیے "صبح" کے مناظر پیش کیے۔رومانوی شعرا نے عورت اور مظاہر قدرت کو حسن قرار دیا ۔جب کہ ترقی پسندوں نے عورت ہو یا قدرت کے حسن کو ماورائی اور ناقابل حصول اور اس کے سراپا کو بیان کرنے کے بجائے اس کو عام انسان اور شریک زندگی اور دکھ سکھ اور امن وترقی کا ساتھی قرار دیا۔انھوں نے عورت کو بھی زندگی کے خوشگوار اور خوب صورت شرکا میں شمار کیا۔ترقی پسند تحریک کے زیر اثر جب موضوعات اور سوچ کے دھارے بدلے

تو فطرت نگاری کے زاویے بھی واضح تبدیل ہوگئے۔ انھوں نے تشبیہات واستعارات سے فطرت نگاری میں جدت پیدا کی۔ترقی پسند فطرت نگاری کے بارے میں ڈاکٹر ناہید قاسمی رقم طراز ہیں:

''ترقی پسند تحریک نے فطرت نگاری کے سکون وجمود کو ختم کیا اور اس میں نئی زندگی کی ہلچل اور ہماہمی کی جھلکیاں دکھائیں۔ان شاعروں کا مشاہدہ خاصا گہرا تھا۔ اس لیے کہ وہ کیوں اور کیسے کے سوالات اٹھاتے اور ان کے جوابات کی کھوج بھی لگاتے ہیں۔ وہ فطرت کے عناصر کو اپنے خیالات اور احساسات کے بیان میں مدد گار کے طور پر برتتے ہیں۔''(۸۷)

ترقی پسندوں نے حقیقت نگاری کے فن کے تقاضے پورے کیے،انھوں نے مظاہر فطرت کی مصوری کرتے ہوئے زندگی کے دونوں رخ پیش کیے۔ جدید اردو نظم کے اولین علم برداروں اور رومانوی دور کے شعرا کی طرح ترقی پسند فکرونظر یہ کے حامل شعرا بھی متعدد موضوعاتی اشتراکات وانسلاکات ،یکسانیت اور تکرار پائی جاتی ہے۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ تمام شعرا میں ہیئت اور صنف کا اشتراک پایا جاتا ہے۔

استخراجِ نتائج/موضوعاتی اشتراکات

ترقی پسند فکر کے حامل نمایندہ شعرا علامہ اقبال ،جوش ملیح آبادی ،ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر، اسرار الحق مجاز، فیض احمد فیض ،علی سردار جعفری، مخدوم محی الدین ، کیفی اعظمی، معین احسن جذبی، جمیل مظہری، ساحر لدھیانوی ،جاں نثار اختر، ظہیر کاشمیری، احمد ندیم قاسمی، عارف عبدالمتین، حبیب جالب، قتیل شفائی ،مصطفیٰ زیدی،احمد فراز، اختر حسین جعفری اور خلیل الرحمٰن اعظمی کی نظموں میں متعدد موضوعاتی وہیئتی اشتراکات ملتے ہیں۔ان نظم نگاروں نے عشقیہ حقیقت نگاری اور رومان وانقلاب کے امتزاج سے ظلم وناانصافی، جنگ وتباہکاری، مایوسی وناامیدی، استحصال، کسان اور مزدور کو موضوع بنایا ہے۔ان شعرا نے یکساں طور پر حقیقت کو فن کے پردوں میں چھپا کر بیان کیا ہے۔ انھوں نے زیادہ تر استعاروں ،کنایوں ،پیکروں ،تمثیل اور علامات میں شعری اظہار کیا ہے۔

ترقی پسند نظم نگاروں نے یکساں طور پر مزدوروں اور کسانوں کو بیدار کیا اور انھیں مضبوط کیا تا کہ وہ استحصالی اور سامراجی طاقتوں سے نبرد آزما ہو سکیں۔ انھوں نے پسے ہوئے طبقے کا درد محسوس کیا اور ان میں ایک امنگ اور ولولہ پیدا کیا۔ ان کے مطابق حاکم ومحکوم ، آجر واجیر، مالک ومزدور اور امیروغریب سب برابرہیں۔ یہ ایسے جمہوری نظام کی بات کرتے ہیں جو سب کو رشتہ انسانیت میں پروتا ہے۔ اقبال ترقی پسند تحریک کے پیش رو ثابت ہوئے۔ اقبال اسلامی جمہوری نظام کا نفاذ چاہتے تھے۔اقبال پہلے شاعر ہیں جنھوں نے سرمایہ ومحنت کو موضوع بنایا ۔ ازاں بعد تمام ترقی پسند نظم نگاروں اسے محبوب موضوع بنا

لیا۔ ترقی پسندوں نے فطرت نگاری اور منظر کشی کو معنی خیز علامتوں اور متاثر کن عناصر کے طور پر پیش کیا ۔ان شعرا نے زندگی کے دونوں رخ پیش کیے۔

ترقی پسند نظم نگاروں نے عورت ہو یا قدرت کے مظاہر سب کے حسن کا استحصال ہوتے دکھایا ہے۔ انھوں نے انسان کو انسان ہی بیان کیا ہے۔ فرشتہ یا کوئی ماورائی مخلوق بنا کر پیش نہیں کیا۔انھوں نے عورت کو ماورائی اور ناقابل حصول اور اس کے سراپا کو بیان کرنے کے بجائے اس کو بھی عام انسان اور شریک زندگی ،دکھ سکھ اور امن اور ترقی کا ساتھی قرار دیا ہے۔ ان شعرا نے رومانی طرز احساس کو غیر روایتی طریقے سے اپنایا ہے۔ انھوں نے حقوق انسانیت اور حریت وآزادی کا منصوبہ بند تجربہ کیا۔ ان کی شاعری عوام کے دکھ ،بے چینی اور سماجی حالات وواقعات کی عمدہ مظہر ہے۔ یہ شعرا مزدور سے ہمدردی رکھتے ہیں انھیں نچلے طبقے کے مسائل کا اندازہ ہے۔ وہ مزدور کی حمایت اور سرمایہ دار کی مذمت کرتے ہیں۔

ان کی شاعری میں مشترکہ طور پر طبقاتی تقسیم کے نتیجے میں لوگوں پر ڈھائے جانے والے مظالم ،محنت کشوں کے عزم ویقین اور انسانی ہمدردی ،مساوات اور امن عالم کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ ان کے دل میں آزادی کی تڑپ ہے۔ یہ تمام شعرا نئے نظام کی بات کرتے ہیں۔ ترقی پسند نظمیں عصری مسائل کے علاوہ ،مذہبی فلسفہ، اسلامی تہذیب وثقافت اور عالمی امن کی ترجمان ہیں۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ شعرا انسان دوست ہیں اور اس زمین پر امن اور محبت کی فراوانی کے آرزو مند ہیں۔ وہ محرومیوں ،ناانصافیوں ،تشدد ،سیاسی ،سماجی قدروں اور ظلم وجبر کے خلاف آواز اٹھاتے ہوئے انسان کی عظمت کی برابری کی بات کرتے ہیں۔ تمام ترقی پسند شعرا مزدور کی حکمرانی چاہتے ہیں اور نظام کہنہ کو بدلنے کے آرزو مندہیں۔

حوالہ جات

۱۔ محمد اقبال،علامہ،کلیات اقبال اردو،(لاہور:الحمد پبلی کیشنز،مارچ۱۹۹۹ء)،ص:۲۱۹

۲۔ منظر ایوبی ،پروفیسر،اردو شاعری میں نئے موضوعات کی تلاش،(کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان،۲۰۱۰ء)،ص:۷۹

۳۔ محمد اقبال،علامہ،کلیات اقبال اردو،(لاہور:الحمد پبلی کیشنز،مارچ۱۹۹۹ء)،ص:۸۵

۴۔ اسرارالحق مجاز،آہنگ،(لاہور:مکتبۂ عالیہ،طبع ثانی ۱۹۴۳ء)،ص:۱۰۵

۵۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا،(لاہور: مکتبۂ کارواں س ن)،ص:۲۴۵

۶۔ جوش ملیح آبادی،جوش کی انقلابی نظمیں ،مرتبہ،وسیم عباس گل،(اسلام آباد: پورب اکادمی،۲۰۱۵ء)،ص:۳۳

۷۔ اسرارالحق مجاز،سازِ نو،(لکھنو:کتابی دنیا، ۱۹۴۹ء)،ص:۱۳۹

۸۔ یعقوب خاور،ڈاکٹر،ترقی پسند تحریک اور اردو شناسی،(علی گڑھ:ایجوکیشنل بک ہاؤس،۱۹۹۷ء)،ص:۱۹

۹۔ محمد اقبال،علامہ،کلیات اقبال اردو،(لاہور:الحمد پبلی کیشنز،مارچ۱۹۹۹ء)،ص:۴۲

۱۰۔ ایضاً،ص:۶۴

۱۱۔ ایضاً،ص:۱۷۷

۱۲۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا،(لاہور: مکتبۂ کارواں س ن)،ص:۴۲۳

۱۳۔ ایضاً،ص:۶۱۸

۱۴۔ احمد ندیم قاسمی ،لوح خاک،(لاہور: اساطیر،اشاعت اول۱۹۸۸ء)،ص:۷۰

۱۵۔ ایضاً،ص:۳۷

۱۶۔ قتیل شفائی ،گجر،(لاہور:الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء)،ص:۷۷

۱۷۔ قتیل شفائی، چھتنار،(لاہور: مکتبہ عالیہ،۱۹۷۵ءص:۸۷

۱۸۔ قتیل شفائی،برشگال،(لاہور: الحمد پبلی کیشنز،۲۰۰۲ء)ص:۱۱۰

۱۹۔ حبیب جالب،کلیاتِ حبیب جالب،(لاہور:طاہر سنزپبلشرز۲۰۱۲ء)،ص:۲۲۹

۲۰۔ احمد فراز،شہرِ سخن آراستہ ہے (کلیات)،(اسلام آباد:دوست پبلی کیشنز،۲۰۰۴ء)،ص:۵۸۸

۲۱۔ ایضاً،ص:۵۹۰

۲۲۔ محمد اقبال،علامہ،کلیات اقبال اردو،(لاہور:الحمد پبلی کیشنز،مارچ۱۹۹۹ء)،ص:۶۱

۲۳۔ ایضاً،ص:۱۰۲

۲۴۔ ایم ڈی تاثیر،آتش کدہ،(لاہور: نوائے وقت،۱۹۵۴ء)،ص:۶۵

۲۵۔ احمد ندیم قاسمی ،لوحِ خاک،(لاہور: اساطیر،اشاعت اول ۱۹۸۸ء)،ص: ۱۳۶

۲۶۔ ایضاً،ص:۶۷

۲۷۔ جوش ملیح آبادی،جوش کی انقلابی نظمیں ،مرتبہ،وسیم عباس گل،(اسلام آباد: پورب اکادمی،۲۰۱۵ء)،ص:۱۷۶

۲۸۔ ایضاً،ص:۱۸۴

۲۹۔ کیفی اعظمی، کیفیات،(دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۱۷ء)،ص:۱۹۷

۳۰۔ اسرارالحق مجاز،آہنگ،(لاہور:مکتبۂ عالیہ،طبع ثانی ۱۹۴۳ء)،ص:۱۰۳

۳۱۔ فیض احمد فیض،دیباچہ،شب تاب،(دلی: ہندستانی پبلشرز،۱۹۳۵ء)،ص:۱۱

۳۲۔ آل احمد سرور،نئے اور پرانے چراغ،(کراچی: اردو اکیڈمی سندھ،۱۹۵۱ء)،ص:۲۵،۲٦

۳۳۔ اسرارالحق مجاز،آہنگ،(لاہور:مکتبۂ عالیہ،طبع ثانی ۱۹۴۳ء)،ص:۱۴۳

۳۴۔ ایضاً،ص:۹۳

۳۵۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا،(لاہور: مکتبۂ کارواں س ن)،ص:۷۵

۳۶۔ عنبرین منیر،ڈاکٹر،جدید اردو نظم میں نفسیاتی عناصر،(فیصل آباد:مثال پبلشرز،۲۰۱۷ء)،ص:۱۳۱

۳۷۔ منظر ایوبی ،پروفیسر،اردو شاعری میں نئے موضوعات کی تلاش،(کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان،۲۰۱۰ء)،ص:۱۰٦

۳۸۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا،(لاہور: مکتبۂ کارواں س ن)،ص:۱۳

۳۹۔ احمد ندیم قاسمی ،ندیم کی نظمیں حصہ اول و دوم،(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۱ء)،ص:۲۰۳

۴۰۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا،(لاہور: مکتبۂ کارواں س ن)،ص:۷۱

۴۱۔ آغا سہیل،ڈاکٹر،ادب اور عصری حسیت،(لاہور: مکتبہ عالیہ،س۔ن)،ص:۲۱۴

۴۲۔ احمد ندیم قاسمی ،ندیم کی نظمیں حصہ اول و دوم،(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۱ء)،ص:۲۴۵

۴۳۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا،(لاہور: مکتبۂ کارواں س ن)،ص:۸۱

۴۴۔ حبیب جالب،کلیاتِ حبیب جالب،(لاہور:طاہر سنز پبلشرز۲۰۱۲ء)،ص:۱۲۳

۴۵۔ عقیل احمد صدیقی، جدید اردو نظم نظریہ و عمل،(لاہور: بیکن بکس،۲۰۱۴ء)،ص:۹۴،۹۵

۴٦۔ اسرارالحق مجاز،آہنگ،(لاہور:مکتبۂ عالیہ،طبع ثانی ۱۹۴۳ء)،ص:۱۰۸،۱۰۶

۴۷۔ جاں نثار اختر،کلیاتِ جاں نثار اختر،(لاہور: الحمد پبلی کیشنز،۲۰۰۳ء)،ص:۲۶۵،۲۶۴

۴۸۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا،(لاہور: مکتبۂ کارواں س ن)،ص:۶۲

۴۹۔ ساحر لدھیانوی،کلیاتِ ساحر،(لاہور: سجاد پبلی کیشنز،س ن)،ص:۱۶۶

۵۰۔ کیفی اعظمی، کیفیات،(دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۱۷ء)،ص:۸۵

۵۱۔ فیض احمد فیض،پیش لفظ،آوارہ سجدے،کیفیات،کلیات کیفی اعظمی،(دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۰۳ء)،ص:۲٦۸

۵۲۔ ساحر لدھیانوی،کلیاتِ ساحر،(لاہور: سجاد پبلی کیشنز،س ن)،ص:۱۹۵

۵۳۔ علی سردارجعفر، کلیات علی سردار جعفری جلد اول،(نئی دہلی:قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان،جولائی ،ستمبر۲۰۰۴ء)، ص: ۲۲۵

۵۴۔ مخدوم محی الدین،بساط رقص،(حیدر آباد:ادبی اسڑیٹ ،۱۹۷۶ء)،ص: ۷۵

۵۵۔ ایضاً ،ص:۸۹

۵۶۔ ایضاً،ص: ۱۱۵

۵۷۔ قمر رئیس،مضمون،مخدوم کی نظموں کا آہنگ،مشمولہ،(کراچی:ارتقا ۴۸مخدوم محی الدین نمبر،جون ۲۰۰۹ء)،ص:۱۴۴

۵۸۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا،(لاہور: مکتبۂ کارواں س ن)،ص:۲۷۸

۵۹۔ کیفی اعظمی، کیفیات،(دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۱۷ء)،ص:۱۱۸

۶۰۔ جمیل مظہری،کلیاتِ جمیل مظہری،(دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۰۸ء)،ص:۱۶۷

۶۱۔ ایضاً،ص:۱۷۴

۶۲۔ علی سردار جعفری ،مقدمہ،پرچھائیاں، مشمولہ،کلیاتِ ساحر،(لاہور: سجاد پبلی کیشنز،س ن)،ص:۱۵

۶۳۔ ساحر لدھیانوی،کلیاتِ ساحر،(لاہور: سجاد پبلی کیشنز،س ن)،ص:۹۹

۶۴۔ احمد ندیم قاسمی ،ندیم کی نظمیں حصہ اول و دوم،(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۱ء)،ص:

۶۵۔ جاں نثار اختر،کلیاتِ جاں نثار اختر،(لاہور: الحمد پبلی کیشنز،۲۰۰۳ء)،ص:۲۲۳

۶۶۔ مخدوم محی الدین،گل تر،(حیدر آباد دکن:مکتبہ صبا،۱۹۶۱ء)،ص:۶۶

۶۷۔ ایضاً،ص:۷۶

۶۸۔ کوثر مظہری،جدید اردو نظم حالی سے میراجی تک،(دہلی: عرشہ پبلی کیشنز،۲۰۱۳ء)،ص:۲۵٦

٦۹۔ مخدوم محی الدین،گل تر،(حیدر آباد دکن:مکتبہ صبا،۱۹۶۱ء)،ص:۱۰۵

۷۰۔ کیفی اعظمی، کیفیات،(دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۱۷ء)،ص:۲۰۲

۷۱۔ معین احسن جذبی،گداز شب،(نئی دہلی:مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ،۱۹۵۸ء)،ص:۴۵

۷۲۔ ایضاً،ص: ۶۷

۷۳۔ کیفی اعظمی، کیفیات،(دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۱۷ء)،ص:۲۸۴

۷۴۔ شائستہ نوشین ،ڈاکٹر، آزادی اور جمہوریت کا تصور اردو نظموں میں،(دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۰۸ء)،ص:۱۲۱

۷۵۔ ساحر لدھیانوی،کلیاتِ ساحر،(لاہور: سجاد پبلی کیشنز،س ن)،ص:۱۲۸

۷۶۔ جاں نثار اختر،کلیاتِ جاں نثار اختر،(لاہور: الحمد پبلی کیشنز،۲۰۰۳ء)،ص:۳۴۸

۷۷۔ احمد فراز،شہرِ سخن آراستہ ہے (کلیات)،(اسلام آباد:دوست پبلی کیشنز،۲۰۰۴ء)،ص:۶۵۸

۷۸۔ ایضاً،ص:۶۶۳

۷۹۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا،(لاہور: مکتبۂ کارواں س ن)،ص:۵۲۷

۸۰۔ احمد ندیم قاسمی ،ندیم کی نظمیں حصہ اول و دوم،(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۱ء)،ص:۳۱۲

۸۱۔ احمد فراز،شہرِ سخن آراستہ ہے (کلیات)،(اسلام آباد:دوست پبلی کیشنز،۲۰۰۴ء)،ص:۴۸۵

۸۲۔ عارف عبدالمتین،آتشِ سیال،(لاہور: بک ورلڈ،۱۹۶۲ء)،ص:۵۵

۸۳۔ ایضاً،ص: ۶۵

۸۴۔ حبیب جالب،کلیاتِ حبیب جالب،(لاہور:طاہر سنز پبلشرز ۲۰۱۲ء)،ص:۲۹۲

۸۵۔ قتیل شفائی ،گجر،(لاہور:الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء)،ص:۲۴

۸۶۔ ایضاً،ص:۵۶

۸۷۔ ناہید قاسمی،ڈاکٹر،جدید اردو شاعری میں فطرت نگاری،(کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان ،۲۰۰۲ء)،ص:۳۸۲،۳۸۳

باب چہارم

حلقہ اربابِ ذوق کے جدید اُردو نظم نگاروں کے موضوعاتی وہیئتی اشتراکات

حلقہ اربا بِ ذوق کے جدید اردو نظم نگاروں کے یہاں متعدد موضوعاتی وہیئتی اشتراکات وانسلاکات دکھائی دیتے ہیں۔حلقے کے شعرا کی شاعری میں یکسانیت اور تکرار کا عنصر نمایاں ہے۔ ترقی پسند تحریک کے عروج کے زمانے(۱۹۳۹ء) میں حلقہ ارباب ذوق کا قیام عمل میں آیا۔ حلقے کی جدید اردو نظم میں موضوعاتی وہیئتی تنوع پایا جاتا ہے۔ اس سے قبل اولین دور کے جدید اردو نظم گو شعرا حالی،آزاد اور ان کے معاصرین نے نظم کو نئی جہت عطا کی تھی ازاں بعد رومانوی شعرا خاص طور پر اقبال کی نظم نگاری کو گویا پر لگ گئے ۔ترقی پسند تحریک نے بھی جدید اردو نظم کو نیا رنگ و آہنگ عطا کیا، ۱۹۳۶ء سے قیام پاکستان تک متعدد اہم شعرا اس تحریک سے وابستہ ہو گئے۔ انجمن پنجاب،رومانوی دور اور ترقی پسند تحریک تک نظم نے کئی کروٹیں لیں اور ایک نئی کروٹ حلقہ ارباب ذوق کے نظم نگاروں نے بھی نظم جدید کو عطا کی۔حلقہ ارباب ذوق کی تحریک نے رومانوی تحریک کے بیشتر اثرات کو قبول کیا ،داخلیت اور خارجیت ،مادیت اور روحانیت کے بنا پر حلقہ ارباب ذوق اور ترقی پسند تحریک میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ان دو تحریکو ں کا قیام تقریباً ایک ہی دور کے سماجی اور معاشی حالات میں ہوا اور دونوں رومانیت کے بطن سے پھوٹیں مگر ایک کا عمل

خارجی اور ہنگامی تھا جب کہ دوسری کا عمل داخلی اور آہستہ رو تھا۔ ان دو تحریکوں نے اپنے عہد کی شاعری کو متاثر کیا۔ ترقی پسند تحریک نے مادی وسائل کو بیان کیا جب کہ حلقے سے وابستہ شعرا نے زیادہ تر روحانی اور داخلی کیفیات کی ترجمانی کی۔ حلقے نے ترقی پسند تحریک کی مقصدیت اور موضوعاتی یکسانیت کو رد کر کے تنوع پیدا کرنے کی سعی کی۔

جدید اردو نظم نگاری میں حلقہ سے متعلق شعرا میراجی ،ن۔م راشد،یوسف ظفر ،قیوم نظر اور ضیا جالندھری نے گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔حلقہ سے جڑے ان شعرا کا کوئی با ضابطہ منشور نہیں تھا۔اس لیے ان میں انتشار بھی رہا،حلقہ سے وابستہ ہر شاعر نے اپنی اپنی ڈفلی بجائی مگر پھر بھی متعدد پہلوؤں میں یکسانیت اور تکرار کی صورت قائم رہی۔ حلقہ کے شعرا فکری اعتبار سے کہیں نہ کہیں ایک دوسرے سے مماثلت رکھتے تھے مگر ان کے ڈکشن اور انداز میں واضح فرق دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً میراجی اور راشد ذات اور کائنات کے بارے میں ایک جیسی دوروں بینی رکھنے کے باوجود ایک جیسا اسلوب استعمال نہیں کرتے،راشد نے فارسی الفاظ کے استعمال سے شاعری کو ثقیل کیا جب کہ میراجی نے ٹھیٹھ ہندی ،سنسکرت اردو اور فارسی کا مخلوط رنگ پیش کیا۔ اس حوالے سے یہ دونوں شعرا اپنے پیش رو عظمت اللہ خان سے متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ترقی پسندوں کی طرف سے حلقہ والوں کو ہیئت پرست ،ابہام پرست اور جنس پرست کہا گیا جب کہ میرا جی نے حلقہ والوں کی طرف سے ترقی پسندوں کو ''آج والے'' کے نام سے موسوم کیا۔ علی سردار جعفری نے حلقہ ارباب ذوق سے متعلق یوں رائے دی:

> ''اس زمانے میں ایک اور گروہ نے سر اٹھایا ہے۔یہ ہیئت پرست اور جنس پرست ادیب تھے جن کے مشہور نمایندے میراجی،یوسف ظفر، ممتاز مفتی اور مختار صدیقی وغیرہ تھے---ان کی بنیاد یہ تھی کہ ادب کا سماج سے کوئی تعلق نہیں ،انھوں نے قدامت سےبچ کر جدت کی طرف قدم بڑھانے کی کوشش کی اور فرائڈ اور ٹی ایس ایلیٹ کی آغوش میں پہنچ گئے۔''(۱)

حلقہ ارباب ذوق کی طرف سے ترقی پسند تحریک پر جو حملہ میراجی نے کیا اس کو یونس جاوید نے یوں رقم کیا ہے:

> ''آج والے کہتے ہیں کہ کل والے ادب کے ذریعہ سے جن کی تلاش میں فن برائے فن کے قائل تھے اس لیے ان کے کلام کو زندگی سے کوئی تعلق نہ تھا اور اس لیے ان کا کلا م زندگی کے لیے مفید نہ تھا۔۔اگر ایک دولمحوں کے لیے فن برائے حیات کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو ہم کہیں گے کہ فن برائے فن

کے بغیر فن ہی نہیں ہو سکتا پھر یہ برائے حیات کا دم چھلا کیسا۔‘‘(۲)

اگر دیکھا جائے تو ایک طرح سے فن برائے فن اور فن برائے زندگی دونوں انتہا پسند میلانات تھے۔اعتدال کا رویہ دونوں تحریکوں کے یہاں نہیں ملتا۔اگر غور کریں تو دونوں کے یہاں فن بھی ہے اور زندگی بھی،لیکن کہیں کہیں انتہا پسندی غالب آگئی ہے۔ انتہا پسندی کے غالب آنے کی وجہ سے ترقی پسند شعرا خطیب یا مصلح قوم کا روپ دھار لیتے ہیں اور حلقہ والوں نے ہر طرح کی وابستگی اور پابندی سے خود کو الگ رکھا۔ حلقے کے دروازے ہر طرح کے شعرا کے لیے کھلے رہے۔ ان میں جمالیت پرست،بائیں بازو، مذہبی،صوفی،روایت پرست اور جدت پسند وغیرہ سب شامل تھے۔ حلقہ کے شعرا راشد وغیرہ نے روایت کے حصار کو توڑا اور معاصر زندگی سے شاعری کا رشتہ استوار کیا جو ان سے پہلے نہیں تھا۔ پہلے شعرا روایت سے انحراف کو معیوب خیال کرتے تھے ،یہ شعرا پرانی پٹریوں کو چھوڑ کر نئی شاہراہوں پر چلنے لگے۔حلقہ کی انفرادی آزادی نے ایک الگ نظریہ ء شعر کو ترویج دینے کی کوشش کی۔حلقہ ایک ملاقات اور مل بیٹھنے کا ذریعہ تھا جس کی مجلسی تنقید میں شاعری کی نوک پلک سنوارنے کے بارے میں رائے زنی کی جاتی،موضوع کو کوئی خاص اہمیت نہ دی جاتی صرف معیار کو ہدف تنقید بنایا جاتا رہا۔ ان کے نزدیک موضوع کا اچھوتا یاپرانا ہوناضروری نہیں بل کہ انداز نظر جدید ہونا ضروری تھا۔حلقہ اربا ب ذوق کے جدید شعری تصور کے بارے میں عقیل احمد صدیقی رقم طراز ہیں:

’’حلقہ والے افادیت کے معیار پر اہم اور غیراہم موضوع کے درمیان فرق نہیں کرتے ۔ان کے نزدیک شخصی اور غیر شخصی دونوں موضوعات اہم ہیں البتہ ان کا اصرار ہے کہ موضوع خیال افروز ہو۔ حلقہ والوں نے اپنے ان تصورات سے فن کار کو ہر طرح کے موضوعات کے اظہار کی آزادی دی اور یہ باور کرایا کہ فن کار کا رشتہ کائنات اور فن کے علاوہ اپنے آپ سے بھی ہے۔اگر وہ آرزو مند ہے کہ خود کوہی موضوع بنائے تو اسے اس بات کی آزادی حاصل ہے۔‘‘(۳)

ترقی پسندوں نے آزاد نظم سے زیادہ تر گریز کیا جب کہ حلقہ ارباب ذوق نے آزاد نظم کو ایک تحریک کی صورت عطا کی۔ ترقی پسندوں نے بہت بعد میں اس ہیئت کو اختیار کیا ،حلقہ والے چوں کہ روایتی نظام سے مکمل آزادی چاہتے تھے اس لیے انھوں نے شعر کے روایتی سانچوں سے بہت جلد انحراف کیا۔ آزاد نظم روایتی اسلوب سے قطعی انحراف کی صورت تھی جسے بالخصوص حلقہ والوں نے اختیار کیا۔جدید اردو نظم میں زبان، علائم اور استعارے کی بات کریں تو ہمیں دو طرح کے انداز نظر آتے ہیں۔ ایک انداز ترقی پسندوں کا ہے اور دوسرا حلقہ ارباب ذوق کے یہاں پایا جاتا ہے۔ ترقی پسندوں نے جہاں براہ راست اور خطیبانہ شاعری پر زور دیا وہاں حلقہ ارباب ذوق کے شعرا نے بالواسطہ اظہار کو اپنا کر اسے

جدت اور انفرادیت کی راہ دکھائی۔ اس لیے ترقی پسند شعرا کے مقابلے میں حلقے کے شعرا کی زبان استعاراتی اور علامتی انداز زیادہ ہے۔

میراجی کی شمولیت کے بعد حلقہ کے پلیٹ فارم سے کہی جانے والی نظم پر مغربی نظموں کے اثرات بھی مرتب ہوئے۔انگریزی نظموں کے تراجم بھی کیے گئے۔ اس عہد کی نظموں کی خاص بات یہ ہے کہ ان میں مقصدیت کی چھاپ دکھائی نہیں دیتی۔ اس دور میں موضوعاتی تنوع کے تحت خوف، تنہائی، جنس،طبقاتی کشمکس، بے سکونی، جبرواستحصال، بے حسی، اخلاقی، روایات ،داخلی احساس وکیفیات ،عشق کا مختلف تصور،انسان کی بے قدری جیسےموجضوعات شامل کیے گئے۔ جنس اور مذہب جیسے حساس موضوعات پر بھی نظمیں کہی گئیں۔ نظم نگاروں نے اپنی تخلیقات میں ہندی الفاظ کا بھی استعمال کیا کیوں کہ حلقہ سے وابستہ کئی شعرا گیت نگاری بھی کرتے رہے۔ میراجی کی نظم''چنچل'' ملاحظہ کیجیے ،ا س نظم میں ہندی الفاظ کے استعمال سے کلام میں حسن پیدا کرنے کی سعی کی گئی ہے:

کبھی آپ ہنسے ،کبھی نین ہنسیں ،کبھی نین کے بیچ ہنسے کجرا/کبھی سارا سندر انگ ہنسے ،کبھی انگ رکے ہنس دے گجرا(۴)

ضیاجالندھری کی شاعری میراجی کے زیر اثر ہے۔جس طرح میراجی نے ہندی الفاظ اور ہندی تہذیب کا ذکر کیا ہے ضیا نے بھی اپنی متعدد نظموں میں خلاص ہندی ڈکشن سے ہندی تہذیب ورنگ کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس کی ایک اہم مثال نظم''موج رگ''ملاحظہ کیجیے:

کنھیا اکے اشلوک ارجن کھلی آنکھوں سنتا رہا/سبھی ایک ہیں/یہ دھرتی،یہ آکاش اور جو بھی ان سب میں ہے(۵)

اس نظم کے علاوہ ضیا کے شعری مجموعہ''سرشام'' کے گیت بھی جن میں شیام،بندرابن، رواں،دروپدی،پانڈو، ہنسی جیسے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ ضیا جالندھری کے اس ڈکشن پر میرا جی کے اثرات واضح نظر آتے ہیں۔ ضیا کے شعری مجموعہ''نارسا'' کی ایک پابند ہیئت کی نظم''دوڑدھوپ'' اس کی اعلا مثال ہے:

میں مورکھ رنگوں کا رسیا ، تیری راہ گیا تھا
بھول
وہ آئی تھی چنچل جس کی نظریں کرنیں ،باتیں
پھول
(٦)

اگرچہ ضیا جالندھری کی یہ نظم ہیئتی اعتبار سے میرا کی متعدد نظموں سےمماثلت نہیں رکھتی لیکن اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ضیا جالندھری نے میراجی کی طرح ہندی الفاظ کا بھر پور استعمال کیا ہے۔مختار صدیقی نے ہندی اور فارسی زبان آمیز کر کے نیا لسانی آہنگ

پیدا کیا ہے ان کی نظمیں''رسوائی''،''دکھ سکھ'' اور ''رات کی بات''اس نئے شعری لسانی آہنگ کی آئینہ دار ہیں۔ مثال کے لیے نظم ''رسوائی'' کے ایک بند کے مصرعے دیکھیے:

ٹیکا لگاؤں ، مانگ بھی ، صندل سے بھر چکوں
دلہن بنوں تو چاہیئے جوڑا سہاگ کا
مہندی رچے گی پوروں کہیں جا کے دیر میں
(۷)

مختار صدیقی ہندی الفاظ کے استعمال کے اعتبار سے میراجی سے متاثر لگتے ہیں۔ان کی شاعری روایت وجدت کا حسین امتزاج ہے۔ان کے علاوہ وہ سیماب ،جوش اور اختر شیرانی سے بھی متاثر رہے۔ اس لیے انھوں نے سیماب کی سی زبان دانی، حفیظ کا سا ترنم، اختر شیرانی کی سی رومانیت اور میرا جی کی طرح کا ہندی ڈکشن اور جنسی رجحان نمایاں نظر آتا ہے۔ مختار صدیقی تہذیبی،لسانی اور فکری ہم آہنگی کے ساتھ ساتھ زندہ ہیں۔ میراجی اور مختار دونوں کے لسانی اور فکری اظہار میں کہیں کہیں مماثلت ہے۔ اور کہیں کچھ فرق بھی نظر آتا ہے۔ اس بارے میں کوثر مظہری رقم طراز ہیں:

''میرا جی نے اپنی مٹی اور اپنے تہذیبی عناصر کوزیادہ ترجیح دی۔ مختار کے یہاں بھی اس طرح کا طرز اظہار ملتا ہے جس سے اس کا اندازہ ہو جاتا ہے۔''(۸)

مختار صدیقی کو میرا جی اور حلقے کے دیگر شعرا کی طرح زمین اور اس کے عوامل سے بے حد قرب ہے۔ اس کی مثال نظم''قریۂ ویراں'' سے ملتی ہے۔ پنگھٹ ،چوپال ،گلیاں ،کوچے اور راکھ ان الفاظ کی خاص ہندوستانی شناخت ہے،مختار صدیقی نے اس نظم میں تہذیبی و لسانی ہم آہنگی پیدا کی ہے۔ وہ ہندی ڈکشن کےلحاظ سے میرا جی سے کافی مماثلت رکھتے ہیں۔ نظم ''خیال چھایا '' میں مختار صدیقی کا ہندی ڈکشن دیکھیے:

مرے چاند ، رچاؤ ساری سکھیوں سنگ راس
میری رانی آؤ بھی
جی کے شیتل گات میں اک اک سجیلے انگ میں
(۹)

مختار صدیقی اپنا تخلیقی مواد معاشرے سے حاصل کرتے ہیں۔ وہ معاشرتی زندگی کا بغور مشاہدہ کرکے اس کی مختلف تہوں کو کھولتے ہیں۔ ان کی شاعری میں معاشرے کے ہاتھوں ستائی ہوئی لٹی ہوئی عورت کاالمیہ بھی ہے اور معاشرتی نشیب وفراز سے پیدا ہونے والی بے اعتدالیوں اور بے انصافیوں کاتذکرہ بھی ملتا ہے۔ مختار نے آزاد نظمیں کم لکھی

ہیں۔انھں نے پابند اورمعرا نظمیں زیادہ لکھی ہیں۔ منیر نیازی ،موضوعات اور ہیئت دونوں اعتبار سے اپنے معاصرین سے مماثلت رکھتے ہیں۔ انھوں نے آزاد نظموں کے علاوہ گیت نگاری بھی کی ہے ،میراجی سمیت حلقے کے کئی شعرا نے گیت میں طبع آزمائی کی انھوں نے میراجی کی طرح ہندی کیفیات کوسمو کر اور ہندی طرز احساس کوبیان کیا ہے۔ان کے ابتدائی گیتوں میں لہجے کا رچاؤ اور لفظیات کا انتخاب میراجی جیسا ہے:

کس کس سے ہم پریت نبھائیں /کون سی مورت من میں بٹھائیں/سانجھ سویر کس کو ڈھونڈنے /کنج گلیوں میں جائیں(۱۰)

اسی نوع کا ایک دوسرے گیت کا نمونہ دیکھیے:

بات تو دیکھو پاگل من کی /چاہ کرے اُس کے جوبن کی/جس کا بسیرا ،سیج گگن کا/باتیں دیکھو پاگل من کی(۱۱)

منیر نیازی نے گیت نگاری کرتے ہوئے بھی اپنے تخلیقی جوہر دکھائے ہیں ،روایتی ہونے کے باوجود انھوں نے گیتوں میں نیا انداز اور نیا رنگ پیدا کیا ہے۔ بعد میں منیر رفتہ رفتہ ہندی آہنگ سے دور ہوتے جاتے ہیں۔ انھوں نے عشق مجازی سے عشق حقیقی کی کیفیات کو رقم کیا ہے۔ اب کے بعد کے گیت اردو گیت نگاری کی روایت میں اہم اضافہ ثابت ہوئے ہیں۔منیر کی شاعری میں میرا جی کی طرح ہنددیومالا کی چند علامتیں ہیں ان میں بندرا بن ،شیام ،گوبیان ،رادھاکا جنگل،پیڑ اہم ہیں۔میراجی نے براہ راست سماجی مسائل کو موضوع نہیں بنایا مگر بنیادی سر چشمہ زندگی ہی کو قرار دیا ہے۔ان کی نظموں میں سماجی اور جنسی زندگی کا سراغ ملتا ہے۔میراجی نے جہاں زندگی سے متعلق مختلف موضوعات کو پیش کیا وہیں ''جنس'' ان کی شاعری کا محبوب موضوع رہا ہے۔ میراجی نے ایک خاص تصور لیے جنسی احساسات کی شاعری شروع کی ۔وہ فرائڈ کے نظریات سے بے حد متاثر تھے اور اس نظریے کی تقلید میں اظہار بھی کرتے رہے۔ اس حوالے سے راشد اور میراجی میں کافی مشترک قدریں پائی جاتی ہیں۔ راشد اور میراجی نے جنس کے سکہ بند تصور سے شعور طور پر انحراف کیا اور یہ باور کرانے کی کام یاب سعی کی کہ جنس ایک فردکی زندگی کا انتہائی محرک پہلو ہے۔ روح اور جسم کی کامل ہم آہنگی کے بغیر انسان کی شخصیت تکمیل نہیں پاتی۔ میراجی نے پہلی مرتبہ جنس کے روایتی تصور کو رد کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ جنسی ناآسودگی کی وجہ سے فرد کی شخصیت پارہ پارہ ہو جاتی ہے اور وہ ذہنی ،جسمانی اور جذباتی پیچیدگیوں کاشکار ہو جاتا ہے۔

میرا جی کی اکثر نظمیں جسم وروح کے ارتباط اور ہم آہنگی سے مملو ہیں۔ انھوں نے اپنی نظموں میں جنس کے ایک نئے تصور کو فروغ دیا۔ ان کی نظمیں زیادہ تر جنسی ناآسودگیوں کی زائیدہ ذہنی اور جذباتی کشکمش اور پیچیدگیوں کو ظاہر کرتی ہیں۔ انھوں نے بے باک جنسی اظہار کرکے نئی شعری بوطیقا تشکیل کی ہے۔ان کی نظم ''اغوا'' میں سماجی

جبر سے آزادی حاصل کرنے کے لیے محبوبہ کو گھر سے بھاگ جانے کی ترغیب دی گئی ہے،مثنوی کی ہیئت میں لکھی ایک نظم ملاحظہ کیجیے:

دھیرے دھیرے قدم اٹھائیں ہم
اور بستی کو چھوڑ جائیں ہم
دیکھو محدو زندگی کیونہو؟
غیر کے بس میں سر خوشی
کیوں ہو؟

(۱۲)

میرا جی نے اس نظم میں عشق کی آزادی کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ ان کی یہی خواہش نظم''رسیلے جرائم کی خوشبو'' میں جنسی وصال کی آرزو میں بدل جاتی ہے۔میراجی نےاس نظم میں ایک فرد کی ذہنی کیفیت اور سماجی جبر سے پیدا ہونے والی کشکمش کو بیان کیا ہے۔ انھوں نے اپنی بیشتر نظموں میں جنسی عمل کی خواہش کو مختلف جزئیات کی صورت میں پیش کیا ہے۔ وہ اپنی ایک نظم''دکھ درد کا دارو'' میں فرد کی جذباتی اور ذہنی کیفیت کو اجاگر کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی متعدد نظموں میں عورت کو ایک زرخیز زمین سے مشابہت دی ہے اور جابجا ناجائز جنسی تعلق کو بھی سراہا ہے۔ اس کی عمدہ مثال ان کی نظم ''حرامی''ہے جس میں انھوں نے جنسی تعلقات کی آسودگی کو زندگی کا حاصل کہا ہے۔ناجائزہ جنسی تعلقات کی بازگشت میراجی کی متعدد نظموں میں سنائی دیتی ہے میراجی کی اس نوع کی نظموں کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا رقم طراز ہیں:

''یہاں دشنو مت کی وہ بنیادی تصور جس کے تحت زرخیزی اور افزائش کو باقی سب باتوں پر فوقیت حاصل ہے ابھر کر نمایاں ہو گیا ہے اور میراجی نے ناجائز محبت کے ضمن میں عام سماجی ردِ عمل کو قطعاً نظر انداز کر دیا ہے۔''(۱۳)

دراصل میراجی کی نظمیں ناجائز جنسی تعلقات کے خلاف صدائے احتجاج ہیں۔ ان پر فحاشی اور جنسی کج روی کا الزام لگانا مناسب نہیں انھوں نے اس نظم میں ایک مسافر ایک عورت کے پاس ٹھہرتا ہے اور پھر چل دیتا ہے ،نظم ملاحظہ کیجیے:

میں تھکا ماندہ مسافر ہوں چلا جاؤں گا/اک گھڑی راہ میں تم مجھ کو بسر کرنے دو /جانی پہچانی ہپر اک بات ہوا کرتی ہے(۱۴)

میراجی نے اپنی نظموں میں جنسی موضوع کو بھر پور انداز میں پیش کیا ہے ،ان کی نظموں ''کروٹیں''،''دھوبی کاگھاٹ''،''ایک شام کی کہانی''میں جنسی الجھن کا موضوع پست سطح سے بلند ہو کر اس دور کی اجتماعی زندگی کاایک پہلو بن جاتا ہے۔میرا جی کا

جنسی جذبہ جب شکست خوردہ ہوا تو انھوں نے ''نارسائی''،''کٹھور''،''مجھے گھر یاد آتا ہے''،''مجاور'' جیسی نظمیں تخلیق کیں۔ ان کی نظم ''اونچا مکان'' ایک فاحشہ کی قابل رحم زندگی کی کہانی ہے۔نظم ''کلرک کا نغمۂ محبت'' میں کلرک کی مجبور زندگی اور ادھورے خوابوں کا ذکر ملتا ہے۔میراجی کے یہاں جو جنسی پیکر دکھائی دیتے ہیں وہ محض تصوراتی ہیں ،وہ حقیقی طور پر جنسی لذت سے آشنا نہ ہو سکے،وہ عورت کے تخیلی پیکر کے ساتھ لذت کا حصول کرتے ہیں۔اس طرح ان کا پردۂ خیال ہمیشہ مرتعش اور رقصاں رہا،ان کے اذیتی عمل ،حسرت اور نارسائی کا کرب نظم''دھوبی کا گھاٹ'' میں دیکھیے:

کیوں صرف اچھوتا /انجان انوکھا/اک خواب ہے خلوت/کیوں صرف تصور/بہلاتا ہے مجھ کو/کیوں خواب فسوں گر کی قبا چاک نہیں(۱۵)

میرا جی کی دیگر نظموں ''ہندی جواں''،'' لب جوئبار''،''سرسراہٹ'' وغیرہ میں بھی اسی نوع کا جذباتی ،ہیجانی اور جنسی اظہار ملتا ہے۔میراجی فطرت کے نظریہ آزادی کے قائل تھے اس لیے وہ مرد اور عورت کے آزادانہ اختلاط کو عین فطرت خیال کرتے تھے۔ان کی نظم''دور کرو پیراہن کے بندھن کو ''میں ان کا نظریہ آزادی دیکھا جا سکتا ہے۔میرا جی نے عورت کو اپنی نظموں کا عنوان بنایا ہے۔ ان میں ''ایک عورت''،''اجنبی انجان عورت رات کی''،''آخری عورت''،''ایک تھی عورت''،''ایک اور عورت''،''ہندوستانی عورت'' ،''دوسری عورت سے''،''پہلی عورت''،''ایک عورت اور ایک تجربہ'' اور''ایک خاموش عورت '' شامل ہیں۔

ن م راشد کے یہاں بھی ابتدائی دور میں میراجی کی طرح جنسی موضوعات پر نظمیں موجود ہیں۔ راشد کی شاعری میں جنسی موضوعات کی حامل نظموں میں ''حزن وملال''،''اتفاقات''،''ایک رات''،''مکافات''اور''انتقام'' زیادہ اہم ہیں۔ ان تمام نظموں میں انتقام کا موضوع ذرا مختلف ہے ،میرا جی کی طرح ن م راشد کی نظموں میں جنسی وصال کی اہمیت اجاگر کر کے محبوبہ کو وصل کی جانب راغب کرنے کی سعی کی گئی ہے۔میراجی کی طرح راشد بھی فرائڈ سے گہرے متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ میرا جی سے موضوعاتی وہیئتی اشتراک کی مثال نظم''مکافات'' دیکھیے:

دبائے رکھا ہے سینے میں اپنی آہوں کو/وہیں دیا ہے شب وروز پیچ وتاب انھیں /زبانِ شوق بنایا نہیں نگاہوں کو/کیا نہیں کبھی وحشت میں بے نقاب انھیں(١٦)

راشد کی شاعری میں فرد کی آزادانہ تعمیر، اداسی، محرومی اور تاریکی کا غلبہ زیادہ ہے مگر فرد کی یہ مایوسی اور ذہنی الجھن ان کی ابتدائی نظموں میں دکھائی دیتی ہے۔ راشد شاعری میں داخلی دنیا کی عکاسی کرتے ہیں۔ راشد کے یہاں فرار اور انحراف کی انتہا پائی جاتی ہے۔ وہ ایسی زندگی کا خواب دیکھتے ہیں جہاں زندگی میں جنس کے سواکوئی قدر برابر نہ ہو ،وہ زندگی کی کشمکش سے گریزاں اور مفرور دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ایسی جگہ تلاش کرتے ہیں خیروشر کے تصورات نہ ہوں۔راشد نے بھی میرا جی کی جنسی جذبے کو اہمیت دی

ہے لیکن انھوں نے زندگی سے متعلق دوسرے موضوعات بھی پیش کیے ہیں۔راشد نے اپنی نظم''حزنِ انسان'' میں نا آسودہ جنسی جذبے کی وجہ سے پیدا ہونے والی ذہنی و جذباتی کیفیت کو بیان کیا ہے۔راشد کی نظموں میں بھی روایتی زندگی اور محبت کے مروجہ تصور سے بغاوت کارجحان ملتا ہے۔ راشد نے بھی محبت کو جنسی جذبے اور لذت تک محدود کر دیا ہے۔ اس کی وجہ ان پر مغربی شاعری اور فرائڈ کے نظریاتی اثرات ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر وزیرآغا رقم طراز ہیں:

> ''راشد کے یہاں ایک تو گوشت پوست کی عورت ابھری ہے اور دوسرے شاعر نے محبت کو محض جسمانی لذت محدود کر دیا ہے۔ ایک لحاظ سے راشد کی ایک قابلِ قدر خدمت بھی ہے کہ محبت کو تخیل محض سے نجات دلائی اور اس کے مادی پہلوؤں کی طرف ہمیں متوجہ کیا لیکن مصیبت یہ ہوئی کہ راشد نے محبت کی مادی کیفیات ہی کو سب کچھ سمجھ لیا ۔''(۱۷)

راشد نے بھی میراجی کی طرح محبوبہ کو سماجی جبر سے چھٹکارہ پاکر وصل سے لطف اندوز ہونے کی ترغیب دی ہے۔ انھیں اس بات کا یقین ہے کہ وصال کی لذت کی آشنائی جسم وروح میں ہم آہنگی پیدا کرتی ہے۔اس کی واضح مثال نظم ''طلسمِ جاوداں ''ہے۔راشد کے مطابق مرد اور عورت کے جنسی وصال کے بغیر معتدل زندگی کا تصور محال ہے،وہ جسم و روح کی مکمل ہم آہنگی وصال ہی میں سمجھتے ہیں،اس بات کا ذکر انھوں نے اپنی نظم''اتفاقات'' میں کیا ہے۔راشد نے اپنی نظموں میں جابجا جنسی آسودگی کے حصول کا ذکر کیا ہے،انھوں نے اپنی محبوبہ کو سماجی بندھن توڑ کر وصال پر آمادہ کیا ہے،ان کی نظم''ایک رات'' میں بالآخر ان کی محبوبہ سارے ضابطے پس پشت ڈال کر اپنے محبوب سے ہم آہنگی کر لیتی ہے۔نظم کے یہ مصرعے دیکھیے:

تیرے سینے کے سمن زاروں میں اٹھیں لرزشیں/میرے انگاروں کو بے تابانہ لینے کے لیے/اپنی نکہت اپنی مستی مجھ کو دینے کے لیے (۱۸)

راشد اور میرا جی میں ایک خاص مشترک پہلو یہ ہے کہ ان دوشعرا نے جنسی احساسات کی شاعری کے ایک خاص تصور کے زیر اثر شروع کی،یہ دونوں شعرا فرائڈ کی تحلیل نفسی کے تصور سے متاثر ہو کر ''لاشعور''کو فرد کی زندگی کا طاقتورمحرک گردانتے تھے۔ فرائڈ کے مطابق لاشعور میں ناآسودہ خواہشیں جو تکمیل نہیں پاتیں جمع ہوتی رہتی ہیں اور یہ غیر ارادی طور پر انسان کے روزمرہ کے اعمال سے ظہور پاتی ہیں۔راشد اور میراجی کی شاعری میں متعدد اشتراکات پائے جاتے ہیں ۔

ڈاکٹر تصدق حسین خالد بھی راشد اور میراجی کی طرح رومانوی صف سے نکل کر ترقی پسندی کی طرف آئے لیکن فرائڈ کو اپنا امام ماننے اور جنسی کج روی کا شکار ہونے کی بنا پر انھیں ترقی پسند تسلیم نہ کیا گیا۔اس لیے حلقہ کے دیگر شعرا کی طرح یہ بھی دونوں

تحریکوں کے درمیان کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ معاملات ومتعلقات جنسی ان کی نظموں کے موضوعات ہیں۔ خالد نے نئے تجربے کر کے سماجی موضوعات پر بھی قلم اٹھایا کیوں کہ انھیں زندگی کی الجھنوں کا احساس تھا۔ تصدق حسین خالد،راشد اور میراجی کی شاعری میں اختلاف کے بہت کم پہلو نکلتے ہیں۔ان شعرا کے یہاں نئے موضوعات نئے تجربات کے ساتھ ،نظم کی ہیئت اور اسلوب کی جدت طرازی ایک جیسی ہے۔ان تینوں شعرا کی شاعری میں بیرونی دنیا سموئی ہوئی ہے،خالد اپنی نظموں میں بیرونی ممالک کے واقعات وحالات کا ذکر کرتے ہیں۔خالد پر مغربی ادبیات کا بے حد اثر تھا۔ ان کی شاعری میں نفسیاتی الجھنوں ،جنسی کیفیتوں اور سماجی قیود سے متعلق موضوعات کی تفسیر خالد کی نظموں میں ملتی ہے وہی میراجی اور راشد کی شاعری میں ملتی ہے ،ا س کی ایک اہم مثال تصدق حسین خالد کی نظم''ایک کتبہ''ہے۔

منیر نیازی کی نظموں میں بھی جنسی کربناکی بھی ایک نئی صورت میں ملتی ہے۔منیر جنسی شدت پسند تصورات رکھتے تھے۔ ان کی نظموں میں جنسی جذبے کی متعدد علامتیں ملتی ہیں۔ ان کی برتی ہوئی علامتوں میں بھی پراسراریت پائی جاتی ہے۔''لالٹین'' کی علامت منیر کی ذات کا داخلی احساس ہے جس میں خارج سے ٹکرانے کی ہمت موجود ہے۔آندھی اور طوفان بھی داخلی ذات میں بننے والی رکاوٹیں ہیں جو ذہن میں موجود ہوتی ہیں۔''تیز ہوا'' کی علامت بھی اسی حوالے سے ہے۔''دہر کی موج''اور''آوازوں کی فوج ''سے ایک خوف،دباؤ اور گھٹن کی فضا مراد لی گئی ہے۔میراجی نے اپنی نظموں میں انسانی جبلت کو اہمیت دی ہے۔انھوں نے ان نام نہاد اخلاقی اقدار کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے جنھوں نے انسان کی روح کو تباہ کیا ہے۔میراجی کی نظمیں جسم سے بلند ہو کر مابعد الطبیعاتی رخ اختیار کر لیتی ہیں۔ان کی علامتی نوح کی نظموں میں ''فاختہ''،''کوا''،''بعد کی اڑان''اور ''طوفان کے بعد'' اہم ہیں۔میراجی نے روسی شاعرہ اینااینخما توفا کی نظم کا ترجمہ ''سچی بات'' اور الگزانڈر کی نظم کا ترجمہ ''نامحرم'' کے عنوانات سے کیا۔ ان کی نظم''سمندر کا بلاوا'' بھی کافی اہم ہے۔ ملاحظہ ہو:

یہ سرگوشیاں کہہ رہی ہیں اب آؤ کہ برسوں سے تم کو بلاتے بلاتے مرے/دل پہ گہری تھکن چھا رہی ہے/کبھی ایک پل کو کبھی ایک عرصہ صدائیں سنی ہیں مگر یہ انوکھی ندا آرہی ہے/بلاتے بلاتے تو کوئی نہ اب تک تھکا ہے نہ آیندہ شاید تھکے گا(۱۹)

میراجی کی اس نظم میں سمندر کا استعارہ زندگی کے لیے ہے ایک طرف سمندر شاعر کو اپنی طرف بلاتا ہے اور دوسری طرف اسے موت کی آغوش میں جانے کی آرزو ابھرتی ہے۔ہر رومانوی شاعر کی طرح میراجی کے یہاں خوشی کا خاتمہ دکھ پر ہوتا ہے اس لیے ان کی نظموں کی تان بھی موت پر ٹوٹتی ہے۔ انگریزی رومانوی شاعر کیٹس کی نظم'' LaBelle Dame sans Merci'' سے میراجی کی نظم ''محبوبہ کی تصویر '' مناسبت رکھتی ہے۔ کیٹس اپنی اس نظم میں عورت کے حسن سے متاثر ہوتا ہے مگر آخر میں یہ حسن موت کے ہاتھوں فنا ہو جاتا ہے۔اسی طرح میراجی کی نظم''محبوبہ کی تصویر'' زندگی سے بھرپور ہے اور

آخر فنا اس کا مقدر ہے۔میراجی کی انگریزی نظموں کے اثرات کی حامل دیگر نظموں میں ''چل چلاؤ''،'' درشن'' اور ''تنہائی'' شامل ہیں۔انگریزی شعر وادب کا اثر راشد کی شاعری کی ہیئت ،اسلوب اور فکر میں نظر آتا ہے۔ان کیشاعری میں فطری،سیاسی وسماجی اور اقتصادی عناصر ملتے ہیں۔ راشد کی نظموں پر بلیک ولیم اور بائرن کے اثرات ملتے ہیں۔ ''بادل''،''خواب''،''آوارہ''،''خواب بستی''،''رخصت''اور ''ایک رات'' جیسی نظموں میں انگریزی شعرا کی فکری جھلک نظر آتی ہے ،اس کی ایک مثال راشد کی نظم''ستارے''دیکھیے:

نکل کر جوئے نغمہ خلد ازارِ ماہ وانجم سے
فضا کی وسعتوں میں ہے رواں آہستہ آہستہ
یہ سوئے نوحہ آبادِ جہاں آہستہ آہستہ
نکل کر آرہی ہے اک گلستان ترنم سے

(۲۰)

راشد کی نظموں میں مظاہر فطرت کا بیان رومانوی فکر اور طرز احساس کا مظہر ہے لیکن راشد نے ستاروں کے ذریعے انسان کو اپنے مقام کو پہنچانے کی بات کی ہے۔ ولیم بلیک کی نظم ''Star To The evening''بھی اسی نوعیت کی ہے۔ راشد کی یہ نظم سانیٹ کی ہیئت میں ہے ،راشد پر یہ اثرات اختر شیرانی کے بھی ہو سکتے ہیں۔راشد کی بائرن اور بلیک کی طرز پر لکھی ہوئی نظمیں سانیٹ کی ہیئت میں ہیں۔ انگریز ی شاعر ی امراو سلاطین کی خوشنودی کے بغیر ہے اس لیے جدید دور کے شاعر نے ہندوستان کے امراوسلاطین کی خوشنودی کے روایتی ماحول کو یکسر نظر انداز کر دیا اور انگریزی شاعری کے تتبع میں اردو نظم کی بنیاد رکھی،راشد بھی مغربی افکار سے متاثر رہے اس بارے میں ڈاکٹر آفتاب رقم طراز ہیں:

''وہ(راشد) مغرب کے ادب اور مغرب کے خیالات ہی کے نہیں مغرب کی عام روزمرہ زندگی کے طور طریقوں کے بھی دلدادہ تھے۔ مغرب پسندی کی وجہ راشد کی وہی باغیانہ روش کہ انھیں جمود سے نفرت تھی۔''(۲۱)

راشد نے ''ایران میں اجنبی'' میں ایشیائی عوام کی بات کی ہے جو مغربی طاقتوں کے زیر تسلط ہے لیکن انھوں نے اپنی نظموں میں ذاتی محرومیوں کو بیان کرنے کے بجائے انسانیت کے ستم رسیدہ روح کی صدا بلند کی ہے،راشد کی نظم ''من وسلویٰ '' ولیم بلیک کی''Jerusalem'' کی طرح ایشیا کا نوحہ ہے۔ جس طرح بلیک ''Jerusalem'' میں انگلینڈ کے لیے ''Albion'' کی علامت استعمال کرتے ہیں اسی طرح راشد ایشیائی لوگوں کی بے بسی کے لیے ''من وسلویٰ'' کی علامت استعمال کرتے ہیں۔نظم ملاحظہ کیجیے:

بس ایک زنجیر/ایک ہی آہنی کمندِ عظیم/پھیلی ہوئی ہے/مشرق کے اک کنارے سے دوسرے کنارے تک/مرے وطن سے ترے وطن تک/ہم ایشیائی اسیر ہو کرتڑپ رہے ہیں/مغول کی صبح خون فشاں سے/فرنگ کی شامِ جاں ستاں تک(۲۲)

''Jerusalem'' میں بلیک مغربی اقوام کو انگلینڈ کے تابع کرنے کے لیے جو جنگ لڑ رہا ہے وہ انسانیت کی بھلائی کے لیے ہے ،اسی طرح راشد بھی ایشیائی اقوام کو ایک زنجیر سے بندھے رہنے کا کہتے ہیں۔راشد کو حیرت ہے کہ ایشیائی لوگ ایک جیسا درد رکھنے کے باوجود اکٹھے کیوں نہیں ہوتے ایشیائی قوموں کو فرنگی نے جو آلام دیا ہے وہ مشترک ہے۔راشد کے شعری مجموعہ ''ایران میں اجنبی '' میں متعدد بار ایشیائی عوام کا نوحہ دہرایا گیا ہے۔ ''نمرود کی خدائی'' اس نوع کی اہم نظم ہے۔میرا جی کی طرح راشد نے بھی انگریزی رومانی شعرا کے اثرات قبول کیے اس حوالے سے ان میں اشتراک پایا جاتا ہے۔ ان کے شعری مجموعہ ''ماورا '' کی ابتدائی نظموں میں ''انسان '' ، رخصت،شاعر کا ماضی،زندگی،''جوانی''اور''حسن '' پر انگریزی رومانی شعرا کے اثرات ہیں۔راشد نے ایلیٹ کے اثرات کو اپنی تہذیبی اساطیری روایت سے نمایاں کیا ہے۔ان کی نظم ''سباویراں'' اور ایلیٹ کی''Waste Land'' کا فکری پس منظر ایک جیسا ہے۔ راشد اور ایلیٹ دونوں نے تہذیب کے روحانی بنجر پن کی تصویر کشی کی ہے۔

منیر نیازی کی شاعری پر بھی انگریز ی رومانی شعرا کولرج اور ولیم بلیک کے اثرات ملتے ہیں۔منیر کی نظمونمیں بجلیوں کا کڑکنا، طوفانوں اور آندھیوں کا چلنا کولرج کی شاعری کی اساطیری فضا سے متاثر نظر آتا ہے۔ منیر کی نظم''برسات''میں بجلیوں کے چمکنے کی ساری فضا''The Rime of the Ancient Mariner'' سے مماثلت رکھتی ہے،ان کی آسیبی اور اساطیری فضا کولرج کی آسیبی فضا سے متاثر ہے،نظم''برسات'' دیکھیے:

آہ! یہ بارانی رات/مینہ ہوا طوفان رقص صاعقاب/شش جہت پرتیرگی امڈی ہوئی /ایک سناٹے میں گم ہے بزمِ کائنات (۲۳)

ولیم بلیک کے اثرات بھی واضح طور پر منیر نیازی کی نظموں پر موجود ہیں منیر کی نظمیں''خزاں''،''رات کی اذیت''،''میں وہ اور رات''اور'' خواب گاہ'' اس حوالے سے اہم ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ولیم بلیک کی نظم ''To the Evening Star''سے منیر نے شام کے چمکتے ستارے کا مفہوم اخذ کیا ہے۔منیرنیازی کی شاعری کے بارے میں نگہت ناہید ظفر رقم طراز ہیں:

> ''منیرنیازی کی شاعری اس جدید عہد کے کرب کی شاعری ہے۔ منیر کی جدید حسیت اس جدید معاشرے کے انسان کے کرب وویرانی اور بیگانگی جیسے رویوں کو اپنی شاعرانہ فکر سے اس طرح بیان کرتی ہے کہ اس جدید صنعتی معاشرے کا ایک ایک اخلاقی کرب نمایاں ہو جاتا ہے۔''(۲۴)

میراجی نے اپنی فکر کو ہندوستانی تہذیب وتمدن اور مذہبی عقائد سے ہم آہنگ رکھا۔ انھوں نے ''برندابن'' کا استعارا سوچ سمجھ کر استعمال کیا ہے۔ انھوں نے گجراتی لہنگوں ،راجپوتانہ لہنگوں اور ساڑی کا ذکر الگ الگ کیا ہے۔اس حوالے سے میراجی کی نظم ''عکس کی حرکت'' اہم ہے۔ ضیا جالندھری کی اکثر نظمیں کراچی اور لاہور کی ہیں یا پاکستان کے کسی بھی علاقے کی پیداوار ہیں۔ضیا جالندھری نے کراچی میں قیام کیا ان کے مجموعہ'' خواب سراب''میں ایک نظم ''بڑا شہر'' کے نام سے شامل ہے،جس میں کراچی کی تہذیب کی عکاسی کی گئی ہے۔اس نظم میں ضیا نے کراچی کی مشینی زندگی کے حصار میں پھنسے ہوئے لوگوں کی بات کی ہے،انھوں نے عوام کی بے حسی اور ناآشنائی کی بات کی ہے،اس نظم میں ضیا نے ایک مہیب اور جبریہ منظر پیش کیا ہے۔ جہاں تہذیب وثقافت کی قدریں دم توڑتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

راشد کی شاعری میں صرف جوانی کے مسائل وتجربات ہی نہیں بل کہ زندگی کے گہرے مشاہدے اور ماضی کے تہذیبی نقوش بھی ہیں۔وہ اپنے اولین شعری مجموعہ ''ماورا'' میں بھی ماضی کی روایت اور تہذیبی نقوش سے دامن نہ چھڑا سکے۔ وہ نظم ''دریچے کے قریب'' میں اپنی محبوبہ کو صبح کے وقت خواب گاہ کے دریچے سے ایک مشرقی شہر کا نظارہ کراتے ہوئے ایک پرانی مسجد کے میناروں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔اس نظم میں ایک تاریخی و تلمیحی انداز اپنایا گیا ہے۔راشد کی نظموں میں عرب تہذیب وتمدن اور مشرقی روایات کے عناصر موجود ہیں۔ان کی نظموں میں جہاں گاؤں کی زندگی کا رنگ ملتا ہے وہاں شہری زندگی کے نقوش بھی ملتے ہیں۔انھوں نے شہروں کی منافقت اور زبوں حالی کو بیان کیا ہے۔ مثال کے لیے ایک نظم''زندگی سے ڈرتے ہو'' ملاحظہ کیجیے:

شہر کی فصیلوں پر/دیو کا جو سایہ تھا پاک ہو گیا آخر/ رات کا لبادہ بھی/چاک ہو گیا آخر،خاک ہو گیا آخر/اژدہام انساں سے فرد کی نوا آئی(۲۵)

میراجی نے زیادہ تر آزاد نظمیں کہیںاور پابند نظموں میں ہیئت کے تجربے کیے ،ہندی الفاظ اور شعری اثرات شعوری طور پر اپنائے،میارجی نے جس جدت پسندی کا آغاز کیا نوجوان شعرا اس سے بے حد متاثر ہوئے ان کے تمثیلی ،ایمائی اور اشاراتی انداز نے دیگر شعرا کو بہت متاثر کیا ،میراجی سے زیادہ متاثر ہونے والے شعرا میں یوسف ظفر،قیوم نظر،مختار صدیقی اور ضیا جالندھری شامل ہیں۔ اور غیر تحریکی شعرا میں مجید امجد اور اخترالایمان کا نام سامنے آتا ہے۔ میرا جی کی شاعری میں فطرت کی عکاسی کے لیے نظم''اجنتا کے غار'' ملاحظہ کیجیے:

دھیان کی جھیل میں لہراتا کنول کا ڈنٹھل/سوچ آتی ہے مجھے کیوں ہوئی پروا چنچل /دھیان کی جھیل میں ہرچیز ہے کومل شیتل /جیسے ناری ہو اٹھائے ہوئے امرت چھاگل /کیا کنول تال کا منظر نہیں دیکھا تونے/پیڑ بھی ہیں ،پتے بھی ہیں،پودے بھی لہراتے ہیں(۲٦)

اس طویل نظم میں میراجی نے نے ہندوستان کی تاریخ رقم کی ہے انھوں نے اجنتا کے غاروں میں بنی ہوئی تصویروں اور وہاں رکھی ہوئی مورتیوں کے حالات خصوصاً گوتم بدھ کی طرف اشارہ کیا ہے۔اقبال کی نظم''مسجد قرطبہ''،ساحر لدھیانوی کی ''تاج محل''،مجید امجد کی ''مقبرۂ جہانگیر''اوراخترالایمان کی نظم''مسجد'' میراجی کی نظم ''اجتنا کے غار''سے موضوعاتی اشتراکات رکھتی ہے۔ان نظموں میں مغل شہنشاہوں کے عروج وزوال کی عکاسی کی گئی ہے اور نوآبادیاتی عہد کی طرز تعمیرات کا نقشہ کھینچا ہے۔ ضیا نے بھی طویل نظمیں لکھی ہیں۔وہ ہیئتی حوالے سے میراجی اور دیگر شعرا سے اشتراکات رکھتے ہیں۔''ساملی''ان کی ایک طویل نظم ہے۔ ان کی ایک اور نظم"ہابیل اور قابیل" میں نفرت ،حسد اور بڑھتی ہوئی قتل وغارت کی مذمت کی ہے۔

میراجی کی فطرت نگاری کی حامل نظموں میں ''انجام''،''جو ہو کے کنارے''اور'' درشن'' زیادہ اہم ہیں۔میراجی نے بالکل نئے انداز کی فطرت نگاری کی ہے،انھوں نے ایک شاعر کے حساس تنہائی کو بیان کیا ہے۔ ان کا طرز فطرت نگاری عمدہ اور مختلف ہے جس میں انھوں نے علامتوں اور تشبیہوں کا استعمال کیا ہے۔ میراجی کی فطرت نگاری کا ایک نمونہ دیکھیے:

پربت کو اک نیلا بھید بنایا کس نے دوری نے
چاند ستاروں سے دل کو بھر مایا کس نے
دوری نے
نئی، اچھوتی ، انجانی لہروں کا سا ساگر نیارا
ہے
دور کہیں بستی سے بن میں سونا مندر پیارا ہے

(۲۷)

میراجی کی فطرت نگاری میں ان کی تنہائی کا احساس ہوتا ہے ان کے یہاں منظر بکھرے بکھرے دکھائی دیتے ہیں انھوں نے قوی تخیل اور گہرے مشاہدے اور تجربے سے اپنی توانائی ریزہ ریزہ کر کے اردو نظم کو جو کچھ دیا ہے وہ نہایت اہم ہے ۔وہ مناظر فطرت کے ذریعے بھی قاری کے ذہن میں سوال جگاتے ہیں۔ڈاکٹر تصدق حسین خالد کی فطرت کے موضوع پر لکھی گئی نظموں میں ''رودکوہی''،مری میں اکتوبر کی ایک دوپہر،فوراہ،انتخاب،ایک تارہ،تارےسے،سنیٹ جیمز پارک میں،برفباری،چاند آج کی رات،موج،''دریا''اور ''بارش'' اہم ہیں۔اگرچہ خالد نے دیہاتی زندگی کم ہی بسر کی لیکن ان کی شاعری میں دیہی زندگی کی بھر پور عکاسی ملتی ہے۔ ان کی نظم بھولی بسری یادیں اور نیلم کی شہزادی دیہات کی تصویر کشی کرتی ہے۔انھوں نے مشرقی اور مغربی شہروں کے نقشے بھی خوب صورت انداز میں کھینچے ہیں۔ میراجی کی طرح انھوں نے اردو شاعری میں ہندی الفاظ استعمال کر کے بہتر رس گھولا ہے۔درختوں سے انھیں بے حد لگاؤ ہے،پیڑ ایک

،حسن قبول اور شہتوت کے سایوں کے نیچے ،ان کی اہم نظمیں ہیں۔ خالد کی شاعری میں چشمے گاتے ،چاند ناچتے،خوشی سے جھومتے ہوئے درخت،طوطے،مینا ،چڑی،ممولے،کوئے،سیب اور سرسوں کے پھول ،پھول پتیوں کی رنگا رنگی سمیت قدرت کے حسن کی لامتناہی جھلکیاں ملتی ہیں۔ خالد اور میرا جی وراشد میں کئی حوالوں سے اشتراک ملتا ہے کہیں یہ اشتراک ہیئتی ہے اور کہیں انگریزی شعرا سے متاثر ہونے کی وجہ سے سماجی ،سیاسی اور رومانی انداز میں ملتا ہے۔اس بارے میں ڈاکٹر سید عبداللہ رقم طراز ہیں:

''یہاں مقصود ترجیح وتفصیل نہیں ،کہنا صرف یہ ہے کہ جس شاہراہ کی اگلی منزلوں کے خوش نصیب راہرو میراجی اور ن م راشد وغیرہ تھے اس کا پہلا حوصلہ مند مسافر خالد ہی تھا۔۔۔اتنا قطعی ہے کہ خالد پر اقبال کا گہرا اثر ہوا ۔۔۔اس نے مگرب کے رومانوی شاعروں خصوصاً بیسیوں صدی کے انگریزی شعرا کے اثرات زیادہ قبول کیے اور انھیں کے انداز اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔''(۲۸)

حلقے کے شعرا نے فطرت نگاری کے اچھے نمونے پیش کیے ،ان کی فطرت نگاری استعارات اور ایمائیت سے مملو ہے۔قیوم نظر کی نظموں میں فطرت کا مظہر یا منظر کسی نہ کسی پہلو سے ضرور ملتا ہے۔انھوں نے اپنا جذبۂ خیال اور احساس کے اظہار کے لیے خارجی منظر کا سیا ق وسباق تلاش کیا ہے۔قیوم کی فطرت نگاری کی مثال نظم''گیان''دیکھیے:

تری ہی صورت زیبا مجھے دکھاتے ہیں
یہ مرغزار یہ میدان ، یہ کہسار یہ برف
یہ ابر پارے جو چپ چاپ اڑتے جاتے ہیں
(۲۹)

قیوم نظر کی نظم ''واپسی'' میں مظاہر فطرت کا ذکر بڑے خوب صورت انداز میں ملتا ہے۔ وہ جب اداسی کی کیفیت بیان کرتے ہیں تو شام کے تلازمات کا استعمال کرتے ہیں ،ا س اداسی کی حالت کو بیان کرتے ہوئے وہ فطرت کی تصویر کشی کرتے ہیں ۔ان کی نظمیں ''شکست '' ،''خلش تاثر''اور'' انجام'' مشاہدہ فطرت کی مثالیں ہیں۔ میراجی اور یوسف ظفر کی طرح انھوں نے بھی رات کو آندھی کی طرح آتا اور چھاتا ہوا بیان کیا ہے لیکن وہ رات کو اچھا نہیں سمجھتے کیوں کہ دن کوچھپا دیتی ہے۔وہ اپنی ایک نظم ''الجھن'' میں دن کو پسند کرنے کی وجہ بھی بیان کرتے ہیں۔قیوم نظر نے گردپیش سے کافی اثر لیا ان کی نظموں میں سماجی ،معاشی اور سیاسی حالات کا ذکر بھی ملتا ہے اور رومانوی احساس بھی نمایاں ہے۔ ان کی رومانیت ان کی افسردہ خاطری میں اضافہ کرتی ہے۔ ''خواب کار'' اور''یاد'' اس سلسلے کی اہم نظمیں ہیں۔انھوں نے فطرت کو پس منظر بنا کر اپنی ذہنی اور جذباتی کیفیت بیان کی

ہے۔ قیوم نظر کی نظموں''برسات کی رات''، ''خواب گراں''،''زندگی'' اور''شکست'' میں فطرت کے مظاہر کا ذکر ملتا ہے۔نظم ''برسات کی رات'' کا نمونہ دیکھیے:

کالی کالی بہت ہی کالی
بے ربط مگر جواں حسینہ
کیا رکھتی ہے زیست کا قرینہ
ہلنے لگے اس کے سرنگیں لب

(۳۰)

قیوم نظر کی نظم''زندگی'' بھی ان کی فطرت نگاری کی عمدہ مثال ہے۔ یوسف ظفر نے بھی اپنی نظموں میں مظاہر قدرت کی خوب منظر کشی کی ہے۔''صدائے آوارہ'' اس حوالے سے عمدہ مثال ہے۔یوسف ظفر اور فطرت میں ایک تعلق ضرور پایا جاتا ہے ۔جب انھیں تنہائی کا احساس ہوا تو وہ مناظر فطرت کے قافلوں کے ساتھ محو سفر ہو گئے۔میراجی اور حلقہ ارباب ذوق کے دوسرے شعرا سے ظفر کی مماثلت کے بارے میں ڈاکٹر ناہید قاسمی رقم طراز ہیں:

''یوسف ظفر، میراجی سے خاصے متاثر ہیں لیکن ان کی نظم ان کی اپنی ہے۔ کیوں کہ وہ میراجی کی طرح تنہا تو ہیں لیکن تنہائی انھیں ڈس نہیں رہی۔ مایوس وہ بھی ہیں لیکن امید بھرے سوال ضرور کرتے ہیناور بڑی بات یہ کہ شاعر اور فطرت میں ایک تعلق ضرور باقی ہے یوں وہ سچ مچ اکیلا نہیں رہتا بلکہ اس کے ساتھ مناظر فطرت کے قافلے رواں دواں ہیں۔''(۳۱)

یوسف ظفر نے خارجی مناظر کی عکاسی بڑی عمدگی کے ساتھ کی ہے ،وہ اپنے دلی سکون کے لیے مضافات کی طرف نکل جاتے ،ان کی نظم ''سفر''ملاحظہ کیجیے:

بھیگی رات کی بے نور سیہ تاریکی
راستے پر کئی سنسان ، سبک سرسائے
میری آہٹ پہ اچک کر مجھے یوں دیکھتے ہیں
جس طرح گھات میں دشمن کوئی گھبرا جائے

(۳۲)

یوسف ظفر ابتدا میں مناظر فطرت کو موضوع بناتے رہے بعدمیں تلخئ ایام نے ان کے تخیل کو تحریک دی تو وہ انسانی جذبات اور حقیقت نگاری کے قریب ہو گئے ۔انھوں نے ذاتی

اور عصری زندگی میں لاچاری اور گھٹن محسوس کی اور اسے شعری پیکر عطا کیا ۔ضیا جالندھری فطرت اور حسن کی رنگینیوں سے بھی محبت کرنے والے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری ماضی کی یادوں اور ناآسودہ خواہشوں کی ترجمان ہے۔نظم ''برسات''کے یہ مصرعے دیکھیے:

دل میں آیا ہوا ہے چھپ کے کوئی/آرزوئیں مگر ترستی ہیں/ گرتی ہیں ذہن کے دھندلکوں سے /یادِ ماضی کی بجلیاں دل پر/مینہ برستا ہے گرم پلکوں سے(۳۳)

یہی آنسو نظم''برکھا''اور ''آنسو'' میں نظر آتے ہیں۔ شکستگی ،ویرانی،آنسو اور افسردگی ضیا کی شاعری پر چھائے ہوئے ہیں۔ ''زمستان'' اور ''سانولی'' میں موت کا تصور نمایاں ہے۔ ان کی شاعری میں مظاہر فطرت کی عکاسی دیکھنے کے لیے نظم ''برکھا '' پیش خدمت ہے:

بھیگے ہوئے شاخ پر شگوفے
خنداں خنداں ، گہر بداماں
بھیگی ہوئی پتیاں زمیں پر

(۳۴)

ضیا جالندھری کی شاعری پر حلقہ ارباب ذوق کے اہم شاعر راشد کے اثرات ملتے ہیں ،اس بارے میں ڈاکٹر ناہید قاسمی رقم طراز ہیں:

''ضیا جالندھری نے راشد سے جنگ عظیم کے بعد کی مغربی شاعری کا مزاج مشرقی آہنگ میں برتنے کا سلیقہ سیکھا۔ ضیا نے بھی فنی تکنیکی اور جمالیاتی تہ داری کا اندازہ مغربی ادبیات سے خود اکتساب کیا اور کمال تخلیقی تنوعات کے ساتھ برتا۔''(۳۵)

ضیا جالندھری نے نظم ''انجام'' میں رمزیہ انداز اپناتے ہوئے فطرت نگاری کی ہے۔ نظم ''دکھاوا''میں انھوں نے شکستہ دیوار ودر پہ سبزہ بہار کے راگ الاپے ہیں۔میراجی ،راشد اور دیگر شعرا کی طرح ابتدا میں ضیا نے بھی فطرت نگاری کرتے ہوئے انگریزی فطرت پرست شعرا سے اثر قبول کیا بعد میں انھوں نے مقامی استعاروں اور تشبیہات استعمال کر کے اپنا مشرقی اسلوب قائم کیا۔ طویل نظم ''خزاں'' میں ضیا نے فطرت کی تصویر کشی کی ہے۔ضیا کی فطرت نگاری میں اداسی بھی ہے اور امید کی شمع بھی جلی نظر آتی ہے۔وہ اپنی شاعری کو فکر کا رنگ دینے کے لیے فطرت سے رجوع کرتے ہیں۔ مختار صدیقی اپنے اپنے گردوپیش کا گہرا مشاہدہ کرتے ہیں۔ وہ حسن فطرت کے جلوؤں سے حظ اٹھاتے ہیں ،انھوں نے علامتی و رمزیہ انداز بیان میں مظاہر فطرت کا ذکر کیا ہے ۔مختار فطرت کے مظاہر میں

سمندر،دریا،جھیلیں، ہوائیں، مینہ،پھواریں، کھیت کھلیان، میدان، پھول ،تاروں بھری راتیں،ساحل ،موجیں، پنگھٹ ،چوپال، بستیاں، گلی،کوچے، گھٹائیں، ویرانے، صحرا، خزاں،بہار ،وادیاں، کہسار،ابر ،ستارے، آفتاب ،مہتاب ،بھیگی راتیں اور گھور اندھیرے سناٹے وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ مختار صدیقی فطرت نگاری کرتے ہوئے کائنات کی وسعتوں میں کھو جاتے ہیں۔ مختار نے فطرت کے مناظر اور موسم کے رنگ کو تہذیبی تناظر میں بیان کیا ہے۔

مختار صدیقی نے ذات پرستی کو بڑے غوروفکر کے بعد اپنایا،انھوں نے عرفان ذات مناظر فطرت سے حاصل کیا،نظم "حرف وسخن" بھی اسی سلسلے کی نظم ہے۔ مختار صدیقی نےمناسک حج کے دوران چاندنی رات کا خوب صورت منظر پیش کیا ہے،چاندنی کا حسین نور دیکھیے:

موتیوں اور ہیروں سے بھی پیاری ،اجلی چاندنی/جھلملاتی ریت کی پہنائیاں /خنکی سے چور/ سائے لٹ چھٹکائیں ، ان میں نور کے موتی پروتی چاندنی(۳٦)

مختار صدیقی نے قدیم تاریخ اور تہذیب کو بھی مناظر فطرت کے ذریعے بیان کیا ہے انھوں نے تشبیہات اور استعارات سے فطرت کی تصویر کشی کی ہے۔ ضیا جالندھری اور دیگر شعرا کی طرح انھوں نے بھی طویل نظمیں تخلیق کی ہیں۔ ان کی ایک طویل نظم''لہریں'' کافی اہم ہے۔انھوں نے اس نظم میں تاریخ کی لہروں کومناظر فطرت کے ذریعے بیان کیا ہے۔مختار صدیقی کی فطرت نگاری کے حوالے سے پائے جانے والے اشتراکات و انسلاکات کی بات کریں تو قیوم نظر کی نظم ''جہلم کا پانی ''اورمیراجی کی نظم ''سمندر کا بلاوا'' اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ڈاکٹر وزیرآغا کی متعدد نظمیں متحرک پیکر اور فطرت کی تجسیم کا عمدہ نمونہ ہیں وہ لہلہاتے کھیتوں ،گھنی ٹھنڈی چھاؤں اور بستی کی دیگر چھوٹی چھوٹی اشیا کا گہرا مشاہدہ کر کے بالکل نئے امیج تلاش کرتے ہیں۔ دھرتی پوجا سے لگاؤر فطرت اردو شاعری میں ہمیشہ سے رہی ہے اس حوالے سے وزیر آغا کی نظم''دھرتی کی آواز''اہم ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کی شاعری کے موضوعات حیات وکائنات کے اسرار کی کھوج سے متعلق ہیں، وہ روحانی کشف کے اظہار کو وسیلہ بناتے ہیں ،وہ محبوب کے لیے مثال بھی مظاہر فطرت سے لاتے ہیں:

چکہتے ہوئے تینوں نٹ کھٹ زمانے/ترے گرد ناچیں/تو ہنسی کی تانوں سے ہر شے کو پاگل کرے نذرِ آتش کرے/توڑ ڈالے(۳۷)

میراجی کے یہاں سماجی شعور کی جھلک بھی بڑی واضح دکھائی دیتی ہے ،وہ اپنی ذات کے حصار میں رہتے ہوئے کسی طرح بھی سماجی شعور سے عاری نہیں،ان کا سماجی شعور ان کی متعد د نظموں میں نمایاں ہے۔ان کے گہری سماجی بصیرت کی عمدہ مثال نظم ''آدرش'' ہے۔میراجی کی نظم''بیوپاری'' بھی سماجی ناہمواری کو بیان کرتی ہے ۔انھیں اپنے معاصر حالات سے کافی آگہی تھی اس نظم میں انسانیت کے درد کا ذکر ملتا ہے ۔میراجی اپنی

ذات میں اک سماج تھے ۔ان کی ذاتی کیفیت اور جذبات کی ترجمانی کرتی ہوئی نظمیں بھی دوسروں کے جذبات واحساسات کو ابھارتی ہیں:

میں ہوں اک بھنڈار دکھوں کا میرے پاس خزانہ ہے
میں نے اوروں کے دکھ میں اپنے دکھ کو پہچانا ہے

(۳۸)

ن م راشد کی نظموں میں معاشی اور معاشرتی مسائل کی جھلک نظر آتی ہے۔''انسان'' ان کے ابتدائی دور کی نظم ہےجس میں انھوں نے معاشرے میں پائی جانے والی ناہمواری اور نابرابری کا ذکر کیا ہے۔ راشد نے اس سماجی ناہمواری پر نہ صرف افسوس کا اظہار کیا ہے بل کہ اس صورت حال کا حل بھی نکالا ہے۔ وہ اپنی ذاتی افسردگی کو نظم ''وادئ پنہاں''میں یوں بیان کرتے ہیں:

کاش بتلا دے کوئی/مجھ کو بھی اس وادئ پنہاں کی راہ/مجھ کو اب تک جستجو ہے/زندگی کے تازہ جولانگاہ کی/کیسی بیزاری سی ہے/زندگی کے کہنہ آہنگِ مسلسل سے مجھے(۳۹)

میراجی کی ذات کافی ناکامیوں اور محرومیوں سے ہمکنار رہی ،اس کیفیت میں وہ کبھی زندگی سے بیزار نظر آتے ہیں اور دنیا سے ترک تعلق کا ارادہ کر لیتے ہیں،نظم ''ترک تعلق'' اس حوالے سے زیادہ اہم ہے۔میراجی زیادہ تر اپنی ذات کے شاعر ہیں لیکن ذات بھی تو سماج ہی کا ایک حصہ ہے،انھوں نے اپنی ذات کے حوالے سے زندگی کو تعبیر کیا ہے۔انھوں نے راشد کی نسبت سماجی وسیاسی موضوعات کا بیان کم کیا ہے۔ مختار صدیقی نے سیاسی وسماجی موضوعات کو بھی اہمیت دی ہے ان کے نزدیک اصل فن پارہ وہ ہے جو اپنے عہد کا ترجمان ہو اور اس میں آفاقی عنصر پایا جائے۔ان کی نظموں میں اضمحلال اور سرور کی ملی جلی کیفیت پائی جاتی ہے۔ان کی نظموں ،غزلوں اور گیتوں میں بھی المیہ کا احساس ملتا ہے ان کی ذہنی وفکری ہم آہنگی اور مزاج ومیلان اور تخلیقی جوہر کا پتا نظم''بازیافت''سے لگایا جا سکتا ہے۔حلقہ والوں نے بھی استحصال زدہ طبقے سے ہمدردی ،مظلوم کی حمایت کی ہے۔انھوں نے ادب کے ذریعے آدمیت کا ساتھ دیا ہے حلقہ والوں نے کسی خاص نوع کا آلہ کار بننے کے ببجائے شاعری کی جمالیاتی اقدار کی پاسداری کی ہے۔ضیا جالندھری کی نظموں میں سماجی ذمہ داریوں کا احساس پایا جاتا ہے ۔انھوں نے اپنی نظم ''ٹائپسٹ'' میں استحصالی سماج میں فرد کی حالت زار کو بیان کیا ہے۔

اس نظم میں انسان کےمشینی عہد کا بیان کیا گیا ہے کہ شام ہونے والی ہے اور ایک ٹائپسٹ کا کام ختم ہونے والا نہیں ،سورج کی ایک کرن کمرے میں داخل ہو کر اس دن بھر کی اکتا دینے والی تھکن اور مصروفیت کو خیر باد کہہ دینے پر اکساتی ہے لیکن گرد سے آلود

ماحول،کاغذوں سےاٹی میز ،رجسٹروں سے بھری الماری اور ٹائپ رائٹر کی منحوس آواز سے فوراً گھبرا کر باہر نکل جاتی ہے۔ اس نظم میں جو ٹائپسٹ ہے وہ ایک لڑکی ہے اور ہدہد کے گھونسلہ بنانے کے عمل اور دوشیزہ کے گھر آباد کرنے کو ہم رشتہ کر کے موضوعاتی بہاؤ میں تیزی پیدا کی ہے۔ بادلوں کے امڈ آنے سے کسان اس امید سے ہیں کہ بارش ہونے سے فصلیں بھر پور پیداوار دیں گی۔ اس نظم میں سماجی جبر اور استحصالی طبقہ کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ ہمارے محنت کش طبقہ اپنی محنت کے ثمر سے ہمیشہ محروم رہتا ہے۔ ضیا جالندھری نظم ''ٹائپسٹ'' میں ایک دوشیزہ کی آنکھ سے موضوع کو سماجی ،طبقاتی ،وقت اور تقدیر کے ہاتھوں پس جانے والی زندگی کا مشاہدہ کیا ہے۔ انھوں نے انسانی زندگی کو مسلسل رو بہ زوال ہوتے دکھایا ہے اور ٹائپسٹ کو ایک دوشیزہ کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ان کی نظم''کچرا'' میں یہی دوشیزہ بھیس بدل کر ایک عورت کا روپ دھار لیتی ہے ۔اس نظم میں انھوں نے انتہائی نچلی سطح کی بات کی ہے۔انھوں نےاس بسنتی کا ذکر کیا ہے جو گھر وں میں صفائی ستھرائی کاکام کرکے پیٹ کی آگ بجھاتی ہے:

بسنتی ہمارے یہاں صبح کے وقت آتی ہے/ڈیوڑھی میں ،دلان میں اور آنگن میں جھاڑو لگاتی /وہ باورچی خانے سے اور گھر کے ہر کونے کھدرے سے کچرا اٹھاتی/گئے روز کے ردی کے کاغذ الگ جمع کرتی/تپائی سے کرسی اور میز سے گرد اور گندگی جھاڑتی پونچھتی(۴۰)

ضیا جالندھری نے متوسط طبقے کے گھرانوں کی بات کی ہے جنھوں نے صفائی ستھرائی کے لیے عورت رکھی ہوتی ہے ،نظم میں کرسی،میز،چارپائی،تپائی،باورچی خانے ،دالان ،ڈیوڑھی اور غسل خانے کے الفاظ آئے ہیں جو متوسط طبقے کی علامت ہیں۔ جو درمیانی طبقے کی ترجمانی کرتےہیں اور اونچے طبقے کی نقالی کرتے ہیں۔ اس نظم میں ضیا نے انسان کو انسان کے ساتھ محبت کے رشتے میں آمیز کرنے کی بات کی ہے۔ ان کی نظم''ہم'' میں عورت اک ایک روپ قابل ذکر ہے۔ اس نظم میں وہ ایک دلال عورت کا ذکر کرتے ہیں جو اونچے طبقے کے عیش پرستوں کو لڑکیاں فراہم کرتی ہے ،یہ عورت ایک ہوٹل کی لابی میں متکلم نظر آتی ہے۔ضیا جالندھری نے اونچے طبقے کی عیش پرستی،ضمیر فروشی اور بداعمالیوں کا ذکر کیا ہے اور یہ بات انھوں نے ایک دلال عورت کے کردار کے ذریعے پیش کی ہے۔ انھوں نے اس نظم میں عورت کو استحصالی نظام کا شکار دکھایا ہے۔

ضیا جالندھری بڑے محب وطن شاعر تھے انھوں نے ۱۹۷۳ء میں'' شہر آشوب'' کے نام سے ایک نظم لکھی جس میں پاکستان کو دولخت ہوتے ہوئے دکھایا ہے۔ وہ اس سانحے پر افسو س کا اظہار کرتے ہیں۔ضیا کی شاعری میں تہذیبی زوال اور صنعتی معاشرے کی بے حسی،کچلے ہوئے افراد اور استحصال زدہ غریبوں اور عورتوں کو مخصوص استعاروں اور علامتوں کے ذریعے بیان کیا ہے۔ ان کی نظموں میں ایک طرف سیاسی معنویت پائی جاتی ہے قیام پاکستان کے بعد ضیا کو سیاسی موضوعات سے دل چسپی ہونے لگی تو انھوں نے اپنے عہد کے سیاسی اور تمدنی آشوب کو شعری پیکر عطا کیا۔ضیاجالندھری کے سیاسی شعور کی توضیح کرتےے ہوئے فتح محمد ملک رائے زنی کرتے ہیں:

> ''ضیا کا سیاسی شعور ان کے سیاسی نعروں سے مستعار نہیں جن کا چلن ضیا کی فنی شخصیت کے تشکیلی دور میں عام تھا ۔اس کے برعکس اقبال کے مانند ضیا کے سیاسی شعور کی جڑیں ان کے جمالیاتی تصورات اور روحانی عقائد میں پیوست ہیں ۔''(۴۱)

''وقت کاتب ہے'' اور ''راہیں'' ضیا کے سیاسی شعور کی حامل نظمیں ہیں ضیا نے سیاسی حکمرانوں کو علامتی انداز میں بیان کیا ہے۔انھوں نے اپنی نظموں میں حکمرانوں اور اونچے طبقے کی جبریت کا احساس دلایا ہے وہ انسان کو وقت کی ناپائیداری اور فنا کا احساس دلاتے ہیں ،وہ ایسی منزل کے متلاشی ہیں جہاں وقت کے بندھنوں سے آزاد ہو کر انسان زندگی گزار سکے۔ضیا جالندھری کے شعری مجموعوں ''سرشام''سے لے کر''پس حرف'' تک کی طویل اور مختصر نظموں میں انسانی نفسیاتی حقائق کو قریب سے دیکھنے اور محسوس کرنے کا عمل نظر آتا ہے۔

حلقہ کے دیگر شعرا نے بھی علامت نگاری کی ہے مگر انھوں نے نظم کو اس علامتی عمل سے نہیں گزارا جس طرح میراجی نے علامت نگاری کی ہے۔علامت نگاری کے سلسلہ میں میراجی اور حلقے کے دوسرے شعرا میں اشتراک پایا جاتا ہے۔ ان کے یہاں اس طرح علامت نگاری ہوئی ہے کہ ہر لفظ پچھلے اور بعد کے لفظ سے مل کر کوئی مفہوم متعین کرتا ہے۔میراجی کے یہاں جنسی احساسات اور مظاہر فطرت سے معمور نظموں میں علامتی رجحان پایا جاتا ہے۔انھوں نے نظم "عورت" میں بڑے خوب صورت انداز میں مناظر فطرت کو پیش کرتےہوئے علامتی عمل اپنایا ہے۔میراجی کا علامتی عمل انتہائی معنوی انداز میں ملتا ہے ان کی علامتی نظموں میں ''لب جوئبار''،اونچا مکان،جاتری ،اجنتا کے غار ،''سمندر کا بلاوا'' اور'' آبگینوں کے اس پار کی ایک شام''زیادہ پر مغز اور پر معنی ہیں۔میراجی کی علامت نگاری کا انداز روایتی ہے،وہ فرانسیسی علامت نگاروں خصوصاً بودلیئر سے گہرے متاثر تھے۔ میراجی حلقے کے نمایندہ شاعر تھے انھوں نے اردو نظم کو اس کی مخصوص ہیئتوں اور موضوعات سے آزاد کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔اس سلسلے میں انھوں نے نظم معریٰ اور آزاد نظم کو فروغ دیا۔

علامت نگاری کی بات کریں تو راشد میراجی سے اشتراک رکھتے ہیں لیکن ان کا علامتی عمل قدرے مختلف ہے۔ میراجی پوری پوری نظم علامتی عمل سے گزارتے ہیں جب کہ راشد کسی شے کو کسی تصور کی علامت سے بیان کرتے ہیں۔راشد نے متعدد انفرادی علامتیں بھی تخلیق کیں۔انھوں نے متعدد نظموں کے کر داروں کو فنکار کی علامت میں پیش کیا ہے۔مثال کے طور پر نظم''حسن کوزہ گر''میں حسن کوزہ گر ،''ابولہب کی شادی'' میں ابولہب ،''سلیماں سر بہ زانو'' میں سلیمان اور نہایت مشہور نظم''اندھا کباڑی''میں اندھا کباڑی ایک فنکا ر کی علامت ہے۔ان نظموں میں راشد نے کرداروں کے احوال بیان کرتے ہوئے علامتی عمل اپنایا ہے۔ نظم ''اندھا کباڑی''ایک فنکار کی علامت ہے جو ایک بے حس

سماج میں اپنے فن کے ذریعے خواب تقسیم کرتا ہے۔راشد تہذیبی وتاریخی اہمیت کے حامل کرداروں کو بھی نظموں میں بطور علامت پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ''سبا ویراں'' میں سلیمان ایک عظیم لاشان بادشاہ کو ایشیائی حکمرانوں اورفنکاروں کی علامت بنا کر پیش کیا ہے۔راشد نے اپنی نظموں میں جابجا ریگ،آگ اور خواب کو بطور علامت استعمال کیا ہے۔انھوں نے اپنی نظم''دل،مرے صحرا نورد پیر دل'' میں ریگ کو فرد کی آزادی کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔نمونہ دیکھیے:

ریگ صبحِ عید کی مانند زرتاب و جلیل /ریگ صدیوں کا جمال/جشنِ آدم پر بچھڑ کر ملنے والوں کا وصال/شوق کے لمحات کے مانند آزد وعظیم(۴۲)

راشد کی اسی نوع کی دیگر نظموں میں ''نیا آدمی''میں آگ کو اور''میرے بھی ہیں کچھ خواب'' میں خواب کو علامتی اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ راشد کو جب اپنا خواب شرمندہ تعبیر ہوتا دکھائی نہیں دیتا تو وہ طنزیہ انداز میں خواب کو علامتی روپ میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں خواب کا یہی پہلو میراجی جیسا ہے۔ میراجی اور راشد میں کئی اعتبار سے علامتی یکسانیت پائی جاتی ہے اس حوالے سے ان کی نظم''مری مورِ جاں'' اہمیت کی حامل ہے۔ تصدق حسین خالد نے پرانی علامات بھی استعمال کی ہیں کیوں کہ انھوں نے بھی ''شمع ناتواں''نظم میں محبت اور امید کے روایتی معنوں میں استعمال کیا ہے۔نظم "یونہی " میں ستاروں کو بچوں کے طور پر استعمال کیا ہے نظم''پشیمانی''کی فضا بھی علامتی ہے۔''لو'' پشیمانی کے تصورات سے پیدا ہونے والی کیفیت کا نام ہے۔خالد کی ترقی پسند فکر کی علامتوں میں ''تیرگی ''،''ظلمت ''اور ''غلامی'' سرمایہ دارانہ نظام کی علامت ہیں۔ خالد کی شاعری میں اگرچہ علامتیں زیادہ استعما ل نہیں ہوئیں پھر بھی انھوں نے جو علامتیں استعمال کی ہیں ان میں ''بوڑھے پیڑ''،کو بوڑھے آدمی یا قدامت کی مثال دی ہے۔''ایک پیڑ'' بھی اس نوع کی نظم ہے۔ اس میں''برگ ہائے زرد رنگ'' کا ٹہنیوں سے گرنا ماہ وسال کی علامت ہے۔نظم ''ایک پیڑ'' کا نمونہ ملاحظہ ہو:

کہرسےسکڑے ہوئے/سمٹے ہوئے/ برگ ہائے زرد رنگ/ ٹہنیوں سے گر رہے ہیں ٹوٹ کر/اک نحیف آواز لرزاں /پیش وپس(۴۳)

ڈاکٹر تصدق حسین خالد کی نظم''بوڑھا درخت''عمر کی علامت ہے ''طوفان''مصائب کی علامت ہے اور''پتوں کے جھومر'' اور ''پھولوں کے گہنے'' اچھے دنوں کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔راشد کی نظموں میں جنسیات،سامراج سے دشمنی اور اساطیری حوالے جیسے موضوعات ملتے ہیں۔ ان کی نظم''زنجیر''بغاوت کی زنجیر توڑنے کا جذبہ ابھارتی ہے۔راشد کی نظموں میں میراجی کی طرح یوں تو بغاوت کے کئی پہلو ملتے ہیں لیکن ان کی شاعری کا ایک اہم پہلو انگریزی حکومت کے خلاف نفرت ،سرکشی اور بغاوت ہے۔ وہ انگریزی حکومت کے استبداد اور غلبے کو برداشت نہ کرتے ہوئے ایک اجنبی عورت سے انتقام پر اتر آتے ہیں۔ان کی نظموں میں پائی جانے والی بغاوت صرف ملکی سطح پر ہی نہیں

بل کہ انھوں نے عالمگیر بغاوت کی ہے،ایران میں قیام کے دوران جب انھوں نے دیکھا کہ ایران بھی ہندوستان جیسی صورت حال سے دوچار ہے تو پھر وہ صرف ہندوستان کی غلامی کی بات نہیں کرتے تھے بل کہ سارے ایشیا پر مغرب کے غلبے کی مذمت کرتے تھے ،اس کی ایک مثال نظم''ایران میں اجنبی''کے کانتو''من وسلویٰ'' میں دیکھیے:

زمین مشرق کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک/مرے وطن سے ترے وطن تک/ایک ہی عنکبوت کا جال ہے کہ جس میں/ہم ایشیائی اسیر ہو کر تڑپ رہے ہیں(۴۴)

راشد اپنی نظموں کے ذریعے لوگوں میں جذبۂ بیداری پیدا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مغرب کے اس غلبے سے نجات کے لیے لوگوں کو متحد ہو کر جدوجہد کرنی چاہیئے ۔نظم''نارسائی'' اسی نوع کی ہے۔تصدق حسین خالد نے برطانوی استعمار کی مذمت کی ہے انھوں نے احساس غلامی کو محسوس کرتے ہوئے ''بن غازی کا یک مجروح'' ،''ایک اشتہار''اور'' ایک سپاہی کی دلہن'' جیسی نظمیں لکھیں،اس طرح کی نظموں سے پتا چلتا ہے کہ خالد حلقہ کے دوسرے شعرا کی طرح ٹھوس تلخ حقیقتوں سے بے حس نہیں تھے۔

حلقہ ارباب ذوق کےشعرا نے جو آزاد نظمیں لکھیں ان میں دو طرح کا طریقہ کار اپنایا گیا ان میں ایک کی نمایندگی میراجی اور تصدق حسین خالد کرتے تھے اور دوسرے کی ن م راشد۔ خالد اور میرا جی نے مصرعوں کے ارکان کی مقررہ تعداد اور قافیہ کی پروانہ کی بل کہ مصرعوں کو ایک دوسرے سے ملاتے چلے جاتے ہیں تا کہ ایک مصرعے کا مفہوم دوسرے مصرعے سے ملتا جائے۔ اس طرح ان کی نظموں میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے،جب کہ راشد نے آزاد نظم میں خیالات کے آزاد تسلسل اور جامعیت پیدا کر دی۔اس کی عمدہ مثال میراجی کی نظم ''سرسراہٹ'' ہے۔تصدق حسین خالد کی نظموں کے مصرعے بھی ایک دوسرے میں پیوست دکھائی دیتے ہیں اس کی ایک مثال ان کی نظم''ایک شام'' ہے۔میراجی اور راشد کی نظموں کے ہر مصرعے کو الگ الگ پڑھنے سے ان کی نظموں کا آہنگ بگڑ جاتا ہے۔ دوسری طرف راشد کی نظم کے ہر مصرعے میں ایک بات مکمل کی گئی ہے۔ حلقہ ارباب ذوق کے شعرا نے قافیے کے استعمال سے آزاد نظم میں موسیقی پیدا کر دی ہے۔ راشد میرا جی،خالد اور دیگر شعرا نے قافیہ پیمائی کی غرض سے قافیے استعمال نہیں کیے بل کہ خیال کے فطری بہاؤ سے قافیہ استعمال کیا ہے۔ راشد کی آزاد نظم''وادئ پنہاں'' قافیہ پیمائی کی گئی ہے۔ راشد اور میراجی نے آزاد نظم میں جو تجربے کیے وہ حلقے کے دوسرے شعرا بالخصوص قیوم نظر،یوسف ظفر، ضیا جالندھری، مختار صدیقی ،انجم رومانی اور دیگر نے اس کی پیروی کی۔حلقہ ارباب ذوق کے جدید نظم نگاروں نے نظم معریٰ کی ترویج میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ ۱۹۳٦ء سے پہلے کی معریٰ نظم اور حلقے کی معریٰ نظم میں فرق ہے۔ان کے یہاں معریٰ اور آزاد نظم متوازی فروغ پا رہی ہے۔ اس بارے میں ڈاکٹر حنیف کیفی رقم طراز ہیں:

''۱۹۳۶ء کے بعد کے زمانے کی نظم معرا میں جو آزاد نظم
کے متوازی نشوونما پارہی تھی ،افتاد وانداز دونوں اعتبار سے
پہلے کے مقابلے میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ اب وہ رک رک
کر چلنے کے بجائے مسلسل بڑھتی ہوئی نظر آتی ہے اور اس
کے اسلوب وآہنگ میں جو حرکت و توانائی اب دیکھنے میں آتا
ہے اس سے پہلے کی نظم یکسر محروم تھی۔''(۴۵)

تصدق حسین خالد کی شاعری کا رنگ شوخ اور آہنگ نرم اور پرکیف ہے،وہ ایسا عشق کرتے ہیں جو انسان کو بلندیوں تک لے جاتا ہے نظم''محبت'' اس کی مثال ہے۔ وہ اپنی نظموں''چاند آج کی رات نہیں نکلا'' اور ''نوحہ'' میں اپنے محبوب کا بے نتیجہ انتظار کر رہے ہیں۔تصدق حسین خالد نے اپنی نظموں میں زمانے کی ستم ظریفی بیان کی ہے کہ کس طرح سماج کی رکاوٹیں انسان کو مجبور اور بے بس کر دیتی ہیں ،ان سماجی ضابطوں کو انھوں نے نظم''ایک لڑکی'' میں پیش کیا ہے۔ یہ نظم درحقیقت محبت میں ناکامی کا نوحہ ہے۔ خالد نے نظم"تیری محبت" میں بھی زمانے کی ستم آرائیوں کا ذکر کیا ہے۔مناظر فطرت ،عورت اور تنہائی کے موضوعات کم بیش حلقہ ارباب ذوق کے تمام شعرا کے یہاں موجود ہیں۔ منیر نیازی نے تنہائی ،اداسی اور ہجرت کے کرب کا بہت ذکر کیا ہے۔ میراجی ،راشد اور دیگر شعرا نے عورت سے متعلق کافی نظمیں تخلیق کی ہیں۔ مناظر فطرت کو ہر شاعر نےکسی نہ کسی انداز میں ضرور پیش کیا۔ڈاکٹر تصدق حسین خالد کی شاعری میں یہ تینوں عناصر شامل ہیں۔ ان کی شاعری میں فطرت کی رنگا رنگی اور انسان کی ازلی تنہائی ،محبوبہ کے عشق میں عرفان ذات اور وجود وعدم کی کشمکش ملتی ہے۔ ان کی اس سلسلے کی اہم نظم ''کس قدر تنہا ہے'' ہے،''کیف بہار'' میں انھوں نے مظاہر فطرت کا اپنا غمگسار مان کر اپنی تنہائی کا مداوا کیا ہے۔

تصدق حسین خالد کی نظموں میں دعائیہ انداز بھی پایا جاتا ہے نظم''کوئی آواز تو دے'' میں عورت کی عصمت،ابن آدم کی ہوس اور انسان کے خون کی کہانی بیان کرتے ہیں۔خالد زندگی کی مشکلات اور اداسی کے لمحوں میں خدا کو پکار اٹھتے ہیں،ایک لڑکی جو کہ ضبط کی آگ میں جل کر خود کشی کر لیتی ہے ۔وہ نظم ''ایک لڑکی''میں اس کے لیے دعا گو ہیں:

خدا ترے دل کو شانتی دے/تجھے میسر ہوں سکھ کی گھڑیاں/مزے سے ہو/لمبی لمبی گھاس اگ رہی ہے/اس کے گھنیرے سائے میں/سو مزے سے(۳۶)

خالد کی دیگر دعائیہ نظموں میں ''حسن قبول''،اور ''یارب''اہم ہیں۔قیوم کی نظموں میں مناظر فطرت ،سامراجی تشدد ،حالات کا جبر ،عشق ومحبت ،روایات کی پامالی اور انسانیت سے ہمدردی اور خدا سے دعا کے مضامین ملتے ہیں ۔اس کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری میں انسان کی قلبی واردات اور داخلی کیفیات کی ترجمانی ملتی ہے۔معاصر شعرا کی

طرح انھوں نے مذہب اسلام اور وطن سے محبت کا اظہارکیا ہے۔وہ گدایانہ اندازمیں خدا سے بخشش کے لیے دعا گو ہیں۔انھوں نے دوسری جنگ عظیم کی شکست وریخت کو بھی موضوع بنایا ہے انھوں نے ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں میں مجاہدین کا حوصلہ بڑھایا ہے وہ ۱۹۷۱ء کے شہیدوں اور غازیوں کے لیے دعا گو ہیں۔یوسف ظفر نے بھی خالق بے عدیل ویکتا کا اعتراف دعائیہ کلمات میں کیا ہے۔ انسان سب آسائشیں ہونے کے باوجود خود کو مجبور محض محسوس کرتا ہے اور خدا کی ہستی کے سامنے سرنگوں ہوجاتا ہے۔یوسف کا دعائیہ انداز ملاحظہ کیجیے:

خدا کرے کہ کوئی ٹوٹتا ہوا تارا/فضائے تار میں آوازِ نور پھیلا دے/ خدا کرے کہ حریم نظر سے لہرا کر/سیاہ صدیوں کی بے نور راگنی(۴۷)

ضیا جالندھری کی شاعری میں انسان کا کرب، زندگی کی بے کیفی، بے حسی اور ویرانی کی عکاسی کی گئی ہے۔وہ وطن کی خوشحالی اور بقا کے خواہاں ہیں اور اس کی سلامتی کے لیے دعا گو ہیں۔یوسف ظفر اور دیگر شعرا کی طرح ضیا نے بھی ستمبر ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کے شہدا اور غازیوں کے لیے دعا کی ہے اور قوم کا حوصلہ بڑھایا ہے:

اپنے غازیوں کو فتح کی نوید
دے
آج پھر انھیں وہ ساعتِ سعید
دے
تو جسے بھی چاہے رتبہ شہید
دے

(۴۸)

منیر نیازی کی شاعری میں بھی پاک بھارت جنگوں کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ وہ شہروں پر بمباری اور شہری آبادی کو ہلاک کرنے پر شدید خائف ہیں،کشت وخون کی جوہولی سرحدوں پر کھیلی گئی منیر کی نظر ان معصوم جانوں کے ضیاع کی طرف جاتی ہے۔وہ شہریوں کی حفاظت کے لیے اپنی نظم''اپنے شہریوں کے لیے دعا‘‘میں دعا گو ہیں:

پاکستان کے سارے شہرو
زندہ رہو ، پائندہ رہو
روشنیوں ، رنگوں کی لہرو

(۴۹)

منیر نیازی ایک محب وطن شاعر ہیں انھوں نے پاکستان کی سالمیت کے لیے دشمن کو للکارا ہے۔انھوں نے کہا ہے کہ وطن کی حفاظت کے لیے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ان کی شاعری عام شہری کے سچے اور نکھرے ہوئے جذبات ہیں۔منیر کو شہر لاہور زیادہ پسند تھا اس لیے وہ اس کے لیے خصوصی دعا کرتے ہیں۔ان کی دعاؤں کا محور وطن اور اس کے شہروں کی سلامتی ہے،وہ وطن کے بڑے خیرخواہ ہیں اور اپنے صادق جذبوں کا اظہار دعاؤں کی صورت میں کرتے ہیں۔قیوم نظر نے نامانوس بحروں، ارکان کی کم بیشی کے ساتھ ساتھ استعاروں،علامتوں ،ترکیب وتمثیل کا عمدہ استعمال کیا ہے۔ ان کی نظموں میں عشق ومحبت سے لے کر مناظر فطرت ،سامراجی تشدد اور معاشرتی استحصال ،آدمی کے دکھ درد ،انسانی عظمت اور تہذیب وثقافت جیسے مضامین ملتے ہیں۔ ان کی شاعری کا بیشتر حصہ افسردہ دلی کا نمونہ ہے۔ قیوم نظر حلقے کے اہم شعرا میراجی اور راشد سے کافی متاثر تھے اور متعدد بار ان کا اتباع بھی کیا۔اس بارے میں ڈاکٹر حامدی کاشمیری لکھتے ہیں:

> ''قیوم نظر نے بھی میراجی اور راشد کے اتباع میں جدید انسان کی جذباتی افسردگی اور نفسیاتی الجھن کی مصوری پر اپنی توجہ مرکوز کی ہے،وہ اپنے ماحول اور حیات کی ناہمواریوں کا شدید احساس رکھتے تھے۔''(۵۰)

قیوم نظر نے جنگ عظیم کے تباہ کن نتائج کو سنجیدگی اور ہمدردی سے سوچا اسی لیے ان کی متعدد نظموں میں جذباتی ویرانی اور افسردگی کی چھاپ لگی ہے ان کی اس نوع کی نظموں میں''محرومی''،بے بسی،جوانی،جنگ،خلش تاثر،شب خون،الجھن،تھکن،''انجام''اور ''درمانده''قابل ذکر ہیں۔مثال کے لیے نظم''شب خون ''کانمونہ دیکھیے:

کالی آندھی رات بھیانک
پھیلی پھیلی خاموشی کا
کالا جادو اس میں اچانک
ایک ہنگامہ سیلِ بلا ہے
(۵۱)

قیوم نظر کی نظموں میں انسا نی ہمدردی کے عناصر پائے جاتے ہیں۔انھوں نے سماج کے ہاتھوں ستائے ہوئے اور ٹھکرائے ہوئے انسانوں سے ہمدردی کا اظہار کیا ہے،ا س کی مثال ''مجبوری''،''بازار میں ایک شام''اور ''داشتہ'' میں بھی معاشرے کی مظلوم عورت کا ذکر ملتا ہے۔قیوم نظر کی اداسی اور افسردگی اتنی شدید ہے کہ وہ مستقبل سے بھی کوئی امید نہیں رکھتے ،اس کی مثال ان کی نظم ''بے خوابی'' ہے۔ قیوم نظر کی شاعری میں سماجی شعور اور تہذیبی رنگ ملتا ہے۔ان کی اس قبیل کی دیگر اہم نظموں میں''بے حس''،''تماشائی''اور''زہرخند'' شامل ہیں۔ ان نظموں میں قیوم نے انسانی تہذیب اور معاشرت کے اندروں میں جھانکنے کی سعی کی ہے۔تہذیبی وسماجی شعور ان کے گیتوں میں بھی نمایاں

نظر آتا ہے ،انھوں نے حسن وعشق کو موضوع سخن بنایا تو افسردگی اور مایوسی نے دامن تھام لیا۔ قیوم کی نظمیں ''یہ راتیں یہ دن''،''قرطبہ کا پل''اور''پرچم پاک''تہذیبی بساط کی نمایندگی کرتی ہیں۔قیوم نے وطن کی محبت میں متعدد گیت اور نظمیں لکھیں،حب الوطنی ،نیچر اور مناظر فطرت سے لگاؤ ان کے انسانی جذبات کا غماز ہے۔انھوں نے ''حب وطن''،''سری نگر''،''خاک وطن''،''وطن پہ قربان جاں ہماری''،جیسی جذباتی نظمیں لکھیں۔ انھیں گاؤں اور کھیتوں سے پیار تھا اس لیے انھوں نے پگڈنڈی اور سرکنڈوں کے جھولوں کا ذکر کیا ہے۔قیوم نے وادئ کشمیر کو بھی یاد کیا دہقان اور اس کی زندگی ان کے حصار فکر سے باہر نہ تھی اس کی عمدہ مثال نظم''واپسی''ملاحظہ کیجیے:

ہرے کھیتوں میں گندم کے ہرے خوشے ہوا کو سلوٹوں کی گدگداتے ہیں/کنار آب سرکنڈوں کے جھولے ہیں جہاں بیٹھے ہوئے ننھے حسیں طائر /خوشی کے پیارے پیارے گیت نازک کاغذی ناؤوں کی صورت میں بہاتے ہیں(۵۲)

دیگر شعرا کی طرح قیوم نے پاک بھارت جنگوں کو بھی موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے وطن کی محبت میں ترانے لکھ کر وطن کو نئی زندگی کی نوید سنائی ہے،وہ کہتے ہیں کہ اس گلشن کی جو ڈالی ڈالی ہری ہے وہ ان مجاہدین کے دم سے ہے جو دشمن کا لہو بہا کر ان کیاریوں کی آبیاری کرتے ہیں،نظم''ترانہ'' اس کی اہم مثال ہے۔قیوم نظر نے معرکۂ حق وباطل بیان کیا ہے انھوں نے ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ جو بغیر اعلامیے کے بھارت کی طرف سے پاکستان پر مختلف محاذوں پر شروع کی گئی تھی اس کا نقشہ کھینچا ہے۔اس جنگ میں جب بھارت نے لاہور پر چڑھائی کی تو قیوم نظر نے لاہور سے والہانہ عقیدت کا اظہار کیا ہے۔اس حوالے سے ان کی نظم''داتا کی نگری'' عمدہ مثال ہے۔قیوم کی ۱۹۷۱ء کی جنگ کے ساتھ بھی گہری وابستگی نظر آتی ہے۔اس سلسلے میں انھوں نے ''جنگی قیدیوں کی آمد پر''اور ''اسیران جنگ کی واپسی پر'' جیسی نظمیں لکھیں۔ان کی جنگی نظموں میں استعارات کا استعمال کم زیادہ عوامی جذبات ملتے ہیں۔چوں کہ حلقے کے شعرا کو موضوع کی کوئی پابند ی نہ تھی اس لیے انھوں نے داخلیت کے ساتھ ساتھ خارجی موضوعات کو بھی اپنایا۔ انھوں نے پابند،معرا اور آزاد ہیئت میں نظمیں لکھی ہیں۔

یوسف ظفر کے یہاں بھی حلقے کے روایتی موضوعات پائے جاتے ہیں ان کے یہاں زندگی کے مصائب کا تذکرہ بھی ہے ،ہجرو وصال کا ذکر بھی ہے اور ملی شعور کے نقوش بھی ملتے ہیں۔ ظفر تحریک آزادی ہند کے دوران جذبہ آزادی سے سرشار تھے ،انھوں نے قیام پاکستان کے لیے اپنا قلم استعمال کیا۔یوسف ظفر حلقہ کے ان شعرا میں سے تھے جو میرا جی کے بڑے قریب تھے ۔وہ موضوعاتی وہیئتی اعتبار سے میراجی سے اشتراک رکھتے ہیں مگر ان کی شاعری میں میرا جی کی طرح ابہام کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی۔ظفر اپنی نظموں کے موضوعات کا انتخاب اپنے گردوپیش کی حقیقی زندگی سے کرتے ہیں۔ظفر پر میراجی اور راشد کی شاعری کی طرح جنسی بھوک،مایوسی اور محرومیت کا رنگ نظر آتا ہے۔یوسف ظفر غم حیات سے گھبرا کر رومانوی تصور کے رنگیں دھندلکوں میں پناہ لیتے ہیں اور تسکن قلب

کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔اس سلسلے کی نظموں’’فردوس گوش‘‘،’’ابدیت‘‘،’’آخری سہارا‘‘اور’’وحشت ‘‘شامل ہیں۔ شاعر چاندنی رات میں گھاس پر لیٹ کر اپنے ماحول اور زندگی کی تلخیوں کو بھول کر تخیل کی وادی میں اپنے محبوب کے تصور میں یوں گم ہوتے ہیں ،نظم ’’آخری سہارا‘‘دیکھیے:

اگر حیات کے رازوں کا پا نہیں سکتا
تو تیرے چہرے کے پھولوں میں پھول سکتا ہوں
یہ کم ہے سکون دل حزیں کے لیے
کہ تیرے حسن کے جھولوں میں جھول سکتا ہوں

(۵۳)

یوسف کی نظم’’ابدیت‘‘میں حیات کی تلخی اور بھوک کا کڑوا احساس ملتا ہے۔اور’’فردوس گوش‘‘میں محبوب کا رومانوی تصور ابھارا ہے۔نظم ’’وحشت‘‘ میں محبوب سے دوری کی سنگلاخ حقیقتوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جانے والے کے غم ،خوف، مایوسی اور بے بسی سے ملے جلے جذبات کا احساس ملتا ہے۔اس طرح وہ تہذیب کے سیاہ پہلو سامنے لاتے ہیں۔نظم ’’سائے‘‘ اس اعتبار سے اہم ہے۔

چاند کی کرنیں ، فرنگی کی یہ دوشیزائیں
اپنی گدائی ہوئی بانہوں پہ یہ اتراتی ہیں
اپنی زلفوں کو حسیں شانوں پہ لہراتی ہیں
بھوکے زنگی کے سیہ بچے فلاکت کے نقوش

(۵۴)

یوسف ظفر نے بھی قیوم نظر کی طرح زندگی کے تلخ وترش تجربے اپنی شاعری میں بیان کیے ہیں۔ ڈاکٹر عقیل احمد صدیقی یوسف ظفر اور حلقہ ارباب ذوق کے دوسرے اہم شعرا کے درمیان پائے جانے والے اشتراک وانسلاک سے متعلق رقم طراز ہیں:

’’قیوم نظر، یوسف ظفر،مختار صدیقی وغیرہ عام سیاسی ،سماجی اور تہذیبی مسائل میں گہری دل چسپی لیتے ہیں۔ اور وہ مسائل ان کی شاعری کا موضوع بھی بنتے ہیں۔‘‘(۵۵)

حلقہ کے شعرا نے ترقی پسندوں کی نسبت موضوعات کو وسعت دی اور پیرایہ اظہار میں تنوع پیدا کیا ۔کیوں کہ حلقہ کی شاعری کسی ایک مخصوص نظریہ لیے ہوئے نہیں۔ضیا جالندھری نے طویل نظم کو جدید شاعری کے قالب میں ڈھالا،ان کے شعری مجموعے

''سرشام'' میں دو طویل نظمیں ہیں ان میں ایک ''زمستان کی شام''اور دوسری''ساملی''ہے۔ یہ دونوں نظمیں فنی وفکری لحاظ سے اہمیت کی حامل ہیں۔ ضیا براہ راست بیانیہ انداز میں نعرہ بازی نہیں کرتے بل کہ انھوں نے سیاسی تبدیلیوں کے اثرات کو رمزیہ انداز میں پیش کیا وہ حسن ومحبت اور سماجی قدروں کے شاعر ہیں۔ ضیا جالندھری اور جیلانی کامران کی نظموں میں ہیئتی اشتراک پایا جاتا ہے۔ جیلانی کامران کی طویل نظم''باغ دنیا'' علامتی انداز کی نظم ہے۔ وہ ہماری دنیا کو بھی باغِ بہشت کے تصور سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ کیوں کہ بہشت کو وہ شر سے پاک ،خیر اور امن کا گہوارہ سمجھتے ہیں۔ جہاں حسین وجمیل مناظر، امن ،سکون اور محبت ہے۔اس نظم میں چار کردار ہیں ،محبوب ،ابلیس، ملائکہ اور انسان اور چار شہر ہیں ،شہر محبوب ،شہر جدائی، شہرشر اور شہر وفا اور چار ہی کیفیات فرقت،سفر ،قیام اور تمنا ہیں۔اس نظم کے عناصر اسی قرآنی قصے سے اخذ کیے گئے ہیں کو آدم ،ہبوطِ آدم اور دنیا کی بنیاد سے متعلق ہیں۔ جیلانی کامران نے اپنی متعدد نظموں میں یہ کہانی مختلف رنگوں اور مناظر میں پیش کی ہے۔

جیلانی کامران نے نہ صرف اس طویل نظم میں بہشت کی روداد سنائی ہے بل کہ ان کی بیش تر چھوٹی نظموں میں بھی بشارت دی گئی ہے کہ ایک دن انسان بہشت کو دنیا ہی میں حاصل کر لے گا۔وہ پر امید نظر آتے ہیں ان کی آخری چند سالوں کی نظموں میں مخصوص استعارے استعمال ہوئے ہیں ،انھوں نے ننھے بچوں کے لیے خطاب اور شاداب مستقبل اور روشن صبح کی بشارت دی ہے۔ اس لیے وہ باغ، پھول ،پتے،درخت،موسم ، رنگ ،خوشبو، ہوا،شاخ تتلی، نغمے،چشمے اور شبنم جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔اور بہشت کی دنیا آباد کرتے ہیں ان کی شاعری میں ایک طرح کی رجائیت ،امید اور سرخوشی کی لہر دکھائی دیتی ہے۔ اس نوع کی اہم نظموں میں''پھلواری''،''کچے شگوفےاتاریں'' اور'' شبنم ڈھونڈیں'' شامل ہیں۔جیلانی کی آزاد ہیئت کی نظم ''پھلواری'' دیکھیے:

جیسے پھول کھلے ہوں/ایسے بچے کھیل رہے ہوں/چڑیا،مینا،توتے،کوے/کچھ تم ڈھونڈو/کچھ ہم ڈھونڈیں(٥٦)

جیلانی کامران کی نظموں میں مسافرت ، سفر اور حرکت کے استعارے استعمال ہوئے ہیں ان کی طویل نظم"نقشِ کفِ پا" زمینی آشوب کا علامتی اظہار ہے۔ اس نظم کے علائم میں اندھے مردوں کا کورس،قیدی،سایہ ،لڑکا،بوڑھے درویش، عورت کا سایہ علامتی کردار ہیں اور صحرا ،تنگ وادی ،سرو کا درخت ،سرخ پانی کا دریا اور آسمان موجودہ حالات کی علامت ہے۔شہزاد احمد نے بھی مثنوی کی روایتی ہیئت میں ایک طویل نظم ''ساقی نامہ''لکھی ہے۔ یہ اقبال کی مشہور نظم ساقی نامہ کی بحر میں ہونے کے باوجود منفرد نوعیت کی ہے۔مختار صدیقی تک آتے آتے نظم موضوع ،ہیئت اور انقلانی تبدیلیوں کی خوگر ہو چکی تھی ،تیزی سے بدلتے ہوئے سیاسی حالات ،معاشی ومعاشرتی صورت حال نے جدید اردو نظم میں موضوعاتی وہیئتی تبدیلی کو رواج دیا،مختار صدیقی نے بھی حلقے کے دوسرے شعرا کی طرح لوگوں کی پیچیدہ نفسی اور جذباتی کیفیات کو اپنی نظموں میں بیان کیا،انھوں نے خارج

سے داخل کی طرف رجوع کیا اور نئے استعارے ،نئی علامتیں اور نئی تشبیہات تراشیں۔مختار صدیقی نے حلقہ کے رواج کے مطابق تحت الشعور جیسی نفیساتی اصطلاحات کو اپنایا۔

موت کے بارے میں مختار صدیقی کا یہ رد عمل فکری سبب سے ہے ،میراجی ،راشد،قیوم نظر اور ضیا جالندھری بھی اسی رو میں بہہ رہے ہیں۔ ضیا جالندھری کی نظم ''زمسان کی شام'' ایسے ہی جذبات واحساسات کی مظہر ہے۔ مختار نے ناگا ساکی،ہیروشیما کی بربادی پر نظمیں لکھی ہیں۔ انھوں نے جنگوں اور ہجرت کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورت حال کے تناظر میں جو نظمیں لکھیں ان میں ''کیسے کیسے لوگ'' ،''قریۂ ویراں''،''آخری بات''اور ''لب ساحل '' اہم ہیں۔ جنگوں اور ہجرت سے پیدا شدہ فضا یوسف ظفر کی نظموں میں بھی نظر آتی ہے ۔مختار صدیقی کی ''منزل شب'' ایک ایسی نظم ہے جس میں اجتماعی شعور کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس نظم میں شاعر نے انسانی رشتوں کی بگڑتی ہوئی صورتوں اور سسکتی ہوئی زندگی کو بیان کیا ہے۔''اسیرانِ قفس'' اور ''سحر سے پہلے'' سماجی نوعیت کی نظمیں ہیں۔ مختار نے ان نظموں میں انسانیت کے مٹ جانے کا مرثیہ اور ذلت و رسوائی کا نمونہ پیش کیا ہے۔

مختار صدیقی نے بھی میراجی کی طرح دھرتی کی بوباس اور دیومالا سے بھی رشتہ استوار رکھا، ان کی شاعری میں ثقافتی اور تہذیبی ماضی کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ مختار صدیقی کی نظموں میں جیتی جاگتی عورت کا سراپا بھی نظر آتا ہے جو میراجی کی شاعری میں موجود ہے۔ موضوعاتی حوالے سے مختار اور میرا جی میں مماثلت تو پائی جاتی ہے لیکن میراجی کے یہاں عورت محبوبہ یا دل کی ملکہ ہرگز نہیں بل کہ آزاد جنسی اختلاط کی علامت اور افزئش نسل کے عمل میں ایک حصہ دار کے سوا کچھ نہیں۔مختار صدیقی اور میراجی کے اشتراک کے بارے میں ڈاکٹر صابرہ شاہین رقم طراز ہیں:

> ''مختار اور میراجی میں ایک قدر مشترک ہے کہ میراجی کی ذرخیز عورت ہو یا مختار کے دل کی ملکہ دونوں جسمانی بعد اور فاصلے کی اذیت کا سر چشمہ ہیں۔میراجی کی میراسین ہویامختار کی محبوبہ ،دل نواز حقیقی وجود سے خالی محض ذہنی یوٹو پیا کی پیداوار ہیں۔ میراجی کی ''حرامی'' اور''ترغیب'' میراجی کے نظریات کی عکاس ہیں اور مختار کی پاک بازو مطہر محبوبہ اور جیتے جاگتے جذبات کی حسینہ دلنواز ''رات کی بات'' ،''سکھ میں دکھ'' ،''رسوائی'' اور''آتش دان کابت''جیسی نظموں میں بخوبی دیکھی اور محسوس کی جا سکتی ہے۔''(۵۷)

مختار بھی میراجی کی طرح خیالی محبوبہ کی بات کرتے ہیں ،ان کی یہ محبوبہ صرف پردہء خیال ہی پر رقص کرتی ہے ۔مشتر ک جذباتی تجربے کے بعد دونوں شعرا کا رد عمل

جدا جدا ہے۔ انجم رومانی ابتدا میں اخترشیرانی سے متاثر رہے، انھوں نے ابتدا میں پابند ہیئت میں نظم نگاری کی ازاں بعد وہ حلقے کے روج کے مطابق آزاد اور معریٰ نظم نگاری کرنے لگے ۔ان کی متعدد نظمیں قومی وملی موضوعات کی حامل ہیں۔ ''دنیا کے کنارے سے'' انجم رومانی کی آزاد نظموں کا مجموعہ ہے۔ ان کی آزاد نظم کا نمونہ ملاحظہ کیجیے:

کسی موہوم دوشیزہ کی عریاں ،مرمریں بانہیں/حمائل میری حسرت کے گلے میں اب بھی ہوتی ہیں/ لحافوں سے پرے ٹھٹھری ہوئی راتیں زمسان کی/نشیلی چاندنی کے پھول پہنے اب بھی روتی ہیں/نہیں ہے آج بھی کوئی یہ آنسو پونچھنے والا(۵۸)

انجم رومانی نے یوسف ظفر اور قیوم نظر کی طرح نئی نظم کو فروغ دیا ،انھوں نے روایتی نظم نگاری کی مگر ان تمام لوازمات کو انفراد کے ساتھ نبھایا ،انجم جدت،خیال،ندرت فکر ،سچائی اور اخلاص کے ساتھ اپنی ذہنی سوچ سمیٹتے ہیں۔ نظم ''تحیر'' اس حوالے سے اہم مثال ہے۔رومانی ہونے کے باوجود انجمؔ نے زندگی کے مسائل کو یکسانیت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ انھوں نے اپنے دکھ درد کو بھی ایک استعارے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ان کی شاعری میں جذبہ حب الوطنی ہے۔انھوں نے پاکستان بنتے دیکھا ان کی ایک نظم''قائداعظم''وطن سے محبت کی عکاس ہے۔ اپنے وطن سے محبت ان کی شاعری سے جھلکتی ہے وہ تمام امت مسلمہ کے حق میں آواز اٹھاتے ہیں۔ انجم اپنی نظموں میں زندگی اور رومان کی بات کرتے ہیں ان کے یہاں رومان کبھی عاشق ومعشوق کے روپ میں سامنے نہیں آیا۔ بل کہ فطرت اور جذبات اور دوسرے عوامل اس کا روپ ہیں۔ جذبہ ملی کو بیدار کرنے اورعوامی نوعیت کی نظمیں حلقہ کے دیگر شعرا نے بھی تخلیق کی ہیں۔ان کی آزاد ہیئت کی نظمیں''شاہکار''،''سمندر کے کنارے''،'' دہلیز کائنات پر''اور'' کہے گی اجنبی ہوں کوئی مجھ کو جانتا نہیں'' شامل ہیں۔الطاف گوہر نے بھی حلقے کے رواج کے مطابق آزاد نظمیں تخلیق کیں ان کی نظمیں حزن پیدا کرتی ہیں۔ الطاف گوہر کی آزاد ہیئت کی نظم''نادانی''اہمیت کی حامل ہے۔

اس نظم میں بالواسطہ انداز اپنایا گیا ہے ،زمان ومکان کو فطری اشاروں اور علامتوں سے ہم آہنگ کیا گیا ہے ۔ان کی نظمیں''دھوپ کے سائے'' اور''سراب''کافی اہم ہیں۔ ان کی یہ نظمیں ایک مخصوص سماجی زندگی کی عکاس ہیں۔ الطاف گوہر کی شاعری میں وہ تمام کیفیات محسوس کی جا سکتی ہیں جو میراجی ،راشد ،یوسف اور قیوم کی شاعری میں موجود ہیں۔ان کی شاعری میں''شام'' ایک استعارے کے طور پر استعمال ہوئی ہے۔ الطاف نے شام کو رنگوں میں نہائی ہوئی اور شرمائی ہوئی دلہن کے پیکر میں دکھایا ہے۔ الطاف گوہر کی نظم''اے پیارے لوگو'' مستقبل کی طرف سفر کرتے نظر آتے ہیں ان کی نظمیں آنے والے زمانے میں طلوع ہونے والے بھیانک واقعات کی خبر دیتے ہیں۔

منیرنیازی تہذیب وروایت کا عمدہ منظر نامہ پیش کرتے ہیں ان کی نظموں میں ویرانی اورو حشت لیے پرانا کھنڈر اور قلعہ دکھایا گیا ہے۔ منیرشہر کی عمارتوں سے دور بھاگتے

ہیں۔ وہ شہر کی بھیڑ بھاڑ اور سماجی زندگی کی وحشت ناک حقیقتوں کے بارے میں نظم''سفر کے طلسمات'' میں اس بارے میں اظہار کرتےہیں۔وزیر آغا کی نظموں میں علامتوں کا انتخاب قدرتی ماحول سے کیا گیا ہے۔ ان کا تعلق مضافات سے تھا اس لیے انھوں نے اپنی نظموں میں دیہی زندگی کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ ان کی نظموں میں پیٹ،پتا،گھاس، بادل، جنگل، لوہا،زمین،اندھیرا، پھول،شہر،ہوا، رات، دن، شام،سمندر،پانی،درانتی ،سایہ ،سناٹا،آواز، ریل گاڑی، سورج اور پرندہ وغیرہ کی علامتیں استعمال ہوئی ہیں۔پیڑوں کا ذکر وزیرآغا کی متعدد نظموں میں ملتا ہے۔ اس حوالے سے وزیر آغا اور مجید امجدمیں گہری مماثلت پائی جاتی ہے کیوں کہ انھیں بھی پیڑ سے گہری رغبت تھی۔ وزیر آغا کے یہاں پیڑ سے مرد اور عورت دونوں تصورات جنم لیتے ہیں انھوں نے برگد کے پیڑ کو ماں سے مشابہت دی ہے،وزیر آغا کے یہاں سانپ کی شوکر ،گہری کھڈ،ہرن کی دلدوز چیخوں سے یا پھر خود جنگل کی ٹیڑھی میڑھی آنتوں جیسی ٹہنیوں کا ذکر ملتا ہے۔ منیر کے یہاں جنگل کے سبز اور سیاہ رازوں کو الگ الگ آشکارا کرنے کی روش ملتی ہے جب کہ وزیر آغا جنگل کے سیاہ وسبز عقدوں کو ایک ساتھ کھولنے کی جستجو کرتے ہیں۔

حلقہ ارباب ذوق کے رواج کے مطابق ڈاکٹر وزیر آغا کی فطرت نگاری میراجی راشد،یوسف ظفر اور قیوم نظر جیسی ہے مگر ان کا تخلیقِ نظم کا طریقہ قدرے مختلف ہے۔وزیر آغا نے تجسیمی عمل کے دوران غیرمرئی اجسام کو بھی مرئی تجسیم کے دائرہ میں لایا ہے۔انھوں نے خوب صورت انداز میں ایک کردار کو دوسرے کردار میں بولتے دکھایا ہے بعض اوقات ان کی نظم میں ایک تمثیل چلتی ہے اور بعض اوقات کئی تمثیلوں کو نظم کا حصہ بناتے ہیں۔انھوں نے کمال فنی مہارت سے نظم میں تمثیل کا ٹانکہ لگایا ہے۔ہندودیومالا میں تمثیل کا عنصر میراجی سمیت دوسرے شعرا کی نظموں میں بھی ملتا ہے۔وزیر آغا کی تمثیلوں میں یاد زخم خوردہ آہو کے روپ میں ،گنے کا کھیت دلہا کے روپ میں، سانس پرندے اور خواہشیں شارکوں کے روپ میں ہے۔جیلانی کامران کی نظموں میں اساطیری اور علامتی انداز پایا جاتا ہے۔"تمنا" ان کی نظموں کا بڑا استعارہ ہے۔ یہی تمنا ہم سے کھو گئی ہے اور یہی تمنا انسان کو آرام سے بیٹھنے نہیں دیتی ،یہی تمنا اسے آمادۂ سفر رکھتی ہے۔یہی تمنا مستقبل کا محرک ہے،یہی تمنا امیداور نشان منزل ہے۔

شہزاد احمد کی نظموں میں رومانیت اور روایت کے ساتھ ساتھ سنجیدہ رویے اور زندگی سے متعلق موضوعات بھی ملتے ہیں۔ ان کی نظموں میں رومانیت کہیں''سانولی'' سے تعلق کے اظہار کی صورت میں ہے اور کہیں زندگی کو حقیقت کی آنکھ سے دیکھنے کے بجائے تصور کے جھروکے سے دیکھنے کا نام ہے۔انھوں نے غزل کے چند منتخب موضوعات کو آزادنظم کی ہیئت میں منظوم کر دیا۔ شہزاد احمد نے معریٰ اور پابند ہیئت میں بھی نظم نگاری کی ہے ان کی نظم ''تنہائی'' مسدس کی روایتی ہیئت میں لکھی گئی ہے۔ان کی نظمیں رومانی،فلسفیانہ، نفسیاتی ،سیا سی و انقلابی اور سائنسی موضوعات کی حامل ہیں۔ شہزاد احمد،ضیا جالندھری،جیلانی کامران، اور دیگر نظم نگاروں سے ہیئتی اشتراکات رکھتےہیں۔ان کی نظمیں رومانوی ہوتے ہوئے بھی رومانیت سے ماورا ہیں انھوں نے کشمیر کو سیاسی تناظر

میں دیکھنے کے بجائے انسانی تنا ظر میں دیکھا ہے۔ جس کی بنا پر ان کی نظموں میں سیاسی اور انقلابی کرختگی کے بجائے ملال اور حسن کی بے بسی پیدا ہو گئی ہے۔ ان کی کشمیر کے حالات پر لکھی گئی نظموں میں''ایک زخمی پرندہ''،''بہت سے گھر خاک ہو چکے ہیں''اور '' کس قدر آہستہ رو ہے زندگی'' شامل ہیں۔شہزاد احمد نے حلقے کے بعض شاعروں کی طرح نظموں کے تراجم بھی کیے ہیں۔شہزاد احمد کی پہلے دور کی نظموں پر غزل کا جمالیاتی ورومانی اسلوب اور آہنگ حاوی ہے جب کہ دوسرے دور میں وہ مکمل ایک نظم گو کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ انھوں نے پابند،معرا ، آزاد اور نثری ہیئت میں لکھا ہے لیکن ان کی زیادہ نظمیں آزاد ہیئت میں ہیں۔

حلقہ ارباب ذوق کے شعرا نے روایت کو اہمیت دی انھوں نے قدما سے قوت کا خزینہ حاصل کیااور ایک جہت ماضی کی طرف رکھی،چناں چہ میرا جی سے وزیر آغا اور شہزاد احمد تک ان کی تخلیقات میں ماضی کے روشن نقوش اپنی جھلکیاں دکھاتے ہیں۔حلقہ کے شعرا نے دوسری جہت مستقبل کی طرف رکھی اور عہد بہ عہد نئی نسل کی طرف قدم بڑھایا۔حلقہ کی نظمیہ شاعری نیم کلاسیکی اور نیم رومانی ہے،اس میں سیاسی ،سماجی شعور اور مختلف نظریات سما گئے ہیں۔ حلقہ کی شاعری موضوع اور ہیئت دونوں اعتبار سے اشتراک وانسلاک کی کیفیت میں ڈوبی ہوئی ہے۔

استخراجِ نتائج/موضوعاتی اشتراکات

حلقہ ارباب ذوق کے نمایندہ شعرا میں میراجی ،ن۔م۔راشد ،تصدق حسین خالد ،قیوم نظر ،یوسف ظفر، ضیاجالندھری، مختار صدیقی ،انجم رومانی،منیر نیازی ،وزیر آغا،جیلانی کامران اور شہزاد احمد کی نظموں میں موضوعاتی اشتراکات پائے جاتے ہیں۔حلقہ کی نظم موضوع اور ہیئت دونوں اعتبار سے اشتراکات کی حامل ہے۔ حلقہ کی شاعری نیم کلاسیکی اور نیم رومانی ہے۔ ان شعرا کا عام رجحان فرد کے داخلی احساسات اور تاثرات کی طرف ہے۔ ان شعرا کے یہاں نفسی بے چینی ،روحانی اضمحلال اور جنسی محرومی جیسے موضوعات مشترک ہیں۔میراجی اور راشد ذات اور کائنات کے بارے میں ایک جیسی دروں بینی رکھتے ہیں۔ یہ دونوں شعرا عظمت اللہ خاں سے متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ حلقے کے شعرا کی زبان استعاراتی اور علامتی زیادہ ہے۔ میراجی کی شمولیت کے بعد حلقہ کی نظم پر مغربی نظموں کے اثرات مرتب ہوئے۔ حلقہ کے شعرا نے بھی انگریزی نظموں کے تراجم کیے۔انھوں نے خوف، تنہائی ،جنس، طبقاتی کشمکش ،بے سکونی ،صبرواستحصال ،بے حسی ،اخلاقی روایات ،داخلی احساس وکیفیات ،عشق کا مختلف تصور اور انسان کی بے قدری کو مشترکہ موضوع بنایا ہے۔

حلقہ کے شعرا نے جنس اور مذہب جیسے حساس موضوع پر متعدد نظمیں تخلیق کی ہیں۔ میراجی سمیت حلقہ کے کئی شعرا نے ہندی الفاظ استعمال کیے ہیں۔ کیوں کہ حلقہ کے متعدد شعرا گیت نگاری بھی کرتے رہے۔ میراجی ،ضیا جالندھری ،مختار صدیقی اور

منیرنیازی نے گیت نگاری کرتے ہوئے ایک جیسے ہندی الفاظ ،ہندی کیفیات اور ہندی طرز احساس اپنایا ہے۔ حلقہ کے شعرا نے بنیادی سرچشمہ زندگی ہی کو قرار دیا ہے۔ ان کی نظموں میں سماجی اور جنسی زندگی کا سراغ ملتا ہے۔ میراجی اور راشد فرائڈ کے نظریات سے بے حد متاثر تھے اس لیے ان کی شاعری میں کافی موضوعات مشترک ہیں۔ انھوں نے ایک فرد کی ذہنی کیفیت اور سماجی جبر سے پیدا ہونے والی کشمکش کو بیان کیا ہے۔ میراجی کی طرح ن م راشد کی نظموں میں جنسی وصال کی اہمیت اجاگر کر کے محبوبہ کو وصل کی جانب راغب کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

حلقہ کی شاعری میں فرد کی آزادانہ تعمیر، اداسی، محرومی اور تاریکی کا غلبہ زیادہ ہے۔ ان کی شاعری داخلی دنیا کی عکاسی کرتی ہے۔ میراجی اور راشد نے محبت کو جنسی جذبے اور لذت تک محدود کر دیا ہے۔ یہ دونوں شعرا فرائڈ کے تحلیل نفسی کے تصور سے متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ حلقہ کے شعرا کو زندگی کی الجھنوں کا احساس تھا اس لیے انھوں نے سماجی موضوعات پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ ان کی نظموں میں سیاسی ،سماجی اور اقتصادی عناصر بھی ملتے ہیں۔ تہذیب وتمدن اور مذہبی عقائد جیسے موضوعات میں بھی اشتراک پایا جاتا ہے۔ انگریزی شعرا سے متاثر ہونے کی وجہ سے حلقہ والوں میں متعدد موضوعات مشترک ہیں۔ حلقے کے شعرا نے فطرت نگاری کے اچھے نمونے پیش کیے ہیں۔ ان کی فطرت نگاری استعارات اور ایمائیت سے مملو ہے۔ان شعرا نے انگریزی فطرت پرست شعرا کا اثر لیا ہے لیکن مقامی استعاروں اور تشبیہات کا استعمال کرتے ہوئے فطرت کے مناظر اور موسم کے رنگ تہذیبی تناظر میں بیان کیا ہے۔ حلقہ والوں نے عشق ومحبت سے لے کر مناظر فطرت ،سامراجی تشدد، معاشرتی استحصال ،آدمی کے دکھ درد انسانی عظمت اور تہذیب وثقافت جیسے موضوعات میں شاعری کی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ علی سردار جعفری،ترقی پسند ادب،(علی گڑھ :ترقی اردو ہند،۱۹۵۷ء)،ص:۱۹۳،۱۹۴

۲۔ یونس جاوید،حلقہ ارباب ذوق،(لاہور: مجلس ترقی ادب،۱۹۸۴ء) ،ص:۴۲

۳۔ عقیل احمد صدیقی،جدید اردو نظم نظریہ و عمل،(لاہور: بیکن بکس،۲۰۱۴ء)،ص:۱۸۶

۴۔ میراجی،کلیاتِ میراجی،مرتبہ،ڈاکٹر جمیل جالبی،(لندن:اردو مرکز بار اوّل۱۹۸۸ء)،ص:۵۸

۵۔ ضیا جالندھری،نارسا،(کراچی: الیٹ پبلشرز،۱۹۸۴ء)،ص:۱۵۰

۶۔ ایضاً،ص:۳۵

۷۔ مختار صدیقی،منزلِ شب،(لاہور: نیا ادارہ سویرا آرٹس پریس،۱۹۵۵ء)،ص:۲۳

۸۔ کوثر مظہری،جدید حالی سے میراجی تک،(دہلی: عرشیہ پبلی کیشنز،۲۰۱۳ء)،ص: ۴۱۱

۹۔ مختار صدیقی،منزلِ شب،(لاہور: نیا ادارہ سویرا آرٹس پریس،۱۹۵۵ء)،ص:۸۲

۱۰۔ منیر نیازی،ایک اور دریا کا سامنا تھا(کلیات)،(سلام آباد: دوست پبلی کیشنز،۲۰۱۸ء)،ص:۱۰۸

۱۱۔ ایضاً ،ص:۱۱۱

۱۲۔ میراجی،کلیاتِ میراجی،مرتبہ،ڈاکٹر جمیل جالبی،(لندل: اردو مرکز،بار اوّل ۱۹۸۸ء)،ص:۶۴

۱۳۔ وزیر آغا،ڈاکٹر،نظم جدید کی کروٹیں،(علی گڑھ : ایجوکیشنل بک ہاؤس ،۲۰۰۰ء)،ص:۵۵

۱۴۔ میراجی،کلیاتِ میراجی،مرتبہ،ڈاکٹر جمیل جالبی،(لندن:اردو مرکز،بار اوّل۱۹۸۸ء)،ص:۸۴

۱۵۔ ایضاً،ص:۸۲

۱۶۔ ن م راشد،کلیاتِ راشد،(لاہور: ماورا پبلشرز،س ن)،ص:۴۲،۴۳

۱۷۔ وزیر آغا ،ڈاکٹر،نظم جدید کی کروٹیں،(علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس،۲۰۰۰ء)،ص:۴۰،۴۱

۱۸۔ ن م راشد،کلیاتِ راشد،(لاہور: ماورا پبلشرز،س ن)،ص:۷۵،۷۶

۱۹۔ میراجی،کلیاتِ میراجی،مرتبہ،ڈاکٹر جمیل جالبی،(لندن:اردو مرکز،بار اوّل ۱۹۸۸ء)،ص:۲۲۹

۲۰۔ ن م راشد،کلیاتِ راشد،(لاہور: ماورا پبلشرز،س ن)،ص:۳۳

۲۱۔ آفتاب احمد،ڈاکٹر،ن م راشد۔۔شاعر اور شخص،(لاہور: ماورا پبلشرز،۱۹۸۹ء)،ص:۲۴

۲۲۔ ن م راشد،کلیات راشد،(لاہور: ماورا پبلشرز،س ن)،ص:۱۹۲،۱۹۱

۲۳۔ منیر نیازی،ایک اور دریا کا سامنا تھا(کلیات)،(سلام آباد: دوست پبلی کیشنز،۲۰۱۸ء)،ص:۲۵

۲۴۔ نگہت ناہید ظفر ،ڈاکٹر،انگریزی رومانوی شعرا کے اردو شاعری پر اثرات،(لاہور: پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی،۲۰۱۵ء) ص:۲۸۸

۲۵۔ ن م راشد،کلیاتِ راشد،(لاہور: ماورا پبلشرز،س ن)،ص:۳۱۵

۲۶۔ میراجی،کلیاتِ میراجی،مرتبہ،ڈاکٹر جمیل جالبی،(لندن: اردو مرکز،بار اوّل ۱۹۸۸ء)،ص:۱۷۸

۲۷۔ ایضاً،ص:۱۸۹

۲۸۔ سید عبداللہ ،ڈاکٹر،مضمون،سرودِ نو،(لاہور ،،سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۰ء)،ص:۴۰،۴۱

۲۹۔ قیوم نظر، قلب و نظر کے سلسلے(کلیات)،(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۸۷ء)،ص:۱۵۶

۳۰۔ قیوم نظر،قندیل،(لاہور: کتاب خانہ پنجاب،جون ۱۹۴۵ء)،ص:۲۶

۳۱۔ ناہید قاسمی،ڈاکٹر،جدید اردو شاعری میں فطرت نگاری،(کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان،۲۰۰۲ء)،ص: ۴۸۰

۳۲۔ یوسف ظفر،زہر خند،(لاہور: مکتبہ اردو،۱۹۴۴ء)،ص:۳۱

۳۳۔ ضیا جالندھری،سرشام سر پسِ حرف تک،(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۳ء)،ص:۱۸

۳۴۔ ایضاً ص:۱۹

۳۵۔ ناہید قاسمی،ڈاکٹر،جدید اردو شاعری میں فطرت نگاری،(کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان،۲۰۰۲ء)،ص:۴۹۰

۳۶۔ مختار صدیقی،منزلِ شب،(لاہور: نیا ادارہ سویرا آرٹس پریس،۱۹۵۵ء)،ص:۴۷

۳۷۔ وزیر آغا،چہک اُٹھی لفظوں کی چھاگل(کلیات)،(لاہور:ماورا پبلشرز، ۱۹۹۲ء)،۱۷۵

۳۸۔ میراجی،کلیاتِ میراجی،مرتبہ،ڈاکٹر جمیل جالبی،(لندن: اردو مرکز،بار اوّل ۱۹۸۸ء)،ص:۳۷۶

۳۹۔ ن م راشد،کلیاتِ راشد،(لاہور: ماورا پبلشرز،س ن)،ص:۶۰

۴۰۔ ضیا جالندھری،کلیاتِ ضیا،(اسلام آباد: ٹیلی میگ پبلشرز،۲۰۰۷)،ص:۴۲۱

۴۱۔ فتح محمدملک،پروفیسر،مضمون،ضیا جالندھری کے خواب ،مشمولہ،(کراچی: ارتقا،دسمبر،۱۹۹۵ء) ،ص:۱۶

۴۲۔ ن م راشد،کلیاتِ راشد،(لاہور: ماورا پبلشرز،س ن)،ص:۲۷۲،۲۷۱

۴۳۔ تصدق حسین خالد،ڈاکٹر،سرودِ نو،(لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۰ء)،ص:۲۰۰

۴۴۔ ن م راشد،کلیاتِ راشد،(لاہور: ماورا پبلشرز،س ن)،ص:۱۹۲

۴۵۔ حنیف کیفی،ڈاکٹر،اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم،(لاہور: الوقار پبلی کیشنز ،۱۹۹۵ء)ص:۵۲۴

۴۶۔ تصدق حسین خالد،ڈاکٹر،سرودِ نو،(لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۰ء)،ص:۱۲۳،۱۲۲

۴۷۔ یوسف ظفر،زہر خند،(لاہور: مکتبہ اردو،۱۹۴۴ء)،ص:۱۲۰

۴۸۔ ضیا جالندھری،کلیاتِ ضیا،(اسلام آباد: ٹیلی میگ پبلشرز،۲۰۰۷)،ص:۳۲۰

۴۹۔ منیر نیازی،ایک اور دریا کا سامنا تھا(کلیات)،(سلام آباد: دوست پبلی کیشنز،۲۰۱۸ء)،ص:۳۰۵

۵۰۔ حامدی ،کاشمیری ،ڈاکٹر،جدید اردو نظم اور یورپی اثرات،(دہلی : موڈرن پبلشنگ ہاؤس،اشاعت دوم ۲۰۱۰ء)،ص:۴۸۲

۵۱۔ قیوم نظر، قلب و نظر کے سلسلے(کلیات)،(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۸۷ء)،ص:۱۸۷

۵۲۔ قیوم نظر،قندیل،(لاہور: کتاب خانہ پنجاب،جون ۱۹۴۵ء)،ص:۵۸

۵۳۔ یوسف ظفر،زہر خند،(لاہور: مکتبہ اردو،۱۹۴۴ء)،ص:۴۲

۵۴۔ ایضاً،ص:۴۵

۵۵۔ عقیل احمد صدیقی،جدید اردو نظم نظریہ و عمل،(لاہور: بیکن بکس،۲۰۱۴ء)،ص:۲۰۶

۵۶۔ جیلانی کامران،جیلانی کی نظمیں،(لاہور:کتابیات،۱۹۴۷ء)،ص: ۱۲۰

۵۷۔ صابرہ شاہین،ڈاکٹر،،مختار صدیقی حیات و خدمات،(لاہور: الوقار پبلی کیشنز،۲۰۱۴ء)،ص:۱۰۹

۵۸۔ انجم رومانی،دنیا کے کنارے سے،(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۸ء)،ص: ٦٤

باب پنجم

غیر تحریکی نظم نگاروں کے موضوعاتی وہیئتی اشتراکات

جدید اُردو نظم دراصل ادبی تحریکوں کا دوسرا نام ہے۔اس کو فروغ دینے میں انجمن پنجاب،رومانوی تحریک،ترقی پسند اور حلقہ ارباب ذوق جیسی ادبی تحریکوں کو خاص مقام و اہمیت حاصل رہی ہے۔ ان تحریکوں سے وابستہ ہو کر شعرا نے بہت جلد مقبولیت بھی حاصل کی اور کچھ شعرا ان ادبی تنظیموں سے الگ ہو کر بھی جدید اردو نظم کی تخلیق کرتے رہے۔ایسے شعرا کی شاعرانہ حیثیت بہت بعد میں قائم ہوئی ۔جدید اردو نظم نگاروں کے اس قبیل کو ترقی پسند اور حلقے کی فہرست سے الگ کر کے دیکھنا چاہیے۔ ادبی تحریکوں سے الگ رہ کر نظم تخلیق کرنے والے شعرا کے بارے میں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا لکھتے ہیں:

''...اس دور میں حلقہ ارباب ذوق اور انجمن ترقی پسند مصنفین
سے تعلق رکھنے والوں کے علاوہ کچھ ایسے شعرا بھی نظمیں

لکھ رہے تھے جو ان میں سے کسی ایک طرف جھکاؤ رکھنے کے باوجود زیادہ تر گروہ بندی سے آزاد تھے ۔ان میں مجید امجد کا نام سر فہرست ہے ۔دیگر شعرا میں اخترالایمان ،سلام مچھلی شہری اور منیب الرحمٰن خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔سلام پچاس ساٹھ پہلے بہت مشہور تھے ،اب کم جانے جاتے ہیں ۔کم وبیش یہی کیفیت منیب الرحمٰن کی ہے لیکن مجید امجد اور اخترالایمان رفتہ رفتہ اہمیت اور شہرت حاصل کرتے جا رہے ہیں۔‘‘(۱)

تقسیم سے قبل رومانوی اور تقسیم کے بعد ترقی پسند اور حلقہ کے شعرا خوب جانے پہچانے جاتے تھے،پھر رفتہ رفتہ غیر تحریکی شعرا بھی نئے مسائل اور نئے تقاضوں کے ساتھ سامنے آئے۔یہ شعرا رومانوی تحریک اور ترقی پسند تحریک کی درمیانی کڑی ہیں۔ان شعرا میں رومانوی،ترقی پسند اور حلقہ کی تحریکوں کے اثرات ہونے کی وجہ سے تینوں رجحانات کی جھلک نظر آتی ہے۔ان شعرا نے نئے موضوعات کےا ظہار کے لیے نئی ہیئتوں کو وسیلہ بنایا ۔ان شعرا نے جذبات واحساسات اور تمناؤں کے اظہار کے ساتھ ساتھ عقل وشعور سے تلخ سچائیوں اور عہد کے کڑے لمحوں کی عکاسی کرتے ہوئے تہذیبی وتمدنی اقدار کی شکست و ریخت کا احساس بھی دلایا ہے۔ ان غیر تحریکی شعرا کے یہاں حلقہ ارباب ذوق اور ترقی پسند شعرا سے مماثلتیں بھی ہیں اور متفرق موضوعات کے صد رنگ تجربے ملتے ہیں۔ ان شعرا نے جدید اردو نظم کو مخصوص موضوعات اور اسالیب کے دائرے سے نکال کر وسعت عطا کی۔ غیر تحریک شعرا کی شاعری میں پائےجانے والے موضوعاتی وہیئتی اشتراکات اور نظری مباحث کی تفصیل درج ذیل ہے۔

فاخر ہریانوی ایسے فطرت نگار شاعر تھے جن کا جھکاؤ کسی ایک تحریک کی طرف نہیں تھا ۔وہ رومانوی اور ترقی پسند تحریک دونوں سے متاثر تھے اگر کہا جائے کہ انھوں نے رومانوی اور ترقی پسند تحریک کے درمیان کڑی کا کام کیا تو بجا ہے۔ان کی نظمیں رومانوی طرز احساس لیے ہوئے ہیں۔ سیاسی وسماجی مسائل کی ترجمانی کرتی ہیں۔ انھوں نے کسی قسم کی نظریاتی پابندی قبول نہ کی اور ہر طرح کے موضوعات کو اپنی نظموں میں پیش کیا۔ ان کی شاعری میں معاصر رجحانات کی جھلک دکھائی دیتی ہے مگر کسی ادبی گروہ کی چھاپ نہیں ملتی۔ ان کا شعری مجموعہ’’موجِ صبا‘‘ ایک مشترک انسانیت کو منعکس کرتا ہے۔انھوں نے بچپن کی یادوں کو تادم آخر قائم رکھا۔انھوں نے جدید اردو نظم کو فطرت کا قابل قدر سرمایہ عطا کیا ،اس ضمن میں ان کی نظم’’خدا‘‘ دیکھیے:

اسی کے حکم سے بہتی ہے چاندی آبشاروں
میں
حسیں فطرت لیے بیٹھی ہے بربط کوہساروں
میں

اسی کے حکم سے دن رات گردش ہے بگولوں
میں
چراغاں کر رہے ہیں کرمک شب تاب پھولوں
میں

(۲)

فاخر ہریانوی نے عظمت اللہ خان کے لہجہ اور اسلوب سے اثر قبول کیا ،انگریزی شاعری کے زیر اثر بھی انھوں نے نظمیں تخلیق کیں ۔نظم ''کوئل'' اس کی عمدہ مثال ہے۔ اس نظم میں فطرت کی خوب صورت مصوری کے ساتھ ساتھ شاعر نے وطن سے محبت کا اظہار بھی کیا ہے۔ ''سر زمین پاک'' کا لفظ فاخر نے اپنے وطن کی مٹی سے وفاداری میں استعمال کیا ہے۔ فاخر نے بھی اقبال کی طرح ''ہمالہ'' پر نظم لکھی مگر ان کا اسلوب اور لہجہ مختلف ہے:

کیا تھا نصب خیمہ دھوپ نے سیمیں چٹانوں پر
زمیں کا عکس پڑتا تھا سنہری آسمانوں پر
نظر کو خوش نما سب وادیاں معلوم ہوتی تھیں
سنہری دھوپ میں شہزادیاں معلوم ہوتی تھیں

(۳)

فاخر نے یہ نظمیں مثنوی کی ہیئت میں لکھی ہیں ،انھوں نے ہمالہ کی عظمت کا اظہار کیا ہے اور فطرت کے مناظر کی جھلکیاں دکھائی ہیں۔ ان کے یہاں فطرت اور سماجی شعور کی متعدد نظمیں ہیں۔ ان کے شعری مجموعہ"موجِ صبا" میں ایک حصہ ''دیہاتی نغمے'' کے نام سے الگ بنایا ہوا ہے اس حصے میں شامل نظموں میں ''کسان''،''دیہات کی رات''اور''دیہات کی صبح'' اہم ہیں۔ان نظموں میں بڑے دل کش انداز میں دیہاتی ماحول میں فطرت کی تصویر کشی کی گئی ہے۔جب صبح کی روشنی پھیلی تو سویا ہوا گاؤں بھی جاگ اٹھا ،فاخر نے یہ منظر یوں بیان کیا ہے:

آ رہی ہے کان میں چکی کھر کھر کی صدا
ہے فضا میں منتشر اللہ اکبر کی صدا
(۴)

فاخر نے گاؤں کی عورتوں کا ذکر بھی کیا ،وہ دراصل گاؤں کی عزت وناموس ہیں۔انھوں نے پردہ نشیں عورتوں کا نقشہ کھینچا ہے۔فاخر ہریانوی نے اپنی نظموں میں فطرت کے مسحور کن مناظر کو آہستہ آہستہ بیان کیا ہے۔ انھوں نے گاؤں کے پاکیزہ ماحول اور مویشیوں کے گلوں میں گھنٹیوں اور گھنگھرو کی تال سے مناظر کو مزید حسن وتاثیر دی

ہے۔انگریزی نظموں کے تراجم اور رومانوی تحریک کے اثرات کی وجہ سے فاخرؔ کی نظموں میں حقیقی فطرت نگاری کے نمونے ملتے ہیں۔انھوں نے جب شاعری کا آغاز کیا تو رومانوی تحریک اپنے عروج پر تھی اس لیے انھوں نے جدید اردو نظم کو لازوال مناظر فطرت سے مالا مال کر دیا۔فاخر نے ملک کی آزادی اور سیاسی کشمکش کو بھی موضوع بنایا ہے اور اپنے عہد کی تہذیب ومعاشرت کی عکاسی بھی کی ہے۔ وہ بڑے محب وطن شاعر تھے۔ان کی شاعری میں مجید امجد اور اخترالایمان کی شاعری جیسا موضوعاتی تنوع پایا جاتا ہے۔ فطرت نگاری کم وبیش تمام شعرا کے یہاں موجود ہے مجید امجد کو بھی فطرت سے لگاؤ تھا انھوں نے مناظر فطرت کی دل موہ لینے والی مرقع کاری کی ہے۔ انھوں نے اپنے گردوپیش کے ماحول کی عکاسی کرتے ہوئے کھیت کھلیان،رہٹ،فصلیں،نالے ،ندی ،نہریں اور دیگر دیہاتی مناظر نظم کیے ہیں۔ مجید امجد کی فطرت نگاری کے بارے میں احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں:

>''مجید امجد اردو شاعری میں نیچر سے گہری اور با مقصد اور بامعنی دوستی کی ایک نہایت بلیغ مثال ہے۔ ''(۵)

مجید امجد کو مناظر فطرت میں درخت بے حد پسند ہیں ،انھوں نے تمثیلی انداز میں درختوں کو جا بجا پیش کیا ہے۔ نظم''توسیع شہر'' اس سلسلے کی نہایت اہم نظم ہے۔ اس نظم میں انھوں نے توسیع شہر کے سلسلے میں ہرے بھرے درختوں کو کاٹنے کی مذمت کی ہے۔جب شہر کی توسیع کے دوران ہرے بھرے درختوں کی پوری قطار قاتل تیشوں کی زد میں آ جاتی ہے تو مجیدامجد کا درد مند دل تلملا اٹھتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ درختوں سے انسان کا دیرینہ تعلق ہے۔مجید امجد نے انگریزی رومانوی شعرا کیٹس اور شیلے سے متاثر ہو کر ''توسیع شہر'' جیسی نظمیں تخلیق کیں۔انگریزی رومانوی شعرا نے جس طرح یورپ کی چراگاہوں ،دریاؤں اور وادیوں کا ذکر کیا اہے اسی طرح مجید امجد نے جھنگ اور ساہیوال کی دیہی زندگی کو پیش کیا ہے۔ان کی نظم ''پژمردہ پتیاں''پڑھ کر کیٹس کی نظم'' To Autumn''یاد آ جاتی ہے۔اسی طرح امجد کی نظمیں ''بن کی چڑیا''اور''یاد'' شیلے کی نظموں''To a Sky Lark''اور''Memory'' سے متاثر ہو کر لکھی ہیں۔اس مشینی عہد میں انسان فطرت سے دور ہو گیا ہے ،فطرت سے انسان کی اس دوری نے مجید امجد کو اذیت دی ہے۔ نظم''بھکارن''میں انھوں نے سڑک کے دورویہ سبزہ وگل کا ذکر کیا ہے۔انھوں نے انسان کو اس قدر مصروف دکھایا ہے کہ ایک پھولوں سے لدی ٹہنی کا ذکر کیا ہے جو راہگیروں کی ایک نگاہ کی بھیک مانگتی ہے:

سرخ پھولوں سے اک لدی ٹہنی
آن کر بچھ گئی ہے رست پر
کنکروں پر جبیں رگڑتی ہے
میں کہاں روز روز آتی ہوں

(٦)

فطرت کے ساتھ مجید امجد کی ذہنی اور جذباتی وابستگی کے ضمن میں’’بس اسٹینڈ پر‘‘،’’گلی کا چراغ‘‘،’’ایک پر نشاط جلوس کے ساتھ‘‘،’’آنگن کھڑکیاں‘‘ جیسی نظمیں دیکھی جا سکتی ہیں۔انھوں نے زرعی فطرت نگاری کی ہے اور پنجاب کے میدانی علاقوں کا گہرا مشاہدہ کیا ہے اس حوالے سے ان کی نظم’’گاؤں ‘‘ زیادہ اہم ہے۔اس نظم میں مجید امجد نے گاؤں کی جھلکیاں دکھائی ہیں اور ہیئت کے تجربے کیے ہیں۔ نظم’’سنگت‘‘ بھی اسی نوع کی ایک نظم ہے۔مجید امجد کے دل میں پرندوں کے لیے بے حد محبت اور ہمدردی تھی اس کی مثال ان کی نظمیں’’افریشیا‘‘ میں آبی پرندوں کا ذکر ملتا ہے۔ ’’بہار کی چڑیا‘‘ میں چڑیا اور اس کے منگیتر کا سواگت کیا ہے۔ اور نظم’’اری چڑیا‘‘ میں بھی پرندوں سے ہمدردی نمایاں ہو رہی ہے۔اخترالایمان اپنی ذاتی محرومیوں اورتجربوں کی ترجمانی علامتوں کے ذریعے کرتے ہیں۔ ان میں کچھ علامتیں انھوں نے فطرت سے بھی لی ہیں۔ان کی نظم ’’نیند سے پہلے‘‘اہم ہے۔

اختر الایمان تاروں کے ٹوٹنے کا بہت ذکر کرتے ہیں ،وہ فطرت اور انسانی تصادم میں مختلف پہلوؤں کا ذکر کرتے ہیں۔ اختر کہتے ہیں کہ انسان نے زمین کو تاریک سیارہ بنا رکھا ہے۔وہ مجید امجد کی طرح اس امید پہ قائم ہیں کہ نیا انسان نئی صبح لائے گا۔ ان کی نظمیں’’اعتماد‘‘،’’ایک سوال‘‘،’’سوالیہ نشان‘‘،’’انتظار‘‘،’’تاریک سیارہ‘‘ اور’’ایک لڑکا‘‘ رجائی فطرت نگاری کی عمدہ مثالیں ہیں۔ابنِ انشا ایک مسافر شاعر تھے جو شہرتمنا کی تلاش میں سرگرداں رہے ۔مسلسل سفر ہی ان کی زندگی کا مقصد رہا ،ان کی نہ کوئی منزل تھی ،نہ ماضی اور نہ ہی مستقبل کی کوئی فکر تھی۔ انھوں نے ماضی ،حال اور مستقبل کے لمحوں کو ملا ملا کر خواب تراشے ہیں اور ایسے چاند نگر کے متلاشی ہیں جو روئے زمین پر نہیں ہے۔ابن انشا کی شاعری میں مجید امجد کی طرح اداسی کا عنصر نمایاں ہے ۔ان دوشعرا نے اپنی اداسی فطرت نگاری سے ظاہر کی ہے،ابن انشا جب بہت اداس ہو جاتے تو اپنی دلی کیفیت کے اظہار کے لیے فطرت کی طرف نکل جاتے ،ان کی ایک آزاد نظم ’’چاندکے تمنائی‘‘ اس ضمن میں ملاحظہ کیجیے:

تاک ،شب کی بیلوں پر/ شبنمیں سر کشوں کی/ یادگار چھوڑی ہے/ اتنی بات تھوڑی ہے/آج دل میں ویرانی ہے(۷)

اس نظم میں یوں لگتا ہے کہ ابن انشا نے چاند کے ہر منظر کابغور مشاہدہ کیا ہے ،انھو ں نے چاند کی کرنوں کے بکھرنے سے پیدا ہونے والے حسن کو نظم’’کاتک کا چاند‘‘ میں بیان کیا ہے۔چاند رات ہی کو چمکتا ہے اس لیے ابن انشا رات بھر جاگتے رہتے ہیں جس رات چاند نہیں نکلتا وہ شہر کی سڑکوں پر اداس گھومتے ہیں،انھیں چاند کے بغیر رات بہت طویل لگتی ہے ۔ان کی شاعری میں شام اور رات کے مناظر عام ملتے ہیں۔ انھوں نے مجید امجد اور اخترالایمان کی طرح فطرت نگاری کی مگر ان کی منظر کشی اتنی معنی خیز نہیں لیکن حسین اور حقیقی ضرور ہے نظم’’پچھلے پہر کے سناٹے میں‘‘ اس کی اہم مثال ہے۔ابن انشا کی نظموں میں رومانوی مناظر کی جھلکیاں اور تصویریں ملتی ہیں ،ان کی نظموں کا مرکز تو

چاند ہے مگر وہ گروپیش سے ب ے خبر نہیں انھوں نے انسانی ہمدردی اور انسانیت کے تحفظ کی بات کی ہے۔ وہ تلخ حقائق سے گھبرا کر خیالی دنیا نہیں بساتے بل کہ ان کا حقیقی زندگی میں رہ کر سامنا کرتے ہیں ،ابن انشا ''چاند نگر'' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''انسانیت کا دھیلہ بھر جوہر میرے نزدیک دنیا بھر کی دولت
پر بھاری ہے میری کتنی ہی نظمیں کہ مجھے عزیز ہیں اسی
دھیلہ بھر انسانیت کے متعلق ہیں۔''(۸)

ابن انشا کی ترقی پسند فکر کی حامل نظموں کا طرز احساس اور طرز اظہار ترقی پسندوں سے مختلف ہے کیوں کہ مخصوص آئیڈیلزم میں رہتے ہوئے اپنے گردوپیش کےمسائل کی عکاسی کرتے ہیں۔ابن انشا نے دو مختلف تحریکوں کی موجودگی میں علامتی فطرت نگاری کی ہے۔ ان کی فطرت نگاری میں معاصرشعرا کی سی یکسانیت اور مکرر پن نمایاں ہے۔ ہیئتی اعتبار اور فنی حوالے سے بھی ابن انشا معاصر نظم نگاروں سے اشتراک وانسلاک رکھتے ہیں۔ کمارپاشی کی شاعری میں مناظر فطرت کی عکاسی خوب صورت انداز میں ملتی ہے،شاعر فطرت کی طلسماتی فضا میں جینے کا آرزو مند ہے،اس سلسلے میں ایک آزاد نظم''انجام''دیکھیے:

بھری سبھا ہے/چاند کھلا ہے/لب پر نغمے تھرک رہے ہیں/سپنوں کی سندر تعبیریں ۔پلکوں کے ٹھنڈے سایوں میں رقصندہ ہیں/سانس کی مدھم ،موہن جھنکار کی خوشبو(۹)

مجید امجد کا عہد تحریکی تھا مگر وہ کسی تحریک یا رجحان سے وابستہ نہ ہوئے ۔جب حلقہ ارباب ذوق نے شعری انتخاب شایع کیے تو اس میں مجید امجد کی نظمیں بھی شامل کر لی گئیں۔انھوں نے اپنی ابتدائی نظموں میں روایتی ہیئت کا استعمال کیا۔بعد میں مجید امجد حلقہ ارباب ذوق کی معروف ہیئت ''آزاد نظم'' کی طرف راغب ہوئے اور اس ہیئت میں متعدد تجربے کیے۔مجید امجد کسی نظریے کے پابند دکھائی نہیں دیتے ان کی شاعری میں انفرادی رد عمل کی جھلک نظر آتی ہے۔ انھوں نے زندگی سےمتعلق مسائل کاذکر تو کیا لیکن ترقی پسندوں اور حلقہ کے شعرا کی طرح زندگی کے بڑے بڑے موضوعات کو نظم نہیں کیا ۔وہ اپنی محرومی کا راگ الاپتے ہوئے بھی مظاہر فطرت کی عکاسی کرتے ہیں ان کی طویل نظم''طلوعِ فرض'' اس ضمن میں اہم ہے۔مجید امجد نے اپنی اس طویل نظم میں امارت اور غربت کے المیے کو بیان کیا ہے۔اس نظم میں وہ ایک کلرک اور دوسرے ہزاروں لوگوں کا ذکر کرتے ہیں۔ ''نالی کے پانی'' اور''خاموش پنچھی'' کے روپ میں ایک مجبور انسان کی زندگی کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔مجید امجد کی اسی قبیل کی نظم ''کنواں '' میں ہیئتی تجربہ کیا گیا ہے۔وقت کے تصرف کو شاعر نے ''کنواں'' کی علامت میں پیش کیا ہے، انھوں نے تمثیلی انداز کی معنویت بیان کی ہے۔

مجید امجد پر اشتراکی نظریے کی چھاپ موجود نہیں وہ Humanityہیں Progressiveنہیں۔انھوں نے مالدار اور جاگیردار طبقے سے بیزاری شاید اس لیے کی ہے کہ

جس لڑکی سے انھوں نے محبت کی تھی ،وہ کسی امیرگھرانے سے تعلق رکھتی تھی،اس ضمن میں نظم ''اورآج سوچتا ہوں'' دیکھیے:

اور آج سوچتا ہوں کہ کیوں میرا سوزِ دل
تیرے محل کا جشن چراغاں نہ بن سکا
تیری وفا سے پردۂ محمل نہ اٹھ سکا
میرا جنوں بھی چاک گریباں نہ بن سکا

(۱۰)

مجید امجد نے ترقی پسند موضوعات کا ذکر تو کیا ہے لیکن انھوں نے ترقی پسندوں کی طرح جبر زمانہ سے بغاوت نہیں کی۔انھوں نے زمانے کے بدلنے کی تمنا تو کی اسے نعرہ نہ بننے دیا۔ان کے اس احساس محرومی نے ان کے اندر رومانی کیفیت پیدا کر دی۔مجید امجد نے میراجی کی طرح ہندی الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے،ا س طرح اخترالایمان اور دیگر غیر تحریکی شعرا نے بھی ترقی پسندوں اور حلقہ کے شعرا کے اثرات قبول کیے ہیں نظم''زینیا''میں گرمی کے موسم میں کھلنے والے پھول زینیا کا ذکر کیا گیا ہے:

پائے موجِ نمو/خوشبو تج کر تو/اگنی پیتے پھول/تیری جبیں پر لاکھ/بجھے دلوں کی راکھ(۱۱)

مجید امجد اس دنیا کی محفلوں سے مایوس نظر آتے ہیں ،وہ انسان کی موجودہ زندگی کا سامنا نہیں کر سکتے اور نظام میں تبدیلی کے خواہش مند ہیں۔ وہ ایسی تبدیلی چاہتے ہیں جہاں انسان خوشی اور آرام و سکون سے زندگی بسر کر سکیں۔ ان کی شاعری میں تنہائیوں کی پرچھائیاں ہیں ان کا احساس اپنی ذات ،محرومیوں ،ناکامیوں اور زندگی کی بے حاصلی و بے مصرفی سے پیدا ہوتا ہے:

دل نے ایک دکھ سہا تنہا
انجمن انجمن رہا تنہا
ڈھلتے سایوں میں تیرے کوچے سے
کوئی گزرا بار ہا تنہا

(۱۲)

تنہائی اور بے یارومدد ہونے کا ذکر اخترالایمان کی شاعری میں بھی نمایاں ہے۔ ان کے شعری مجموعہ"گرداب" میں شامل نظم''لغزش''میں یہ عنصر نمایاں ہے:

اب مرے معصوم زخموں سے لہو بہتا نہیں
میں اکیلا جا رہا ہوں اور زمیں ہے سنگلاخ
اجنبی وادی میں میرا آشنا کوئی نہیں

(۱۳)

مجید امجد اور اخترالایمان کی یہ نظمیں اگرچہ ہیئتی اعتبار سے مختلف ہیں لیکن موضوع ایک جیسا ہے۔اختر کی یہ نظم معرا کی ہیئت میں لکھی گئی ہے۔ ان دونوں شعرا کی متعدد نظمیںایسی ہیں جنھیں پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ شاموں اور اداسیوں کے شاعر ہیں۔ مجید امجد زندگی سے مکمل مایوس اور اداس نہیں کیوں کہ اگر وہ ہوتے تو وہ نئی نسل کو پھول نہ کہتے اور کبھی ہری بھری فصلو کہہ کر دعا نہ دیتے،انھیں زندگی اور کائنات کی حسین وجمیل اشیا سے پیار ہے۔منیب الرحمٰن کی نظم جدید حسیت کی غمازی میں ذات اور کائنات کا دامن تھام کر سفر کرتی ہے۔ ان کی نظموں میں غم ذات اور غم کائنات دونوں کو آمیز کر دیا گیا ہے۔ منیب الرحمٰن کی نظمیں محبت اور رومان کا بیان ہیں۔ ان میں محرومی ،مایوسی اور یادوں کے کرب سے جینے کی امنگ پیدا ہوتی ہے۔ ان کی شاعری میں وطن کی دوری کا عنصر بھی ہے ان کی شاعری انسان کی ذات کے جزیرے کی سیر ہے ،احساس اور یاد کا رنگ ہونے کی وجہ سے ان کی شاعری پر ناسٹلجیا کا رنگ ملتا ہے۔نظم''رنگ'' میں منیب اپنی ذات میں جھانک کر اس کی پیچیدگیاں بیان کرتے ہیں۔اس نظم میں انھوں نے انسان کی محرومی کا ذکر کیا ہے ،ان کی شاعری میں احساسات کے کھنڈر ،خواب ،اندیشے اور شہروں کے مناظر دکھائے گئے ہیں۔منیب کی نظم ''کھنڈر'' میں بھی تنہائی اور ناسٹلجیا کی کیفیت بہت زیادہ ہے۔ اس کی ایک وجہ دیار غیر میں ہونا بھی ہو سکتا ہے۔ایک نظم''چراغ روشن ہیں''مثال کے لیے دیکھیے:

صحبت باز پسیں ختم ہوئی /حالِ دل کہہ بھی چکے ،سن بھی چکے/مسندیں رکھ دی گئیں تہ کر کے/دوست آپس میں گلے ملنے لگے /طول دیتے ہوئے ہر لمحہ دزدیدہ کو/میں نے جاتے ہوئے مڑ کر دیکھا/اس کے ایوانوں میں روشن تھے چراغ(۱۴)

عمیق حنفی کی شاعری میں جدید دور کے انسان کی تنہائی کا احساس پوری شدت کے ساتھ محسوس کیا جا سکتا ہے ،وہ کہتے ہیں اس پر ہجوم کائنات میں بھی آج کا انسان اکیلے پن کا شکار ہے۔ یہ شعری نمونہ دیکھیے:

اس بھیڑ کے میلے ٹھیلے میں
آدم زادوں کے ریلے میں
کیا حسن ادا ، کیا عشق و ہوس
ہر منظر بھیڑ میں ڈوب گیا
تنہا تنہا ، تنہا تنہا
(۱۵)

مجید امجد نے عربی،فارسی اور ہندی زبان سے بھی الفاظ لیے ہیں ،اخترالایمان نے فارسی اور ہندی دونوں زبانوں کا استعمال کیا ،ان کی ابتدائی نظموں میں

''جواری''اور ''پگڈنڈی''کا ڈکشن ہندی الاصل ہے۔ ان سے پہلے میراجی میں اظہار کے ایسے تجربے کر چکے تھے۔اختر نے ابھی دونوں زبانوں کے امتزاج سے انفرادیت قائم کرنے کی کوشش کی۔اخترالایمان کے غیر تحریکی رویے کے بارے میں عقیل احمد صدیقی رقم طراز ہیں:

> ''اخترالایمان سماجی شاعر ہوتے ہوئے بھی ترقی پسندوں کی طرح تصورات کے شاعر نہیں ہیں بلکہ تجربے اور مشاہدے کے شاعر نہیں ہیں۔اخترالایمان تجربے کو میراجی کی طرح داخلی واردات بنا کر پیش نہیں کرتے بلکہ خارجی حوالوں کی مدد سے بیان کرتے ہیں۔''(١٦)

مجید امجد نے اخترالایمان کی طرح حرکی اور دل کش علامتوں سے کام لیا ہے ،انھوں نے کیفیات کو بھی اشیا اور محل کا پیکر عطا کر دیا ہے۔ وہ ''ریوڑ '' کی تصویر کشی یوں کرتے ہیں:

مست چرواہا ، چراگاہ کی ایک چوٹی سے
جب اترتا ہے تو زیتون کی لانبی سونٹی
کسی جلتی ہوئی بدلی میں اٹک جاتی ہے
بکریاں ، دشت کی مہکار میں گوندھا ہوا دودھ
چھاگلوں میں لیے جب رقص کناں آتی ہیں
کوئی چوڑی خم دوراں پہ چھنک جاتی ہے

(١٧)

مجید امجد کی زندگی سے مربوط نظموں میں ''خدا''،ایک اچھوت ماں کا تصور،پنواڑی،ایک کوہستانی سفر کے دوران،کہانی ایک ملک کی،''جاروب کش''اور''بارکش''شامل ہیں۔ان نظموں میں مجید امجد ترقی پسند نظر آتے ہیں مگر ان کی یہ ترقی پسندی مخصوص آئیڈیالوجی سے انسلاک کی تشہیر نہیں کرتی۔ مجید امجد زندگی کے بنیادی سوالات ،موت،وقت،اور غم پر غوروفکر کرتے ہیں،ان کی شاعری میں یاسیت کا جو احساس ملتا ہے وہ بشری تقاضا ہے مجید امجد اگر مایوس ہوتے تو ''نژاد نو'' سے پیار نہ کرتے۔ مجید امجد کی اس نظم کے علاوہ بھی متعدد نظموں میں سماجی ناہمواری ،غیر ہم آہنگی اور ظلم وتشدد کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوتی ہے۔ وہ عدم مساوات پر کافی برہم نظر آتے ہیں مگر اسے نعرہ نہیں بناتے۔ مجید امجد کی شاعری فکر وفن دونوں اعتبار سے اخترالایمان اور جدید اردو نظم کے معاصر شعرا سے مماثلت رکھتی ہے اس کی بڑی وجہ ایک عہد کا سماجی ماحول ہے۔ ان کی شاعری بھی اخترالایمان کی طرح کسی خاص نقطۂ نظر سے انسلاک نہیں کرتی بل کہ متنوع نقطہ ہائے نظر کی حامل ہے۔مجید امجد کی نظم ''مقبرۂ

جہانگیر''اخترالایمان کی نظم"مسجد" سے موضوعاتی انسلاک رکھتی ہے۔ اس میں بھی مسلمانوں کے تہذیبی انہدام کی بات کی گئی ہے۔تہذیبی انہدام کا یہی پہلو ہمیں اقبال کی ''مسجد قرطبہ'' ،میراجی کی ''اجنتا کے غار''اورسحر لدھیانوی کی''تاج محل''اور ''نور جہاں کے مزار پر'' میں نظر آتا ہے۔ان نظموں میں مغل حکمرانوں کے جاہ وجلال اور شکست وریخت کا بیان ہے اور طرزتعمیر کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

مجید امجد نے عام زندگی سے متعلق موضوعات بیان کیے ہیں ،اس لیے ان کی شاعری میں آفاقی صداقتیں ہیں ۔مجید امجد صرف درختوں ،پھولوں اور چیونٹیوں وغیرہ ہی سے ہمدردی نہیں رکھتے بل کہ اس ہمدردی کا بڑا حصہ انسانوں کے لیے ہے۔وہ بچوں ،قیدیوں اور مفلس لوگوں کے لیے اپنے دل میں درد رکھتے تھے۔ نظم "حادثہ" میں انھوں نے ایک بچے کی درد ناک حادثاتی موت کا اس طرح ذکر کیا ہے کہ اس کا اثر ایک کٹار کی طرح قاری کے دل میں پیوست ہو جاتا ہے۔مجید امجد نے انسان کی جنسی جبلت کو بھی موضوع بنایا ہے۔اس سلسلے کی اہم نظموں میں''آٹو گراف''اور'' ایکٹرس کا کنٹریکٹ'' شامل ہیں۔ اس موضوع پر کم ہی نظمیں ملتی ہیں لیکن امجد نے جنسی جبلت کے تقاضوں کو زندگی سے باہر نہیں رکھا۔ امجد کی نظمیں ان کے عہد کے ساتھ مل کر انسان کے بے مائیگی اور ذہنی انتشار کی صورت حال کا تزکیہ کرتی ہیں۔ بلراج کومل کی شاعری میں جنسی موضوعات میں جنسی آسودگی اور الجھاؤ دونوں پہلو ملتے ہیں یہ جنسی ہم آہنگی شیریں لمحوں کی امین بھی ہے۔مثلاً ''وصال''،''موسمِ گل''،''لذتِ قرب''اور''رشتہ میں محبوب کی ہستی''میں جواں جذبات کی عکاسی کی گئی ہے ۔نظم ''موسمِ گل''ملاحظہ کیجیے:

میں جسم میں اب،میں جسم ہوں اب/تو آج ہے اور کل نہ ہوگی /تو جسم ہے اب تو جسم ہے اب/یہ لمحۂ بے کراں مری جاں بڑا حسین ہے(۱۸)

بلراج کومل کے خیال میں جسم ایک زندہ حقیقت ہے اورجسم سے قربت ایک لذتِ نایاب کا حصول ہے۔ مجید امجد کی نظموں میں معاصر شعرا کی طرح ذاتی ،سماجی ،تہذیبی ،فلسفیانہ ،سائنسی اور نفسیاتی شعور کے مضامین ملتے ہیں۔مجید امجد کی نظموں میں خدا کا تصور اور تصور دعا نمایاں ہے،وہ زندگی کے کرب کی گتھیاںسلجھاتےہوئے بار بار خدا کو یاد کرتے ہیں۔''مرے خدا ،مرے دل''،''مریض دعا''اور'' محبوب خدا سے''ان کی اس نوع کی نظمیں ہیں۔ مجید امجد کی شاعری میں وطن اور اہل وطن کا جذبہ بھی موجود ہے ۔۱۹۵۸ء کے مارشل لا اور دوپاک بھارت جنگوں نے ان کو کافی متاثر کیا ان کی اس ہنگامہ خیز دور کی نظمیں شہدا اور غازیوں کے خراج تحسین پیش کرتی ہیں۔نظم''چہرہ مسعود'' میں ۱۹۶۵ء کے شہدا کے لیے دعا کی گئی ہے۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ کے قیدی کے نام ایک نظم میں لکھتے ہیں:

وہاں جہاں مشکلوں سے آزاد گلشنوں کی ہوائیں
پہنچیں
وہیں کہیں دورا دھر تمھاری دکھوں بھری کال

کوٹھری تک
ہمارے ٹوٹے ہوئے دلوں کی صدائیں پہنچیں
(۱۹)

اخترالایمان دست دعا پر یقین رکھنے والے شاعر ہیں اس ضمن میں ان کی نظم "حرف تمنا" اہم ہے۔ وہ خدا سے دعا کرتے ہیں کہ خدایا سب تیرے بندے ہیں سب کو بخش دے ہم سب تیری حمدوثنا کرتے ہیں۔منیب الرحمٰن کی شاعری میں خدا کی نعمتوں کا اعتراف دعائیہ انداز میں کیا گیا ہے۔ وہ دعا ئیہ انداز میں خدا کو پکارتے ہیں اور اس کی بیش بہا نعمتوں پر اظہار تشکر کرتے ہیں ان کی نظم ''خداوند '' میں قرآن پاک کی آیت (ترجمہ: تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے) کے تناظر میں خدا کو پکارا گیا ہے اور اس میں زندگی جینے کا سلیقہ سکھانے کی دعا گو ہیں:

خداوندا مجھے تو نے متاعِ علم ودانش دی/ کروں انکار تیری کس عنایت سے/مگر اب اےمرے مالک /نہ رکھ محروم اپنی خاص رحمت سے (۲۰)

عبدالعزیز خالد کی شاعری میں دعائیہ انداز نظر آتا ہے ،انھوں نے دعا والتجا کو موثر انداز میں نبھایا اور مشکلات کا حل خدا کی ذات سے چاہتے ہیں۔ان کی شاعری میں بیشتر اشعار دعائیہ ہیں انھوں نے اپنی حسرت وتمنا کو دعائیہ روپ میں بیان کیا ہے۔اختر الایمان کا سیاسی وسماجی شعور بڑا بالغ ہے اس لیے وہ تہذیب وتمدن کے پیکر دکھاتے ہیں ۔وہ ایک جغرافیائی حدود اور ایک قومیت تک محدود نہیں بل کہ وہ تمام انسانوں کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں، اور سب کے ساتھ برابر سلوک ہو۔ ان کی نظم ''کوزہ گر''ملاحظہ کیجیے:

کہیں قومیت ہے کہیں ملک و ملت کی زنجیر ہے
کہیں مذہبیت کہیں حریت ، ہر قدم پر عناں گیر ہے
اگر میں یہ پردہ ہٹا دوں جسے لفظِ ماضی سے تعبیر کرتے رہے ہیں
اگر میں حدود زمان و مکاں سب مٹا دوں
اگر میں یہ دیواریں جتنی کھڑی ہیں گرا دوں

(۲۱)

اختر الایمان نے معاصرزندگی کو اپنی شاعری کا موضو ع بنایا ہے۔ انھوں نے زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں کو سمجھنے اور اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ مٹتی قدروں کو کرب ناک انداز میں بیان کرتے ہیں۔اختر کی شاعری کے بارے میں کوثر مظہری لکھتے ہیں:

> ''انسانی زندگی کے کرب اور آلودہ سماج کو اخترالایمان کی شاعری آئینہ دکھاتی ہے۔ان کے یہاں جو علامتیں اور استعارے وضع ہوئے ہیں وہ اقدار وروایات اور تہذیبی عوامل سے وضع ہیں۔''(۲۲)

فنی اور ہیئتی حوالے سے بات کریں تو اختر الایمان کی متعدد نظمیں مجموعہ قطعات ہیں۔ بعض مربع ،مخمس اور مسدس کی سی ترمیم شدہ صورت ہیں۔ ان کا زیادہ کلام نظم کی پابند ہیئت میں ہے ،نظم معریٰ اور آزاد نظم کو ترجیحی طور پرا نھوں نے ''سب رنگ''،ایک سیارہ،بزدل،میرا دوست ابو الہول، آثار قدیمہ،نظم کی تلاش،میں تمھاری ایک تخلیق،راہ فرار ، پیمان،نیا آہنگ، گونگی عورت،کالے پردوں والاپرندہ،اور میری ایک شام ،ترقی کی رفتار ،حمام ،''باردگر'' اور'' دن کا سورج ''کے بعد کی نظموں میں قابل ذکر انداز اپنایا ہے۔مجید امجد کی طرح ان کی ابتدائی زندگی بھی مصائب ومشکلات میں گزری ،جس کی وجہ سے وہ سماج کے باغی بن گئے۔

عزیز حامد مدنی دیگر غیر تحریکی شعرا سے موضوعاتی وہیئتی اشتراک رکھتے ہیں اس کی ایک مثال اخترالایمان کی نظم کا پہلا مصرع ہے''آج سوچا ہے کہ احساس کو زائل کردوں'' مدنی بھی اپنی نظم''تصویریں'' کی ابتدا اسی طرح کے مصرع سے کرتے ہیں۔''میں نے سوچا ہے کہ خورشید کاماتم نہ کروں''مدنی کی بیشتر نظمیں رومانی ہیں ۔ان کی نظم''صلیبوں کی اوٹ میں''،میں دوسری جنگ عظیم کی ہولناکی بیان کی گئی ہے۔اس میں بے گناہ شہریوں،بچوں اور حاملہ عورتوں کے قتل عام کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس نظم میں شاعر نے ہوائی بمباری،راکٹوں ،ٹینکوں سے شہروں اور بستیوں کو پلک جھپکتے میں ویران اور سمندر کے پانی کو انسانی لہو سے سرخ ہوتے دکھایا ہے۔عزیز حامد مدنی کی نظموں میں ہَوا کا استعارا کافی نمایاں ہے ،ہوا اور درخت مجید امجد نے بھی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ مدنی کی نظموں میں ایک خاص قسم کا خوف ،آسیب اور کہر آلودگی کا تصور نمایاں ہے۔ان کی شاعری معاشرے کی رفتار سے ہم آہنگ ہے ،ان کی شاعری داخلی کیفیات اور خارجی دنیا کی اکائی ہے۔

منیب الرحمٰن نے ماضی اور بچپن کی یادوں کو شاعری کا حصہ بنایا ہے۔وہ وصال کی پریشانیوں سے چھٹکارہ پانے کے لیے اپنے بچپن کے دنوں کو یاد کرنے لگتے ہیں۔وہ اپنے لوگوں ،اپنے رشتوں اور اپنے وطن کے لیے بے قرار ہیں اس قبیل کی دوسری نظموں میں ''نظم'' ،''خون بہا''،''شاعر کی اَنا'' اہم ہیں۔ ''تم اپنےخواب گھر چھوڑ آؤ'' میں شاعر نے خوابوں کی کسک کا روح سے رشتہ قائم کیا ہے۔دیار غیر میں منیب وطن کی یاد آتی ہے تو وہ اس کیفیت کا اظہار نظم''یاد''میں یوں کرتے ہیں:

دیارِ غیر میں صبح وطن کی یاد آئی
نسیم آبلہ پا کو چمن کی یاد آئی

دل بھی اب نیند سے جاگ اٹھا یاد کے ساتھ
کھل گئے غنچۂ ماضی نفسِ باد کے ساتھ
اپنی ہجرت سے تخیل کے پرندے لوٹے
(۲۳)

عبدالعزیز خالد کی کرداری نظمیں فنی حوالے سے کام یاب نظر آتی ہیں۔ ان کے یہاں وطن کی محبت نظریاتی اساس بن کر ابھرتی ہے ان کی نظم''اے دیارِ وطن''دیکھیے:

جذبۂ حب وطن کے فیض سے
بن گیا نغمۂ نوائے آتشیں
تو جیالے جاں نثاروں کا وطن
تو سجیلے سرفروشوں کی زمیں
تیرے محبوب ومقدس بام و در

(۲۴)

منیب الرحمن یادوں اور خوابوں کے شاعر ہیں انھوں نے خواب کی شکست کے المیے کو اپنے شعری تجربے کا موضوع بنایا ہے۔ اس نوع کی ایک نظم''شہر گمنام '' میں خوابوں کی پرچھائیاں ،گمنام خواہشوں کا ہجوم شاعر کے اندروں کو تنہا کر دیتا ہے۔ منیب الرحمن کی اس قبیل کی اہم نظموں ''دن کی موت'' گزرنے والے دن کا نوحہ ہے۔ جب کہ ''ایک مسافر سے''، اور''اجنبی بن کے رہے'' بھی اسی طرز کی ہیں۔ ان کی نظمیں ماضی،حال اور مستقبل کے شعور میں پروئی ہوئی ہیں۔ ان کی شاعری علامتی اور کرداری نوعیت کی حامل ہے۔ ان کا اسلوب سادہ ،غیر تہہ دار ہوتے ہوئے تمثیلی اور استعاراتی طریق کا ہے جس میں احساس ،جذبات کی لو اور نفسیاتی عناصر نمایاں ہیں۔ان کاناستلجیائی انداز اپنی ایمائیت کے باوجود روح کی بالیدگی کا حامل ہے۔عبدالعزیز کی شاعری میں بھی منیب الرحمن کی طرح ماضی کا پہلو نمایاں ہے لیکن ان کا ماضی ،ماضیِ قدیم ہے۔ دیومالا اور یونانی علم الاصنام ان کی شاعری کے اہم مآخذ ہیں۔ ان کی تمثیلاتی نظموں میں ''سلومی''،''برگ خزاں''اور ''زرِ داغ دل''شامل ہیں۔ ان میں متعدد اساطیری کردار وواقعات بیان کیے گئے ہیں۔

عبدالعزیز خالد ،اخترالایمان سے موضوعاتی اشتراک رکھتے ہیں کیوں کہ اختر نے ناگزیر تاریخی عمل اور پرانی قدروں کو زوال کی صورت دیکھا ہے ،ان کے نزدیک جدید دور مادی اقدار کی بالا دستی کا زمانہ ہے جس میں ماضی کی لازوال تہذیبی قدریں شکست میں ہیں۔ ان کے یہاں بھی متعدد نظموں میں مکالمے اور ڈرامائیت پیدا کی گئی ہے۔ انھوں نے بھی خالد کی طرح منظوم تمثیلات پیش کی ہیں۔ان کی تمثیلی نظموں کے کردار کسی نہ کسی واقعہ کی عکاسی کرتے ہیں۔ اختر کی اسی نوع کی ایک کردارنگاری کی اعلا مثال ہے۔مجید امجد نے اپنی اس نظم میں پنواڑی کی کردار نگاری کرتے ہوئے پنواڑی کا حلیہ بھی بیان کیا ہے اور

اس کی دکان کا نقشہ بھی کھینچا ہے۔مجید امجد کی اہم کرداری نظموں میں ''خدا''،''بیاہی سہیلی کا خط''،''بھکارن''،''ماڈرن لڑکیاں''،''گداگر''،''چچی''،''طلوع فرض'' اور''ایکٹرس کا کانٹریکٹ'' شامل ہیں۔عبدالعزیز کی کرداری نظموں میں بھی یہی تکنیک استعمال ہوئی ہے۔بلراج کومل کی نظموں''ریڈیو''،اور''ملاقات''میں بھی خالد کی طرز کا کردار نگاری کا بالواسطہ طریق کار ملتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو یہ سب شعرا مجموعی طور پر اقبال کی مکالمہ نگاری سے شعوری اورلاشعوری طور پر متاثر لگتے ہیں۔عبدالعزیز خالد کی نظموں کے کردار بلراج کومل کی کرداری نظموں جیسے ہیں ان کی کرداری نظموں جیسے ہیں ان کی نظم''فریبِ لطف'' میں مکالماتی انداز اپناتے ہوئے ایک شرابی کی شراب کی جھلک دکھائی گئی ہے۔ اسی طرح عبدالعزیز خالد کی تمثیلی نظموں میں کردار نگاری اور کرداروں کے مکالمے بڑے توانا اور جان دار ہیں۔ان میں انسانی جذبات وعادات کے گہرے مشاہدے کی غمازی ملتی ہے۔ان میں سبق آموزی اور حکمت اندوزی نمایاں ہے۔

عبدالعزیز خالد نے جدید اردو نظم میں کرداروں کی پیش کش کے لیے متعدد فنی حربے استعمال کیے ہیں ،''دکان شیشہ گر'' میں شامل نظم''حریرِ رگِ گل'' میں یونانی دیو مالا کے مختلف کردار ملتے ہیں۔ ان میں ہیفاسطس ،زیوس،پروےتھئس ،ہرمس اور پینڈورا شامل ہیں۔ایک اور تمثیلی نظم ''مشتِ شریر '' میں لیلیٰ کا اساطیری کردار ''شعلہ گل''میں قیس اور مہدی کے کردار اہم ہیں۔شعری مجموعہ''ورق ناخوانده'' کی نظم''چراغ تہ داماں'' میں سیف الملوک ،زیتون اور لالہ رخ کے کردار شامل کیے گئے ہیں۔ عبدلعزیز خالد کی مذکورہ تمثیلی نظموں میں تاریخی کردار آئے ہیں۔عبدالعزیز خالد اور معاصر شعرا کی شاعری میں کردار نگاری کے بارے میں عارفہ شہزاد رقم طراز ہیں:

> ''سلام مچھلی شہری،شاد عارفی، راشد،میراجی،صفدر میر،اخترالایمان، عبدالعزیز خالد ،ضیا جالندھری ،جعفر طاہر ،بلراج کومل ،جیلانی کامران اور انیس ناگی وغیرہ کے ہاں کردار نگاری بالواسطہ طریق کار غالب ہے۔ ان شعرا نے اس ضمن میں مکالمے اور خودکلامی کی تکنیک کو نہایت کامیابی سے استعمال کیا ہے۔''(۲۵)

عمیق حنفی کی نظمیں گہری تاثیر کی حامل اور ڈکشن علامتی ہے۔ ان کی شاعری میں نفسیاتی تناؤ اور اعصابی کھچاؤ نمایاں ملتا ہے۔ان کی نظموں میں انسانی ذات کی شکستگی کا اجتماعی المیہ موجود ہے۔ وہ ہجوم میں بھی تنہائی کا شکار ہیں۔ان کی نظموں میں مشینی اور صنعتی زندگی کی بے حسی کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ یہی صورت ہمیں مجید امجد کی شاعری میں بھی ملتی ہے۔ وہ بھی درختوں کے کاٹنے پر صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں ۔عمیق حنفی کہتے ہیں کہ ہمارا فطرت سے تعلق کب کا کٹ چکا ہے ،اب گلاب کا پھول اور پونم کا چاند محبوبہ کے چہرے کی یاد تازہ نہیں کرتے،سمندر ،آبشار ،کوہسار،صحرا اور لالہ زار مسرت کی لہریں اٹھاتے ہیں اور نہ غم کی موجیں ،اب ہماری زندگیاں مشین نما ہو گئی ہیں۔ہم

فطرت کی خوب صورتی سے لطف اندوز نہیں ہوتے ۔عمیق حنفی کی شاعری میں فطرت،مشین اور دیگر تجربات کا ذکر ملتا ہے۔اس میں اجتماعی لا شعوری ،جذباتی اضطراب اور بگڑتی ہوئی انسانی شخصیت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ عمیق حنفی کے بارے میں شمیم حنفی لکھتے ہیں:

''عمیق حنفی کا ذہن غیر معمولی طور پر زرخیز تھا ۔اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی دنیا سے وہ ایک ساتھ بہت سی سطحوں پر تعلق قائم کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کا مطالعہ ہندوستانی زبانوں کے ادب اور دنیا کی کئی زبانوں کے ادب کا بے حد وسیع تھا۔ تاریخ، تہذیب،ثقافت، فنون، فلسفہ اور سماجیت کے مسائل پر ان کی گہری نظر تھی۔''(۲۶)

عمیق حنفی کی اکثر نظموں میں محسوساتی ،منطقی اور نفسیاتی طریق اپنایا گیا ہے۔ان کی نظموں میں انفرادی اور اجتماعی نفسیات کے متعدد پہلو نظر آتے ہیں۔ ان کی نظم''آئینہ خانے کے قیدی سے'' میں شاعر ایسے جدید انسان سے مخاطب ہے جس نے اپنی ذات کے چاروں طرف آئینہ خانے سجا رکھے ہیں ۔ان آئینوں میں اس کی ذات منعکس ہے۔ شاعر نے جدید انسان کو خود غرض اور خود پسند دکھایا ہے جو صرف اپنی ہی ذات کا قصیدہ خواں ہے۔ اس میں ذرا سی بھی انکساری نہیں ملتی ۔وہ خیالی شہنشاہ بنا ہوا ہے۔دراصل اس نظم میں عمیق حنفی یہ بتانا چاہتے ہیں کہ احساسِ برتری کے پیچھے احساس کمتری کا ہاتھ ہوتا ہے۔عمیق حنفی کی نظم''ایک لمحہ'' ملاحظہ کیجیے:

یہ کیسی طلسمی فضا ہے/ یہ کیا ہو رہا ہے/یکایک مری کار کیوں غار بنتی جا رہی ہے/یہ ٹھنڈی مشین ایک آغوش امکاں ہے کیا ماجرا ہے/حجابات وآداب سب سرد ہیں/قوانین کے چہرے بھی زرد ہیں/یہاں نسل آدم کے دوفرد یعنی زن ومرد ہیں/کہ اور امتیازات سب گرد ہیں(۲۷)

عمیق حنفی کی یہ نظم زندگی کی لایعنی اور بے معنویت کا لمحہ ہے۔انسان اس مشینی دور کی بے رنگی اور جمود سے جب گھبرا جاتا ہے تو تہذیب کے لازوال عناصر میں راحت تلاش کرتا ہے۔ اس نظم میں انسان کی اضطرابی کیفیت بیان کی گئی ہے۔اس نظم میں فطرت جبلت اور معاشرہ ایک اکائی میں ڈھلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔عمیق حنفی کی شاعری میں جنگل کی تصویریں ہیں جو آسودگی ،محبت،دوستی اور آلودگی سے پاک زندگی کی علامت ہیں۔ مجید امجد کی شاعری میں بھی درختوں اور جنگلوں کے استعارے ملتے ہیں۔ سکون کی تلاش میں انسان کھنڈروں ،پیڑوں اور پھولوں سے ربط قائم کرتا ہے۔ انسان کی انتشاری جدت آسودہ قدامت کی طرف سفر کر رہی ہے نظم''پتھروں کا آتما'' اس ضمن میں اہمیت کی حامل ہے۔عمیق اپنی نظموں میں یہ کہتے ہیں کہ عہد جدید کا انسان فطرت سے دوری اختیار کر چکا ہے بل کہ سائنسی ترقی کی تیز رفتاری کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اعصابی تھکن کا شکار ہو چکا ہے۔آج کا انسان غائب دماغی اور بے عملی کی سی زندگی بسر کر رہا ہے۔ نظم''تشنج''

اعصابی تناؤ کی ایک عمدہ تمثیل ہے ۔انسان شکستِ ذات سے دوچار دکھائی دے رہا ہے اس کی آنکھوں میں وہ پہلے جیسی تب وتاب نہیں رہی ۔

عمیق حنفی نے اپنی شاعری میں سمعی تمثالوں سے شور کی آلودگی کو علامتی انداز میں ظاہر کیا ہے۔ انھوں نے نظم''بال'' میں انسانی ترقی کا ذکر پتھروں کے زمانے سے لے کر اب تک کیا ہے۔ انھوں نے دوپتھروں کورگڑ کر آگ جلانے کے عمل سے جدید دور میں لگی ہوئی بارودی آگ تک کا ذکر کیا ہے۔انسان نے ترقی کی اس تیز رفتاری کی دوڑ میں زمین پر قیامت خیز تباہی مچانے کی تیاری کر رکھی ہے۔نظم ''بمبئی ،رات اور سمندر'' میں بمبئی ایک ترقی یافتہ شہر کی علامت ہے۔عمیق حنفی نے نئی نسل کے ہپی ازم کو بھی ہدف تنقید بنایا ہے کہ وہ جسمانی اور مادی طور پر تو عیش وعشرت سے لطف اندوز ہو رہے ہیں لیکن جذباتی سطح پر ان کی تسکین ادھوری ہے۔ عمیق نے ماضی کے نرم روجھونکوں کو بھی چھوا ہے انھوں نے جدید دور کی زندگی کو تیز آندھی ،بگولے اور جمود قرار دیا ہے۔عمیق حنفی رومانیت یا ترقی و عقلیت کے مخالف نہیں بل کہ انھوں نے ترقی کے تخریبی عناصر کی جہات کو بیان کیا ہے۔ فطرت سے محبت اور قدیم آثار کی طرف مراجعت امید کی کرنیں روشن کرتی ہے،نظم''چلو واپس چلیں'' ملاحظہ کیجیے:

چلو اپنے محلے کا باغیچہ دیکھ آئیں/روپہلے بیجنی پیلے /سنہرے زرد بھڑکیلے/گلابی چمپئی نیلے/یہ شوخ وشنگ شرمیلے/پرندے یا پھدکتے رنگ(۲۸)

عمیق حنفی پرانی نسل سے تعلق رکھتے ہیں لیکن وہ بہت جلد جدید شعری روایت سے ہم آہنگ ہو گئے انھوں نے عہد حاضر کی بے رنگ اور جدید میکانکی زندگی کی اضطرابی اور بے اطمینانی کیفیات کو موضوع بنایا ہے۔انھوں نے رنگ بدلتی دنیا کے انسان کی بےچارگی ،بے بسی کو پراسرار انداز میں بیان کیا ہے۔ان کی اہم نظموں میں مشین زاروں کی بستی ،ایک رات، جنگل ،واپسی،شہرزاد،سندباد شامل ہیں۔عمیق نے اپنی نظموں میں معاشرتی رویوں میں رچی ہوئی سرد مہری اور تعقل سے پیدا ہونے والی معروضیت کو بیان کیا ہے۔ انھوں نے صنعتی اور مشینی ترقی کے انسانی جذبات واحساسات پر ہونے والے اثرات کو موضوع بنایا ہے۔آج کا انسان مشین زادوں کی بستی میں سانس لیتے ہوئے مشینی پرزہ بن گیا ہے اس میں جذبے اور احساس کی ہلکی سی رمق بھی باقی نہیں رہی۔اس کی مثالیں''شہرزاد''،''سند باد''،''شب گشت''اور ''کیوپیڈیا'' جیسی نظموں میں ملتی ہیں،ان کی یہ چاروں نظمیں طویل نظم نگاری کی روایت میں اضافہ ہیں۔ عمیق حنفی نے اپنی نظموں میں مختلف تکنیکوں سے کام لیا ہے۔ انھوں نے شعری پیش کش میں جدت وندرت پر خاصا زور دیا ہے۔ عمیق حنفی اپنے عہد کے داخلی اور خارجی تجربات کو شاعری میں بیان کرتے ہیں۔انھوں نے استعاروں،اساطیری علامتوں،پیکر تراشیوں،تمثیل نگاری اور خودکلامی سے اپنی تخلیقات مزین کی ہیں۔عمیق حنفی نے اپنے عہد کی ادبی تحریکوں اور نمایندہ نظم نگاروں کے اثرات بھی قبول کیے مگر انھوں نے اپنی انفرادیت قائم رکھی۔ وہ غیر تحریکی رویے کی وجہ سے

جلد شہرت حاصل نہ کر سکے۔ان کی شاعری میں معاصر شعرا کی شاعری سے اشتراک وانسلاک کی کئی مثالیں موجود ہیں۔

بلراج کومل کی شاعری میں عہد جدید کے متنوع تجربات واحساسات موجود ہیں۔ صنعتی ومادی زندگی کی مصروفیت ،تشدد اور ذہنی کرب ان کی شاعری کے موضوعات ہیں۔ وہ گھبرا کر ماضی میں پناہ نہیں لیتے اور نہ ہی مستقبل کے خوابوں کا سہارا تلاش کرتے ہیں بل لمحۂ حال میں رہ کر تعمیری سوچ کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں۔ بلراج کومل تمام تر بحرانوں کے باوجود لمحۂ حال میں جینے کے خواہش مند ہیں۔ بلراج کومل اور مجید امجد میں اس حوالے سے مماثلت پائی جاتی ہے کیوں کہ مجید امجد بھی لمحہء حال کے شاعر کے طور پر پہچان رکھتے ہیں ۔ان کی نظم''جنگ'' ملاحظہ کیجیے:

ایک ماں سینہ کوبی سے تھک کر گری/اک بہن اپنی آنکھوں میں آنسو لیے/راہ تکتی رہی/ایک ننھا کھلونے کی امید میں/سردہلیز پر رکھ کر سوتا رہا(۲۹)

بلراج کومل کی یہ نظم جنگی جنون اور جارحیت کے محرک سے پیدا ہونے والے بھیانک نتائج کو ایک تمثیلی انداز میں پیش کرتی ہے۔ان کی نظمیں اجتماعی تشدد کو بے نقاب کرتی ہیں ان میں "سوگندھی،تشدد ،احمد آباد،اک گل تازہ کہیں باقی ہے شاید اور جشنِ ہوس جیسی نظمیں شامل ہیں۔انھوں نےقتل وغارت اور فسادات میں ہونے والے جنسی تشدد کا ذکر کیا ہے۔بلراج کومل کی شاعری نظام زیست اور انسانی رویوں سے مربوط ہے ان کی شاعری میں تمثیلی اور علامتی نظموں کے علاوہ شکستِ ذات اور حصارِ ذات کی حامل نظمیں بھی ملتی ہیں۔ ان کی کرداری نظموں میں مکالمے بڑی عمدگی سے استعمال کیے گئے ہیں۔انھوں نے بھی عبدالعزیز خالد کی طرز اختیار کی ہے۔ان کی اہم کرداری نظموں میں''قنوطی شاعر''،ریڈیو،یہ زرد بچے،سرکس کا گھوڑا،فریب لطف،''بچوں کا جلوس ''اور ''میرا پوتا'' اہم ہیں۔جدید اردو نظم کے غیر تحریکی شعرا کی طرح بلراج کومل نے بھی استعاروں اور علامتی انداز میں موضوعات بیان کیے ہیں ،پرندہ ان کی نظموں کی اہم علامت ہے۔بلراج کومل کی نظموں میں موجود موضوعاتی تنوع ان کے عہد کی بتدریج عکاسی کرتا ہے۔ ان کی شاعری میں وجودیت کا آفاقی تصور پایا جاتا ہے۔ انھوں نے جدید اردو نظم میں متنوع موضوعات اور ہیئتی تجربات کیے ہیں۔

کمارپاشی عہد جدید کے انسان کو ماضی کا تہذیبی سرمایہ فراہم کرتے ہیں۔ انھوں نے یہ بتانے کی سعی کی ہے کہ ہم اپنی روایات اور تہذیب سے دور ہو گئے ہیں اور ہماری رسائی حسن بے پناہ تک نہیں رہی ،جدید دور کا انسان جدت پسندی کے زعم میں مبتلا ہے۔ کمار پاشی ماضی کے انفردای تجربے میں قید ہونے سے نالاں ہیں اور لمحۂ حال کے لیے سرگرداں ہیں۔ وہ انفرادی ماضی میں اپنی ذات کو محصور نہیں کرنا چاہتے وہ اس ماضی کی بات کرتے ہیں جو اجتماعی روایت کی پاسدار ہو۔اجتماعی دکھوں کی بہتی ندی میں انفرادی نوعیت کے دکھ مٹ جاتے ہیں،اس کی مثال ''انتم سنسار'' دیکھیے:

سوکھ چکی ہے بہتی ندی/آنکھوں میں اب نیر نہیں ہیں/سوچو تو کچھ/کہاں گئے وہ بھگت پجاری/صبح کو اٹھ کر/جو سورج کو جل دیتے ہیں(۳۰)

کمارپاشی نے اپنی نظم ''سکون''میں انسانی زندگی کی صداقتوں کو زبان دی ہے۔ انھوں نے معاشرتی جبر کے خلاف آواز بلند کی ہے اس سلسلے میں انھیں اپنی ذات کو نقاب میں چھپانا پڑا کیوں کہ معاشرے نے انھیں قابل قبول چہرہ اپنانے پر مجبور کیا۔ ان کی یہ نظم داخلی سچائیوں اور معاشرتی اقدار کے ٹکراؤ سے پیدا ہونے والی کشمکش کی عمدہ تمثیل ہے۔جدید دور کا انسان اپنی ذات سے فرار چاہتا ہے اور معاشرے کی آندھیوں اور دھول سے گھبراہٹ کا شکار نظر آتا ہے نظم''سکون'' ملاحظہ کیجیے:

مجھے پتا تھا/کسی گھڑی یونہی بیٹھے بیٹھے/مرے گلے میں اٹک رہے گی/جو بات میں کہنا چاہتا ہوں دیئے ہیں/مرے ہی الفاظ خار بن کر/چبھیں گے مجھ کو/مرا تخیل بھی جل بجھے گا(۳۱)

کمار پاشی کی دیگر اہم نظموں میں ''جنم دن''،''پردہ ''،''بوڑھی کہانی''اور''آنے والے دن ''شامل ہیں۔ کمار پاشی کی نظموں میں عظمت انسان کا تصور نمایاں ہے انھوں نے تہذیب کے ارتقا کی بات کی ہے۔ ان کے مطابق عہد جدید کا انتشار تہذیبی پاسداری نہ کرنے کی وجہ سے ہے۔نظم '' اُس کادکھ'' میں خیروشر کے تصادم کا ذکر ملتا ہے۔نظم''تشخیص'' میں سمندر اور سمندر کا پانی آفاقی تجربے کی علامات ہے۔ کمار پاشی ایسے غیر تحریکی شاعر ہیں جنھوں نے جدید انسان کے انفرادی مسائل کے بجائے اجتماعی مسائل کو بیان کرنے کی سعی کی ہے۔ ان کی نظموں میں خود کلامی ،تمثیل اور علامت نگاری کی کئی مثالیں ہیں۔کمارپاشی بھی وجودیت کے فلسفے سے متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ان کی متعدد نظموں میں وجودی فکر وخیال کے گہرے نقوش نظر آتے ہیں۔ ان کی نظمیں نئے عہد کے تضادات کی عکاسی کرتی ہیں۔ان کی شاعری میں اپنی ذات کی تلاش،منزل کی جستجو اور بے یقینی کا احساس پایا جاتا ہے۔ان کی نظم ''نامراد نسل کا نوحہ'' دیکھیے:

نہ راستوں کا یقین نہ منزلوں کا پتہ/فلک فلک ہے سیاہی،زمیں زمیں کہرا/نہ رنگ رنگ مناظر نہ موسموں کی خبر/خلا میں گونج رہا ہے ہواؤں کا نوحہ(۳۲)

عہد جدید کی صنعتی اور مادی زندگی کی عدمیت ،اضطراب اور بے معنویت وغیرہ کمارپاشی کی دیگر نظموں میں بھی نظر آتا ہے، اس کی مثال نظم"جنم دن" دیکھیے:

میں پرانا سا کوئی انسان ہوں ،محسوس یہ ہوتا ہے مجھ کو/میں نے ہر ساون میں دھویا ہے بدن کو/اور یہ دھرتی مجھے روز ازل سے جانتی ہے/یاد ہیں ہے وہ دن مجھے اچھی طرح سے/کھولتے چنگھاڑتے لاوے کے پایاں سمندر سے اچھل کر /ہم اکٹھے ہی گرے تھے(۳۳)

جدید اردو نظم نگاروں میں کمارپاشی،اس لیے بھی ممتاز ہیں کہ انھوں نے نظموں کے زبان و بیان اور پیش کش کے طریقِ کار میں جدت سے کام لیا ہے اور متعدد موضوعاتی وہیئتی تجربے کیے ہیں۔

استخراجِ نتائج/موضوعاتی اشتراکات

غیر تحریکی نظم نگاروں فاخر ہریانوی ،مجید امجد، اخترالایمان، عزیز حامد مدنی، ابنِ انشا، منیب الرحمٰن ،عبدالعزیز خالد، عمیق حنفی، بلراج کومل اور کمار پاشی کی نظموں میں موضوعاتی اشتراکات ملتے ہیں۔غیر تحریکی نظم نگاروں پر رومانوی ،ترقی پسندی اور حلقہ کی تحریکوں کے اثرات کی وجہ سے تینوں رجحانات کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان شعرا نے جذبات واحساسات اور تمناؤں کے اظہار کے ساتھ ساتھ عقل وشعور سے تلخ سچائیوں اور عہد کے کڑے لمحوں کومشترکہ طور پر اپنی شاعری کا موضوع بنایاہے۔ ان شعرا کی شاعری کا جھکاؤ کسی ایک تحریک کی طرف نہیں ہے۔ ان کی نظمیں رومانی طرز احساس لیے ہوئے تہذیبی وتمدنی شکست وریخت کا احساس دلاتی ہیں۔ انھوں نے سیاسی وسماجی مسائل کی ترجمانی بھی کی ہے۔

غیر تحریکی نظم نگاروں نے کچھ نظمیں انگریزی شاعری کے زیر اثربھی تخلیق کی ہیں۔ انھوں نے مشترکہ طور پر فطرت کی خوب صورت مصوری کے بعد وطن سے محبت کا والہانہ اظہار کیا ہے۔ ان شعرا نے اپنے عہد کی سیاسی کشمکش اور تہذیب ومعاشرت کی عکاسی کی ہے۔ انھوں نے گردوپیش کے مناظر کی عکاسی کرتے ہوئے کھیت کھلیانوں ، رہٹ، فصلیں، نالے، ندی، نہریں اور دیگر مناظر نظم کیے ہیں۔ان شعرا نے اپنی ذاتی محرومیوں اور تجربوں کو علامتوں کے ذریعے بیان کیا ہے۔ اس حوالے سے انھوں نے متعدد علامتیں فطرت سے لی ہیں۔ اخترالایمان،مجید امجد کی طرح اس امید پر قائم ہیں کہ نیا انسان نئی صبح لے کر آئے گا۔ ابن انشا نے بھی مجید امجد اور اخترالایمان کی طرح فطرت نگاری کی مگر ان کی منظر کشی اتنی معنی خیز نہیں لیکن حسین اور حقیقی ضرور ہے۔ان کی فطرت نگاری میں دیگر شعرا کی سی یکسانیت اور مکرر پن نمایاں ہے۔

غیر تحریکی نظم نگاروں نے زندگی کے مسائل کا ذکر تو کیا ہے لیکن ترقی پسندوں اور حلقہ کے شعرا کی طرح بڑے بڑے موضوعات کو نظم نہیں کیا۔ وہ اپنی محرومی کا راگ لاپتے ہوئے بھی مظاہر فطرت کی عکاسی کرتے ہیں۔غیر تحریکی شعرا کے موضوعات پر اشتراکی نظریے کی چھاپ نظر نہیں آتی وہ Humanityہیں Progressiveنہیں۔ ان کی نظموں میں غم ذات اور غم کائنات دونوں کو آمیز کر دیا گیا ہے۔ ان کی نظمیں محبت اور رومان کا بیان ہیں۔ ان کی نظمیں محرومی، مایوسی اور یادوں کے کرب سے جینے کی امنگ پیدا کرتی ہیں۔ ان شعرا نے کہیں کہیں سماجی ناہمواری اور ظلم وتشدد کو بھی موضوع بنایا ہے۔ مجید امجد نے بھی انسان کی جنسی جبلت کو موضوع بنایا ہے بلراج کومل بھی جنسی موضوعات میں جنسی آسودگی اور الجھاؤ کی بات کرتے ہیں۔ مجید امجد اور اخترالایمان کے علاوہ بھی

غیر تحریکی شعرا مسلمانوں کے تہذیبی انہدام کی بات کرتے ہیں۔ ان کے یہاں ذاتی ،سماجی ،تہذیبی فلسفیانہ ،سائنسی اور نفسیاتی شعور کے مضامین میں اشتراک پایا جاتا ہے۔ ان کی نظموں میں خدا کا تصور اور تصور دعا نمایاں ہے۔ انھوں نے خدا کی نعمتوں کا اعتراف دعائیہ انداز میں کیا ہے وہ دعائیہ انداز میں خدا کو پکارتے ہیں اور اس کی بیش بہا نعمتوں پر خدا سے اظہار تشکر کرتے ہیں۔

ہیئتی حوالے سے بات کریں تو غیر تحریکی شعرا کی شاعری میں نظم کی پابند ہیئت، نظم معریٰ اور نظم آزاد میں ملتی ہے انھوں نے قطعات، مربع، مخمس اور مسدس کی سی ترمیم شدہ ہیئتوں میں بھی نظمیں لکھی ہیں۔ مجید امجد اور عزیز حامد مدنی نے مشترکہ طور پر ہوا اور درخت کا استعارہ استعمال کیا ہے۔مجید امجد ،عمیق حنفی اور دیگر شعرا نے اپنی نظموں میں مشینی اور صنعتی زندگی کی بے حسی کو بھی موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں معاشرتی رویوں میں رچی ہوئی سرد مہری اور تعقل سے پیدا ہونے والی معروضیت کو بیان کیا ہے۔انھوں نے صنعتی اور مشینی ترقی سے انسانی جذبات واحساسات پر ہونے والے منفی اثرات کو بھی موضوع بنایا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ خواجہ محمد زکریا،ڈاکٹر،دیباچہ ،انتخاب زریں اردو نظم ،(لاہور:سنگت پبلشرز،۲۰۱۵ء)،ص:۱۹

۲۔ فاخرہریانوی،موجِ صبا،(لاہور: ایوانِ ادب،۱۹۶۶ء)،ص:۲۵

۳۔ ایضاً،ص:۲۴

۴۔ ایضاً ،ص:۵۵

۵۔ احمد ندیم قاسمی،مضمون،لوحِ دل(کلیات مجید امجد)،(پشاور:مکتبہ ارژنگ ،۱۹۸۷ء)،ص:۱۲۱

۶۔ مجید امجد، کلیاتِ مجید امجد،(لاہور: الحمد پبلی کیشنز،۲۰۱۴ء)،ص:۳۰۴

۷۔ ابنِ انشا،چاند نگر،(لاہور:لاہور اکیڈمی،۱۹۸۶ء)،ص: ۴۵

۸۔ ابن انشا،دیباچہ،چاند نگر،(لاہور: لاہور اکیڈمی،۱۹۶۸ء)،ص:۱۱

۹۔ کمار پاشی،پرانے موسموں کی آواز،(دہلی: نازش بک سنٹر،١٩٦٦ء)،ص:۲۸

۱۰۔ مجید امجد، کلیاتِ مجید امجد،(لاہور: الحمد پبلی کیشنز،۲۰۱۴ء)،ص:۱۱۷

۱۱۔ ایضاً،ص:۳۴۸

۱۲۔ ایضاً،ص:۳۷۶

۱۳۔ اختر الایمان،کلیاتِ اخترالایمان،مرتبہ،سلطانہ ایمان وبیدار بخت،(کراچی: آج کی کتابیں،۲۰۱۴ء)،ص:۶۴

۱۴۔ منیب الرحمٰن،بازدید،(علی گڑھ: انجمن اردو ہند،۱۹۶۵ء)،ص:۲۳

۱۵۔ عمیق حنفی،شب گشت،(الہٰ آباد: شب خون ،۱۹۶۹ء)،ص:۶۷

۱۶۔ عقیل احمد صدیقی ،ڈاکٹر،جدید اردو نظم نظریہ وعمل،(لاہور: بیکن بکس،۲۰۱۴ء)،ص:۳۱۴

۱۷۔ مجید امجد، کلیاتِ مجید امجد،(لاہور: الحمد پبلی کیشنز،۲۰۱۴ء)،ص: ۱۶۰

۱۸۔ بلراج کومل،میری نظمیں،(دہلی: مکتبہ فنکار،۱۹۵۴ء)،ص:۶۷

۱۹۔ مجید امجد، کلیاتِ مجید امجد،(لاہور: الحمد پبلی کیشنز،۲۰۱۴ء)،ص:۳۴۵

۲۰۔ منیب الرحمٰن،بازدید،(علی گڑھ: انجمن اردو ہند،۱۹۶۵ء)،ص:۱۰۲

۲۱۔ اختر الایمان،کلیاتِ اخترالایمان،مرتبہ،سلطانہ ایمان وبیدار بخت،(کراچی: آج کی کتابیں،۲۰۱۴ء)،ص:۳۲۰

۲۲۔ کوثر مظہری،جدید اردو نظم حالی سے میرا جی تک،(دہلی:عرشیہ پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء)،ص:۳۲۰

۲۳۔ منیب الرحمٰن،بازدید،(علی گڑھ: انجمن اردو ہند،۱۹۶۵ء)،ص:۱۲۳

۲۴۔ عبدالعزیز خالد،برگ خزاں، (کراچی:مطبوعات مشرق،۱۹۶۲ء)،ص:۶۵

۲۵۔ عارفہ شہزاد،جدید اردو شاعری میں کردار نگاری، (لاہور: الاشراق پبلی کیشنز،۲۰۰۷ء)،ص:۱۲۳

۲۶۔ شمیم حنفی،پیش لفظ،انتخاب عمیق حنفی،(دلی: اردو اکادمی ،۱۹۹۵ء)،ص:۳

۲۷۔ عمیق حنفی،شجرِ صدا،(لکھنو: نصرت پبلشرز،۱۹۷۵ء)،ص:۹

۲۸۔ ایضاً،ص: ۶۰

۲۹۔ مجید امجد، کلیاتِ مجید امجد،(لاہور: الحمد پبلی کیشنز،۲۰۱۴ء)،ص:۳۲۵

۳۰۔ کمار پاشی،پرانے موسموں کی آواز،(دلّی: نازش بک سنٹر،۱۹٦٦ء)،ص:۳۰

۳۱۔ ایضاً،ص:۳۴

۳۲۔ کمار پاشی، خواب تماشا،(دلّی: نازش بک سنٹر،۱۹٦۸ء)،ص:۵۴

۳۳۔ کمار پاشی،پرانے موسموں کی آواز،(دلّی: نازش بک سنٹر،۱۹٦٦ء)،ص:۳٦

باب ششم

معاصر جدیداُردو نظم کے موضوعاتی وہیئتی اشتراکات(۱۹۷۰ء تا حال)

پچھلے سو برس کی نظم مختلف تحریکوں، رجحانات،نئے طرز احساسات اور افکار کے ساتھ عہد بہ عہد سفر کرتے ہوئے جب ۱۹۷۰ء تک پہنچی تو تمام تحریکیں،رجحانات اور رویے اس طرح گھل مل گئے کہ اب کسی تحریکی وابستگی اور رجحان کی حد بندی کی واضح لکیر کھینچنا مشکل ہے۔ کیوں ہم بیشتر معاصر شعرا کو رومانوی ،ترقی پسند،داخلیت پسندی،امیجسٹ نہیں کہہ سکتے۔۱۹۷۰ء کے الگ بھگ اپنی شناخت بنانے والے شعرا میں متعدد ۱۹٦۰ء میں اپنے شعری سفر کا آغاز کر چکے تھے ۔۱۹۷۰ء کے بعد سامنے آنے والے جدید شعرا اپنے ذاتی بحرانوں اور عصری تلخیوں کا اظہار جیسا ہے جہاں ہے کی بنیادپر کرتے ہیں۔ انھوں نے نظموں کردار نگاری کے بجائے تمثیل اور تصاویر بنانے کی سعی اور ظاہر وباطن کی تفریق مٹا دی۔گذشتہ پچاس سالوں میں نظم مختلف تکنیکی ،اسلوبیاتی اور موضوعاتی نشیب وفراز سے نبٹتی ہے۔اس دور کے شعرا میں روایت سے چپٹے رہنے کی ضد بھی نظر آتی ہے اور نئی راہوں کی تلاش وبسیار کا جذبہ بھی ابھرتا ہے۔ساتویں دھے کے نظم نگاروں سے متعلق عقیل احمد صدیقی رقم طراز ہیں:

''انکشاف ذات ساتوٰیں دھے کے شاعروں کی عام خصوصیت ہےجس میں چھٹے دہے کے بعض شاعر بھی شامل ہیں ان

> شاعروں پر ان کے مخصوص رویے کے سبب داخلیت پسند یا انفرادیت پرست ہونے کا الزام لگایا ہے۔یہ رویہ ذات کی طرف مراجعت ضرور ہے لیکن ایسا نہیں کہ جدید شاعروں نے خارجی کائنات سے اپنا رشتہ ختم کر لیا ہو۔سماج سے ان کا رشتہ اسی طرح برقرار ہے جس طرح کہ ماضی کے ادیبوں کا۔''(۱)

۱۹۷۰ء کے بعد کے شعرا کی نظموں میں مظاہر فطرت ،معاشرہ ،ذات ،وقت اور موت کے افعال ،اعمال اور رد اعمال سمٹے ہوئے ہیں۔ان کے یہاں عصری حسیت بڑئے واضح خدوخال میں نظر آتی ہے،انھوں نے ذاتی واردات ،خود شناسی اور احساسات میں ڈوب کر نئے شعری پیکر تراشے ہیں۔ کچھ شعرا نے فطرت کے مناظر کو عورت کے جسمانی اعضا میں مجسم کر کے پیش کیا ہے اور کچھ نے قدیم اساطیری علامتوں کے ذریعے مرد اور عورت کے آپسی رشتے کو تصور کے دائرے میں لانے کی سعی کی ہے۔اس دور کے شعرا کسی تکنیک کومقصود بالذات نہیں سمجھتے اور کسی تحریک اوررجحان کا حد سے زیادہ حصہ بھی نہیں بنتے۔بل کہ اپنے تخلیقی وفور سے مختلف ہیئتیں اور تکنیکیں بروئے کار لاتے ہیں۔ ۷۰ء کے بعد کی نظموں میں فرد اور معاشرے کا انتشار باہم شیروشکر ہو گئے ہیں۔ معاصرنظم نگاروں کی مخصوص حسیست ،فہم اور متخیلہ کے بارے میں احتشام علی رقم طراز ہیں:

> ''معاصر اردو نظم نگار اپنے فہم اور متخیلہ کی آمیزش سے سماجی ،فکر متخیلہ کی آمیزش سے سماجی ،فکری اور نفسیاتی تبدیلیوں کے نتیجے میں جنم لینے والی اُن کثیر العباد لہروں کو حسی اور ادراکی سطوح پر اپنی نظموں میں منقلب کر رہے ہیں جو ہمارے ''عصر'' کے بیرونی اور اندرونی ساختوں میں موجزن ہو کر معاشرتی تقلیب کا فریضہ انجام دے رہی ہے۔''(۲)

ستر کی دہائی کی نظم اقبال کے سطحی اثرات،تصدق حسین خالد ،میراجی اور ن م راشد کے فکری دھاروں اور اسالیب کو ایک دوسرے میں ضم کر کے ایک نیا لہجہ اور ایک نیاآہنگ تشکیل دینے میں کام یاب ہوگئی۔اقبال سے مجید امجد اور اخترالایمان تک کے نظم نگاروں نے جن امکانا ت کو کھنگالا اس کے اثرات ہمیں ستر کے دہے کےنظم نگاروں پر ملتے ہیں لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ ستر کے بعد کے نظم نگاروں نے اندھی تقلید کرنے کے بجائے اپنے اپنے مزاج کے مطابق ماضی کی بازگشت کے ساتھ ساتھ گذشتہ پچاس سالوں میں پاکستان اور ہندوستان میں آمریت اور جمہوریت کے تسلسل کو بیان کیا ہے۔ پاکستان میں فوجی حکومت ایک تسلسل کے ساتھ رہی ہے جس کی وجہ سے اظہار کی آزادی کم کم ملتی رہی اور پھر استعماری قوتوں نے یہاں شکنجا کسنا شروع کر دیا ،اس دور کے شعرا نے نہ صرف اس سماجی صورت حال کو محسوس کیا ہے بل کہ اپنی نظموں میں پیش کر دیا ہے۔ انھوں نے اپنے

پیش رو شعرا سے سیکھتے ہوئے تمثال ،تشبیہ اور استعارے کا برمحل استعمال کیا ہے اور اسلوبیاتی سطحی مماثلتیں پیدا کرنے کے بجائے زیادہ گہرے اسلوبیاتی اور تہذیبی عوامل کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ انھوں نے اپنے مزاج ،ذوق اور تخلیقی ذات کے مطابق حوادث زمانہ کے اثرات قبول کرتے ہوئے لگے بندھے موضوعات اور اسالیب کو دہراتے ہوئے الگ شناخت اور انفرادیت قائم کی ہے۔ معاصر جدید اردو نظم نگاروں پرسینئر کے اثرات اور ان کی تخلیقات میں پروان چڑھتی ہوئی یکسانیت کا جائزہ لیتے ہوئے امجد طفیل رقم طراز ہیں:

> ’’اپنے اپنے شعری اور تخلیقی تجربات کو انفرادی رنگ میں بیان کرنے کے باوجود ان لکھنے والوں میں طرزِ احساس کی یکتائی موجود ہے۔ ان کے موضوعات ایک دوسرے سے لگا کھاتے ہیں۔ ایک عہد میں ایک معاشرے میں زندگی گزارتے ہوئے اور ایک جیسی صورت حال میں رہتے ہوئے طرز احساس کی یکتائی فطری اور لازمی بات ہے لیکن ان لکھنے والوں نے اپنے انفرادی تخلیقی جوہرکو کسی مشترکہ مقصد یا طریقہ کار کے سامنے سرنگوں نہیں کیا بلکہ اپنے انفرادی اظہار سے خود کو اس یکسانیت سے بچایا ہے جس کی بدولت کچھ لکھنے والے ایک دوسرے سے مربوط تو نظر آتے ہیں لیکن آگے چل کر احساس ہوتا ہے جیسے انھوں نے اپنے تخلیقی جوہر کو ایک دوسرے میں ضم کر دیا ہے۔‘‘(۳)

گذشتہ پچاس سال سے نظم نگاروں نے متنوع سماجی مسائل کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا،اس عرصے میں جن شعرا نے جدید اردو کا منظر نامہ تشکیل دیا ان کے یہاں موضوع اور ہیئت کی سطح پر متعدد اشتراکات موجود ہیں۔انیس ناگی ستر کی دہائی کے قریب شعری افق پر نمودار ہونے والے نظم نگاروں میں سرفہرست نظر آتے ہیں۔ابتدا میں انھوں نے بھی اپنے معاصر نوجوان شعرا کی طرح افتخار جالب کے شعری اسلوب کی پیروی کی لیکن بعد میں انھوں نے مشکل لفظیات ترک کر کے اپنا الگ اسلوب وضع کر لیا۔انیس ناگی اپنے عہد کے انسان کو درپیش مسائل اور چیلنجز کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا،ان کی نظموں میں ابہام کی کیفیت ملتی ہے جو کہیں تخلیقی نوعیت کی ہے اور کہیں بے معنویت معلوم ہوتی ہے۔ انیس ناگی نے زیادہ شاعری آزاد ہیئت میں کی ہے لیکن ان کی نثری نظمیں کافی تعداد میں موجود ہیں۔ انھوں نے نئی نظم کی نظریہ سازی کی اور بہت سی غیر ملکی نظموں کے تراجم کر کے نظم کو نئے شعری مزاج سے روشناس کرایا۔ انیس ناگی کی نظمیں ان کی اپنی سرگزشت اور عہد نو کا نوحہ ہیں،ان کی شاعری علامت پسندی اور بیان محض کی صورت میں تشکیل پاتی ہے۔ان کی شاعری اپنے عہد کی تہذیب ،مسائل و معاملات کا احاطہ کرتی ہے۔احتشام علی ،انیس ناگی کی شاعری سے متعلق لکھتے ہیں:

''انیس ناگی کی نظموں کا کلیات"بیگانگی کی نظمیں" اس لیے خصوصی مطالعے کا متقاضی ہے کہ ان کا شعری سفر ارتقائی مراحل طے کرنے کے ساتھ ساتھ مخصوص حسیت کے جملہ عناصر کو بھی اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے جسے ہم اپنے عصر کی ہیجان خیزی کے نتیجے میں جنم لینے والی اجتماعی آشوب اور داخلی خلفشار سے موسوم کرتے ہیں۔''(۴)

انیس ناگی کی نظموں میں وجودی کرب ،داخلی خلفشاری ،احساسِ عدم تحفظ اور زندگی کی لایعنیت سے پیدا ہونے والا ایک خاص قسم کا احساس ،بیگانگی پایا جاتا ہے۔انفرادی واجتماعی زندگی کی محرومیوں اور پریشانیوں سے ابھرنے والی بے ذائقگی نے انیس کی عورت ذات سے وابستہ رشتوں سے متنفر کر دیا ہے ان کو عورت کی محبت بھی مادیت پرست اور بے رنگ محسوس ہوتی ہے،نظم ''اجڑتی جارہی ہے'' عورت کے مادہ پرست کردار کی عمدہ مثال پیش کرتی ہے:

احساس کی دنیا اجڑتی جا رہی ہے/پھول بھی بے رنگ خوشبو سے تہی/ہر سمت ویرانی/مکاں ٹوٹے اور مکیں بدحال/غصے میں نچڑتی عورتیں/خاوندوں کو گالیاں بکتی گھریلو عورتیں/جو ہمیشہ مال وزر کی منتظر ہیں/اسی طرح کی ابتری میں(۵)

اس ہیجان انگیز کیفیت نے آج کے انسان کو اعصابی مریض بنا دیا ہے ،ا س کی ضرورتیں تو پوری ہو جاتی ہیں لیکن ایک خوف اور اضطراب کی کیفیت نے ایک بے لذتی پید اکر دی ہے۔انھوں نے ابہام کو ایک دائمی عارضہ قرار دیا ہے۔ اس کی مثال نظم'' ایک علالت'' ہے۔انیس جب اپنے ماضی کی طرف دیکھتے ہیں تو ان کا لہجہ تلخ ہوجاتا ہے ان کو ماضی میں چھپے ہوئے خوف، خودرحمی اور زندگی کے افسردہ احساسات ملتے ہیں۔ اس ضمن میں نظم ''سناٹا '' ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔جدید دور میں جو آدمی دنیا کی بھاگ ڈور کو کارِ فضول سمجھتا ہے معاشرہ اسے تنہائی ،نارسائی اور اندرون بینی کا شکار کر دیتا ہے۔اور کہیں یہ نارسائی خوف اور انا کی کی شکست کا درد ابھارتی ہے ایسے میں شاعر خود کو برتر محسوس کر کے اپنی انا کی تسکین کرتا ہے۔

محمد علوی کی عصری صورت حال کی عکاسی کرتی ہوئی اہم نظموں میں ''آخری دن کی تلاش'' ،''آئینے میں''،''کیبرے''،''ہال میں''،''مچھلی کی بو''اور ''مجھے ان جزیروں میں لے جاؤ''شامل ہیں۔ نظم ''ہوا سرد ہے'' میں علوی نے اپنی داخلی تنہائی کو اپنےاندرونی کرب سے ہم آہنگ کر کے بیان کیا ہے:

میں دریچے میں تنہا/کھڑاسوچتا ہوں/رات کے پاس میرے لیے کیاہے/ان جانی خوشیاں ہیں یا/کل کا باسی پرانا/پھپھوندی لگا دردہے(٦)

مجموعی طور پر جو لوگ معاشرتی جبر سے جذباتی شکست کا شکار ہیں انیس نے ان کو موضوع بنایا ہے ،ان کی نظمیں اپنے عہد کے انسان کی بے بسی ،مضمحل اور مجروح انا کی آئینہ دار ہیں۔ انیس عصری پیچیدگیوں مشینی ومادی مصروفیات اور صنعتی دھوئیں سے کوئی راستہ دریافت کرنے کی کوشش میں ہیں اور جدید انسان کی بے حسی کا اعتراف کرتے ہیں۔ انیس ناگی کی نظموں میں علامتی انداز بھی ملتا ہے۔ "بیمار لڑکا"انا،بے بسی ارو بے چارگی کی علامت ہے جو متعدد الجھنوں کا شکار ہے ارو ماضی کا خوف لاشعوری طور پر اس پر چھایا ہوا ہے۔نظم''نوحہ'' میں انا کی بے چارگی شدید صورت اختیار کر لیتی ہے،یہاں زندگی ایک معنی علامت معلوم لگتی ہے۔نوحہ ایک ایسے شخص کی علامت بھی بنتا ہے جو جلا وطنی کی زندگی بھی بسر کررہا ہے ،ا س کے عزائم مفلوج ہو چکے ہیں ۔

انیس ناگی کی یہ بے بسی بدن کو زمین پر مصیبت کی علامت بنا دیتی ہے۔ صدی،سال،مہینے ایسی علامتیں ہیں جوماضی کی کڑیوں سے ملا دیتی ہیں اور بدن یہاں ایک مستقل المیہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔شہریار نے انسان کی بے بسی ،تنہائی اور بے اختیاری کو بھی شعری پیکر دیا ہے،اس بے بسی سے انسان اذیت کا شکار ہوجاتا ہے یہ بے بسی انسان کو مجسم بناتی ہے،نظم ''بے بسی''ملاحظہ کیجیے:

جسم کے قہر کی فریادی ہے روح تنہائی /پھر بھی آنکھوں میں مری دور تلک/نیند کی پرچھائیں نہیں/ اور افق دھند کا زندانی ہے/ اور سناٹوں کی سرگوشیاں۔تلواریں لیے/صف بہ صف بڑھتی چلی آتی ہیں دل کی جانب(۷)

وحید اختر کی ذات اور تنہائی باہم مدغم دکھائی دیتی ہیں، اس نوع کی نظموں میں ''راکھ کا گھر''اہم ہے۔ اس نظم میں تنہائی کی منظر کشی دیکھیے:

تنہائی کے صحرا میں کل آگ لگی ایسے/نیندوں کے دریاؤں تک شعلوں کی زباں پہنچی/پھوٹی ہے تو لاوے کی حدت نے جلا ڈالا ہر چیز بھسم کر دی/کون آگ بجھا سکتا ہے/تنہائی کے صحرا سے ہر شخص گریزاں تھا(۸)

بشر نواز نےاپنی نظموں میں اپنے عہد کی بے رنگینیوں اور نفرتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ انھوں نے آزاد اور معرادونوں ہیئتوں کا استعمال کیا ہے،ان کی نظموں میں تنہائی کا ذکر بھی ملتا ہے اس حوالے سے ان کی نظمیں ''تنہا رات سمندر''اور''کوئی تنہائی سی تنہائی ہے'' زیادہ اہم ہیں۔ انھوں نے اپنی نارسائیوں ،محرومیوں اور تنہائیوں کا تجربہ اپنی نظموں میں بیان کیا ہے۔ ان کی تنہائی اور نارسائی کے موضوع پر لکھی گئی نظمیں رومانوی طرز احساس کی حامل ہیں۔انھوں نے تنہائی کے لمحوں میں اپنی یادوں کی شمع جلائی ہے۔ ان کی شاعری میں شام،چراغ اور تاریکی کے الفاظ بطور استعارہ استعمال ہوئے ہیں۔مثال کے لیے نظم''کوئی تنہائی سی تنہائی ہے''ملاحظہ کیجیے:

رات تاریک ہے ، خاموشی ہے تنہائی ہے
آج یادوں کی بھی شمعیں نہیں روشن دل میں
شورِ ماتم ہے نہ اب سازِ طرب کی جھنکار
اتنی ویرانی نہ تھی آج تک اس محفل میں
جانے پہچانے سے کچھ چہرے تو مل جاتے تھے
دوگھڑی ہی کو سہی پھول تو کھِل جاتے تھے
(۹)

انیس ناگی کے یہاں عصری زندگی سے متعلق علامتیں بھی ملتی ہیں جدید دور کا انسان بہت مصروف ہو گیا ہے اور اس عصری بھول بھلیوں میں گم انسان کی ذات ناگی کے یہاں ملتی ہے۔رجائی علامت کی ایک مثال پیش کیا جاتی ہے:

زمین پہ اس کا سہاگ دن ہے/قدم قدم پر جو تیرگی تھی/ہوائیں اڑاتی صدا کی مانند جل رہی ہیں/پرانے کاغذ کے راز سارے سلگ سلگ کر بکھر گئے ہیں/سدا سہاگن زمین کا چہرہ/عجیب رنگت سے تمتمانے لگا شاید /برے دنوں کی پرانی باتوں میں جو مزہ تھا/وہ زبان سے باہر زبان کے نیچے لٹک رہا ہے(۱۰)

انیس ناگی کی شاعری کا موضوع مارشل لا کا تشدد ،شخصی آزادی اور داخلی زندگی ہیں،ان کی نظم ''بجھا رت''میں خدا کی ہستی کی موجودگی اور نادیدہ تصور کا بیان ملتا ہے۔انیس کی نظموں میں تصور دعا کے نمونے ملتے ہیں ،شاعر جب شہر کی زندگی سے بیزاری محسوس کرتا ہے تو اللہ کی پناہ مانگتا ہے اور اپنے رب کو پکارتا ہے۔انیس ناگی نے اپنی نظموں میں خدا کو پکارا ہے:

خدا صبح آنے کو ہے/ضعف سے آج آزاد کر/آمروں کا ارادہ/ فتوحات کا شوق مجھ کو عطا کر /میں نے سہا ہے /بہت کچھ سہا ہے(۱۱)

انیس کو اپنے وطن اور شہروں سے بے حد محبت ہے وہ اس کے درودیوار کی سالہاسال کی کہانی سناتے ہیں ،انھیں خاص طور پر لاہور سے محبت تھی ٦ستمبر ۱۹٦۵ء کو جب دشمن نے شہر لاہور کو میلی آنکھ سے دیکھا تو وہ اپنے وطن کی حفاظت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور دشمن کو للکارتے ہوئے خدا سے اس کی سلامتی کے لیے دعا گو ہوئے، زندگی سے متعلق متعدد معاملات میں انیس کی نظموں میں دعائیہ انداز نمایاں ہے،وہ لاہور کی سلامتی کے لیے یوں دعا گو ہیں:

سلامت رہے شہر لاہور/اور سلامت رہیں اس کے درودیوار /اور سلامت رہیں اس کے باسی جنھیں دھول سونا ہوا پھول ہے(۱۲)

شہر یار کی نظموں میں بھی دعائیہ عنصر نمایاں ہے وہ بڑے لطیف اور دھیمے لہجے میں دعا کا تصور بیان کرتے ہیں۔وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے حالات کی بہتری کے لیے پر امید ہیں،نظم ''پیشانی کا کرب''اس ضمن میں بڑی اہم ہے۔شہر یار دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں اور سکون سے زندگی بسر کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ خدا سے فریاد اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ انھیں سکون دے۔شاعر کا خیال ہے کہ اگر اچھی چیزیں ختم ہو جائیں تو شاید بری چیزیں بھی ختم ہو جائیں۔محمد علوی کی نظموں میں عصری مسائل انسلاک کا عمل نئے تناظر میں دکھائی دیتا ہے۔ ان کے یہاں مختصر نظم نگاری کا غالب رجحان پایا جاتا ہے اور سماجی مسائل کو پیش کرتے ہوئے انھوں نے روزمرہ کے الفاظ کا استعمال زیادہ کیا ہے۔ محمد علوی کی خارجی وداخلی ساخت ،نئے اسلوب اور الفاظ کا چناؤ ان کی نظموں کا انفراد ہے۔ علوی کی متعدد نظموں میں شہر کو استعارے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے،ان کی نظموں میں دوردور تک پھیلے ہوئے بڑے شہر ویرانے میں منقلب ہو جاتے ہیں۔انھوں نے شہری زندگی کو اجتماعی دوڑ کہا ہے اور اس اجتماعیت میں فرد کی انا مجروح ہو جاتی ہے۔ایک آدمی دوسرے کو کچل کر کامیابی حاصل کرتا ہے،انھی بڑے شہروں کی عکاسی کرتی ہوئی نظم ''شکاگو'' ملاحظہ ہو:

آدھی رات کو /ایک سوتیسری منزل سے/ شہر کو دیکھو تو وہ لگتا ہے /دور دور تک روشنیوں کا جال بچھا ہے /اونچی اونچی عمارتیں/دوڑتی کاریں(۱۳)

ڈاکٹر ستیہ پال آنند عصری حسیت کو داخلی کرب سے آمیز کر کے اپنی نظموں میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے مختلف مذاہب،ہندومت ،بدھ مت اور جین مت کو بغیر کسی تقلیبی عمل سے گزارے اپنی نظموں میں پیش کیا ہے ،ان کی متعدد نظموں میں مشرقی اور مغربی فلسفے کا بیانیہ بھی شامل ہے۔ان کی شاعری میں عالمی صارفی طاقتوں کے نقوش ملتے ہیں۔عصری حسیت کی اہم نظموں میں''نیویارک کا آسمان''،اندھوں کی نگری،بھولا بسرا دیس انگلستان،کراسنگ اور میری کھڑکی اور''ختم ہونا شام کا'' شامل ہیں۔ستیہ پال نے وسائل پر اجارے کے لیے نوآبادیاتی نظام کے نقاذ کا ذکر کیا ہے۔انھوں نے انگلستان کو کباڑی کو دکان کہا ہے،آنند کینوآبادیاتی تناظر کی نظم دیکھیے:

یہ ولایت وہ نہیں ہے/جس پہ سورج آج تک ڈوبا نہیں تھا/اب تو اک تاریک تہہ خانہ ہے،جس میں/ٹوٹی پھوٹی کرسیاں،صوفے پڑے ہیں(۱۴)

شہریار نے عہد اور سماج کی تلخ حقیقتوں کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے،انھوں نے انفرادی واجتماعی ،داخلی وخارجی سیاسی وسماجی مسائل ،احساسات اور ذہنی وجذباتی الجھنوں کو موضوع بنایا ہے۔ ان کی نظمیں اپنے عہد کی جیتی جاگتی سچائی سے سروکار رکھتی ہیں۔ ان کی شاعری ان کے عہد کا اظہار کہی جا سکتی ہے کیوں کہ اس میں اس عہد کی صدقتیں موجود ہیں۔ اس ضمن میں شہر زار کی نظم''سہارا'' اہم ہے۔شہر یار نے عصری شعور کے وسیلے سے اپنا شعری سفر نبھایا ہے انھوں نے انسان کے خارجی اور داخلی مسائل

کو یکسانیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں بکھرے ہوئے سماج، اقدار کی شکست وریخت اور اخلاقی زوال وانحطاط سے دوچار معاشرے کی خوب صورت عکاسی کی ہے۔ انھوں نے شہری زندگی کے کرب ،تنہائی ،اداسی اور بیچارگی کی کیفیت کو بھی موضوع بنایا ہے۔شہریار کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے زندگی کے دکھ درد ،سیاسی ،سماجی اور معاشی مسائل کی ترجمانی روایتی انداز میں نہیں کی ،ان کی شاعری موضوعاتی اعتبار سے ہمہ جہت کہی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر ستیہ پال آنند کی شاعری داخلی وجود اور عرفان وآگہی سے رشتہ قائم کرتی ہے،انھوں نے لاشعوری اسرار منکشف کر کے خارجی زندگی کی پیچیدگیوں ،تضادوں اور امیدوبیم کی کشمکش کو بیان کیا ہے۔ آنند صاحب کو انگریز ی کے پروفیسر کے طور پر امریکہ میں تدریس کا موقع ملا اس لیے ان کی نظر عالمی ادب کے محرکات اور امکانات پر بھی رہی ،انھوں نے بیانیہ ،خطابیہ ،علامت اور استعارہ کو انتہائی کامیابی سے برتا ہے۔انھوں نے سماجی، جمالیاتی اور تہذیبی اقدار شعری عمل کا حصہ بنایا ہے،اس بارے میں ڈاکٹر شکیل الرحمٰن رقم طراز ہیں:

> ’’ستیہ پال آنند جدید اردو نظم میں جمالیاتی رومانی حسیت کے ایک ممتاز شاعر ہیں ۔ان کی نظموں کا مطالعہ کرتے ہوئے شدت سے محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اس رومانیت مفہوم میں بڑی وسعت اور گہرائی پیدا کی ہے جو کہ جمالیات کی سب سے تابناک جہت ہے ۔یہ رومانیت تجربوں کی وسعت اور تہہ داری کا جمالیاتی احساس بخشے ہوئے جمالیاتی انبساط عطا کرتی ہے۔ ‘‘(۱۵)

ستیہ پال آنند کی نظموں میں فلسفہ ،سماجی،نظریاتی، تاریخی،مذہبی کرداروں اور سیاسی معاملات کو کہانیوں میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ آنند جی ہندو ہونے کے باوجود اردو سے محبت کرتے ہیں ،وہ اردو ،پنجابی،ہندی اور انگریزی میں لکھتے ہیں۔ انھوں نے متعدد نظمیں قرآنی آیات پر لکھی ہیں۔ انھوں نے مسلم ثقافت اور مذہب کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ ڈاکٹر ستیہ پال آنند نے اپنی مرحومہ بیوی کی یاد میں ’’سنو اینجل‘‘ کے نام سے نظم لکھی ،ان کی نظم"گم سم " بھی اہمیت کی حامل ہے۔ستیہ پال آنند کی نظموں میں ہندوستان کے مشترکہ ثقافتی ورثے کی بازیافت کی گئی ہے ،یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی نظموں نے اپنی نظموں میں اردو ،پنجابی ،ہندی اور انگریزی الفاظ استعمال کیے ہیں۔آنند نے اپنی نظموں میں آدم وحوا کی حکم عدولی کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے چرب زبان شیطان کے بہکاوے میں آکر کی تھی ۔انھوں نے یہ بتانے کی سعی کی ہے کہ شیطان انسان کو ورغلا سکتا ہے اور وہ اللہ کی ہدایت سے بھٹک بھی سکتا ہے رومائے قدیم کے ادب سیب کو عورت کے جسم میں بلوغت کے آثار نمودار ہونے سے مماثلت دی جاتی تھی ۔اس لیے ستیہ پال نے ’’سیب‘‘ کی علامت استعمال کی ہے،نظم’’کہا یہ سیب نے۔۔۔‘‘ملاحظہ ہو:

یہ مانا جسم کی بےپردگی کا پہلا سبق /ملا تھا حوا کو اس چرب زباں شیطان سے/جسے یقیں تھا کہ آدم کی صنفِ نازک کو/وہ اپنے کذبِ زباں ،چکنی چپڑی باتوں سے /بغیر حیل کے حجت کے ،ورغلا لے گا/یہ مانا حوا ابھی کچھ نیم رضامند ہی تھی(۱٦)

''واپسی'' اور''کینچلی'' بھی اسی نوع کی نظمیں ہیں،ستیہ پال آنند کی نظموں میں مستعمل ہیئتیں اور موضوعات متعدد صورتوں میں معاصر نظم نگاروں سے اشتراکات کے حامل ہیں۔ شہریار کی شاعری کا تجزیہ کریں تو نیند،خواب اور تنہائی کے یہی علائم ورڈزورتھ ،کولرج،کیٹس،بائرن اور شیلے وغیرہ کے یہاں بھی نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری پر انگریزی رومانوی شعرا کی فکری چھاپ لگی ہے،اس کے باوجود ان کی نظموں کا لہجہ نئے طرز احساس اور طرز فکر کا حامل ہے۔ ''لازوال''،''سکوت''،''سائے کی موت''،''فریب درفریب''اور''ایک منظر''اسی طرز احساس اور فکر کی آئینہ دار ہیں۔ اس کی مثال شہریار کی نظم''خواب'' ملاحظہ کیجیے:

خواب/نغمگی آرزو کی بکھری جاتی ہے /رات شرما رہی ہے اپنے سے/ہونٹ امید کے پھڑکتے ہیں/پاؤں حسرت کے لڑکھڑاتے ہیں/دور پلکوں سے رستوں کے قریب/نیند دامن سمیٹے بیٹھی ہے/خواب تعبیر کے شکستہ دل/آج پھر جوڑنے کو آئے ہیں(۱۷)

خواب کا عنصر شہریار کی شاعری کا بنیادی محرک اور استعارہ ہے،ان کی شاعری میں جدید دور کا حساس نوجوان ایک بھٹکے ہوئے مسافر کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ خواب اس نوجوان کی کمزوری اور طاقت کی علامت ہے۔ شہریار نے صدیوں کے دیکھے ہوئے خوابوں کی شکست کا ذکر کرتے ہوئے اپنی یادوں اور آرزوؤں کے قافلے سکوت کے سمندر میں غرق کر دیے ہیں۔ان کی نظموں میں عہد جدید کے انسان کا درد بھی ہے اور خواب بھی،ان کی شاعری میں پائی جانے والی غنائیت معاصر شعرا کی طرح شیلے اور انگریزی رومانوی شعرا سے مماثلت رکھتی ہے۔ اس کی اعلا مثال نظم''اجل کی نغمگی'' ہے۔شہریار کی نظموں میں جدت ،تازگی اور انفرادیت آمیز ہےاور انھوں نے روایت کی کڑی کو جدت بخوبی ملا دیا ہے۔ان کی شاعری انسانی تجربے اورمشاہدے کی عکاس ہے۔شہریار کی ابتدائی نظمیں نفسیاتی محرککی حامل ہیں۔''وقت''،''سائے''،''آرزو''،''پرچھائی''اور''خودفریبی''کے عنوان سے لکھی ہوئی نظموں میں انسانی نفسیات کے اشارے ملتے ہیں۔شہر یار نے عصری زندگی کے سنجیدہ مسائل کو اپنی نظمیہ شاعری کا فکری محور بنایا،انھوں نے معاصر صورت حال کا بڑے تیقن اور باریک بینی سے مشاہدہ کیا اور گردوپیش کی زندگی کے مسائل کو موضوع بنایا ۔ انھوں نے حیات وکائنات کے ذاتی وانفرادی مسائل کو بھی موضوع بنایا۔ شہریار نے معاصر شعری روایت کی آبیاری میں اہم کردار ادا کیا۔ان کی اہم نظموں میں ''نیا امرت''،ہوا،اپنی یاد میں،بارش،پھر سفر بے سمت بے منزل ہوا،نیا دن نیا عذاب،پچھتاوا، تنبیہ،دانۂ گندم سے دوری ،باقی ماندہ خواب،اپنے سے دوری،باقی آدھی داستان،''کمرے میں مقید روشنی''اور''دھندلکا '' شامل ہیں۔

وحید اختر کی نظموں اور مرثیوں میں ایک خاص جوش اور جذبہ ابھرتا ہے۔ انھوں نے اپنے عہد کے پرآشوب معاشرے اور جبروتشدد کی عکاسی کی ہے۔ انھوں نے ترقی پسند موضوعات کو تو شاعری کا حصہ بنایا ہے لیکن ایک خاص تحریک کے تحت فارمولے بند ادب تخلیق کرنے سے گریز کیا۔ انھوں نے عوام کے مسائل کو سمجھنے کی ہمدردانہ کوشش کی ،ان پر کسی ایک نظریے اور تحریک کی چھاپ دکھائی نہیں دیتی اس لیے ان کی نظمیں بے باک اور غیر جانبدار رویہ کی حامل ہیں۔ان کی نظم ''پتھروں کا مغنی'' ملاحظہ کیجیے:

مطرب وخوش نوا زندگی کے حسین گیت گاتا رہا/اس کی آواز پر انجمن جھوم اٹھی /اس نے جب زخم دل کو زبان بخش دی/سننے والوں کے بے ساختہ آہ کی/ عشق کے ساز پر جب ہوا خیمہ زن/شور تحسین میں خود اس کی آواز دب سی گئی(۱۸)

یہ نظم وحید اختر کی سیاسی وسماجی بصیرت کی نمایاں مثال ہے۔ انھوں نے اس نظم میں روح عصر کی سچی عکاسی کی ہے، انھوں نے پتھروں کی علامت میں آج کے انسان کی بے حسی کا نوحہ گنگنایا ہے۔ آج کا انسان پتھر دل ہو گیا ہے اس کے اندر جذبات واحساسات نہیں رہے ،وہ سفاک ،ظالم اور مادہ پرست ہو گیا ہے۔ اسے کسی سے ہمدردی نہیں رہی۔ ان کے یہاں رومانی طرز احساس بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کی شاعری میں خواب اور شکست خواب کا ذکر بھی بہت ملتا ہے۔ ان کے یہاں بھی یادیں حاوی ہیں اس ضمن میں نظم''عدم سے عدم تک'' کا ذکر ضروری ہے۔شہریار کی ایک نظم''ایک سالگرہ'' وحید اختر کی متعدد نظموں سے مماثلت رکھتی ہے ۔انھوں نے بچپن ،لڑکپن اور جوانی کے واقعات اور جہات کو شعری پیکر میں ڈھالا ہے۔وحید اختر کی نظموں میں ماضی ،تنہائی اور فلسفے کے آثار تلاش کیے جا سکتے ہیں۔

ندا فاضلی کی نظموں میں محرومیوں ،اداسیوں ،ناگواریوں اور مسرتوں کی عکاسی کے ساتھ ساتھ سماجی اور اقتصادی مسائل کا ذکر بھی ملتا ہے۔ انھوں نے زندگی کی سطح پر ابھرنے والے متعدد موضوعات کو بڑی فنی چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ وہ شہر میں رہتے ہوئے گاؤں کے باسی معلوم ہوتے ہیں۔اس کی مثال ان کے کلیات کا نام''شہر میں گاؤں''ہے۔ان کی فکر درون ذات سے بیرون ذات کی طرف سفر کرتی ہے۔ انھوں نے گلزار کی طرح ہندی الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ انھوں نے اپنی نظم''ماں'' میں ایک ہندوستانی عورت کو پیش کیا ہے۔اس نظم میں جذباتیت کا وفور ہے اور اس میں ہندوستان کی تہذیب وثقافت کی بھر پور عکاسی کی گئی ہے۔ ندافاضلی نے گاؤں کی سیدھی سادی ز ندگی ،سلگتے چولہے،چمکتے برتن،تیز بھوک،بچپن،سوندھی روٹی،کٹھی میٹھی چٹنی اور ماں کی مامتا کو بیان کیا ہے۔ندا کی نظم''دوکھڑکیاں'' میں لڑکے لڑکیاں،ماں باپ اور خاندانی رکاوٹوں کو کھڑکیوں ،بوڑھے دروازوں ،جلتی سگریٹ کی علامت میں پیش کیا ہے۔ندا کی اکثر نظمیں سردی،گرمی،پانی،صبح،دوپہر،شام اور رات جیسی تاثراتی کیفیات کو بیان کرتی ہے۔

ندافاضلی کے یہاں شاعرانہ درد پوری شدت کے ساتھ موجود ہے ،ترک محبت،ٹوٹے ہوئے رشتوں کا غم،گاؤں کی خوشگوار یادیں اور کھویا ہوا سا کچھ کا احساس پایا جاتا ہے۔ لیکن ان کی نظموں میں ناستلجیائی کیفیت نہیں ملتی۔ندا فاضلی کے یہاں بعض سیاسی ،سماجی اور اخلاقی موضوعات پر بڑی دل چسپ نظمیں ملتی ہیں۔ ''چھوٹا آدمی'' اس نوع کی اہم نظم ہے۔ چھوٹا آدمی سیاسی شطرج کا مہرہ ،مذاہب کا شکار،تاریخ کا ستایا ہوا،کچلا ہوا اور غموں کے انبار بے پایاں میں دبا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ان کی نظم''ایک قومی رہنما کے نام''فیض کی ''سیاسی لیڈر کے نام'' کی طرح کی ہے۔،ندا کی نظم''چھوٹا آدمی''ملاحظہ کیجیے:

تمھارے لیے سب دعا گو ہیں/تم جو نہ ہو گے تو کچھ بھی نہ ہوگا/اسی طرح مرمر کے جیتے رہو تو/تمھیں ہر جگہ ہو تمھیں مسلہ ہو/تمھیں حوصلہ ہو/ سبھی آسمانی کتابوں نے تم پر /تمھارے عذابوں کو / آساں کیا ہے(۱۹)

ندا فاضلی کو اپنا عہد ،عہد غلامی سے بھی بدتر لگتا ہے کیوں کہ ہر طرف فسادات اور خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے ۔انسان حیوانات کا روپ دھار لیتا ہے۔ندا نے اپنی نظموں میں قومی یکجہتی پر زور دیا ہے۔انھوں نے فرقہ پرستی اور فسادات کے خلاف متعدد نظمیں لکھی ہیں انھوں نے مذہب کے نام پر روا رکھی جانے والی خون ریزی کی مذمت کی ہے،ندا فاضلی کی نظمیں سیاسی رہنماؤں پر طنز کاری کرتی ہیں۔نظم''ایک قومی رہنما کے نام''دیکھیے:

کرفیوزدہ راہیں/سلگتے کھیل کے میدان/روتی چیختی مائیں/مجھے معلوم ہے/چاروں طرف / جویہ تباہی ہے/حکومت میں/سیاست کے تماشوں کی گواہی سے/تمھیں/ ہندو کی چاہت ہے /نہ مسلم سے عداوت ہے/تمھارا دھرم/ صدیوں سے تجارت تھا/ تجارت ہے(۲۰)

ندا فاضلی کی نظموں میں رومانوی احساس بدرجہ اتم موجود ہے انھوں نے محبت کی یاد کو دھندلا کرنے والے عناصر کو سخت ناپسند کیا ہے نظم''پگھلتا دھواں''شخصی آفاقیت میں گم ہے ۔گھر،خدااورشہر،ندا کی شعری رامائن کے تین کردار ہیںاور ابتدائی شاعری میں قصباتی معصومیت ملتی ہے جو بڑے بڑے شہروں کے تجارتی تعلقات سے تصادم ہوکر ریاکاری میں بدل جاتی ہے۔انھیں کھوئے ہوئے اور بچھڑے ہوئے لوگ یاد آتے ہیں۔وہ شہر میں جا کر اپنے گاؤں کو بہت یاد کرتے ہیں۔ان کی نظمیں کھیت کھلیانوں میں گنگناتی پھرتی ہیں۔ ان کے رومانی طرز احساس کی نظمیں محبت میں جدائی کی تمام کیفیتوں کا احاطہ کرتی ہیں۔ اس کی ایک مثال ''پھر یوں ہوا''اور''ایک کہانی''ہے۔بشر نواز کی رومانوی طرز احساس سے مملو نظم'' ایک خواہش''ملاحظہ ہو:

اب کی بار ملو جب مجھ سے/پہلی اور بس آخری بار/ہنس کر ملنا/پیار بھری نظروں سے تکنا/ایسے ملنا/جیسے ازل سے/میرے لیے سرگرداںتھے/ بحر تھا میں ،تم موجِ رواں تھے/جیسے تم مجھ پہ فدا ہو/جیسے مجسم مہرووفا ہو/جیسے بت ہو تم نہ خدا ہو(۲۱)

ندا فاضلی نےاپنی نظموں میں انسان دوستی، انسانی ہمدردی،محبت اور یگانگت کا پیغام دیا ہے۔ان کے یہاں ترقی پسندوں کی طرح جگالی نظر نہیں آتی اور نہ ہی جدیدیوں کی بیانیہ ژولیدگی ملتی ہے۔ کبیرداس،تلسی داس اور سوداس تینوں سے ندا فاضلی اتفاقاً متاثر لگتے ہیں۔اکبر الہٰ آبادی کے سماجی تفکرات کا اثر بھی ندا پر پڑا ہے۔ ند ا کا احتجاج کار آمد وسائل مہیا کرتا ہے۔ ان کے احتجاج میں بموں ،توپوں،اور قتل وغارت کا ذکر کم ملتا ہے۔ان کا احتجاج خوش سلیقگی سے کام کرتا ہے۔ انھوں نے نہ زیادہ تلخ اور نہ زیادہ شیریں احتجاج کیا ہے۔ نہ ہی زیادہ گھن گرج اور نہ زیادہ سرگوشی کی ہے۔ انھوں نے ایک متوازن اور معتدل احتجاجی رویہ روا رکھا ہے۔ ان کے احتجاج میں شاد عارفی جیسا پھکڑپن نہیں اور نہ ہی حبیب جالب جیسا اکہرپن دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے شعری چاشنی اور تہذیب کو ملحوظ رکھتے ہوئے نظم نگاری کی ہے اسی لیے وہ معاصرین میں ممتاز اسلوب رکھتے ہیں۔ ندا فاضلی نے اپنی نظموں میں جذبات اور منطق کو ایک خاص ڈھب سے آمیز کیا ہے۔ ان کی نظمیں اپنے جذبۂ وفور کی وجہ سے اپنے موضوع سے نہیں ہٹتیں اور ایک خاص تسلسل اور روانی لیے ہیں۔ ندا کی نظموں میں مسجد ،مندر،ایک ملاقات،پہلا پانی،مشورہ،موڈس،پھر یوں ہوا،شام،بجلی کا کھمبا،قاتل،بس کا سفر، پگھلتا سورج، نئی کھڑکیاں،بینچ اور گوک،کبھی کبھی ،بوجھ ،پنجرے کا پنچھی،سنا ہے میں نے،پگھلتا دھواں،تم سے ،ایک خبراور آدمی نہیں کہتے اہم ہیں۔یہ سب نظمیں آزاد ہیئت میں ہیں۔ندا فاضلی نے موسموں اور دن کے پہروں مثلاً سردی ،گرمی،صبح دوپہر یا شام یا نیا دن یاچھوٹے شہر کی رات کی تاریک کیفیات کو بیان کیا ہے۔خوب صورت اسلوب کی حامل نظم ''شام''دیکھیے:

سوکھے ہوئے کپڑوں کو چھت سے چنتی ہوئی
پیلی کرنوں کا ہاتھ بنتی ہوئی
گیلے بالوں میں تولیہ لپٹائے
ہاتھ میں اک کٹی پتنگ اٹھائے
(۲۲)

ندا فاضلی نے شام کو مناظر فطرت کے طو ر پر استعمال کیا ہے ،انھوں نے شہر کی شام،گاؤں کی شام اور وادئ کہسار کی شام کو موضوع بنایا ہے۔ ندا فاضلی کے یہاں فطرت اور تمدن کی آمیزش ہے ۔بشرنواز کی نظموں میں مناظر فطرت کی عکاسی بڑی عمدگی سے کی گئی ہے اس کی ایک مثال نظم ''منظر''ملاحظہ ہو:

ایک پھول/آسمان کی بلندیوں سے اک سنہرا پھول/سرد کالی جھیل میں/موج موج ڈوبتا ابھرتا دور تک پہنچ گیا/سبک کچھ اس قدر سبک/کہ دیر تک ساحلوں نہ موج کو پتا چلا(۲۳)

بشر نواز نے آزاد ہیئت میں قدرتی مناظر کی تصویر کشی کرتے ہوئے فنی مہارت سے کام لیا ہے۔ انھوں نے قدرتی مناظر سے تشبیہ اور استعارے کاکام لیا ہے۔ یہ ان کے تخلیقی وفور کا ثبوت ہے۔ اس نوع کی دیگر اہم نظموں میں ''مناظر تتلیاں ہیں''،''یہیں منظر ٹھہر

جائے،''بیاباں ہیں اور میاں ''،اور'' لہو کی بوند چاند ہے''شامل ہیں۔ بشر نواز کی نظم''پہلی بارش''شعریت اور تخیل سے بھر پور ہے۔بشر نواز نے مناظر فطرت کی عکاسی کرتے ہوئے نظم کے روایتی انداز کو برقرار رکھا ہے ،انھوں نے سماج اور کائنات کے رازوں کو بھی شعری پیکر عطا کیا ہے۔ انھوں نے اپنی ذات کے غم اور راحت بھری لمحوں کا ذکر بھی کیا ہے۔انھوں نے اپنی داخلی اور خارجی کیفیات کو نظم کا حصہ بنایا ہے۔ گلزار کے یہاں دیہاتی زندگی کی عکاسی پورے حسن وجمال کے ساتھ ملتی ہے، انھوں نے نہایت خوب صورت انداز میں فطری حسن اور فطری زندگی کو اپنی نظمیہ شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ اس نوع کی ایک نظم''ایندھن''ملاحظیہ کیجیے:

چھوٹے تھے ماں اپلے تھاپا کرتی تھی/ہم اپلوں پر شکلیں گوندھا کرتے تھے/آنکھ لگا کر کان بنا کر/ناک سجا کر/پگڑی بالا ،ٹوپی والا/وہ پنڈت تھا(۲۴)

ن م راشد سے لے کر جدید اردو نظم نگاروں نے دیہاتی مناظر و تہذیب کی عکاسی کی ہے۔گلزار کی جدید حسیت ان کے فطرت سے لگاؤ کو ظاہر کرتی ہے۔ان کی شاعری مجید امجد کے قریب تر دکھائی دیتی ہے۔ کیوں کہ گلزار سے پہلے اتنی سادہ اور پرتاثیر نظمیہ شاعری مجید امجد کے یہاں موجود ہے۔گلزار کی نظمیں ان کے انتہائی حساس مشاہدے کا نتیجہ ہیں۔ان کی تمثیلیں بصری اور سمعی ہیں۔ ان کے یہاں بھی انگریزی رومانوی شعرا کے اثرات ملتے ہیں۔ ان کی شاعری بیک وقت جون ڈن اور ورڈزورتھ کے زیر اثر لگتی ہے۔کیوں کہ گلزار دیہاتی منظر کشی اور تہذیب کی عکاسی اور فطرت پرستی میں رومانوی شعرا کا عکس لیے ہوئے ہیں۔گلزار کی شاعری سے متعلق احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں:

> ''دور حاضر میں اردو زبان کی حد تک گلزار سے زیادہ سراسر اوریجنل شاعر میری نظر سے نہیں گزرا ۔اس شاعر کی لفظیات،اس کی تشبیہات ، اس کے استعارے ،اس کے موضوعات سب اردو کے ماضی اور حال کی شاعری سے اس قدر مختلف ہیں کہ روایت کے تسلسل کی حقیقت پہ شک گزرنے لگتا ہے۔''(۲۵)

گلزار کی شاعری ہندوستان کے انسان کے ماضی کا نوحہ ہے جو دو دھڑوں اور دوسرحدوں میں بٹا ہوا ہے،وہ ابھی تک اپنی جنم بھومی کو نہیں بھلا پایا سرحد کی یہ اونچی باڑ اسے اپنے آبائی علاقے کی یادوں سے جدا نہیں کر سکی۔گلزار کی شاعری میں دیہات کا فطری حسن منعکس ہے اور اسی عنصر نے ان کے رومانوی طرز فکر کو جلا بخشی ہے۔ان کی نظمیہ شاعری کے متعدد موضوعات انگریزی رومانوی شعرا سے مماثلت رکھتے ہیں،انھوں نے ''آنسو'' کے نام سے تین نظمیں ''بادل''، کے عنوان سے دو نظمیں"کائنات" کے عنوان سے چار نظمیں اور ''خدا'' کے عنوان سے تین نظمیں لکھی ہیں۔ اسی طرح ٹینی سن کی نظم ''God and Universe'' ہے اس میں نظام کائنات کا ذکر ہے۔ گلزار نے بھی اپنی نظمیں نظام

کائنات سے ترتیب دی ہیں۔ گلزار کی اس نوع کی اہم نظموں میں ''کہسار''،''رات''،''پربت''،''یہ سات رنگی دھنک''اور''جنگل'' شامل ہیں۔گلزار کی جدید رومانوی حسیت کی عکاسی کرتی ہوئی نظم''آنسو'' ملاحظہ کیجیے:

سنا ہے مٹی پانی کا ازل سے ایک رشتہ ہے/جڑیں مٹی میں لگتی ہیں/جڑوں میں پانی رہتا ہے/تمھاری آنکھ سے آنسو گرتا تھا کہ دل میں درد بھر آیا/ذرا سے بیج سے کونپل نکل آئی(۲۶)

بشر نواز کی معریٰ نظموں میں ''رائیگاں''،مسیحا،ہمیں چراغ ہمیں پروانے،آدم وآہن،خواب ٹوٹنے پر اور ''المیہ'' زیادہ اہم ہیں۔ان کے شعری مجموعہ''اجنبی سمندر'' کی نظمیں آزا د ہیئت میں خلق ہوئی ہیں۔ ان میں ''اجنبی سمندر''،پتہ نہیں وہ کون تھا،نارسا،وقت کے کٹہرے میں ،کھوئے گیتوں کا نوحہ،یہیں منظر ٹھہر جائے،زینہ زینہ،اعتراف،اور ''وقت زندگی اور میں''زیادہ اہم ہیں۔ ان کی نظم میں ان کی ذات اور کائنات کے موضوع ملتے ہیں ۔بشر نواز نے اپنی ذات کی محرومیوں ،نارسائیوں،خواہشوں اور خوابوں کو بھی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔انھوں نے کچھ خواب دیکھے ہیں جو تعبیر نہیں ہوئے،انھوں نے کچھ ادھوری خواہشیں بھی اپنے دل میں چھپا رکھی ہیں۔

زبیر رضوی ایک حساس شاعر تھے انھوں نے عصری مسائل کو محسوس کیا ،ان کی عصری حسیت کی حامل نظمیں قاری کے دل ودماغ پر گہراارتعاش مرتب کرتی ہیں۔انھوں نے شہر اور اس کے آس پاس پروان چڑھنے والی مادی اقدار کو معاصر عہد کی روح کے ساتھ بیان کیا ہے۔ زبیر اپنی نظموں میں معاصر ہندوستانی حالات کی عکاسی کی ہے۔ اور معاشرےاور فرد کی زندگی میں آنے والی تبدیلیوں کا ذکر کیا ہے۔زبیر نے اپنا بیانیہ نت نئے پیکروں اور تمثالوں سے مزین کیا ہے۔انھوں نے اپنے ارد گرد بکھرے آشوب کی صورت گری کرتے ہوئے استعاروں کا بھر پور استعمال کیا ہے۔ زبیر رضوی کی ایک نظم''دوپہر'' ملاحظہ کیجیے:

بلا کا حبس ہے/سورج گھروں کی چھت پہ رکھا/کھلی ہیں کھڑکیاں/لیکن ہوا/ٹھنڈی ہوا مفقود ہے/کس نے ہوا کے پر کتر ڈالے/زمیں کے جسم پر زخموں کی/گنتی بڑھتی جاتی ہے/زمیں چپ چاپ ہے/اور چیخ کر یہ بھی نہیں کہتی/سنو موسم بدل جانے کا جو مژدہ سنا تھا /جھوٹ تھا(۲۷)

زبیر کی کچھ نظمیں بھی عصری حالات کو نئے انداز میں متشکل کرتی ہیں۔ ان نظموں میں "سیاہ پٹی،تبدیلی،تیسرے شہر کی تلاش،ردِ عمل ،اور،شہر کی صبح،زیادہ اہم ہیں۔شاعر نے مذہبی ،لسانی اور سماجی تفریق کی وجہ سے جنم لینے والی فرقہ واریت کی فضا کو بھی شعری موضوع بنایا ہے اور اسے ہندوستان کے امن ،سکون اور ترقی کے لیے مضمر قرار دیا ہے۔زبیر رضوی نے ہندوستان میں بڑھتی ہوئی فرقہ واریت سے خطرہ محسوس کیا ہے اور اسے سخت ناپسند کیا ہے،وہ کہتے ہیں کہ اسی فرقہ پرستی نے معاشرے کا امن تباہ کیا

ہے،جگہ جگہ قتل وغارت کے بازار سجا دیے ہیں۔انھوں نے معاشرے کو فرقہ اور گروہ بندی سے پاک کرنے کے لیے اپنی شاعری کو ذریعہ بنایا ہے۔انھوں نے پیچیدہ معاصر حالات کو اپنی شاعری میں بیان کیا ہے۔ جس میں مذہبی ،لسانی اور سماجی تفریق ہے،جس نے افراد کی جان لے لی ہے۔زبیر رضوی سماجی رویوں کے شاعر ہیں۔انھیں معاصر اردو نظم میں یکساں اہمیت حاصل ہے۔

گلزار کا رومانوی مزاج انھیں ماضی کی یادوں میں سرگرداں رکھتا ہے،ان کی ابتدائی نظموں میں ماضی کی بازیافت کا پہلو ابھرتا ہے رومانوی طرز احساس کی خوب صورت شاعری گلزار کی نظموں میں بچپن کی معصوم اور خوشگوار یادیں ابھرتی ہیں۔ اس کی مثال نظم ''امیجز'' ہے۔گلزار کی بچپن کی یادوں،خوشیوں اور سانجھے غم اور اس نوع کی دیگر نظموں میں''ٹوبہ ٹیک سنگھ''،لباس،الجھن،کتابیں،شاخیں، گرہیں،دینہ میں ،''چھٹیاں گرمیوں کی''شامل ہیں۔گلزار کی شاعری میں پرندوں،درختوں،آبشاروں، کہساروں،ندیوں، بادل،ہوا، موسم ،چاند،رات،سورج،وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ گلزار کی فطرت پرستی کے بارے میں احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں:

> ''گلزار کے یہاں فطرت کے یہ مظاہر جیتے جاگتے ،سانس لیتے اور انسانوں کی طرح جانداروں کا روپ دھارتے محسوس ہوتے ہیں۔''(۲۸)

گلزار کی متعدد نظموں میں فطرت کا اظہار ۔فطرت کی بوباس نمایاں ہے جو ان کے رومانوی مزاج اور فطرت پرستی کا پتہ دیتی ہے گلزار نے شفق ،چمپئی دھوپ،مینہ،موسم،ہم دم،کہسار،جنگل،پہاڑ کی املی، اخروٹ،کبھی کبھی، جب بھی اترو گے تم پہاڑوں سے،کبھی آنا پہاڑوں پر،شرارت ،پت جھڑ، شام اور ،انتظار ،جیسی نظمیں لکھی ہیں۔گلزار کی نظموں میں سیاسی وسماجی موضوعات کا دائرہ وسیع نظر آتا ہے۔ ان کی سماجی اور عصری شعور کی حامل نظموں میں"کچہریاں،ریپ،ایک منظر،تھرڈورلڈ ،خبر ہے،میرے ہاتھ،اخبار،طوائف،بابا بگلوس،فٹ پاتھ،ڈائری،گالی دی تھی اس نے،ذرا علامہ کو کوئی خبر کر دے،کسے پہناتے ہیں یہ ہار،کہیں جانا نہیں،ٹریفک سگنل،کانچ بھی توڑ دے، بغداد،اور ،سورج کی بیک لائٹ ،زیادہ اہم ہیں۔

آفتاب اقبال شمیم کی ابتدائی نظموں میں ہمزاد کو بنیادی اہمیت حاصل ہے ،موت کا انجام ،ذات کا کرب اور احساس ان کی نظموں میں ڈھل جاتا ہے۔بے بسی ،شکستگی کی تمثالوں سے پر نظموں میں''ایوری باڈی نو باڈی''،سوضرب صفر،جہانوں کا عہد،بے زور آور،کایا کا کرب،نیلی گرد کا زمزم شامل ہیں۔ کہیں کہیں ان نظموں میں نوحے کا رنگ نظر آتا ہے۔آفتاب اقبال شمیم کی نظموں میں وجودی فکر کی نشان دہی ،کڑواہٹ،نمکین ذائقہ،خوف کی چمگادڑیں،فالتو ہونے کا احساس اور کالے پانیوں کا جبر کا تذکرہ جیسے الفاظ سے ہوتی ہے۔آفتاب اقبال کی طویل نظموں میں احساسات کا دھارا ،داخلی شخصیت کی تنہائی سے پھوٹتا

ہے اور اس کرب انگیز کیفیت کو سمجھنے کے لیے وہ وجودیت کی طرف لپکتے ہیں۔آفتاب اقبال شمیم کی نظموں میں زید منافقت اور ریاکاری کی علامت ہے جو اچانک منکشف ہو کر حیات کے سارے راز کھول دیتا ہے۔ آفتاب اقبال شمیم کی نظموں میں انفرادی اور اجتماعی ذات کو دیکھنے کی سعی کی گئی ہے۔ انھوں نے زیادہ تر نظمیں آزاد ہیئت میں لکھی ہیں اور حلقہ ارباب ذوق کے قریب دکھائی دیتے ہیں۔ان کی داخلی اور نفسیاتی کیفیات کا بھرپور اظہار کیا گیا ہے۔ ان کی نظمیں داخلی اور خارجی ہر دو سطح پر جمالیاتی قدروں کو فن پارے کو اکائی کی شکل عطا کرتی ہیں۔

آفتاب اقبال شمیم اپنی نظموں میں زید سے مکالمہ کرتے ہوئے اپنے معاشرے کے آشوب کی عکاسی کرتے ہیں انھوں نے خود اپنے تخلیق کردہ کردار تخلیقی بازیافت کے ذریعے عصری حسیات ٹٹولنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور معاصر فرد کی لخت لخت ہوتی ذات کو نئی معنویت سے ہمکنار کیا ہے۔ان کی نظمیں معاصر عہد میں سانس لیتے فرد کی بے نور آنکھوں کو خواب سونپتی ہیں:

کیا پتا کل کا دیکھا ہوا خواب/سچا نکل آئے ،دنیا بدل جائے/گلیوں محلوں کے/لچے ،لفنگے ،گلا کاٹتے ،جیب کترتے دنوں کو/فلاں اور فلاں شہر(۲۹)

آفتاب اقبال شمیم کے تیسرے شعری مجموعے ''گم سمندر'' کی نظمیں بھی معاصر عہد کے بے جان جسم اور تھکی ہوئی روح میں جینے کی رمق پیدا کرتی ہیں ا س نوع کی اہم نظموں میں ''ایک ہارا ہوا دن''،''آرزو''،''آپان کھانے چلیں''،''والیریا کے ساتھ آدھی شام''،''یک شہرآرززردرو'' اور '' دھوپ ندی کا مانجھی'' شامل ہیں۔ان کی نظم میں حسیت کا عمل تازہ اور تمثیلی نوعیت کا ہے۔نظم''یک شہر زردرو'' اس بارے میں اہم ہیں۔محمد سلیم الرحمٰن نے روایتی غنائی اسلوب ترک کے منفرد اسلوب اور نیا آہنگ اپنایا۔ان کی نظم میں موضوع اور ہیئت کے بجائے تخلیقی تجربے نظر آتے ہیں ۔ ان کی نظموں میں عصری مسائل وآشوب کے بیانیے مختلف تمثالوں اور علامتوں کی صورت میں ملتے ہیں۔ انھوں نے اپنی متعدد نظموں میں نچلے طبقوں کی نمایندگی کی ہے:

ہونٹ کڑوے ہیں ، کھدرے ہیں جا بجا کھارے
کنویں
پپڑیاں پیاسی زمیں پر ، خشک دریا ، زرد
گھاس
ہر نئے نقشے کو منظر کا وہی روکھا جواب
تہ بہ تہ جھلسے ہوئے رنگوں سے درماندہ
حواس

(۳۰)

محمد سلیم الرحمٰن نے اپنی نظموں میں عصری آشوب بیان کیے ہیں ،اس وجہ سے ان کا اسلوب کہیں کہیں کھردرا اور ناہموار سا لگتا ہے۔ ان کی نظموں میں ندرت انتہائی کم دکھائی دیتی ہے۔ شاید انھوں نے ارادتاً ایسا اسلوب اختیار کیا ہے۔ انھوں نے صنعتی اور مشینی زندگی کی عکاسی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس دور میں انسان گوست پوست کے ایک روبوٹ کی شکل اختیار کر گیا ہے۔اس میں جذبات واحساسات اور ذات کا جوہر نظر نہیں آتا ۔محمد سلم الرحمٰن نے مشینی تہذیب کا ذکر کیا ہے انھوں نے سمندر کے گرد پھیلی ہوئی زندگی کا جائزہ پیش کیا ہے۔ انھوں نے انسان کے بجھے اور خالی چہروں کو اپنے عہد کی رائیگانی محسوس کیا ہے۔ انھوں نے صنعتی اور مشینی نظام سے وابستہ لوگوں کا وجود دیوار سے چمٹی ہوئی مکھیاں قرار دیا ہے۔محمد سلیم الرحمٰن کی نظموں کا تخلیقی رچاؤ اور ڈکشن میں ہندی الفاظ کے استعمال سے انفرادیت قائم ہوئی ہے۔ وہ الگ اور منفرد انداز بیان سے اپنی انفرادیت کا احسا س دلاتے ہیں۔محمد سلیم لرحمٰن نے اپنی نظموں میں ان افراد کی زندگیوں کی عکاسی کی ہے جو حصول معاش کے لیے پرائے دیس میں مقیم ہیں۔ انھوں نے دربدر ہونے والے لوگوں کے جذبات واحساسات کو نظم''رات'' میں بیان کیا ہے:

آگ میں جلتے خطوں اور روزناموں میں لکھے/ راکھ ہوتے جا رہے ہیں عمر کے پچھلے پتے/شہرتوں کے برگ وبار/دربدر اڑتی ہوئی خبروں کی پت جھڑ میں یہاں/ جاگتے ہیں بھولنے والوں کی آنکھوں میں کئی/بے نور ، اجڑے وطن(۳۱)

محمدسلیم الرحمٰن کی نظمیں عصری حسیت اور نفسیاتی عوامل کی عکاسی ہیں ،وہ ترقی پسندوں اور حلقہ ارباب ذوق کے نمایندہ شعرا کی طرح مغربی شعرا کے اسلوب اور طرز اظہار سے متاثر لگتے ہیں لیکن انھوں نے اپنے وطن کو بووباس کو اپنی نظموں سے نہیں نکالا۔انھوں نے مناظرفطرت کی عکاسی کی ہے انھوں نے انفرادی اور اجتماعی کرداروں کو بیان کرتے ہوئے تہذیب کا حصار نہیں توڑا۔وہ گھٹن اور تشدد کے نظام کا شکار ہونے والے افراد کی نفسیات سے بخوبی آگاہ ہیں۔ ،محمد سلیم الرحمٰن کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے سہیل احمد خاں رقم طراز ہیں:

> ''۱۹۷۵ء کے بعد کی نظموں میں یادِ رفتگاں بچپن کے بھولے بسرے دنوں ،مناظر اور ذات کے اندر بپا کشاکش کے ساتھ ساتھ انسانی اجتماع کے بعض رجحانات کا محاکمہ بھی ہے۔ ''ایک بگٹٹ شہر کے آگے پیچھے''اور''ظالم بادشاہوں کے لیے نظم''،''ایک بڑے پچھتاوے کے کنارے''جیسی نظموں میں یہ احساس کھل کر سامنے آتا ہے جب کہ بعض دوسری نظموں میں زیریں لہر کی طرح ''ظالم بادشاہ کے لیے نظم'' میں تو شاعر اندرونی ارتعاش سے پھٹتا ہوا لگتا ہے اور غصے کو دبانے والا شاعر گالیاں دنیے سے بھی گریزاں نہیں مگر اس نظم کی اصل خصوصیت بھی یہ غصیلا لہجہ نہیں۔''(۳۲)

محمد سلیم الرحمٰن نئے زمانے میں ماضی کی نفی کرنے والوں کے حق میں نہیں،وہ کہتے ہیں اگر ہمیں ماضی کی یادیں بھول گئی ہیں تو شاید ہماری یاداشت کمزور ہو گئی ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں انسان کی اس نفسیاتی بیماری کا ذکر کیا ہے ،نظم'' قید مکرر'' اس کی اہم مثال ہے۔انھوں نے ظالم حکمران کے ظلم کو بھی اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔انھوں نے ظالم حکمرانوں کی سازشوں اورغاصبانہ رویوں کی چکی پسنے والے عوام کی عکاسی کی ہے۔ انھوں نے عہد حاضر میں درپیش مسائل کا ذکر ''ظالم بادشاہوں کے لیے نظم''میں کیا ہے:

آج زیبِ داستاں ہم/استخواں در استخواں تاریخ کے پہیوں کے نیچے /اور مرفوع القلم تم /کل کو ٹھونکیں اور بھنبھوڑیں گے تمھیں بھی چیل کوے اور کتے(۳۳)

محمد سلیم الرحمٰن اپنی نظموں میں رات کے خیال کو بڑی کثرت سے استعمال کرتے ہیں ،متعدد نظموں میں رات کا ذکر کیا ہے لیکن رات کے عنوان سے نو نظمیں لکھی ہیں۔وہ رات کو خیال کا رزق اور آئینہ صاحب نظراں قرار دیتے ہیں۔قرآن مجید میں بھی رات کا ذکر کئی مقامات پر آیا ہے۔ رات کا ذکر اسی لیے شاید ان کے یہاں زیادہ ملتا ہے۔ان کی نظموں میں رات کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے ،رات ان خواہشوں کی تکمیل کرتی ہے جو دن میں تشنہ رہتی ہیں ۔رات میں یادیں ایک تسلسل سے آتی ہیں۔ شاعر نے رات کو ایک تاریکی کی علامت میں بیان کیا ہے۔ جو ۱۹۴۷ء سے اب تک ہمارا مقدر بنی ہوئی ہے ۔انھوں نے رات کی تاریکی میں چراغ جلا کر سچائی تلاش کی ہے:

آدھی رات ادھر آدھی رات ادھر/مدھم بلب کی روشنی میں/میرے بستر پر ایک چیونٹی چل رہی ہے/ننھی ساتھی /تمھاری دنیا میں اس وقت دن ہے یارات؟(۳۴)

رات مجید امجد ،ناصر کاظمی اور محمد سلیم الرحمٰن کا مشترکہ دکھ ہے ۔انھوں نے رات کے وقت کو پورے لوازمات کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ انھوں نے رات کے مناظر کو داخل میں بیان کیا ہے۔انھوں نے رات کے مختلف دکھ دکھائے ہیں ۔انھوں نے خوشیاں ،غم ،شکوے اور شکاتیں سب رات کے استعارے میں بیان کی ہیں۔ محمد سلیم الرحمٰن بحروں اور آہنگ میں کھیلتے ہیں ،ان کی نظم کی بنت میں قافیے کافی اہمیت رکھتے ہیں ۔اس سلسلے میں وہ مجید امجد سے متاثر ہیں کیوں کہ ان کے یہاں بھی مجید امجد کی طرح قافیے کی آمد اچانک ہوتی ہے۔ان کی ہر نظم میں بندوں کی تعدا د مختلف ہے۔ پہلے مصرعے میں''کھو دیا'' کے قافیے کو آٹھویں بند میں ''بو دیا'' سے ملایا ہے۔ محمدسلیم الرحمٰن کی نظموں میں یاد کا اشتراک ملتا ہے جوان کی داخلی کیفیت کا عکاس ہے،ان کی ایک معرا ہیئت کی نظم دیکھیے:

سبز تال ، سبز پیڑ ، سبز کھیت ، سبز جال
پتیوں پہ دھوپ ، لال پھول اور سبز چھال
ساونی دنوں کی یاد کے کواڑ کھول کر
سبز ابتری کے روپ دیکھتا ہوں بار بار

(۳۵)

محمد سلیم الرحمٰن نے یاد کے ساتھ متوازی استعارے عمل میں لائے ہیں ،انھوں نے بہار کی ہوائیں ،البم میں پرانی بھوری تصویر ،خواب میں سلگتی اگربتی اور ہلکے نیلے آسمان کے نیچے اڑتا نیل کنٹھ جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ انھوں نے اپنی داخلی نظموں میں استعارے اور تلازمے بڑے مضبوط باندھے ہیں ۔وہ تخلیق کے دوران مناظر کا مشاہدہ کرتے ہیں اور اپنے داخلی جذبات کے ساتھ تخلیق کے حسن میں انفرادیت بھرتے ہیں ۔ساقی فاروقی نے صنعتی ومشینی تہذیب کی برق رفتار لہر کا بڑا قریب سے مشاہدہ کیا ہے۔ اس لیے ان کی نظموں میں عالمی صارفی معاشرے کے خدوخال نظر آتے ہیں۔ انھوں نے عہد جدید کے مادی معاشرے میں سانس لینے والے افراد کی عکاسی کی ہے۔ ساقی صاحب طویل عرصہ یورپ میں قیام پذیر رہے اس لیے انھوں نے مغربی صنعتی و مشینی نظام کی میکانکیت سے جنم لینے والے معاشرے کا بغور مشاہدہ کیا۔ انھوں نے اس تہذیب کی اجارہ داری کی وجہ سے انسا ن کو حیوان میں بدلتے ہوئے دیکھا۔ ساقی کی نظم "نوحہ" کے یہ مصرعے دیکھیے:

یہ میری آنکھوں میں کیسا صحرا ابھررہا ہے/میں بال روموں میں بجھ رہا ہوں،شراب خانوں میں جل رہا ہوں/ جو میرے اندر دھڑک رہا تھا وہ مر رہا ہے (۳٦)

ساقی فاروقی کہتے ہیں دور حاضر کا انسان تمام تر آسائشوں اور رونقوں کے باوجود قابل رحم زندگی بسر کر رہا ہے ۔آج کے مشینی دور کا انسان اندر سے اس قدر تنہائی کا شکار ہے کہ دنیا کی رنگینیاں اس کے سامنے ہیچ ہیں۔ساقی فاروقی کی نظمیں مشرقی تہذیب اور مغربی دانش کے تصادم اور آمیزش کے تناظر میں تخلیق ہوئی ہیں ،ان کی تخلیق متنوع تجربات کی آئینہ دار ہے۔ ساقی فاروقی کی نظموں کے بارے میں محمد سلیم الرحمٰن لکھتے ہیں:

> ’’اس کی تازہ شاعری میں تیزابی سا اثر ہے۔لہجے کی خلیق سفاکی جو شاعرانہ سطح پر نہایت پرکاری سے کہیں تو اپنی اور پرائی خوش فہمیوں اور اترابٹوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتی ہے اور کہیں پھیلے زہر خند کے لبادے میں بشری کمزوریوں کو پیٹھ تھپکتی ہے۔‘‘(۳۷)

ساقی فاروقی نے اپنی نظموں میں توسیع پسندانہ عناصرپر طنز کیا ہے۔ایسے لوگ انسانوں کو ہی نہیں بل کہ حیوانوں کو بھی صفحہ ہستی سے مٹا رہے ہیں۔ساقی کی اس نوع کی اہم نظموں ’’پام کے پیٹ سے گفتگو‘‘،خرگوش کی سرگشت،پیراسائٹ اور’’شیر علی کا مینڈک‘‘ شامل ہیں۔معین نظامی نے بھی استعارات اورعلامات کا انداز اپنایا ہے۔ ان کی نظموں میں عالمی صارفی معاشرے کا بیانیہ ملتا ہے،انھوں نے اپنی نظموں میں صنعتی اور مشینی تہذیب کی تصویر کشی کی ہے۔ معین نظامی کی اس نوع کی اہم نظموں میں ’’اس شہر نفاق

میں‘‘، نیند نہیں آتی، کوفۂ جمال،رائیگانی،آج ڈالر کا کیا ریٹ نکلا، اور، ’’ایک ناقہ سوار سے مکالمہ‘‘ شامل ہیں۔معین نظامی کی آزاد ہیئت کی ایک نظم’’مرغی خانہ‘‘ دیکھیے:

سبزی منڈی کا اک کونہ/دوفٹ کا اک ڈربہ/لگ بھگ دوسو مرغی/وافر دانہ پانی/وقفے وقفے سے گھس جاتا ہے اس ڈربے میں/اک کالے کالے بالونوالا کھردرا ہاتھ/ اس کے بعد خدا کا نام اور تیز چھری کی کاٹ(۳۸)

اس نظم میں علامتی انداز میں اس مقتدرہ کے بہیمانہ ظلم کو بیان کیا گیا ہے جو بستی پر باری باری آگ اور خون کی ہولی کھیل پر ہیں۔ انھوں نے علامتی طور پر اس مادی اور معاشی وسائل کا ذکر کیا ہے۔ جو ترقی پذیر قوموں کا استحصال کرتی ہیں۔معین نظامی کہتے ہیں کہ یہ استحصالی قوتیں باری باری سب کے ساتھ ایسا سلوک کرتی ہیں۔ ان کی نظموں میں ’’بغدادمیں‘‘،زبیدہ کہاں ہو،اور’’مجھے بغداد کہتے ہیں‘‘ میں نائن الیون کے بعد پیدا ہونے والی تباہی وبربادی اور مٹتی ہوئی تہذیب کا ذکر کیا گیا ہے۔ انھوں نے سامراج کے توسیع پسندانہ عزائم کی عکاسی کی ہے جو مادی وسائل پر قابض ہونے کے لیے انسانوں کا خون بہاتے ہیں۔ ڈاکٹر سہیل احمد خاں ،معین نظامی کی شاعری سے متعلق رقم طراز ہیں:

> ’’معین نظامی اشیا اور انسانی تجربات کے جوہر تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ زندگی کے دائمی سوالوں سے پیدا ہونے والا اضطراب انھیں اساطیر اور حکایت کے سرچشموں کی طرف لے جاتا ہے۔ وہ "منطق الطیر"،" اور"طوطی نامہ"،کی فضاؤں میں سفر کرتے ہیں۔ وہ صرف باز گوئی تک نہیں رہتے ،شعورِ تہذیب کو شعورِ عصر تک ملانا چاہتے ہیں۔‘‘(۳۹)

معین نظامی کی نظموں میں آشوب زمانہ نئی شکل اور تجربے کی صورت میں ملتا ہے ۔وہ کہتے ہیں کہ عصر حاضر کا انسان ذہنی ضطرابی اور روحانی کرب میں مبتلا ہو کر جذباتی توازن اور قلبی سکون سے محروم ہو گیا ہے۔ جدید دور کاانسان اپنی تہذیب سے کٹ گیا ہے اور مشینی زندگی کی وجہ سے نفسیاتی پیچیدگیوں اور الجھنوں کا شکار دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے آج کی زندگی کو جمود اور گھٹن آمیز قرار دیا ہے۔ آج کا انسان بے ہنگم آرائش میں قید ہے نظم ’’ان ڈور پلانٹ‘‘ملاحظہ کیجیے:

میرے سرسبز خوابوں کے مقدر میں/فضائے بے حسی محض بے ہنگم سی آرائش ہے/اوراس گھومتے ایوانِ اعرافِ روابط میں /میری ہستی نمایش ہے(۴۰)

معین نظامی کی نظموں میں ترقی پسندی ،معاشرتی انتشار ،سماجی مسائل اور انسان کی ذہنی الجھنوں اور پیچیدگیوں کو موضوع بناتے ہیں۔ساقی فاروقی کی نظمیں عصر حاضر کی حسیات کوایک نئے سیاق میں بیان کرتی ہیں۔ ان کی نظموں میں غنائیت بھی ہے اور کہیں انھوں نے قافیہ اور ردیف کا استعمال بھی خوب صورت انداز میں کیا ہے۔ ساقی اپنی اولین

نظموں میں جانوروں کی تمثالوں سے جدید انسان کی خودغرضی ،نفسانفسی اور مادہ پرستی کو بیان کیا ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں انسان کو مادی خواہشات میں جلتا ہوا دکھایا ہے۔ان کی متعدد نظمیں عصری شعور اور ذاتی شعور کی ترجمان ہیں۔نظم ''تتلی'' دیکھیے:

وہ پاگل تھی/پاگل پن میں/سا کے پر کانٹوں سے الجھ کر ٹوٹ گئے/اب اپنے زخمی پیروں سے/اک پیلے پتے کے نیچے/بیٹھی ہے اور سوچتی ہے(۴۱)

ساقی صاحب نے جدید انسان کی تصویر کشی کرتے ہوئے اس کی جنسی جبلت کا ذکر کیا ہے،انھوں نے جنس کو واضح موضوع بنایا ہے۔مرد اپنی طاقت کی وجہ سے عورت کو جیت لیتا ہے اس سوچ کا بھی ذکر ان کی نظم میں ملتا ہے۔انھوں نے جنسی بے راہ روی کا شکار مردوں کی عکاسی کی ہے جو جنسی اذیت پسندی اور تشدد کے عادی ہیں۔ نظم''امانت''اس کی مثال ہے۔ ساقی فاروقی نے جنس کو موضوع بناتے ہوئے بڑے بے باکی اور جذبات کی عریانی سے کام لیا ہے۔ انھوں نے انسانی جذبوں میں چھپی ہوئی چیز کو نمایاں کیا ہے اور جنس کو تطہیر ذات کا وسیلہ قرار دیا ہے۔اس حوالے سے ان کی نظمیں"سَب بیچ پر صبح کا ننگا پن،سسٹر ماریا تیریزا،حبس ،اور،شہناز بانو دختر شہباز حسین "انسانی نفسیات کی نئی تاویلیں اور پیچیدگیاں اجاگر کرتی ہیں۔

ساقی فاروقی نے مشینی زندگی کی اطاعت اور بے جہتی کی وجہ سے انسانوں میں پیدا ہونے والے خوف اور حیوانی صفات کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے مغربی شاعری سے بھی تاثر لیا اور علامت نگاری ۔تمثال نگاری اور ڈرامائی تکنیک سے متنوع کرداری نظمیں تخلیق کی ہیں۔ ان کی اہم نظموں میں "مکڑا ،خالی بورے میں زخمی بِلا،شیرامداد علی کا مینڈک،مردہ خانہ، زندہ پانی سچا، نیا روگ، نیا آدمی، پرنا سوال، محاصرہ،چراغ کی تلاش، تعاقب اور سائے کا سفر،شامل ہیں۔ساقی نے جانوروں کے کرداروں سے علامتی معنی نکالے ہیں۔ انھوں نے مینڈک کی آواز کو آزادی حاصل کر نے کے لیے نکالی آواز کہا ہے جو دنیا بھر کے مینڈکوں کو اکٹھا کر رہی ہے۔ خرگوش کی سرگزشت انسان کے اندر موجود تجسس ،کھوج اور تلاش وبسیار کی جبلت کی علامت ہے۔ ساقی فاروقی نےانسان کی پریشانیوں اور الجھنوں کو جانوروں کے کرداروں کے ذریعے علامتی انداز میں بیان کیا ہے۔ انھوں نے خواہشات کے پیچھے بھاگنے والے جدید انسان کی بات کی ہے اور اقدار کی شکست و ریخت کو موضوع بنایا ہے۔

ثروت حسین نے اپنی نظموں میں فطرت کی جھلملاہٹ، انسانی رویوں اور جذبات کے امتزاج کو بیان کرتے ہوئے تمثیلی اسلوب اختیار کیا ہے۔ ان کی شاعری میں نفسی کج روی ،مایوسی اور ذات کی تنہائی تو نظر آتی ہے لیکن ثروت حسین نے اپنی شاعری میں انسانی جذبات واحساسات کی تازہ فضائیں پیش کی ہیں۔ ثروت حسین کہتے ہیں کہ تمام سیارے کا موسم ایک جیسا نہیں ہوتا ،انسان بظاہر خوش ہوتا ہے لیکن اس کے اندر سسکیوں کی گونج دبی ہوتی ہے ۔انسانی زندگی میں کئی تضادات ہوتے ہیں ،ثروت حسین اس سے خوب واقف تھے، ان کی

اپنی زندگی میں کئی تضادات اور موڑ موجود تھے۔نظم ''آدھے سیارے پر'' ثروت حسین کی اہم نظم ہے۔فطرت سے محبت اور خواب ثروت حسین کی نظموں کا بنیادی حوالہ ہیں۔ ان کی مثبت سوچ اور ان کے اندر قنوطیت پیدا نہیں ہونے دیتی۔وہ اپنی الجھنوں اور پیچیدگیوں کا کتھارسس فطرت کے حسین مناظر کی محبت میں کرتے ہیں۔ ان کی نظموں میں فطرت کی حسین تصویر کے پس پردہ کوئی حقیقت ،جذبات ،احساسات اور سرمستی چھپی ہوتی ہے۔وہ اپنی نظم ''ایک نظم کہیں سے بھی شروع ہو سکتی ہے'' میں روزمرہ کے عام واقعات سے زندگی کے حقائق بیان کرتے ہیں۔ اس میں وہ تمثیلی اسلوب اختیار کرتے ہوئے حیات انسانی کی تصویر کشی کرتے ہیں:

جوتوں کی جوڑی سے /یا قبر سے جو بارشوں میں بیٹھ گئی/یا اس پھول سے جو قبر کی پائینتی پر کھلا/ہر ایک کو کہیں نہ کہیں پناہ مل گئی/چیونٹیوں کو جائے نماز کے نیچے/اور لڑکیوں کو میری آواز میں/مردہ بیل کی کھوپڑی میں گلہری نے گھر بنا لیا ہے(۳۲)

ثروت حسین کی نظموں میں موجود فطرت کے گوناگوں رنگوں کے پیچھے چھپی ہوئی ناہموار نفسی الجھنوں کا پتا ان کی خودکشی سے لگایا جا سکتا ہے۔ وہ اپنی ذات اور سماجی میں مطابقت پیدا نہ کر سکتے اور نتیجے میں انھوں نے خود کشی کر لی۔ ثروت حسین ساری زندگی ذہنی پیچیدگیوں کا شکار رہے ۔انھوں نے خوابوں سے نظمیں تخلیق کیں۔ نظم ''یہ میرے خواب کا مکاں'' کافی اہم ہے۔ انھوں نے اپنی مجموعی زندگی خوابوں کے سہارے گزاری، خواب ان کے کتھارسس کا ذریعہ تھے ا نھیں زمانہ رات کی مانند لگتا تھا۔ ان کے خواب بڑے مثبت تھے اور ان میں امید کی ایک لَے نظر آتی ہے۔ ثروت حسین کو محبت کے جذبات اور احساسات سے کچلنے والے معاشرے فطرت مخالف رویہ رکھنے والے انسانوں سے نفرت تھی۔ان کی شاعری محبت ،مناظر فطرت ،وجدانی خوشی کی سرزمین کا رستہ دکھاتی ہے۔اس کے باوجود ان کے مزاج کا اتار چڑھاؤ ان کی نفسیاتی اور ذہنی کج روی کی عکاسی کرتا ہے۔

ڈاکٹر سعادت سعید کی نظم نگاری سائنسی شعور ،ترقی پسند ،سماجی فکر اور بدلتے ہوئے عالمی حالات سے اپنا فکری خمیر اٹھاتی ہے۔ وہ اعلانیہ طور پر ایک ترقی پسند شاعر ہیں تاہم انھوں نے اپنی نظموں میں جدیدیوں کا سا اسلوب اختیار کیا ہے۔ یہ وہ اسلوب ہے جو ابہام کو ترسیل پر ترجیح دیتا ہے۔ حالاں کہ ترقی پسند ترسیل کو باہم پر ترجیح دیتے ہیں۔ ان کی نظم بشمول طویل نظمیں ہمیں ہیئت ،لفظیات اور اسلوب نگاری میں وزیرآغا یا اوراق کے قریب تر دکھائی دیتی ہیں۔سعادت سعید وہاں متاثر کرتے ہیں جہاں عالمی معاشرتی چیرہ دستی اور جدید عہد کے انسان کا نوحہ رقم کرتے ہیں۔ سعدت سعید زیادہ تر آزاد ہیئت میں شاعری کرتے ہیں۔ انھوں نے مزاحمتی اور انقلابی شاعری کے ساتھ ساتھ زندگی سے متعلق تخلیقی رویوں اور فنون لطیفہ کی نوحہ خوانی کرتے ہیں۔سعادت سعید کی شاعری داخلی کرب کے علاوہ ،عزم ،عمل اور عہد کی عکاسی بھی کرتی ہے۔ ان کی نظموں میں ان کے باطنی محسوسات اور معاصر افراد کے نفسیاتی پہلو شامل ہیں۔

سعادت سعید نے اپنے عہد اور ذات کو تمثیلوں کے ذریعے نئے لسانی پیرائیوں اور آزاد تلازموں میں پیش کیا ہے۔ ان کی شاعری میں زمانہ قدیم سے لے کر دور حاضر کے انسان کی نفسیاتی کشاکش اور معاشرتی شکست وریخت کا شعور ملتا ہے۔ان کی تہہ در تہہ تمثیلوں میں معنی کی نئی جہتیں ملتی ہیں۔ نظم''ققنس'' ملاحظہ کیجیے:

تری ہڈیوں میں وہ برف ہے جو لہو کو سنگ بنا گئی/ترے قلب میں وہ گلیشیر کہ جو سورجوں کو بجھا گیا/ترے سردخانوں کی قید سے جو ہوائیں چھوٹ کے آئی تھیں/مرے دل کی ساری حرارتیں وہ جلو میں باندھ کے لے گئیں/ذرا آنکھیں کھول کے دیکھ تو(۴۳)

سعادت سعید داخل اور خارج کو ہم میں تبدیل کر کے فرد کے اجتماعی تجربے کو بیان کرتے ہیں،انھوں نے معاصر فرد کی نفسیات کی عکاسی کے لیے متعدد تمثالوں کو پیش کیا ہے۔نظم ''کجلی بن'' اس حوالے سے اہم ہے۔سعادت سعید نے طویل نظمیں بھی لکھی ہیں ان کی طویل نظم ''فنون آشوب'' ذاتی انتشار اور اجتماعی جکڑ بندیوں کا بیان ہے۔ ان کی شاعری میں انفرادی شعور سے زیادہ اجتماعی شعور کی کارفرمائی زیادہ ہے۔وہ معاشرے میں پیدا ہونے والی غلامانہ ذہنیت کا خاتمہ چاہتے ہیں اور فرد کی ذاتی آزادی کے خواہاں ہیں۔سعادت سعید کی نظموں میں سائنسی شعور ،فلسفیانہ ،نفسیاتی اور تہذیبی موضوعات ملتے ہیں۔ سعادت معاشرے کے نبض شناس ہیں انھوں نے متعدد عصری مسائل کو اپنی نظموں میں سمویا ہے۔

سرمد صہبائی کی نظم خالص انسانی بل کہ بدنی معاملات کو ترجیح دیتی ہے جو جذبے اور کیفیت کو تفکر اور فلسفے پر فوقیت دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک خالص انسانی جذباتی بل کہ جنسی احساسات کا بیان کرنا علم وفکر پر شاعری سے بہتر ہے۔ انھوں نے زیادہ تر آزاد ہیئت میں نظم نگاری کی ہے ان کا انداز اور لفظیات منفرد نوعیت کی ہیں۔مقامی ثقافتوں کے رنگ ،مقامی بولیوں کے الفاظ خاص طور پر پنجاب کی دھرتی کے ثقافتی اور جذباتی احساسات کو خوب صورت انداز میں نظم کیا ہے۔ ان کا لسانی شعور جدیدیت سے قریب تر ہے ان کی موضوعاتی کیفیات میں ایک خاص تنوع پایا جاتا ہے۔انھوں نے گھسی پٹی لغت کا استعمال کم کیا ہے۔ ان کی نظموں میں لاشعوری ہیجان ،تشدد،غصہ اور عہد جدید کے انسان کی بے حسی کی ترجمانی ملتی ہے۔ ان کی شاعری میں نفسیاتی پیچیدگیوں ،واہموں ،پرچھائیوں اور دبی ہوئی خواہشات کی تمثیلیں نظر آتی ہیں۔ سرمد کی شاعری کے بارے میں ڈاکٹر شاہین مفتی رقم طراز ہیں:

> ''سرمد کی انگلیاں زرد تنہائی کی اوڑھنی بنتے بنتے پگھل گئی ہیں اس کی پتلیوں میں ادھڑے ہوئے خواب دھجیاں بن کر پھڑپھڑاتے رہے ہیں،واہموں کی عجب سی پرچھائیاں ،راستوں پر بچھی ہے اور گدلے شہروں کے پاتال سے لوگ باہر نکل کر افواہیں پھیلا رہے ہیں وہ سمجھتا ہے کہ اس دنیا میں جینے اور مرنے کی لذت ایک جیسی ہے۔''(۴۴)

سرمد صہبائی کا سلوب ان کے ذاتی تجربات سے اکتساب کا مظہر ہے،انھوں نے ذاتی جمع شدہ تجربات کو تراکیب کے ساتھ منفرد تازگی دی ہے،نظم ''یہ کیسی تدبیریں ہیں''ملاحظہ کیجیے:

یہ کیسی تدبیریں ہیں جو سیفٹی پن کے کھلنے سے کھل جاتی ہیں/ساری صداقتیں سارے رشتے/اک پل کی اَن دیکھی کاٹ سے کٹ جاتے ہیں/میلے اندرس کی بدشکلی دیکھتے دیکھتے اپنا تمسخر بن جاتی ہے/کیسے چھپائیں اس بدشکلی کی یہ ہونی(۴۵)

سرمد صہبائی بے معجزہ ابہام سے افسردہ دکھائی دیتے ہیں اور نیم تاریک خواہشوں کے لیے مہلت مانگتے ہیں۔ ان کی نظموں میں جنسی خواہشات ،کش مکش اور معاشرتی اقدار کا تصادم نظر آتا ہے انھوں نے خوابوں کی حقیقی نفسیات کی معنویت کو اجاگر کیا ہے اور یہ ظاہر کیا کہ خواب خواہشات کو پورا کرنے کی نقلی اور جھوٹی تسلی ہیں۔نظم ''کوئی نہ اس کو جگائے'' اس ضمن میں اہم ہے۔ انسانی خواہشات ذہنی الجھنوں کو پیدا کرتی ہیں اور انسان کے دماغی اعصاب پر بوجھ ڈالتی ہیں،شاعر انسانی نفسیات کی لاشعوری خواہشات سے بہ خوبی آگاہ ہیں،یہ خواہشات انسان سماجی جکڑ بندیوں کی وجہ سے حاصل نہیں کر سکتا۔ سرمد صہبائی نے اس کو علامتی انداز میں بیان کیا ہے،اس کے لیے نظم''میرے اوپر کتنے بوجھ ہیں''دیکھیے:

میرے اوپر کتنے بوجھ ہیں/ایک کھلی آنکھوں میں ساکت /گہرے خواب کا سکتہ/ایک بدن کے اندر پلتا کالی رات کا قصہ/کندھوں پر وزنی آسمانوں کی اک ازلی ہیئت /سانسوں کی دہلیز پہ چڑھتے دن کا زہری خنجر(۴۶)

سرمد صہبائی کے یہاں بے جا معاشرتی پابندیوں کو بیمار رسمیں کہتے ہیں ان کے یہاں معاشرتی اقدار سے بھٹک کر جنسی آسودگی کا حصول کوئی جرم نہیں۔سرمد کی شاعری میں ہیجان ،تشدد ،غصہ اور انسان کی بے حیثیتی کا کرب بیان کیا گیا ہے۔ ان کی بیشتر نظموں میں جمالیاتی اور ثقافتی رنگ نئے سیاق میں ملتے ہیں۔ان کی نئے تناظر کو پیش کرتی ہوئی نظموں میں ''پوٹریٹ''،وہ پھول کاڑھتی رہی،ملاقات،اندرون شہر کی ایک لڑکی کے نام، وہ بین کرتی ہے،اسے کون جینا سکھائے گا،ایک سیدھی سی لڑکی کے لیے ایک نظم،نیشنل کالج آف آرٹس کی ایک تجریدی لڑکی کےنام،وہ نیک دل اور سادہ ہے،سخن زاد،گود،''میں گنہ پالتی ہوں ''اور''سازش کے شہر میں گم شدہ لڑکی''شامل ہیں۔سرمد صہبائی نے ان کرداروں کو بیان کرنے کے لیے جو پیکر اور تمثالیں وضع کیں ہیں ان میں نسائی عنصر کے باوجود بیانیہ اکہریت میں ڈھلا ہوا نظر نہیں آتا ۔ ان کی ہر نظم نئے تناظر کے معنی کے دریچے وا کرتی ہے۔سرمد صہبائی کی نظم''پوٹریٹ'' کا نمونہ دیکھیے:

تیری ہتھیلی پر یہ کیسا /دھڑکتا وہم ہے/لاش ہے شاید اک نوزائیدہ بچے کی/جسے تو کیسی ماں ہے جاگتے سوتے اپنی بانہوں میں/جھولنا دیتی رہتی ہے/اس کی بلائیں/ اپنے سر لیتی رہتی ہے/اور کیسا بچہ ہے تیرا(۴۷)

سرمد صہبائی کی نظموں میں کوئی نہ کوئی منظر کشی ہوتی ہے یا کسی اندرونی کرب کی علامتی منظر نامہ پیش کیا جاتا ہے ۔ان کی شاعری یک رخے اظہار کے بجائے سہ جہتی اظہار کو سمیٹے ہوئے ہے۔ انھوں نے نہ تو ایک ہی موضوع دہرایا ہے اور نہ ہی ایک علامت اور استعارے کو رگیدہ ہے۔سرمد صہبائی نے زیادہ تر آزاد ہیئت کو وسیلۂ اظہار بنایا ہے البتہ انھوں نے چند معرا نظمیں بھی لکھی ہیں ،اس کی مثال ان کی نظم''سخن ''ملاحظہ کیجیے:

جب بارش پیاسی دھرتی پر
موسم کا راس رچاتی ہے
خواہش کی تیز چمک میں جب
ہر شے عریاں ہو جاتی ہے
میں ایک بدن بن جاتا ہوں
جب کاگا کھلی منڈیوں پر
سندیس پیا کا لاتا ہے
اور اُجلے روشن دانوں میں
اک ننھی چڑیا گاتی ہے
(۴۸)

سرمد صہبائی نے بارش،کاگا،چڑیا اور آنگن کو علامت اور استعارے کے طور پر استعمال کیا ہے جو ہمیں ہزاروں سال پرانی تہذیب میں لے جاتے ہیں،ان کی شاعری میں قدیم ہندوستان اور سندھ کی تہذیب کی عکاسی ملتی ہے۔وہ جنگلوں ،ہواؤں ،موسموں اور پرندوں سے باتیں کرتے ہیں،شہتوت ،آڑو ،انجیر،زیتون اور جامن کے درخت ان کا استعارہ ہیں۔ سانپ اس کے خزانے کی حفاظت کرتا ہے،بلی طوطے کے پاس رہتی ہے اور ہاتھی اس کے بچوں کو سکول چھوڑنے جاتا ہے۔سرمد کی نظموں میں مایوسیوں ،معاشرتی بدصورتیاں،ذاتی ناکامیاں،انوکھی خواہشیں،خوف وتذبذب ،آسیب ،بھوت اور چھلاؤں کی کئی شکلیں ملتی ہیں۔ان کی نظموں میں سماجی ،تہذیبی پہلوؤں کے علاوہ مناظر فطرت اور رومانوی طرز احساس بھی پایا جاتا ہے۔

عبدالرشیدنے آزاد ہیئت کے ساتھ ساتھ نثری ہیئت میں بھی نظم نگاری کی ہے۔ وہ افتخار جالب سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری میں جنسی بے راہ روی اور ناآسودگی کے موضوعات بھی ملتے ہیں جو انھیں میراجی اور حلقہ ارباب ذوق کے قریب کرتے ہیں۔ انھوں نے جنسی ناآسودگی کے علاوہ جدید نظام زندگی میں پائے جانے والے تضاد ،ریا کاری اور کلچر سے پیدا ہونے والے اضطراب کو بیا ن کیا ہے۔ ان کی نظمیں ان کی ذاتی شکست وریخت اور تنہائی کا شاخسانہ ہیں۔ شاعر کی گمبھیر تنہائی اس کےا حساس عدم تحفظ کا رخ اذیتوں کی جانب کر دیتی ہے۔ نظم ''پھٹا ہوا بادبان'' ملاحظہ کیجیے:

یہاں سانس گنتی کے زندان میں ہے/زبان پر سمندر کا کف ہے،ہوائیں دساور کی خوشبو سے بوجھل/بہت دور رستوں کے پیغام سے رو رہی ہیں/قلم اپنے اطراف بکھرے مناظر کو لفظوں کے دھاگے میں سیتا ہے/دن رات کی اس گرامر میں بھولا ہوا اسم ہے(۴۹)

عبدالرشید نے اپنے داخلی کرب کو جنسی علائم اور تمثالوں سے ظاہر کیا ہے نظم"کیا میں تھک گیا ہوں" اور "کنوارے پنے سے بوجھل ہوں" میں جنسی تجربوں کا بیان ان کے نفسیاتی مسائل کا ترجمان ہے۔ان کی نیم جنسی اور نیم نفسیاتی الجھنوں کی حامل نظموں میں"تم جھے اپنے ہاتھ دے دو،میری رائے میں،سبز سانپ،شام کی بارش،وہ بارشیں،انتظار، سانپ کی زیارت،اور،اے پرندوں کے قوس"اہم ہیں۔عبدالرشید نے تمثال کاری کے ذریعے اپنے خیال کو پیش کیا ہے۔ ابرا ر احمد کی نظم سبک،ہلکی پھلکی اور رواں دواں ہوتی ہے ان کے یہاں اظہار کی جمالیات کو فکر کی لفاظی سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اکثر موضوعات میں بڑے شہروں کی بھاگتی دوڑتی زندگی ،فرد کا احساس ،بیگانگی اور تیز رفتار آمیخت ہو کر نظر آتے ہیں۔ان کا اسلوب نظم گوئی حلقہ ارباب ذوق یا وزیر آغا گروپ کے نزدیک ہے۔انھوں نے وجودی مسائل کو حسیاتی سطح پر پیش کرتے ہوئے نرم رو بہاؤ پیدا کیا ہے کہیں کہیں ان کے یہاں رومانوی احساس کی جھلک نظر آتی ہے۔ان کی شاعری میں معدوم علاقوں ،منہدم زمانوں اور بے حاصلی کی فضاؤں کی منظر کشی ملتی ہے۔ ابرار کی شاعری میں مذہبی منافرت اور بین الاقوامی مسائل کی وجہ سے افسردگی نمایاں ہے:

ہم کہ کس دیس کی پہچان میں ہیں/ہم کہ کس لمس کی تائید میں ہیں/ہم کہ کس زعم کی توفیق میں ہیں/ہم کہ اک ضبط مسلسل ہیں/زمانوں کی ابد سے لرزاں/اپنے دیس میں پردیس لیے پھرتے ہیں/ہم کہ اک بھیس لیے پھرتے ہیں(۵۰)

ابرار کی شاعری میں جمالیاتی قدریں فطرت کی مختلف علامتوں کے ساتھ تشکیل پاتی ہیں،انھوں نے ایک نیا اجلا سماج دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے،انھوں نے بے گھری کے تجربے کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔ ان کی حسی،ادراکی سطح ،تمثالوں اور فطرت سے قریب تر علامتوں کے نمونے کی ایک مثال نظم’’غیر آبادیوں میں ایک نظم‘‘ ہے۔ابرار کی شاعری میں یاد ماضی کا ایک اہم حوالہ بھی ہے۔ انھوں نے بھی دیہات اور قصبوں کو ایک بچھڑی ہوئی محبوبہ کی طرح یاد کیا ہے۔ ہمارے شعرا جب گاؤں چھوڑ کر شہروں میں رچ بس گئے تو انھوں نے اپنے آبائی علاقوں کو بہت یاد کیا،اس طرح ان کے لہجے میں پیار اور اپنائیت کا اظہار جھلکتا ہے۔ اس ضمن میں ابرار کی نظم’’قصباتی لڑکوں کا گیت‘‘خاصی اہم ہے۔ابرار احمد کی شاعری میں انسان کی تنہائی ،بےچارگی،لاحاصلی،ذلت اور ہزیمت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان کی شاعری محض خارج تک محدود نہیں بل کہ انھوں نے باطن میں پوشیدہ ہو کر سماج کی عکاسی کی ہے۔انھوں نے لفظ’’ہوا‘‘ کو اپنی شاعری میں متعدد معنوں میں استعمال کیا ہے۔ کبھی انھوں نے ہوا کو زمانے کے مترادف اور کبھی ماضی کی تاریخ کے استعارے میں۔ابرار کی شاعری میں روح عصر دھڑکتا ہے لیکن وہ کہیں کہیں ماضی پرست

بھی محسوس ہوتے ہیں۔ انھوں نے اپنے عہد کی سماجی اور سیاسی زندگی کی عکاسی کی ہے۔ ان کی نظمیں کئی حوالوں سے معاصر شعرا سے اشتراک رکھتی ہیں۔

علی محمد فرشی نے اپنی نظموں کومہک جمالیات اور فکریات سے منسلک رکھا ہے۔ان کی نظم جدید ایجادات سے لے کر قدیم اساطیر تک تخلیقی سفر کرتی دکھائی دیتی ہے۔ وہ اپنی نظم پر بہت محنت کرتے ہیں اور بلآخر اسے ایسا فن پارہ بناتے ہیں جس میں نامیاتی وحدت ،احساس جمال ،تفکر ،روانی یکجا ہوجاتےہیں۔عام طور پر ان کی نظموں میں کوعی مصرع فالتو دکھائی نہیں دیتا۔علی محمد فرشی کی طویل نظم''علینا'' کافی اہم ہے۔ انھوں نے آزاد ،معرا اور نثری ہیئتوں میں نظم نگاری کی ہے۔ اور کہیں کہیں پابند ہیئت کے نئے تجربے بھی کیے ہیں۔انھوں نے اپنے عہد کی عکاسی کی ہے۔موجودہ سرمایہ دارانہ نظام میں فرد کی گم شدگی اور انسان کی تلاش ان کے اہم موضوعات ہیں۔انھوں نے زندگی سے متعلق اہم موضوعات کو نہایت فنی چابکدستی سے اپنی نظموں کا حصہ بنایا ہے۔ فرشی نے اپنے مخصوص تانیثی اور رومانوی انداز میں سماجی ،سیاسی اور سامراجی عناصر کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔نظم ''علینا''کا یہ نمونہ دیکھیے:

علینہ/نئے آدمی کے/مقدر کا نقشہ بناتے ہوئے/مغربی ساحروں نے/تری فائلوں سے چرائے ہوئے راز کو/کس قدر ایٹمی زندگی کے تصور میں شامل کیاتھا/فقط ہیروشیما کی مٹی کومعلوم ہے/غار سے نکلیں/کوئی رستہ بنائیں/اس گھنی ،گاڑھی سیاہی سے نکلنے کا/اندھیرے ،اندھے ،زہریلےدھوئیں میں(۵۱)

فرشی کی اس نظم میں گھنی،گاڑھی،سیاہی،اندھیرے،اندھے ،زہریلے دھوئیں جیسے الفاظ کا استعمال عصری مسائل اور حسیت کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کی نظموں ''ہمزاد''،دہانہ،بندریا،سیلاب،ریت،اور''مشینہ'' میں عالمی سامراج کے توسیع پسند عزائم کی ترجمانی کی گئی ہے۔ان کی نظموں میں انسانی سوچ کے دھارے کو بدلتے ہوئے اور ترقی اور تیز رفتار زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔نصیر احمد ناصر نے آزاد نظموں میں سائنسی وژن پید کر کے انسان اور فطرت کو روبرو کھڑا کر دیا ہے۔ اس میں کمل انسانی جذبے فطرت میں پناہ پا کر آسودگی کرتے ہیں جب کہ مشینوں اور ایجادات کے سامنےگیر انسانی مشینی کا سا انداز اختیار کر لیتے ہیں۔انھوں نے ماحولیات،مواصلات اور سوشل میڈیا جیسے تازہ تر موضوعات کو بھی استعمال کیا ہے۔ معاصر شعرا کی طرح ان کی نظم کی ہیئتوں میں تنوع موجود ہے۔انھوں نے معاصر جدید اردو نظم میں مستعمل تمام ہیئتوں بشمول آزاد اور نثری کو برتا ہے۔ان کے اسلوب میں ایک تشکیلی ابہام پایا جاتا ہے انھوں نے منتشر معاشرے میں محبت کے فروغ کی بات کی ہے۔نصیرا حمد ناصر نے اپنی شاعری میں بیانیہ اور تاریخ دونوں کو یکجا کر دیا ہے۔ انھوں نے خارج سے زیادہ داخلی محسوسات کو شاعری میں بیان کیا ہے۔ ان کی تمثیلیں اور علامتیں جدید انسان کے انفرادی اور اجتماعی لاشعور میں چھپی آفاقی سچائیوں کو بے نقاب کرتی ہیں۔ان کی شاعری میں فرد ،سماج اور اسرار حیات کے ساتھ ساتھ ماضی ،حال اور مستقبل ہم آمیز دکھائی دیتے ہیں ،نظم ''زینے والا'' دیکھیے:

زینے والا/روزِ ازل سے چپ سادے/اپنے ابد کی بے اندازہ اونچائی پر بیٹھا/وقت کا ایک مدورلمحہ/ہر جانب لڑھکا کر/سیڑھی سیڑھی /دیکھ رہا ہے/پاتال کے پاپی کنویں میں/اس کی کھٹ کھٹ کرتی /صدیاں گونج رہی ہیں(۵۲)

نصیر احمد ناصر کی شاعری سائنسی ترقی سے پیدا ہونےو الے ذہنی اضطراب کو بیان کرتی ہے،ان کی نظموں کے تخیل اور غنائیت کے پیچھے کاروباری سوچ کے حامل اور سرمایہ دار وں سے ڈسے ہوئے سادہ لوح افراد کا کرب پیش کیا گیا ہے۔اس ضمن میں نظم ''مرگِ پیچ'' دیکھیے۔ان کی نظمیں جدیددور کے حادثات ،بے حسی ،ادھورے خوابوں اور حیرتوں کو بیان کرتی ہیں۔انھوں نے جدید عصری حسیت کی ٹوٹ پھوٹ اور نفسیاتی الجھنوں کے جبر ،ان کے بے معنی تجربات اور انوکھی معنویت کو پیش کیا ہے۔ ان کی شاعری میں موضوعاتی تغیر کے ساتھ نئی لسانی ہیئتیں بھی نظر آتی ہیں۔ان کے مشاہدے ،تجربے اور نئی لسانی پرتیں ہیئت کے تقاضے پورے کرتی نظم''ساگردیوتا''دیکھیے:

کہو تم کہاں ہو/مرکب صداؤں کے ریلے میں/کس کو پکاروں/عجب نم زدہ سلوٹوں میں گھری زندگی ہے/زمیں ایک آبی عمل سے گزر کر/مدور ہوئی ہے/چٹانوں کے نیچے بھی، اندر بھی/خوابیدہ بل دار آبی چٹانیں (۵۳)

نصیر احمد ناصر کی نظموں میں فطری علامتوں کے ساتھ ساتھ رومانیت کی ایک رو ایک وسیع تناظر اور ادراک کے ساتھ ملتی ہے۔ ان کے پہلے شعری مجموعے''پانی میں گم خواب''میں رومانوی طرزا حساس کی چھاپ گہری نظر آتی ہے۔ ناصر کی رومانوی رو مخصوص زاویۂ نظر کی عکاس ہے، اس سلسلے میں ان کی نظم''دھند کے پار'' کافی اہم ہے۔ اس نظم میں اردگرد کے آشوب کا اظہار اور ادراک پایا جاتا ہے۔انھوں نے مختلف علامات ،تلازمات کے ذریعے اپنے ارد گرد کھیلے جانے والے آگ اور خون کے کھیل کی عمدہ منظر کشی کی ہے لیکن انھوں نے علائم اور استعارات کے ذریعے کوئی وسیع معنوی نظام تشکیل نہیں دیا۔ان کی استعارہ سازی نظم''ویپ ہولز'' میں دیکھی جا سکتی ہے۔نصیر احمد ناصر کی نظموں میں سماجی اور سیاسی موضوعات بھرپور انداز میں ملتے ہیں۔انھوں نے اپنے عہد کی عکاسی کرتے ہوئے نظموں کی شعریات کو موضوعاتی واسلوبیاتی دونوں سطح پر اہمیت دی ہے۔ان کی اہم نظموں میں''ان فوکس''،گدھے پہ سواری کا اپنا مزہ ہے،الغیاث اور اناپ، ڈسٹ بن سے جھانکتی موت،''میں اندھیرے میں اگی مشروم ہوں''اور'' آزوقہ'' شامل ہیں۔نصیر احمد ناصر نے ان نظموں میں تازہ امیجز اور تمثالوں کے ذریعے اپنے عہد کی تصویر کشی کی ہے۔

معاصر جدید اردو نظم نگاروں(۱۹۷۰ء تا حال) نے مجموعی طور پر اپنی نظموں میں مظاہر فطرت،معاشی ومعاشرتی مسائل،ذات اور کائنات، وقت اور موت کے نفسیاتی افعال اور رد اعمال کو بیان کیا ہے۔انھوں نے نفسیاتی افعال،باطنی دباؤ ،گھٹن اور ناآسودگی سے شروع ہو کر کائنات کی وسعتوں کے سامنے انسانی زندگی کی بے حیثیتی اور سائنسی ترقی کی وجہ

سے پھیلنے والی بے یقینی اور لایعنیت کی فضا کی عکاسی کی ہے۔ شعرا نے اپنے ذاتی احساس ،واردات ،خودشناسی میں ڈوب کر معاشرتی انتشار سے نئی ترتیب اور نظام زندگی تراشنے کی سعی کی ہے۔ انھوں نے کچھ قدیم اساطیری علامتوں کے ذریعے مرد اور عورت کے آپسی رشتے کو اپنی محسوسات کے دائرے میں شامل کیا ہے۔ متعدد شعرا نے مناظر فطرت کو عورت کے جسمانی اعضا میں مجسم کر کے بیان کیا ہے۔

۱۹۷۰ء کے بعد کی شاعری میں فرد اور معاشرے کے انتشار ہم آمیز دکھائی دیتے ہیں۔ انسان کا باطنی کھوکھلا پن اور معاشرتی نمائشی زندگی کے خالی پن سے جڑ کر مضمحل انا کا حوالہ بن گیا ہے۔ آزاد نظم کا دائرہ وسیع کرتے ہوئے اس عہد کے شعرا نے اپنی ذات کی بازیافت کے ساتھ ساتھ اجتماعی آشوب اور خلفشاری کو بھی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ ۱۹۷۰ء کے بعد کے شعرا کی شاعری کا بنیادی سچ فرد اور معاشرے کی کشاکش کا داخلی شعور ہے جس میں انفرادی اور اجتماعی لاشعور کی عکاسی کی گئی ہے۔ اسلوبیاتی سطح پر شعرا نے علامت نگاری تمثال نگاری کے علاوہ کراہت انگیز مناظر ،خودکلامی کی تکنیک اور نفسی حقائق کا اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ ان شعرا نے کسی تحریک کا واضح حصہ بنے بغیر مختلف ہیئتوں اور تکنیکی اور تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے تخلیقی تجربے کی کلیت پر یقین رکھا ہے۔ معاصر اردو نظم نگاروں کے یہاں اپنے عصر کی مخصوص حسیت سے انسلاک کا عمل دکھائی دیتا ہے۔ اس عہد کی نظمیں جدیدت کی واضح توسیع لگتی ہیں اور ان پر راشد ،میراجی،فیض،مجید امجد اور اخترالایمان کے اثرات بھی نظر آتے ہیں۔ اس عہد کی نظمیں عصری ،فکر ی اور اسلوبیاتی سطح پر بھی اظہار کی نوبنو صورتوں کی نشان دہی کرتی ہیں۔ معاصر نظم میں معنی کی تکثریت کے جلو سے علمی ،ادبی ،ثقافتی ،سیاسی ،سماجی ،جمالیاتی اور علامتی سطوح پر نئے جہان خلق ہوئے ہیں۔

استخراجِ نتائج/موضوعاتی اشتراکات

معاصر اردو نظم(۱۹۷۰ء سے تا حال) کے نمایندہ شعرا انیس ناگی ،محمد علوی، ستیہ پال آنند، شہریار، وحید اختر، ندا فاضلی، بشر نواز، زبیر رضوی، گلزار، آفتاب اقبال شمیم، محمدسلیم الرحمٰن ،ساقی فاروقی، ثروت حسین ، معین نظامی، سعادت سعید، سرمد صہبائی، عبدالرشید، ابرار احمد، علی محمد فرشی اورنصیر احمد ناصر کی نظموں میں اشتراکات پائے جاتے ہیں۔ ۱۹۷۰ء کے بعد کے شعرا نےمظاہر فطرت،معاشرت،ذات ،وقت اور موت کے افعال ،اعمال اور رد اعمال کو موضوع بنایا ہے۔ ان کے یہاں سماجی شعور زیادہ ہے۔ انھوں نے ذاتی واردات ،خود شناسی اور احساسات کو شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ انھوں نے مشترکہ طور پر فرد اور معاشرے کے انتشار کو موضوع بنایا ہے۔

معاصر نظم نگاروں نے ماضی کی بازگشت کے ساتھ ساتھ پاکستانی اور ہندوستانی آمریت اور جمہوریت کے گذشتہ پچاس سالوں کو موضوع بنایا ہے۔ ان شعرا نے اپنے عہد کے انسان کو در پیش مسائل اور چیلنجز کو موضوع بنایا ہے۔ ان کی شاعری اپنے عہد کی تہذیب

،مسائل ومعاملات کا احاطہ کرتی ہے۔ ان شعرا نے اپنی نارسائیوں ،محرومیوں اور تنہائیوں کو موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے انفرادی واجتماعی ،داخلی وخارجی ،سیاسی وسماجی مسائل ،احساسات اور ذہنی وجذباتی الجھنوں کو مشترکہ طور پر موضوع بنایا ہے۔ معاصر نظم نگاروں نے انسان کے خارجی اور داخلی مسائل کو یکسانیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ انھوں نے اقتصادی مسائل کے ساتھ ساتھ زندگی کی سطح پر ابھرنے والے متعدد موضوعات کو بڑی فنی چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ ان شعرا نے فرقہ پرستی اور فسادات کے خلاف متعدد نظمیں لکھی ہیں۔

معاصر نظم نگاروں نے محبت اور جدائی کی تمام کیفیتوں کو بھی موضوع بنایا ہے۔ ان شعرا نے پاکستان اور ہندوستان کے تہذیبی ماحول کی عکاسی کی ہے۔ انھوں نے موسموں اور دن کے پہروں مثلاً سردی، گرمی ،صبح ،دوپہر یا شام وغیرہ کو موضوع بنایا ہے۔ ان کے یہاں فطرت اور تمدن کی آمیزش ہے۔ کچھ شعرا مجید امجد کے قریب تر دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے ایک یکسانیت کے ساتھ دیہاتی مناظر وتہذیب کی عکاسی کی ہے۔ ان شعرا نے معاصر پاکستانی اور ہندوستانی حالات کی عکاسی نت نئے پیکروں اور تمثالوں سے مزین کر کے کی ہے۔ انھوں نے اپنے ارد گرد بکھرے آشوب کی صورت گری کے لیے استعاروں کا بھر پور استعمال کیا ہے۔ ان شعرا نے پرندوں ،درختوں، آبشاروں ،رات اور سورج وغیرہ کا ذکر بھی مشترکہ طور پر کیا ہے۔ ان شعرا کی شاعری میں جنسی بے راہ روی اور ناآسودگی کے موضوعات بھی ملتے ہیں۔ ۱۹۷۰ء سے تاحال کے نظم نگاروں نے اپنی شاعری میں زیادہ تر اپنی ذات کی بازیافت کے ساتھ ساتھ اجتماعی آشوب اور خلفشاری کو موضوع بنایا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ عقیل احمد صدیقی، جدید اردو نظم نظریہ وعمل،(لاہور: بیکن بکس،۲۰۱۴ء)،ص:۳۶۶

۲۔ احتشام علی، جدید اردو نظم میں عصری حسیّت،نقاط نظم نمبر،(فیصل آباد: اکتوبر،۲۰۱۰ء)،ص:۲۳۳

۳۔ امجد طفیل ،مضمون ،جدید نظم کی نئی آوازیں،مشمولہ ،ادبِ لطیف(لاہور: شمارہ نومبر تا دسمبر، ۲۰۱۰ء)،ص: ۱۴۸

۴۔ احتشام علی،انیس ناگی اور بیگانگی کی نظمیں ،مشمولہ،راوی،(لاہو:جی سی یونیورسٹی،۲۰۱۱ء)،ص:۱۷۱

۵۔ انیس ناگی،بیگانگی کی نظمیں(کلیاتِ شعر)،(لاہور: تخلیقات،۲۰۰۰ء)،ص:۴۹۱

۶۔ محمد علوی،آخری دن کی تلاش،(الہٰ آباد: شب خون کتاب گھر،۱۹۶۸ء)،ص:۳۴

۷۔ شہر یار، کلیاتِ شہر یار،(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء)،ص:۱۹۱

۸۔ وحید اختر،پتھروں کا مغنی،(علی گڑھ: اردو گھر،۱۹۶۶ء)،ص:۱۷

۹۔ بشر نواز،رایگاں،(اورنگ آباد: دکن پبلشرز،۱۹۷۲ء)،ص: ۱۷

۱۰۔ انیس ناگی،بیگانگی کی نظمیں(کلیاتِ شعر)،(لاہور: تخلیقات،۲۰۰۰ء)،ص:۱۸۷

۱۱۔ ایضاً،ص: ۳۴۵

۱۲۔ ایضاً،ص:۴۲۱

۱۳۔ شہر یار، کلیاتِ شہر یار،(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء)،ص:۲۴۳

۱۴۔ ستیہ پال آنند،ستیہ پال آنند کی ساٹھ منتخب نظمیں،انتخاب،فاطمہ حسن،(کراچی: شہرزاد،۲۰۱۵ء)،ص: ۶۷

۱۵۔ شکیل الرحمن ،ڈاکٹر،فلیپ،ستیہ پال آنند کی ساٹھ نظمیں،انتخاب فاطمہ حسن،(کراچی:شہرزاد ،۲۰۱۵ء)

۱۶۔ ستیہ پال آنند،ستیہ پال آنند کی ساٹھ منتخب نظمیں،انتخاب،فاطمہ حسن،(کراچی: شہرزاد،۲۰۱۵ء)،ص: ۱۵

۱۷۔ شہر یار، کلیاتِ شہر یار،(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء)،ص:۱۷

۱۸۔ وحید اختر،شب کا رزمیہ،(حیدر آباد: مکتبہ ٔ شعروحکمت،۱۹۷۳ء)،ص:۶۱

۱۹۔ ندا فاضلی،شہر میں گاؤں،(کراچی: رنگ ادب پبلی کیشنز،۲۰۱۵ء)،ص:۳۸۷،۳۸۸

۲۰۔ ایضاً،ص:۴۰۴،۴۰۵

۲۱۔ بشر نواز،رایگاں،(اورنگ آباد: دکن پبلشرز،۱۹۷۲ء)،ص: ۲۱

۲۲۔ ندا فاضلی،شہر میں گاؤں،(کراچی: رنگ ادب پبلی کیشنز،۲۰۱۵ء)،ص:۷۴

۲۳۔ بشر نواز،رایگاں،(اورنگ آباد: دکن پبلشرز،۱۹۷۲ء)،ص: ۵۶

۲۴۔ گلزار،رات پشمینے کی ،(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۹ء)،ص:۳۴

۲۵۔ احمد ندیم قاسمی،مضمون،رات پشمینے کی،(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۹ء)،ص:۱۱

۲۶۔ گلزار،رات پشمینے کی ،(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۹ء)،ص:۴۷

۲۷۔ زبیر رضوی،سبزۂ ساحل،(دہلی: ذہن جدید،۲۰۰۸ء)،ص:۳۵

۲۸۔ احمد ندیم قاسمی،دیباچہ ،چاند پکھراج کا،(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۹ء)،ص:۱۰،۱۱

۲۹۔ آفتاب اقبال شمیم،نادریافتہ(کلیات)،مرتبہ ڈاکٹر سعید احمد،(اسلام آباد: پورب اکادمی،۲۰۱۶ء)،ص:۶۳۷

۳۰۔ محمد سلیم الرحمٰن،نظمیں،(لاہور: قوسین،۲۰۰۲ء)،ص:۵۶

۳۱۔ ایضاً،ص:۴۰،۴۱

۳۲۔ سہیل احمد خاں،محمد سلیم الرحمن کی نظمیں ،مشمولہ ،(لاہور: سہ ماہی،معاصر،شمارہ اپریل تا دسمبر۲۰۰۴ء)،ص: ۲۸۰

۳۳۔ محمد سلیم الرحمٰن،نظمیں،(لاہور: قوسین،۲۰۰۲ء)،ص:۱۳۴

۳۴۔ ایضاً،ص: ۶۵

۳۵۔ ایضاً ۹۸

۳۶۔ ساقی فاروقی،رازوں سے بھرا رستہ،(لاہور: قوسین،۱۹۸۱)،ص: ۷۲

۳۷۔ محمد سلیم الرحمن،فلیپ،رادار از ساقی فاروقی،(لاہور: قوسین ،۱۹۷۸ء)

۳۸۔ معین نظامی،تجسیم،(مثال : پبلشرز،۲۰۱۵ء)،ص:۶۵

۳۹۔ سہیل احمد خاں ،ڈاکٹر،پیش لفظ ،تجسیم از معین نظامی،(فیصل آباد: مثال پبلشرز،۲۰۱۵ء)،ص: ۹

۴۰۔ معین نظامی،تجسیم،(مثال : پبلشرز،۲۰۱۵ء)،ص:۱۱۶

۴۱۔ ساقی فاروقی،رازوں سے بھرا رستہ،(لاہور: قوسین،۱۹۸۱ء)،ص: ۲۱

۴۲۔ ثروت حسین،آدھے سیارے پر،(لاہور: قوسین، ۱۹۸۷ء)،ص:۱۲۳

۴۳۔ سعادت سعید،ڈاکٹر ،کجلی بَن،(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،بار وال ۱۹۸۸ء)،ص: ۴۴

۴۴۔ شاہین مفتی،ڈاکٹر،جدید اردو نظم میں وجودیت ،(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۱ء)،ص:۴۱۰

۴۵۔ سرمد صہبائی،پل بھر کا بہشت،(لاہور: دستاویز مطبوعات،۲۰۱۲ء)، ص:۲۴

۴۶۔ ایضاً،ص: ۴۳

۴۷۔ ایضاً،ص: ۵۵

۴۸۔ ایضاً،ص: ۳۸

۴۹۔ عبدالرشید،انی کنت من الظالمین،(لاہور: سانجھ پبلی کیشنز،بار دوم ۲۰۱۱ء)،ص: ۲۹۸

۵۰۔ ابرار احمد، آخری دن سے پہلے، (لاہور: گورا پبلشرز،۱۹۹۷ء)،ص:۵۶

۵۱۔ علی محمد فرشی،علینہ،(راولپنڈی: حرف اکادمی،۲۰۰۲ء)،ص: ۴۵

۵۲۔ نصیر احمد ناصر،عرابچی سو گیا ہے،(لاہور: سانجھ پبلی کیشنز،اشاعت سوم ۲۰۱۳ء)،ص: ۱۷

۵۳۔ ایضاً،ص: ۳۷

باب ہفتم

خواتین نظم نگاروں کے موضوعاتی وہیئتی اشتراکات

جدید اُردو نظم گو شاعروں کے ساتھ ساتھ شاعرات نے بھی نظم نگاری میں خوب نام کمایا ہے۔بل کہ بعض شاعرات تو شاعروں سے بھی زیادہ مقبولیت اور انفرادیت رکھتی ہیں۔ شاعرات کی نظموں میں وہی حسیت ،وہی علائم ورموز، تلمیحات واستعارات موجود ہیں جو مرد شعرا کی شاعری کا حصہ ہیں لیکن عورت کے مسائل کچھ مختلف بھی ہیں ۔جدید اردو نظم کی شاعرات کی شاعری میں خاص طور پر مماثلت نظر آتی ہے کیوں کہ عورتوں کے دکھ اور سکھ یکساں ہوتے ہیں۔عورتوں کے خواب اور عذاب بھی مشترک ہوتے ہیں۔ شاعرات کے یہاں تانیثیت کی رو اور روایت نمایاں انداز میں ملتی ہے۔ انھوں نے تانیثیت کو بیان کرتے ہوئے تحریک سے زیادہ رویے پر زور دیا ہے۔ اسی لیے بیشتر شاعرات کے یہاں معتدل اور متوان انداز فکر ملتا ہے۔ کچھ شاعرات کی شاعری میں مزاحمتی فضا بھی ملتی ہے اور ان کے لہجے میں مردانہ جرات وجسارت کی جھلک نظر آتی ہے۔ متعدد شاعرات نے اس طرح کا مزاحمتی اور احتجاجی رویہ اختیار نہیں کیا کہ مرد اور مردانہ معاشرے کا وجود منہدم ہو جائے۔ انھوں نے مرد اور عورت دونوں کے مسائل کو سنجیدگی سے بیان کیا ہے اور مردانہ معاشرے سے مکالمہ کرتے ہوئے زیادہ درشتی اور کرختگی اختیار نہیں کی۔شاعرات کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے محسن نقوی لکھتے ہیں:

> ’’صنف نازک نے اردو ادب کی ترویج واشاعت میں بھر پور کردار ادا کیا ہے۔۔۔ہندوستان میں سیاسی شکست وریخت ،سماجی نشیب وفراز اور معاشرتی اقدار کی تعمیر وتخریب کے دور میں عورت کومعاشرہ میں آزادی اظہار کا حق چار دیواری سے باہر حاصل نہیں تھا۔۔۔حالات کے بدلنے کے ساتھ سماجی اقدار نے بھی پیرہن بدلنا شروع کیا تو خواتین کے ادراک وآگہی اور شعور نے بھی اظہار کی راہ تلاش کرنا شروع کی۔‘‘(۱)

عورت کو ماں ،بہن ،بیٹی ،بیوی اور محبوبہ کے لبادے سے نکل کر ایک جنس"عورت"کی شناخت حاصل کرنے میں بہت وقت لگا ۔۱۸۵۷ء کے بعد عورتوں کی تعلیم وتربیت پر توجہ دی گئی ۔تعلیم نسواں ،آزادی اور مساوی حیثیت تو بہت بعد میں عورت کو ملی۔ ترقی پسند تحریک نے سب سے پہلے حقوق نسواں کا ادبی نعرہ لگایا ،اس دور میں عورتیں جدید علوم اور شعور کی روشنی سے فیض یاب ہوئیں،اس بارے میں رشید امجد رقم طراز ہیں:

> ’’۱۹۳۶ء کی ادبی تحریک نے جہاں مرد اہل قلم کو متاثر کیا اور فکر واسلوب کی نئی راہیں متعین کیں۔وہیں خواتین کو بھی حیات وکائنات کے مسائل پر نئے زاویے سے سوچنے پر آمادہ کیا۔چناں چہ پیرائے اظہار کی اس روش میں بھی تبدیلی آئی جو روایت کی اندھی پرستش سے عبارت تھی زندگی کی رواں

دواں حقیقتوں پر نگاہ ڈالنے سے خود بینی و جہاں بینی کا ایک نیا انداز وجود میں آیا اور ادب وشعر کو وہی آگاہی نصیب ہوئی جو ا س سے پہلے نہ تھی۔''(۲)

اس تحریک نے بارش کے پہلے قطرے کی صورت میں مشرقی تخلیقی صلاحیتوں کی حامل شاعرات کو برسنا سکھایا ۔انھوں نے اپنے خوابوں اور احساسات کو شاعری میں بیان کرنا شروع کر دیا۔ اس دور میں تانیثیت کی تحریک جو امریکن عورتوں میں رواج پا چکی تھی مشرقی عورتوں برصغیر کی شاعرات میں عام ہونے لگی۔ ان شاعرات میں بیک وقت تانیثی حسیت جلوہ گر ہے۔ ان کی شاعری میں نسائی حقوق ضبط کرنے کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوتی ہے۔ نسائی حسیت سے متعلق خالدہ حسین رقم طراز ہیں:

''نسائی حیثیت سے مراد ہے کہ عورت جس طرح زندگی کو دیکھتی اور بسر کرتی ہے وہ مرد سے مختلف ہے۔ تحقیق بتاتی ہے کہ ہر انسان وقت کو اپنے حوالے سے پہچانتا ہے۔یعنی اس کا وقت کا تصور ذاتی اور داخلی نوعیت رکھتا ہے۔ اسی طرح عورت کا وقتکے ساتھ زمانی احساس مرد سے مختلف ہے کیونکہ اس کے شب وروز اور معاملات وسائل کی نوعیت منفرد ہے ---وہ جب موسموں ،رتوں ،رنگوں ،خوشبوؤں کا تجربہ کرتی ہے اس کے تلازمات میں ممتا اور بیٹی ،بہن اور بیوی کی ذات شامل ہے۔ یوں شعر میں عورت کی شخصیت ایک منفرد نقطہء نظر کی صورت اختیار کرتی ہے تو ہم اسے نسائی حسیت کا نام دیں گے۔''(۳)

نسائی حسیت کے ساتھ تانیثیت کی تحریک بھی خواتین کی شاعری میں نظر آتی ہے۔عورت پر جو بیتی اور وہ جس نفسیاتی دباؤ کا شکار ہوئی ،وہ سب استعاراتی شکل میں جدید اردو نظم کی شاعرات نے اپنی تخلیقات میں پیش کر دیایہی وجہ ہے کہ جدید نظم کی شاعرہ آج اپنی تصویر شعری مجموعے پر آویزاں کرتے ہوئے گھبراتی نہیں بل کہ اس نے اپنے شعری مجموعوں کے نام اپنی جنس کے مطابق رکھ لیے ہیں۔ اس کی عمدہ مثال ادا جعفری کا شعری مجموعہ ''میں ساز ڈھونڈتی رہی''اورکشور ناہید کے ''میں پہلے جنم میں رات تھی ''اور''دشت میں لیلیٰ''شامل ہیں۔جدید اردو نظم کی شاعرات عورت کی نفسیات کی عکاسی میں مرد شعرا سے بہتر نظر آتی ہے۔جدید اردو نظم کی معاصر شاعرات میں مرد اور عورت کے معاشرتی کرداروں ،ان کی کشمکش اور محبت کے رنگ نمایاں ہیں۔ کہیں شاعرہ اپنی ذات کی الجھنوں کو بیان کر رہی ہے اور کہیں وہ زنانہ تجربے کو تخلیق کا حصہ بنا رہی ہے ۔بہت سی شاعرات نے عورت کی محرومیوں اور احساسات کی عکاسی کی ہے اور نسائی باطن کے نازک اور لطیف احساسات کو شعری پیکر عطا کیا ۔ڈاکٹر رشید امجد خواتین نظم نگاروں کے فکروفن کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ہماری شاعرات میں صرف رومانی آرزو مندی ،ذہنی ونفسیاتی تطابق ،سپردگی اور بیگانگی جیسے موضوعات پر ہی سخن فرمائی نہیں کی بلکہ موجودہ دور میں پروان چڑھنے والے رجحانات ومحرکات اور اسالیب فکروفن سے بھی آگاہی حاصل کی ہے۔ ان کے شعری تجربے اپنے عہد سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔وہ عہد جن میں ہماری حسیتوں کو نیا طرز ملا جن کے حوالے سے ہم نے اپنے عہد کے انسانوں کے داخلی وخارجی ،نفسیاتی اور ورمانی مسائل کا مشاہدہ ومطالعہ ایک مختلف نقطہ نگاہ سے کیا ان کا ادراک ہماری جدید دور کی شاعرات کو بخوبی ہے۔''(۴)

خواتین نظم نگاروں نے سماجی تعصبات ،محبت اور وفا کی خواہش،انا کی تعمیروشکستگی سے لے کر معاشرتی رویوں اور رجحانات کو موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے عورت ذات کے ساتھ روا رکھے جانے والے منفی تفاوت اور منافقانہ رویے کو بھی بے نقاب کیا ہے۔ ان کی توانا تخلیقی صلاحیتوں سے نسائی نفسیاتی عناصر ابھر کر سامنے آئے۔ادا جعفری کی ابتدائی شاعری میں کلاسیکی رنگ نظر آتا ہے بعد میں انھوں نے الگ ڈکشن اور منفرد انداز اپنالیا ۔ان کے یہاں موضوعاتی تنوع دکھائی دیتا ہے۔ان کے یہاں فطرت کچھ اداس اداس دکھائی دیتی ہے۔ انھوں نے خوشی اور غم آمیز کر دیے ہیں۔ نظم ''جو ہی کی کلیاں'' ملاحظہ کیجیے:

فلک سے چاند کی مفرور کریں
وفورِ شوق سے مسرور کرنیں
برائے سیرِ گل آئی ہوئی ہیں
زمیں تا آسماں چھائی ہوئی ہیں
سرمژگاں ستارے کانپتے ہیں
کہ جوہی کے شگوفے کھِل رہے ہیں
(۵)

ادا جعفری نے مناظر فطرت کو اپنی شاعری میں نہایت ندرت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ادا کی نظموں میں احتجاج اور بغاوت کی آواز بلند ہونے لگی تو انھوں نے استعاراتی انداز اپناتے ہوئے مناظر فطرت کچھ اس طرح سے بیان کیے،آزاد ہیئت کی نظم''یہ مرے دل کو خیال آتا ہے'' دیکھیے:

دیکھ تو سرمئی آکاش پہ تاروں کا نکھار/رات کی دیوی کے ماتھے پہ چنی ہے افشاں/یا کچھ اشکوں کے چراغ/ہیں کسی رہگزر میں لرزاں/آہ یہ سرمئی آکاش،یہ تاروں کے شرار/وہم آتا ہے مگر/نغمہ ونے کا سہارا لے کر/زندگی چل بھی سکے گی کہ نہیں(٦)

ادا جعفری نسائی جذبات اور احساسات کو بیان کرتے ہوئے بھی فطرت سے ہم آہنگ نظر آتی ہیں۔انھوں نے ماں کی ممتا بیان کرتے ہوئے مظاہر فطرت کا استعمال کیا ہے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ادا جعفری نے اپنے جذبہ حب الوطنی کا بھر پور اظہار کیا۔ان کی حب الوطنی اور حب انسان کے جذبے سرشار نظم "سانجھ سویرے" عمدہ مثال ہے۔اس نظم میں انھوں نے نسوانی پیکر اور نسوانی پن کی عکاسی کی ہے۔ایسا بعد کی شاعرات کی شاعری میں بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ابتدا میں ادا جعفری اقبال سے متاثر رہیں اور ''غزالاں تم تو واقف ہو'' میں فیض کا اثر قبول کیا۔ادا جعفری نے پہلی بار جدید اردو نظم میں نسائی لہجے کو تقویت دی اس بارے ڈاکٹر عنبرین منیر رقم طراز ہیں:

> ''ادا جعفری اردو شاعری کے افق پر نسائی لب ولہجہ کے ساتھ چمکنے والی وہ چاندنی ہیں جنھوں نے آنے والے کہکشاؤں کے لیے راستہ ہموار کیا۔ ''(۷)

ادا جعفری نے ذات ،کرب اور تنہائی کے موضوعات کے ساتھ اجتماعی رویوں کو نئے نسائی نقطۂ نظر سے دیکھا ،انھوں نے ان افکار کو پیش کرنے کے لیے جرات کی برقی رو کا استعمال کیا۔انھوں نے مشرقی سماجی کی عورت کی بے بسی ، مجبوری، لاچاری اور گھٹن سے پیدا ہونے والے مسائل اور نفسیاتی الجھنوں کی ترجمانی کی ہے۔ نظم ''التفات گریزاں'' میں ادا جعفری نے مشرقی عورت کی محبت کے بھرے جذبات بیان کیے ہیں۔اس نظم میں انھوں نے نسائی لہجے میں عورت کے جذبات بیان کیے ہیں۔ وہ عورت کے اندر پائے جانے والے احساس کمتری کو بخوبی سمجھتی ہے۔ اس لیے انھوں نے احتجاجی انداز میں ''تعمیر نو'' کے خوابوں کو اپنی نظموں میں پیش کیا ہے۔ ان کی شاعری اس دور میں عورت کو اعتماد دلانے میں مددگار ثابت ہوئی۔ادا جعفری کی آزاد ہیئت کی نظم''بیزاری''دیکھیے:

قہر ہے اف یہ تسلسل،یہ تواتر یہ جمود/یہ خموشی، یہ تسلی ،یہ گرانبار سکوت/شوق کو رخصتِ پرواز نہیں/رفعت روح کا درباز نہیں(۸)

ادا نے اس نظم میں عورت کی نارسائی اور نامرادی کو بڑے واضح انداز میں بیان کیا ہے،عورت احساس کمتری میں مبتلا دل ہی دل میں خواہش کرتی ہے۔عورت میں احساس کمتری پیدا کرنے کے لیے معاشرے نے اس کے ساتھ کم عقلی اور کمزوری وابستہ کر رکھی ہے۔اسے روایت کو قبول کرنے کے لیے خوف میں مبتلا کر دیا گیا ہے اس لیے وہ کچھ نیا قدم اٹھانے کے لیے ڈرتی ہے،ادا جعفری نے عورت سے یہ ڈر نکالنے کی کوشش کی ہے اور اسے ہمت وحوصلہ دیا ہے اور نئے عزم ویقین سے اپنی دنیا جنت بنانے کی تلقین کی ہے اس ضمن میں نظم ''لرزاں سائے''اہم۔مخمس کی ہیئت میں لکھی نظم کا نمونہ دیکھیے:

یہ کانپتے ہوئے تارے، یہ مہتاب جواں
یہ ناز آفریں گل اور یہ نازنیں گلیاں
ہے ایک جلوہ رنگیں کا منتظر بستاں

بس اک نگاہ سے محشر جگا تو سکتی ہوں
میں اپنی دنیا کو جنت بنا تو سکتی ہوں
(۹)

ادا جعفری نے اپنی نظموں میں مشرقی عورت کو عزت ،غیرت اور آباواجداد کی روایات کی بھینٹ چڑھانے کے واقعات کی عکاسی کی ہے،یہ روایت زبردستی عورت کا سرمایہ حیات بنا دی گئی ہے۔انھی روایات کی پاسداری کرتے کرتے عورت زندگی گزار دیتی ہے۔مشرقی عورت جب اپنے حق کی بات کرتی ہے تو اسے گناہ سمجھا جاتا ہے اور اَن گنت اس کے دشمن بن جاتے ہیں۔ سماجی کی اس دشمنی کا خوف اس کے سینے میں دھڑکتا رہتا ہے ادا جعفری نے اپنے شعری مجموعے''شہردرد'' میں عورت کی بے بسی اور مجبوری اور بے قراری کو نظم''اعتراف'' میں بیان کیا ہے۔ادا جعفری کی متعدد نظموں میں عصری شعور بھی ملتا ہے۔ ان کے شعری مجموعے ''غزالاں تم تو واقف ہو'' کی نظموں'' کوئی پیماں نہیں''،رنگ کے روپ ہزار اور''مسجد اقصیٰ'' میں سماجی مسائل کا ذکر ملتا ہے۔ان کی نظم ''ضدی'' میں داخلی واردات کا اظہار ملتا ہے۔ادا نے اپنی نظموں میں شعوری احتجاج نہیں کیا بل کہ ان کی نظموں میں عورت کا احتجاجی پہلو عورتوں کے کرب اور مجبوری کی وجہ سے ہے۔ ان کی شاعری میں اپنے دین،کلچر اور وطن سے محبت کا احساس ہوتا ہے۔

ساجدہ زیدی نے ادا جعفری اور دیگر معاصر شاعرات کی طرح عورت کے تشخص پر زور دیا اور سماجی ،سیاسی اور معاشرتی مسائل کو بھی موضوع بنایا ۔ان کی نظم ''کھنڈر'' میں فرقہ واریت اور فسادات کا شکار ہونے والی لڑکی کی ذہنی وقلبی کیفیات کو بیان کیا ہے:

کوئی بتا دے کہ کھنڈرات کے اندھیرے میں
کہاں تلک
اپنی زخمی حیات لے کے پھروں؟
کوئی بتا دے کہ اس رنگ وبو کی دنیا میں
میں کب تک یہ لٹی کائنات لے کے پھروں

(۱۰)

اس نظم میں ساجدہ زیدی نے اس زخم کوردہ لڑکی کے جذبات واحساسات بیان کیے ہیں جس کا سارا کنبہ جلا ڈالا گیا۔اب اس کی زندگی بے مقصد ہو گئی ہے اسے زیست میں ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آرہا ہے۔ساجدی زیدی نے اپنی شاعری میں عورت کی شخصی محرومیت کا ذکر بھی کیا اہے۔مغربی تعلیم آزادی اور سماجی انقلاب نے عورت کی شخصیت کو شناخت عطا کی۔ ساجدہ کی شاعری اس بات کا تخلیقی اظہار ہے کہ انھوں نے لوگوں کی بے بسی ،بے کسی اور دور حاضر کے مسائل اور انسان کی تنہائی اور کرب کو بڑے واضح انداز میں بیان کیا ہے۔اس ضمن میں انھوں نے استعاراتی انداز اپنایا ہے:

تم مجھے روح کے سناٹوں کی سوغاتیں دو
میں تمھیں نذر کروں تحفۂ مجبوری زباں
تم مری ذات کی تنہائی میں اترو
انھیں غاروں میں کہیں کھو جاؤ

(۱۱)

ساجدہ زیدی کی شاعری میں تانیثی رویے اور حسیت نمایاں نظر آتی ہے ۔انھوں نے مختلف موضوعات کو خود ساختہ چناؤ کے ذریعے پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ نسوانی جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے انھوں نے نظم''وہ پل یہ گھڑی''میں ایک ماں کی اپنے بچےکے لیے پنپنے والی محبت کو محسوس کیا ہے۔ اس نظم میں ساجدہ نے اپنے بچے کی پیدائش سے اس کی جدائی تک کی عکاسی کی ہے۔ساجدہ نے یہ بتانے کی سعی کی ہے کہ ایک ماں کس طرح اپنے بچے کی پرورش کرتی ہے لیکن اسے ایک عورت سمجھ کر وہ مقام نہیں دیا جاتا جس کی وہ حق دار ہے۔ انھوں نے عورت کی عزت ومقام پر زور دیا ہے۔ساجدہ زیدی نے اپنی نظموں میں ہندوستان کے سیاسی،سماجی اور معاشی مسائل کو بے نقاب کیا ہے انھوں نے نظم ''سال اطفال اور سیاسی بازیگر''میں ہندوستان کی سچی تصویر کشی کی ہے۔اس نظم میں انھوں نے ہندوستان کی سماجی صورت حال اور تلخ حقائق کو پیش کیا ہے۔ اس مرحلے میں وہ اشتراکی نظریے کے قریب تر دکھائی دیتی ہیں۔ انھوں نے بے انصافیوں ،محرومیوں ،ظلم وجبر اور استحصال کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔ ساجدہ زیدی نے اپنی شاعری میں امن ،محبت اور رواداری کا پیغام دیا ہے ،وہ ملک میں انتشار اور بدامنی کی صورت حال سے سخت نالاں ہیں،ان کی شاعری میں ا یک عورت کے اندر پنپنے والی مامتا کے جذبات بھی نظر آتے ہیں جو اپنے نونہالوں کو کسی مصیبت میں دیکھ کر تڑپ اٹھتی ہے ،ایسے جذبات سے مملو نظم''میرے نو نہالوں کی'' ملاحظہ کیجیے:

یہ میری چھاتی ،جو دودھ کی آبشار تھی/اس سے خون کی نہریں ابل رہی ہیں/عجیب سا درد کوکھ میں اٹھ رہا ہے/دیکھو،جفاشعاروں/عجب سی آگ میرے سینے میں جل رہی ہے/مری نگاہوں کے سامنے/مرے نونہالوں کی تین لاشیں پڑی ہیں(۱۲)

ساجدہ زیدی نے انسانی رنج وغم کو بڑے قریب سے دیکھا ہے ،اس دنیا میں انسان کی کوئی قدروقیمت نہیں اسے صرف دولت کے انبار میں تولا جاتا ہے ،اسی وجہ سے پورے ملک میں انتشار اور بے یقینی پھیلی ہوئی ہے ہرشخص مادہ پرست ہو گیا ہے اور دولت وشہرت کے حصول کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے ۔انسان کا خون بہت سستا ہو گیا ہے۔ اس لیے جگہ جگہ بہایا جا رہا ہے۔ساجدہ زیدی ایسی صورت حال میں سخت مایوس ہو جاتی ہیں انھیں اپنے ملک کے حالات کی بہتری کی کوئی امید نظر نہیں آتی،انھوں نے عصری مسائل اور ہنگامی موضوعات کو بھی نظموں کا حصہ بنایا ہے۔ انھوں نے گجرات میں ہونے والے ہندو مسلم

فسادات کے دوران مسلمانوں پر ہونے والے ظلم وستم کے خلاف آواز اٹھائی ،اس موضوع پر انھوں نے گجرات کے شہیدوں کے نام ایک نظم''نسل کشی''کے نام سے لکھی:

عجب عیار دہشت قوت کی خدائی ہے/کہ مجبوروں پہ دنیا تنگ ہے /دریائے خوں میں ڈوبتی ہیں/ان کی تقدیر میں/لہو انسان کا ارزاں ہے(۱۳)

ساجدہ زیدی نے اپنی شاعری میں زندگی اور اس کے مسائل بیان کیے ہیں انھوں نے ''کلیاں۔۔نیلا آسمان۔۔زنجیریں''میں علامتوں کا بڑا دلکش استعمال کیا ہے۔ انھوں نے تانیثی حسیت کی حامل نظمیں بھی لکھی ہیں اور ان میں عورتوں کے احساسات وجذبات ،آرزوئیں بیان کی ہیں۔ انھوں نے عورت کے کچھ خواب بیان کیے جن کو پانے کے لیے وہ سخت اضطراب کا شکار نظر آتی ہے۔ کیوں کہ ا نھیں پانے کے لیے اس مردانہ معاشرہ نے اس کے پاؤں میں زنجیریں ڈال رکھی ہیں۔ ساجدہ نے علامتی انداز اختیار کرتے ہوئے عورت کی مجبوری،محرومی اور بے بسی کو بیان کیا ہے۔ساجدہ زیدی نے شعری نظریات اور موضوعات کے بارے میں ڈاکٹر وسیم بیگم رقم طراز ہیں:

> ''ساجدہ کی شاعری کسی بھی تحریک سے براہ راست متاثر نظر نہیں آتی لیکن ذہنی طور پر وہ ترقی پسند تحریک سے ضرور قریب ہیں۔ پھر بھی انھوں نے ترقی پسند شعرا کی مانند انقلاب کے نغمے نہیں گائے نہ ان کے یہاں وہ انتہا پسندی نظر آتی ہے جو ان شعرا کا خاصہ تھی۔''(۱۴)

ساجدہ زیدی نے انسان اور زندگی سے متعلق چھوٹے چھوٹے موضوعات اور مسائل کو اپنی نظموں کا حصہ بنایا ہے۔انھوں نے ملک کے سیاسی ،سماجی اور معاشی مسائل کو بھی اپنی نظموں میں شامل کیا ہے۔زاہدہ زیدی کی ابتدائی نظموں میں رومانیت ھاوی ہے اور انھوں نے منزل کے حصول کی مستقل جدوجہد اور بلند حوصلے کو علامتی انداز میں بیان کیا ہے۔ زاہدہ کا رومانوی انداز ملاحظہ ہو:

کیا ہوا اگر رہ پر خار میں زخمی ہیں قدم
آج بھی حوصلۂ جہد وفا چور نہیں
نئے انداز سے بیتابی دل کہتی ہے
سرحد منزل جاناں بھی بہت دور نہیں

(۱۵)

زاہدہ زیدی نے آزادی کے بعد پیدا ہونےو الی صورت حال کو بھی موضوع بنایا ہے۔ تقسیم کے نتیجے میں کئی اپنوں سے بچھڑگئے ،کئی شہروں میں جا آباد ہو گئے ،اس طرح انسان تنہائی کا شکار ہو گئے ،تنہائی کی اسی صورت حال کو شاعرہ نے علامتی انداز میں بیان

کیا ہے،انسان جب تنہائی میں گھرا ہوتا ہے تو اسے ہولناکی سناٹا سنائی دیتا ہے،''تنہائی '' اس نوع کی اہم نظم ہے۔زاہد ہ نے بھی عصری حسیت کو علامتی انداز میں بیان کیا ہے۔ اور متعدد سماجی مسائل کو بے نقاب کیا ہے۔ انھوں نے دور حاضر کے انسان کی بے بسی،بے چارگی اور مجبور زندگی کو موضوع بنایا ہے۔مثال کے طور پر نظم''سیاہ آئینے'' دیکھیے:

میں کب سے قید ہوں/بتاؤ کب سے قید ہوں/سیاہ آئینوں کے درمیان/سیاہیوں کے آفریدہ /یہ سیاہ دل ،سیاہ بطن آئینے /کہ جن کے ولولے سیاہ ہیں/کہ جن کے قہقہے سیاہ ہیں(۱۶)

زاہدہ نے اس نظم میں یہ بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ آج کا انسان کس طرح مجبوریوں میں قید ہے، اس نظم میں شاعرہ نے موثر علامتی اسلوب استعمال کیا ہے،سیاہ برائی کی علامت ہے اس نوع کی دوسری نظم "رات کی تیرگی" میں انسان پر ہونے والے ظلم کو علامتی زبان میں بیان کیا گیا ہے،انھوں نے طاقتور کو کمزور پر رات کی تاریکی میں وار کرتے دکھایا ہے۔زاہدہ زیدی نے اس نظم میں ہندوستان کے اقلیتی طبقے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ کس طرح ان پر ظلم وستم کیے جاتے ہیں اور رات کی تاریکی میں انھیں اٹھا کر قتل کر دیا جاتا ہے اور لاشوں کو دفن یا جلا دیا جاتا ہے کہ کوئی پوچھ بھی نہ سکے کہ قتل ہونے والا کون تھا۔ شاعرہ نے معصوم لوگوں کی جانوں سے کھیلنے والے طبقے کو مذمت کا نشانہ بنایا ہے۔زاہدہ نے بھی عورت کی شخصیت ، اس کی حیثیت اور کردار کو پیش کیا ہے کہ عورت کی اہمیت اور وجود نہ ہونے کے برابر ہے۔ شاعرہ نے نسوانی جذبے سے کہا ہے کہ روز ازل ہی سے مرد عورت پر طرح طرح کے ظلم ڈھاتا ہے ۔اسے کم تر سمجھتا ہے جب کہ دور حاضر کی عورت تعلیم یافتہ ہے اور مرد کے برابر صلاحیتیں دکھا رہی ہے۔ زاہدہ نے عورت کو مظلوم شکل میں پیش کیا ہے دیہاتوں میں کس طرح عورت پر ظلم کیا جاتا ہے،انھوں نے معاشرے میں تیزی سے پھیلتی ہوئی جہیز کی لعنت کو موضو ع بنایا ہے۔

زاہدہ زیدی نے استعاراتی انداز میں عورت اور مرد کے فاصلے اور امتیازات کو مٹانے کی کوشش کی ہے جو دنیا میں قائم کیے ہوئے ہے،عورت کی ایک اپنی شناخت اور شخصیت ہے جس کو جھٹلایا نہیں جا سکتاشاعرہ نے حقوق نسواں کے لیے آواز بلند کی ہے۔انھوں نے کمزور طبقے پر ہونےو الے ظلم وستم کی عکاسی کی ہے۔ ان کی نظم ''پشیمان دھرتی'' اس حوالے سے اہم ہے۔ زاہد ہ کی شاعری میں عورت کی شخصیت کو منتشر دکھایا گیا ہے عورت نہ صرف ذہنی بل کہ جسمانی اذیت کا شکار بھی ہے۔ نظم ''جنگل'' میں زاہدہ نے عورت کے تشخص کی تلاش کی ہے:

زخم خوردہ/بھٹکتے قدم/خودبخود رک گئے/کوئی انسان مجھ کو ملے اگر/توپوچھوں/کہ کیا میں ابھی تک/وہی شعلہء اندام/سیماب پا(۱۷)

اس نظم میں شاعرہ نے یہ ظاہر کیا ہے کہ عورت پر اتنے ظلم وستم ہو رہے ہیں کہ اب اس کی روح بھی زخمی ہے اور اس ظالم سماج میں بھٹکتے بھٹکتے اس کے قدم تھک گئے ہیں،اس کے باوجود بھی آج کی عورت کہتی ہے کہ اب بھی میرے اندر وہ دم خم موجود ہے

۔زاہدہ نے دور حاضر کے انسان کی الجھنوں ،پریشانیوں سے بوجھل زندگی کی عکاسی کی ہے ،نظم ''وہ بارگراں''میں بوجھ تلے دبی زندگی اور انسان کی مجبوریوں کا ذکر کیا ہے۔زاہدہ نے عصری مسائل کا ذکر کیا ہے۔ اور بڑے شہروں میں آبادی میں اضافے کے بعد پیدا ہونے والے مسائل کو بیان کیا ہے ۔دیہات سے شہروں کی طرف منتقل ہونے والے لوگوں کے سر پر زندگی کے بوجھ لیے حالات کے تھپیڑے کھاتے ہوئے دکھایا ہے۔ زاہدہ نے اپنی شاعری میں دیہاتوں اور بڑے شہروں کی حقیقی تصویر پیش کی ہے۔ زاہدہ نے اپنی شاعری میں تنہائی کی کیفیات کو بھی بیان کیا ہے،جسے بعد میں پروین شاکر اور دوسری شاعرات نے اپنایا۔ ساجدہ کی طرح انھوں نے بھی ملک میں ہونے والے فسادات کا ذکر کیا ہے،عام آدمی فسادات میں جن اذیتوں سے گزرا ،اس کی عکاسی دل سوز انداز میں نظم ''فسانۂ درد بے زباں ہے'' میں یوں بیان کی ہے:

ہوا میں آہٹ ہے سسکیوں کی/فضا میں بو خون کی بسی ہے/برہنہ لاشیں/خلا میں چشم حیرت سے تک رہی ہیں/ہیں جن میں لاکھوں سوال پنہاں(۱۸)

زاہدہ نے اپنی متعدد نظموں میں یہ بتایا ہے کہ ایک عورت کی تصوراتی دنیا تو بہت اچھی ہوتی ہے جہاں اسے ہر طرح کی آزادی حاصل ہوتی ہے ،وہ ہر کام اپنی مرضی سے کر سکتی ہے لیکن حقیقت میں اسے سماج کی درجنوں رکاوٹیں سنہا پڑتی ہیں۔زاہدہ زیدی کی شاعری کا دائرہ وسیع ہے انھوں نے عصری مسائل کو تازگی اور نئے احساس کے ساتھ بیان کیا ہے۔ انھوں نے معاصر شاعرات کی طرح ملکی فسادات ،انسان کے دردوکرب،بچوں، عورتوں اور کمزور طبقے پر ہونے والے ظلم وستم کو موضوع بنایا ہے۔ ان کی شاعری ایک زخمی دل اور گھائل روح کی حامل شخص کی شاعری ہے،انھوں نے سانحہ کربلا کو بھی عصری تناظر میں دیکھا ہے۔

شفیق فاطمہ شعریٰ نے اپنی شاعری میں مذہبی،تاریخی اور ملکی حالات وواقعات کے ساتھ ساتھ عورت پر ہونے والے بے جا جبر کو معنی خیز علامتوں سے بیان کیا ہے۔انھیں اپنے وطن سے بے حد لگاؤ ہے ،انھوں نے ان ناسازگار حالات کا ذکر بھی کیا ہے جس کے نتیجے میں بے گناہ افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ان کی نظموں میں مایوسی طاری ہے۔شعریٰ نے اپنی شاعری میں عصری مسائل پر طنزیہ انداز بھی اختیار کیا ہے انھوں نے یہ بتایا ہے کہ آج کا انسان بے یقینی سے دوچار ہے۔،اسے اپنے اوپر بھروسا نہیں رہا،شاعرہ نے رومانوی انداز اپناتے ہوئے اپنی متعدد نظموں میں اپنے بیتے ہوئے دنوں کو یاد کیا ہے۔ وہ اپنے اچھے دنوں کو یاد کرتی ہے کہ اس وقت سکون ہی سکون تھا ان اچھے دنوں کی یاد شاعرہ میں بے چینی پیدا کرتی ہے۔ شفیق فاطمہ شعریٰ نے اپنے وطن کی یاد میں نظم''یاد وطن'' لکھی ہے۔انھوں نے وطن کی یاد کو قدرتی مناظر کے ساتھ پیش کیا ہے۔نظم کا نمونہ دیکھیے:

پودے نہیں اکیلے/چھایا ہے ان کی سنگی ساتھی/پرآتما اکیلی/وادی کی گود میں چاند/درپن اچھالتا ہے/چاندی کا جگمگانا/وہ جھلملاتا منڈوا(۱۹)

شفیق فاطمہ شعریٰ نے عصری مسائل ،تاریخی اور ملکی رجحانات اور مذہبی اقدار کے ساتھ ساتھ عورت ذات کو بھی اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے ۔ انھوں نے عورت کو مرد کے برابر صلاحیتوں کی حامل قرار دیتے ہوئے اس پر بےجا سماجی پابندیوں کو سخت ناپسند کیا ہے۔ جس کی وجہ سے عورت احساس کمتری کا شکار رہتی ہے۔ انھوں نے عورت کو مرد کے مقابلے میں کمزور ،کم تر اور کم فہم وادراک کی حامل ہونے کو بڑے معنی خیز اشاروں کنایوں میں بیان کیا ہے۔انھوں نے اپنی نظموں میں مرد حضرات کو ظالم دکھایا ہے۔ جنھوں نے عورت کو بے جا گھر کی چاردیواری میں قید کر رکھا ہے اور اس کی صلاحیتوں سے فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا۔شعریٰ صاحبہ عورت کی بے بسی ،بے چارگی ، بے قراری اور بے چینی کو اپنی نظم''آزردہ قمری'' میں یوں بیان کرتی ہیں:

تمھاری سسکیوں کو سن رہاہوں میں چٹانوں میں/دہکتی جا رہی ہو تم/ابھر آؤ نہیں میں سنگدل/افسردہ قمری/انھوں نے کس دیے ہیں کیا شکنجے/ تمھارے خوش نما شہر پر/وہ تم سے کھل نہیں سکتے۔تو آؤ ،میں نہیں بے دست وپا(۲۰)

زہرا نگاہ کا نسائی لہجہ بھی اداجعفری کی طرح کا ہے۔انھوں نے عورت کی جذباتی اور نفسیاتی کیفیات کو سادہ انداز میں بیان کیا ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں عورت کے متعدد روپ پیش کیے ہیں کیوں کہ عورت عمر کے مختلف مراحل میں مختلف نفسیاتی کیفیات کی حامل ہے۔زہرا نگاہ کی نظموں میں معاشرتی رویوں پر نکتہ چینی کی گئی ہے اور زیادہ تر نظموں میں دیگر موضوعات شامل کیے گئے ہیں۔ ان کی متعدد نظموں میں ایک ایسی عورت کو موضوع بنایا گیا ہے جس کی شادی اس کی مرضی کے خلاف ایک رئیس گھرانے میں کر دی گئی ہے۔ اس لیے وہ روایتی عائلی اقدار نبھانے کے باوجود گھٹن محسوس کرتی ہے،یہ شعری اقتباس دیکھیے:

بال بال موتی پرواؤں
پور پور میں ہیرے پہنوں
کام کاج کا پلو ڈالے
دن بھر گھر سے الجھوں سلجھوں
رات کو لیکن آنکھیں موندے
پچھلی رُت کا ساون دیکھوں
(۲۱)

ہمارے معاشرے میں یہ عام رواج ہے کہ والدین بیٹیاں مال دار گھرانے میں بیاہتے ہیں تاکہ وہ عیش وعشرت اور آسائشوں بھری زندگی بسر کریں لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ بے

جوڑ شادیاں اور مادی آسائشیں عورت کی زندگی میں سکون پیدا نہیں کر سکتیں۔زہرا نے نظم''آنگن'' میں ایک ایسی ہی عورت کی کہانی بیان کی ہے جو مال ودولت اور آرائش وزیبائش کے ہوتے ہوئے بھی سسرال میں خوش نہیں۔ یہ متوسط طبقے کی عورت لگتی ہے جو اس خود غرض ماحول میں اجتماعی معاشرے کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس نظم میں شاعرہ نے جبر بھری زندگی اور ایک عورت کے کرب کو نمایاں کیا۔اسی نوع کی ایک دوسری نظم ''میری سہیلی''میں بھی انھوں نے ایک بٹی ہوئی عورت کی عکاسی کی ہے:

مری سہیلی وہ ساتھ کھیلی ، وہ میری باتوں کو جانتی ہے
وہ زیر لب مسکرا کے آہستگی سے ہر بات مانتی ہے
وہ مجھ سے کہتی ہے آؤ ہم پھر بتاؤ بوجھو کا کھیل کھیلیں
(۲۲)

زہرا نے اپنی نظموں میں صنف نسواں کو کشمکش کا شکار دکھایا ہے۔ اور اس کے لیے تشکیل کیے گئے معاشرتی ضابطوں کا خوب تذکرہ کیا ہے۔نظم''جرم وعدہ'' اس عورت کی کہانی ہے جو اپنے خواب اور خوشیاں اپنی اولاد کی تربیت اور آبرو کی بھینٹ چڑھا دیتی ہے۔اس نظم میں انھوں نے عورت کی نفسیاتی کشمکش اور معاشرتی ضابطوں کی تصویر کشی کی ہے۔ زہرا نے مشرقی عورت کو حیا اور وفا کا پیکر بنا کر پیش کیا ہے اور ذاتی تجربات بھی ایک عورت کی جذبات کی عکاسی کرتے ہوئے آمیز کر دیے ہیں۔عورت مرد کی رفاقت کبھی ختم نہیں ہو سکتی لیکن یہ رفاقت کبھی منافقانہ اور مصلحت آمیز ہوتی ہے ایک عورت کو اس کرب سے بھی گزرنا پڑتا ہے ۔زہرانگاہ نے مرد اور عورت کی اس رفاقت کو سمجھوتا قرار دیا ہے۔''سمجھوتا '' کے عنوان سے لکھی ان کی ایک نظم دیکھیے:

ملائم گرم سمجھوتے کی چادر
یہ چادر میں نے برسوں میں بنی ہے
کہیں بھی سچ کے گل بوٹے نہیں ہیں
کسی بھی جھوٹ کا تانکا نہیں ہے

(۲۳)

زہرا نگاہ اور ادا جعفری دونوں شاعرات کے یہاں اشتراک وانسلاک پایا جاتا ہے۔دونوں کے نسائی جذبات ایک جیسے یہ شاید یہ عورت ذات ہونے کی وجہ سے ہے کیوں کہ ایک عورت ہی دوسری عورت کا دکھ بہتر سمجھ سکتی ہے۔مرد اورعورت کی اس مصلحت آمیز رفاقت اور محبت مرد معاشرہ ہر طرح کا الزام عورت کو دیتا ہے اس لیے وہ اندر ہی اندر گھٹن اور اذیت کا شکار رہتی ہے۔ زہرانگاہ اس گھٹن کا اظہارنظم"دیوار" کرتی ہے۔ زہرانے عورت کی ہر عمر کے جذبات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے،انھوں نے عورت کی جوانی کی الجھنوں اور آسائش کو ہی بیان نہیں کیا بل کہ بڑھاپے کی کج رویں کا ذکر بھی کیا ہے۔ زہرا کہتی ہیں کہ بڑھاپے میں عورت کا نسائی حسن کم ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کا غرور ،بانکپن اور شرم وحیا وجھجک جاتا رہتا ہے۔ اور اسے اپنا مقام واہمیت چھن جانے کا دکھ ہوتا ہے۔ شاعرہ نفسیاتی حوالے سے کہتی ہے کہ اس عمر میں عورت کو توجہ کی ضرورت ہوتی ہے تا کہ وہ فرسٹریشن کا شکار نہ ہو۔زہرانے ا نسائی حسیت کو شاعری میں بیان کیا ہے ۔انھوں نے بھی ادا کی طرح کچھ عرصہ لکھنا ترک کر دیا تھا اور ایک مہذب نسائی آواز کے سے بکھیرے۔ زہرا کو اپنے وطن سے بے پناہ عقیدت ومحبت ہے وہ کراچی کے حالات دیکھ کر اضطراب کا شکار ہوئیں ۔ان کی شاعری انسان سے محبت اور انسانیت کا تحفظ ہے نظم ’’سناٹا‘‘ عصری حالات بیان کرتی ہے:

"سنا ہے جنگلوں کا بھی کوئی دستور ہوتا ہے/سنا ہے شیر کا جب پیٹ بھر جائےتو وہ حملہ نہیں کرتا/سنا ہے جب کسی ندی کے پانی میں بسئے کے گھونسلے کا گندمی سایہ لرزتا ہے/تو ندی کی روپہلی مچھلیاں اس کو پڑوسی مان لیتی ہیں/ہوا کے تیز جھونکے جب درختوں کو ہلاتے ہیں(۲۴)

اس نظم میں زہرا نے انسان کے حقو ق کی بات کی ہے ،انھوں نے انسان سے محبت اور انسنایے قائم کرنے کا کہا ہے۔ آپس میں امن وسکون سے رہنے کا کہا ہے۔ یہ ایک علامتی انداز کی نظم ہے جس میں مناظر فطرت کے سہارے ایک تلخ حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔زہرانگاہ ادا جعفری ،کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض کی طرح جبر کے خلاف قلم اٹھانے والی شاعرہ ہیں۔ انھوں نے روایتی انداز میں نسوانی جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ زہرانگاہ نے اپنی نظموں میں معاشرتی جبر کا شکار متوسط گھرانے کی عورتوں کی داخلی گھٹن کی عکاسی کی ہے۔ اور ان مسائل کو بیان کرنے کے لیے انھوں ن ے علامتی اور بالواسطہ طرز اظہار اختیار کیا ہے۔ زبان وبیان اور اسلوب کے حوالے سے وہ معاصر شاعرات کی طرح حد بندیوں میں جکڑی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ شاعرہ نے محبت بھرے جذبات کی جیتی جاگتی تصویر ہمارے سام نے رکھ دی ہے۔ان کی رومانوی طرز احساس کی نظم"شام کا پہلا تار" اہمیت کی حامل ہے۔زہرانگاہ کی شاعری میں نسوانی حسیت کی جا بجا دکھائی دیتا ہے،انھوں نے نسوانی حسیت کو ایک تحریک کے طور پر قبول کیا ،انھوں نے عورتوں کی کہانیوں کو بیان کیا اور ان کی قلبی واردات اور جذبات کو نظموں میں بیان کیا ہے۔ان کی نظم "جرم وعدہ" میں نسوانی حسیت شروع سے آخر تک ہے اس نظم میں انھوں نے اس عورت کی داستان سنائی ہے جو چاہتے

ہوئے بھی اپنی عزت وآبرو کا تحفظ نہیں کر سکی اور سربلندی سے اپنی زندگی بسر نہیں کر سکی،نظم ملاحظہ ہو:

مرے بچے/کہانی میں تھکی ہاری جو لڑکی تھی/وہ شہزادی نہیں میں تھی/وہ جادو کا محل جو ایک پل میں جل کے صحرا ہو گیا تھا،وہ مرا گھر تھا/جہاں آنکھوں کی سوئیاں رہ گئیں تھیں/خواب میرے تھے/وہ جن میں گھر گئی تھی/غیر کیا سب میرے اپنے تھے(۲۵)

زہرانگاہ نے اس نظم میں عورت کو معاشرے سے تھکا ہارا دکھایا ہے انھوں نے ہندوستان کے سیاسی وسماجی ماحول کی عکاسی کی ہے جہاں اقلیتوں اور عورت ذات کے ساتھ ہونےو الے امتیازی سلوک کی تصویر کشی کی ہے نظم کو دلچسپ بنانے کے لیے اسے شہزادی کی کہانی کے روپ میں پیش کیا ہے کیوں کہ پرانے زمانے میں عورتیں بچوں کو شہزادے اور شہزادیوں کے قصے کہانیاں سنا کر سلاتی تھیں۔ نظم''یہ خال وخد مرے اپنے'' میں بھی زہرا نے سیاسی وسماجی حالات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ زہرا نے اس نظم میں ملکی حالات کی خرابی کا ذمہ دار سیات دانوں کو ٹھہرایا ہے ان کے غلط فیصلوں کی وجہ سے دہشت گردی کو تقویت ملی ہے یہ کیسا وقت آگیا ہے۔شاعرہ امن وسکون کی خواہاں ہے۔ انھوں نے استعاراتی انداز میں حالات کی عکاسی کی ہے۔ جدید اردو نظم کی شاعرات میں یکسانیت ہے تقریباً سب کی شاعری میں مرد اور عورت کے باہمی رشتے اور تعلقات کا ذکر ملتا ہے،گھریلو ماحول ،شوہر اور بیوی کا جھگڑا وغیرہ کے موضوعات ملتے ہیں۔ زہرا نے نظم"ہمارے اور تمھارے راستوں میں"میں ازدواجی رشتوں کو بتانے کی ایک کوشش کی ہے۔انھوں نے اپنی نظموں میں زندگی کی متعدد سچائیوں کو بیان کیا ہے ،انھوں نے نسائی حسیت کو کئی تاریخی واقعات سے جوڑ کر بیان کیا ہے ،عورت کو مرد کے سامنے جھکنا پڑتا ہے اس کے حکم کی تعمیل کرنا پڑتی ہے یہ ہمارے سماج کا دستور ہے شاعرہ کہتی ہے کہ عورت ہمیشہ ناجائز دبایا گیا ہے۔زہرا نگاہ کی شاعری کے بارے میں ڈاکٹر وسیم بیگم رقم طراز ہیں:

> ''زہرا نگاہ نے نسوانی حسیت کو الگ ڈھنگ سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور یہ بھی گوش گزار کرایا ہے کہ عورت ہی میں وہ قوت اور عزم موجود ہوتا ہے جس سے وہ ناگزیر حالات سے بھی سمجھوتا کرتی ہے۔ نیز اپنی تما م آرزوؤں اور چاہتوں کو دفنا کر سمجھوتے کی چادر اوڑھ لیتی ہے۔''(۲٦)

زہرا نے اپنی نظموں میں جنسی بے راہ روی کا تذکرہ زیادہ نہیں کیا لیکن ان کے یہاں بھی جنسی جذبہ نسائی حسیت کے ساتھ موجود ہے۔انھوں نے انسانی مٹتی ہوئی اخلاقی اقدار کو بچانے پر زور دیا ہے اور انسانی رشتوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ انھوں نے عورت کو اپنی شخصیت اور حقوق کے لیے آواز اٹھانے کے لیے اکسایا ہے لیکن باغیانہ تیور نہیں دکھائے۔کشور ناہید ابتدا میں ایک مشرقی خاتون کے روپ میں نظر آتی ہیں اور بعد میں خواتین

کے حقوق کی آواز بلند کرتی ہیں۔ انھوں نے صرف عورت کی محرومیوں کا تذکرہ ہی نہیں بل کہ مرد کے برابر حقوق کا مطالبہ کر دیا ہے۔انھوں نے پاکستان میں خواتین کی بیداری کے حوالے سے جو تحریک چلائی اسے عالمی سطح پر بھی پذیرائی حاصل ہوئی۔ان کی نظموں میں نسائی لہجے کا ہلکا پھلکا رومانوی اندازپایا جاتا ہے۔

کشور ناہید نے ایک عورت کے چھوٹے چھوٹے جذبات واحساسات کو شعری زبان دی ہے مگر بعد میں ان کی شاعری بھی ادا جعفری اور زہرا نگاہ کی طرح عورت کی مظلومی اور مجبوری ایک مستقل موضوع بنا لیتی ہے۔انھوں نے ''لب گویا'' کے بعد کی شاعری میں مستقل مزاحمتی اندازاختیار کر لیا۔ وہ اس روایتی مردانہ معاشرے کے خلاف ایک باغی اور سرکش کے روپ میں نظر آتی ہیں۔ وہ ایک مظلوم ،مجبور اور بے بس عورت کی آواز ہیں۔ ان کی شاعری میں عورت کا استحصال زدگی کی علامت ہیں۔ دراصل کشور پورے استبدادی معاشرے کے خلاف بغاوت کا نام ہیں۔ انھوں نے اپنی ذات کے کرب سے باہر نکل کر معاشرے کی کمزور ،مظلوم اور مجبور عورتوں کے کرب کو محسوس کیا اور ان کی تلخیء حیات کو علامتی انداز میں پیش کیا۔ انھوں نے عورت کو جھجک آمیز موضوعات پر بات کرنے کا راستہ ہموار کیا۔ شاید کشور فرائڈ کے اس تصور سے متاثر تھیں کہ جنس پر کھل کر بات کرنے سے بہت سی لاشعوری تشویش کم ہو جاتی ہے۔

کشور ناہید نے ایک عورت کی جنسی تشنگی اور کج رویوں کا نفسیاتی اور برملا اظہار اپنے خالص نسائی لہجے میں کیا ہے۔ انھوں نے دوسری عورتوں کے جذبات اور نفسیاتی رد عمل کو اپنے ذاتی تجربے میں بیان کیا ہے۔ انھوں نے مشرقی عوت کی جذباتی گھٹن اور جنسی تشنگی اور اس کے باعث پیدا ہونے والے جسمانی اور نفسیاتی رد عمل کو اپنے ذاتی تجربے میں بیان کیا ہے۔ عورت کے اندر کی بے تابی اور بے چینی ،اس کی نیند اور خواب جیسی تمام نسائی کیفیات کشور کی شاعری میں خوب نظر آتی ہیں:

نیند نہیں آتی/بستر کی خواہش بھی آسودگی چاہتی ہے/میں ستارے گنتے گنتے/یہ سوچتی ہوں کہ ستاروں کی گنتی/تو تمھیں گلا گھونٹ کر مار ڈالنے کی گنتی سے کہیں کم ہے/تم میں بھی خواہش ہے /مجھ سے خوب صورت بنے رہنے کی(۲۷)

اس نظم میں کشور ناہید نے اپنے نسوانی کردار کا خوب صورت استعمال کرتے ہوئے اپنی ذاتی کیفیت کو آفاقی بنا دیا ہے۔ انھوں نے عورت کی وہ کیفیات بیان کی ہیں جو مرد کی نظروں میں چھپی رہتی ہیں۔ اس نظم میں انھوں نے نسائی لہجے کااستعمال نہایت سلیقے سے کیا ہے اس نوع کی ایک دوسری نظم"کتھارسس" میں انھوں نے ایک عورت کے بلوغت کے ساتھ ابھرنے والے کچے اور نرالے جذبات کا تزکیہ کیا ہے۔وہ کہتی ہیں کہ مشرقی عورت شادی سے پہلے اپنی پیاس سے آشنائی نہیں پاتی۔کشور نے جنسی ہیجان میں مبتلا مشرقی مرد اور عورت عورت کی کیفیات بیا ن کی ہیں۔ انھوں نے ایک سچی تخلیق کار ہونے کا ثبوت دیا اس جذباتی اور ذہنی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے انھوں نے نہایت بے پردگی اور سچے پن کا

مظاہرہ کیا ہے۔ انھوں نے انسان کی نفسیاتی کجرویوں کو متعدد مرقعوں کی صورت میں پیش شکیا ہے۔ اس موضوع پر کشور کی ایک نظم''سانپ کینچلی'' دیکھیے:

ہمارے ملک میں پرندوں کو پیار کرتے دکھانے کی اجازت ہے/ہمارے ملک میں انسانوں کو پیار کرنے اور پیار کرتے دکھانے کی/اجازت نہیں/وہ شاید اسی لیے شادی کرتے ہیں/ناخنوں کی پوروں تک دہکتے خون /اور آنکھوں کی لووں تک پھیلے جذبات کو/شادی کا نام دیتے ہوئے(۲۸)

کشور ناہید کی شاعری میں جنسی ہیجان کی اس طرح کی کئی تمثیلیں نظر آتی ہیں۔ ان تمثیلوں کے ذریعے کشور نےایک عورت کے واردات قلبی اور اس کے جسمانی تناؤ کو بیان کیا ہے۔ انھوں نے عورتوں کے اعصابی کھینچاؤ اور دیگر رد اعمال کو اپنے نسائی لہجے اور شاعرانہ جمالیات سے بے نقاب کیا ہے۔کشور ناہید نے اس نظم میں علامتی انداز اپنایا ہے اور جنسی جذبات ،ہیجانات اور ممانعت سے پیدا ہونےو الے ذہنی الجھاؤ اور اعصابی تناؤ اور کچھاؤ کو بیان کیا ہے۔ان کی شاعری میں مشرقی عورت ضرورت اور استعمال کی چیز ہے ،بے حس، بے جان اور غیر فعال شخصیت کے روپ میں نظر آتی ہے۔عورت کی اس کیفیت کی منظر کشی نظم''بارش میرے اندر'' کی گئی ہے۔اس نظم میں کشور ناہید نے نسائی حسیت کی ترجمانی کی ہے انھوں نے ایک عورت کے اندر کے کرب اور نفسیاتی کشمکش کو علامتوں کے ذریعے بیان کیا ہے۔ کشور نے مشرقی معاشرے کی عکاسی کرتے ہوئے ایک سخت گیر باپ اور گھریلو جھگڑے میں پلنے والی بیٹی کی نفسیاتی واردات کو بھی موضوع بنایا ہے۔ اس کی اہم مثال''اےمیرے الزام گرفتہ'' ہے۔ انھوں نے میاں بیوی کی لڑائیوں اور ایک دوسرے پر شکش کرنے سے بچوں کے ذہنوں پر مرتب ہونے والے اثرات کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ اس کی ایک مثال نظم''میرا گھر میری جنت'' ہےکشور نے نظم''موت کا تعارف'' میں خواتین کے حقوق کے لیے آواز بلند کی ہے۔

کشور ناہید نے مردانہ ،معاشرے کے پیدا کردہ جبر کے خلاف احتجاج کی آوازبلند کی ہے۔ ان کی شاعری ایک نوجوان لڑکی کے جنسی ابھار کا اظہار ہے اور انھوں نے اپنے مخصوص نسائی لہجے میں ایک متوسط طبقے کی عورت کی زندگی کی عکاسی کی ہے جو معاشرے کے روایتی سلوک سے بیزار ہے۔نسوانی جذبات واحساسات ،آزادی ء نسواں اور عورت کے رویوں کو ان کی نظموں میں بیان کیا گیا ہے۔ مثنوی کی ہیئت میں لکھی ان کی نظم'' اسیں بریاں وے لوکو'' صدیوں سے استحصال کا شکار عورت کی کہانی ہے ،اس نظم میں عورت کی فریاد یوں پیش کی گئی ہے:

کلموہی اور نصیبوں جلی
سنتے سنتے گھر میں پلی
ڈر ڈر دیکھا بدن کو
گندا سمجھا لگن کو

بن بر دیکھے بیاہی گئی
میں سوچوں میں چاہی گئی
(۲۹)

اس نظم میں کشور نے عورت کی داخلی کیفیت بیان کی ہے۔ اس قسم کی ایک اور نظم'' رات آتی ہے'' میں بھی کشور نے اس مشرقی عورت کے حالات بیان کیے ہیں۔انھوں نے اپنی ساری نظموں میں مشرقی عورت کی نفسیات اور نسوانیت کو مرکزی جذبہ واحساس بنایا ہے۔ان کی شاعری میں عورت کی گھٹن اور اعصاب کی تھکن کے واضح اشارے ملتے ہیں۔ان کی اہم نظموں میں''گھا ستو مجھ جیسی ہے''،سمجھوتہ،آخری خواہش،فادر کمپلیکس اور''پرسونا''شامل ہیں۔کشور نے اپنی نظموں میں عورت کی شکست اور پامالی کو موضوع بنایا ہے۔وہ ''شادی کی بیسویں سالگرہ''میں ایک عورت کے احساسات کو بیان کرتی ہیں:

میرے ساتھ کھڑے ہیں آج
تیری عمر کے بیس برس بنیں
زخم کے آتش دانوں میں
کیوں راکھ بھری ان برسوں کی

(۳۰)

کشور کی دیگر اہم نظموں میں"نیلام گھر،تراالٹیا شہر ،بھنبھور،موم محل،اور،جاروب کش،شامل ہیں۔ انھوں نے نظم''نیلام گھر ''میں مہر کی رسم کو موضوع بنایا ہے۔کشور نے اس رسم کو عورت کی فروخت کے مترادف قرار دیا ہے۔ نظم''موم محل'' میں ایک ماں کو اپنی جوان بیٹی کی شادی کے لیے فکر مند دکھایا ہے۔ کہ اتنے ناز سے پالی اس بیٹی کو شاید کس طرح کا سسرال نصیب ہو۔ کشور ناہید نے ہر طرح کی عورت کے مسائل اور جذبات کو موضوع بنایا ہے۔ اور اپنی نظموں میں ان سماجی رویوں پر سخت احتجاج کیا ہے۔ان کی نظمیں تانیثی مزاحمتی رویوں کی حامل ہیں۔نظم''ہم گناہ گار عورتیں'' اس کی ایک اہم مثال ہے:

"یہ ہم گناہ گار عورتیں ہیں/جو اہل جبہ کی تمکنت سے رعب نہ کھائیں/نہ جان بیچیں/نہ سرجھکائیں/نہ ہاتھ جوڑیں عورتیں ہیں/یہ ہم گنہگار/کہ جن کے جسموں کی فصل بیچیں گے لوگ(۳۱)

کشور ناہید کی شاعری میں تانیثی شعور اور تلخ حقائق بیا ن کیے گئے ہیں جو عورتوں کو درپیش ہیں۔ انھوں نے اس مردانہ معاشرے کی بالادستی پر سخت احتجاج کیا ہے۔ اس ضمن میں ان کی نظم''چارج شیٹ'' اہم ہے۔کشور ناہید نے ساری مظلوم ،محکوم اور بےبس ولاچار عورتوں کی نمایندگی کی ہے ۔انھوں نے رومانیت کی جذباتی ترقی پسندی اور حلقہ ارباب ذوق کی داخلیت پسندی کے بنیادی آہنگ کو بھی اپنایا اور نسائی لہجے کا انفراد بھی قائم رکھاڈاکٹر نجمہ رحمانی،کشور ناہید کی شاعری پر تبصرہ کرتی ہیں:

''کشور کی شاعری دراصل گھر آنگن کی شاعری ہے ،جس کے ذریعے انھوں نے ہمیں مشرق کی نئی عورت سے متعارف کرایا ۔اس عورت سے جس کے یہاں محبت فنا ہو جانے والے جذبے کے بجائے اپنی ذات کا عرفان ہے۔ اپنے زمانے کا کرب آگہی ہے جو چاہت کو دیوانگی کا روپ دے کر محبوب کی ذات میں فنا ہونا نہیں چاہتی بلکہ اس کی پہچان اپنی ذات کے حوالے سے چاہتی ہے۔''(۳۲)

کشور کی نظموں میں عورت کی بےچارگی پر ماتم کیا گیا ہے اور اسے بےخوف زندگی بسر کرنے کیترغیب دی گئی ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ پاکستان میں ملائیت کے غکبے کے باعث عورتوں کو محدود کر دیا گیا ہے اور اسے طرح طرح کیاذیتیں دی گئیں۔ ان کی احتجاج پر مبنی نظموں میں''فردکش ہے عدالت''،''گنہگار عورتیں''،اور''طالبان سے قبلہ رو گفتگو'' شامل ہیں۔ کشور کہتی کہ ہمارے مولوی ہمیشہ عورت پر ہی فتویٰ لگاتے ہیں انھوں نے کبھی کسی جاگیردار اور سرمایہ دار پر فتویٰ نہیں لگایا۔ کشور ناہید نے اپنی نظموں میں ملائیت کی تنگ نظری کا تذکرہ کیا ہے اور کبھی کبھی وہ اسلامی عقائد کو بھی نظر انداز کرتے ہوئے حد سے تجاوز کر جاتی ہے۔ اسلام نے عورت کو مخصوص حدود اور ضابطے دیے ہیں کبھی کبھی کشور ان کی بھی پاسداری نہیں کرتی۔پدری نظام معاشرت کے باوجود عورت نے ہر دور میں خود کو منوایا ہے اس نے میرابائی،قلوپطرہ،نوری،ہیر،سسی،سوہنی،نورجہاں اور قرۃالعین حیدر کے روپ میں مردوں کے معاشرے میں اپنا سکہ منوایا ہے۔ نظم ''اے کاتب تقدیر لکھ'' میں عورت کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

کشور ناہید کو عورت کی تاریخ میں جبر ہی جبر نظر آتا ہے۔ انھوں نے عورتوں کے مسائل کو عالمی تناظر میں دیکھا ہے اس لیے انھوں نے لیڈی ڈائنا کو بھی اپنی تخلیق کا حصہ بنایا ہے۔ انھوں نے عورت کے معاملات کو برابری اور نظریاتی شعور کے ساتھ پیش کیا ہے۔ انھیں"نسائی بوطیقا" میں اہم مقام حاصل ہے۔فہمیدہ ریاض کی شاعری جسارت،بےباکی،بغاوت اور احتجاج پر مبنی ہے۔ان سے قبل خواتین نظم نگاروں کے لہجے میں اتنی جسارت اور بے باکی نہیں تھی۔ معاصر شاعرات کی طرح انھوں نے بھی تمام ہیئتوں میں شاعری کی ہے لیکن آزاد ہیئت کا ستعمال زیادہ ہے۔انھوں نے اپنی نظموں میں ایک جوان لڑکی کو پیش آنے والے مسائل کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے ایک لڑکی کی خواہش وصل،امید وبیم کی کیفیت ،بے وفائی کا شکوہ اور نارسائی کے احساس کو اپنی ابتدائی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔ ان کی متعدد نظمیں رومانوی طرز احساس میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ نظم''گڑیا ''،اور''پتھر کی زبان'' اس کی اہم مثالیں ہیں۔انھوں نے دوسری نظم میں عورت اور مرد کے ازلی رشتے اور عورت کی جانب سے وفا کی ریت نبھانے کی عکاسی کی ہے۔اس نظم میں فہمیدہ نے نسوانی جذبات کی ترجمانی کی ہے کہ مردعورت کو وصل کے بعد بھول گیا ہے لیکن عورت اسی جذبے سے محبت اور وفا کی پاسداری کر رہی ہے۔نظم''گڑیا'' میں شاعرہ نے مرد کی ذہنیت کی عکاسی کی ہے کہ وہ کس طرح کہ وہ کس طرح ایک کھلونے کی طرح بھولی بھالی لڑکیوں سے کھیلتے ہیں اور جی بھر

جانے پر اس سے لا تعلق ہو جاتے ہیں۔ مرد عورت کے جواں جسم سے پیار تو کرتا ہے لیکن عشق کی خواہش اور سچے نسوانی جذبے سے بے خبر رہتا ہے۔

فہمیدہ ریاض نے اپنے شعری مجموعہ''پتھر کی زبان'' میں ان مردانہ ذہنیت کے خلاف احتجاجی شعور کا عمدہ اظہار کیا ہے۔ ان کا دوسرا شعری مجموعہ''بدن دریدہ'' اس اظہار کی تکمیل کا نام ہے۔ فہمیدہ عورت کو معاشرے کا اہم کردار سمجھتی ہے وہ اس تصور کو یکسر رد کرتی ہے کہ عورت گوشت پوست سے بنا ہوا خوب صورت انسانی ڈھانچہ مرد کی جنسی آسودگی اور بچے پیدا کرنے کے لیے ہے۔ اس بات کا اظہار وہ ''اقلیما'' میں کرتی ہیں:

اس نقش کو غور سے دیکھو/لمبی رانوں سے اوپر/ابھرے پستانوں سے اوپر/پیچیدہ کوکھ سے اوپر/اقلیما کا سر بھی ہے/اللہ کبھی اقلیما سے بھی کلام کرے/اور پوچھے(۳۳)

فہمیدہ ریاض مرد اور عورت کے لیے قائم کئے گئے دوہرے معیار سے سخت نالاں ہیں کیوں کہ وہ سمجھتی ہیں کہ مرد اور عورت کے مابین تفریق کی کوئی منطقی حیثیت نہیں ملتی تو پھر اس پر جبر کیوں روا رکھا جاتا ہے/ فہمیدہ نے بعض اسلامی عقائد پر بھی سوالیہ نشان لگائے ہیں مثلاً مسلم معاشرے میں عورت ناقص العقل ہے ،فہمیدہ اس بات کو بھی تسلیم نہیں کرتی۔ اللہ نے صرف پیغبروں سے کلام کیا ہے اور پیغمبری کسی عورت کے حصہ میں نہیں آئی اس کے پیچھے بھی شاید عورت کی وہی ناقص العقلی ہے کا فلسفہ ہے۔فہمیدہ نے کچھ باتیں درست بھی کہی ہیں کہ ہمارے معاشرے میں چیزیں اور عمل غلط رواج پا گئے ہیں مثلاً عورت کے ذہن،سوچ اور درد مند دل کو نظر انداز کر کے اس کے جسمانی خطوط پر سارہ روجہ مرکوز کر دی گئی ہے۔اس لیے ایک کمزور مرد بھی عورت کے جسمانی خطوط پر رائے زنی کرتے ہوئے بے باک دکھائی دیتا ہے۔فہمیدہ نے مردانہ ذہنیت کو یوں جھنجھوڑا ہے:

کولہوں میں بھنور جو ہیں تو کیا/سر بھی ہے جستجو کا جوہر/تھا پارۂ دل بھی زیر پستاں/لیکن مرا مول ہے جوانی پر/گھبرا کے نہ یوں گریز پا ہو /پیمائش میری ختم ہو جب/اپنا بھی کوئی عضو ناپو(۳۴)

فہمیدہ نے اپنی شاعری میں مردانہ معاشرے اور مردانہ ذہنیت پر طنز کیا ہے۔ انھوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ مردانہ ذہن صنف نسواں کو جسم سے پرے دیکھنے کا عادی نہیں۔نظم''بڑھتی ناز'' میں اس کی عمدہ عکاسی ملتی ہے۔فہمیدہ نے اپنی نظموں میں احتجاج کی جرات پیدا کی انھوں نے عورتوں کے استحصال کے خلاف آواز بلند کی اور وہ تانیثی مزاحمتی رویے کی اہم شاعرہ ہیں۔فہمیدہ ریاض کے دیگر شاعرات سے اشتراک کے حوالے سے ظفر اقبال لکھتے ہیں:

> ''ان(فہمیدہ اور کشور) دونوں میں ایک امتیازی قدر مشترک موضوعات کا پھیلاؤ اور ورائٹی ہے اور ان کی شاعری میں

خاتون شعرا میں پہلی بار ایک وسیع کینوس دستیاب ہوتا ہے۔
جس پر بین الاقوامی ،سیاسی،سماجی اور ادبی موضوعات کی
باکمال جڑت کی گئی ہوتی ہے۔''(۳۵)

فہمیدہ ریاض کی نظمیں عورت کے حواس ،جذبات اور تجربات کی بے باکی کی سچی عکاسی ہیں۔ انھوں نے مشرقی تہذیب وروایات سے دب جانے والے عورت کے جذبات کو کھول کر بیان کیا ہے۔ ان کی نظمیں''باکرہ'' اور ''زمین دوزریل''عورت کے اَن کہے جذبوں کو زباں دیتی ہیں۔ عورت کے نقطۂ نظر سے پیوستہ نظموں میں ''بدن دریدہ''،ہاتھ اپنا لاؤ،مقابل حسن اورالاؤ،آکاس بیل،دوجا سایہ،لوری،زمیں زبانوں کا بوسی، وہ ایک زن ناپاک ،پچھلے پہر میں،اور''آج شب ''شامل ہیں۔فہمیدہ کی اولین نظموں میں فطرت کے مناظر میں رات کا کافی ذکر ملتا ہے ان کی شاعری میں رات صرف تاریکی کے لیے نہیں بل کہ ان کے جذبہ واحساس کو مثبت انداز میں ظاہر کرتی ہے ،رات کی عمدہ تصویر کشی کے لیے نظم''ایک رات کی کہانی''دیکھیے:

بڑی سہانی سی رات تھی وہ/ہوا میں انجانی کھوئی کھوئی مہک رچی تھی/بہار کی خوشگوار حدت سے رات گلنار ہو رہی تھی/روپہلے سپنے کہ آسماں ہر سحاب بن کر بکھر گئے تھے/اور ایسی رات /ایک آنگن میں کوئی لڑکی کھڑی ہوئی تھی(۳٦)

فہمیدہ کی اس نوع کی دیگر اہم نظموں میں مری چنبیلی کی خوشبو،ابرِ بہار،خواب اور تعبیریں،اور سردیوں کی ایک شام،،میں سمندر،موسم ،اور،پھولوں کا ذکر ملتا ہے۔فہمیدہ نے اپنی نظموں میں فطرت کے مناظر کا ذکر تلخی آمیز اور طنزیہ لہجے میں کیا ہے۔انھوں نے عورت کے دل میں جھانکا ہے اور اس کی شادی اس کی مرضی کے خلاف کرنے پر احتجاج کیا ہے۔ اورا سے سماج کا جبر گردانہ ہے۔ زہرانگاہ کے بعد فہمیدہ ریاض نے بھی معاشرے کی ایسی روش کو سخت نا پسند کیا ہے۔ جس میں والدین اپنی بیٹیوں کی شادیاں ان کی مرضی کے بجائے چند دنیاوی آسائشوں کی خاطر کسی رئیس گھرانے کے مرد سے کر دیتے ہیں۔وہاں اسے مادی سامان آرائش تو مل جاتا ہے لیکن شوہر کا پیار نہیں ملتا۔ اس طرح عورت نفسیاتی الجھن کا شکار ہو کر گھٹن میں زندگی بسر کرتی ہے۔ فہمیدہ نے حقیقت پسند زندگی کے متعدد پہلوؤں کے ساتھ ساتھ صنف نازک کےلطیف جذبات واحساسات کو نظموں میں ڈھالنے کے علاوہ دھرتی اور وطن کی محبت میں دعائیہ اسلوب کی نظمیں بھی لکھی ہیں۔

نورجہاں ثروت کو ذاتی زندگی میں نامساعد حالات اور تلخ تجربات سے واسطہ پڑا اس لیے ان کی شاعری میں بے باکی اور تلخی کا عنصر پایا جاتا ہے۔انھوں نے جس طرح اور جتنے قریب سے زندگی کو محسوس کیا اسی طرح شاعری میں بیان کر دیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ تمام تر ا نسانی اور سماجی اقدار تیز رفتار اولاد آدم کی ٹھوکروں سے لڑھک رہی ہیں۔ انھوں نے اپنے احساسات ،جذبات اور مشاہدات کی سچی عکاسی کی ہے۔ دلی کی تہذیب و تمدن کی پروردہ شاعرہ کے یہاں سماجی اور اخلاقی قدروں کے زوال اور انسان کی بڑھتی ہوئی

مادہ پرستی کا ذکر ملتا ہے۔انھوں نے ظاہر کیا ہے کہ آج کا انسان بڑا مطلب پرست اور خودغرض ہو گیا ہے اور ہر وقت اپنے مفادات کی جستجو میں لگا ہوا ہے۔انھوں نے اپنے وطن سے محبت کی ہے اور ہندوستان کی دھرتی کو اپنی ماں اور سب کچھ مانا ہے۔

ثروت نے اپنی شاعری میں بکھرتے اور ٹوٹتے رشتوں پر بھی طنز کیا ہے انھوں نے عصر حاضر کے حوالے سے بات کی ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ جیسے رشتے بے معنی سے ہو گئے ہیں۔ انھوں نے سماجی المیے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ آج رشتے صرف دولت میں تولے جاتے ہیں ماں باپ کے پاس اگر پیسہ ہےتو بیٹے ان کی خدمت داری کریں گے۔بیوی اس وقت تک شوہر سے خوش رہتی ہے جب تک شوہر کے یہاں دولت کی فراوانی ہو بھائی بہن اور دیگر رشتہ دار غریب سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ شاعرہ نے دولت مندمعاشرے کی ذہنیت کی عکاسی کی ہے اور دولت کے سامنے انسانی رشتے ریت کی دیوار قرار دیے ہیں۔انھوں نے عورت پر ہونے والے تشدد اور امتیازی سلوک کے خلاف اگر آواز اٹھائی ہے تو لہجہ سبک اور شیریں رکھا ہے اور انھوں نے اپنی نظموں میں ماضی کی یادوں کو کافی جگہ دی ہے۔ انھوں نے افسردی کے لمحوں میں ہمیشہ اپنی یادوں کی کہکشاں سجائی ہے۔نظم''بازگشت'' ملاحظہ کیجیے:

آج کھویا ہوا مرا بچپن لوٹ آیا ہے/وہی بچپن کہ جو کھیلا تھا/وقت کے حسیں آنگن میں /محبت کی دھوپ نے جھلسایا نہیں تھا جس کو(۳۷)

نورجہاں ثروت اپنی زندگی کے تلخ حقائق کو بھی اپنی تصوراتی دنیا کے ساتھ لے کر چلتی ہیں۔شاعرہ کہتی ہیں کہ انسان کو زندگی میں سخت مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے اس لیے اپنے قلبی سکون اور راحت کے لیے بیتے ہوئے خوب صورت لمحوں اور سہانی یادوں میں کچھ دیر سفر کر لینا چاہیے۔شاعرہ نے اپنی یادوں اور کاص طور پر بچپن کی یادوں میں کھو کر تسکین اور مسرت تلاش کی ہے۔انھوں نے نسوانی حسیت کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ عورت کو پیار کے بدلے پیار نہیں ملتا جس کی وجہ سے وہ ذہنی ناآسودگی کا شکار ہو جاتی ہے۔اس لیے اسے تشنگی اور محرومی کا احساس باقی رہتا ہے ،اس بات کو استعاراتی لہجے میں ثروت نے نظم''ایک بے شکست رشتہ'' میں بیان کیا ہے۔انھوں نے عورت کی بے چین اور بے قرار اور اضطرابی کیفیت کی مکمل عکاسی کی ہے۔نظم''جو ہو سکے تو''میں شاعرہ نے خوابوں کے شہزادے کے لیے خدا سے دعا کی ہے۔ثروت نے ''اپنے لیے جیو'' کے نام سے ایک طویل نظم بھی لکھی ہے۔ اس نظم میں انھوں نے عوارت کے جذبات واحساسات ،دردوکرب کو نسائی لب ولہجے کے ساتھ بیان کیا ہے۔انھوں نے مرد کی طرف سے عورت کے ساتھ کی جانے والی زیادیتوں کو علامتی انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کی شاعری میں تنہائی اور اکیلے پن کا ذکر بھی ملتا ہے۔ ان کی تنہائی ویرانی کے کئی روپ بدلتی ہے۔ نورجہاں ثروت کی شاعری میں روح عصر نظر آتی ہے انھوں نے سماجی مسائل کی عکاسی کرتے ہوئے انسانی رویوں کا ذکر کیا ہے،نظم''بےچہرہ خیال'' میں انھوں نے بھائی کو بھائی کا خون

بہاتےہوئے دکھایا ہے،انھوں نے کہا ہے انسانیت سوز واقعات دیکھ کر لگتا ہے معاشرت سے انسانیت ختم ہو گئی ہے۔نظم کا نمونہ دیکھیے

ایک زخمی پرندے کی طرح/بے چہرہ خیال/الجھ گیا ہے/اچانک مجھ کو/کیا شکل دوں اسے/کچھ سمجھ میں نہیں آتا/ہر چہرہ لہو لہان زخمی ،ماتم کناں(۳۸)

ثروت نے اس نظم میں یہ بیان کیا ہے کہ زندگی تمام تر سچائیوں کے ساتھ تلخ ہوتی جا رہی ہے انھوں نے بڑے بے باکانہ انداز میں زندگی کی سچائیاں بیان کی ہیں،انسان کے جنم دن کی مسرتوں اور خوشیوں کا ذکر کیا ہے۔ نظم''لہو کے ہتھیار'' میں شاعرہ نے انسان کےانسان پر ڈھائے جانے والے ظلم وستم کی داستان بیان کی ہے اور دنیا کی شیطانی طاقتوں کی تصویر کشی کی ہے۔پروین شاکر،فہمیدہ ریاض کے ابتدائی کلام سے کافی متاثر تھیں لیکن اس کے باوجود ان کا منفرد نسائی لہجہ ہے۔ فہمیدہ کی طرح انھیں بھی ساحل،خوشبو،اور بارش بے حد پسند تھی۔ ان کے پہلے مجموعے میں ساحل،سمندر،ہوا،گیلی ریت،لہریں اور بادبان کا ذکر زیادہ ملتا ہے۔ نظم گوشاعرات میں انھوں نے سمندری فطرت نگاری کی بڑے خوب صورت انداز میں مصوری کی ہے۔ پروین کو عمر بھر بارش،پھولوں اور خوشبو سے پیار رہا ۔اس کی ایک مثال نظم''پیار'' میں پیش کی جاتی ہے:

ابر بہار نے/پھول کا چہرہ/اپنے بنفشی ہاتھ میں لے کر/ایسے چوما/پھول کے سارے دکھ/خوشبو بن کر بہہ نکلے(۳۹)

نسائی جذبوں کی اس رجحان ساز شاعرہ نے متعدد نظموں میں فطرت نگاری کی ہے۔ان کے یہاں بھی فہمیدہ ریاض کی طرح رات کا بہت زیادہ ذکر ملتا ہے۔مشرقی عورت ہونے کی وجہ سے وہ مردشعرا کی طرح سڑکوں،گلیوں،یا میدانوں میں اکیلی جا کر نظارہ نہیں کر سکتی۔اس لیے ان کی شاعری میں رات اور بارش کا ذکر ہے۔ پروین موسموں اور خاص طور پر پھولوں کے موسموں ،بہار،بسنت اور برسات کا ذکر کرتی نہیں۔ پروین کی یہ نظمیں''انچل اور بادبان''،مشورہ،احساس،سمندر کی بیٹی،جان پہچان،اور،پکنک ،ان کی سمندری فطرت نگاری کی مثال پیش کرتی ہیں۔ نظم ''خواب'' میں پروین نے صرف ساحل سمندر کی منظر کشی نہیں کی بل کہ لڑکیوں کے خاموش جذبات کی عکاسی کی ہے:

کھلے پانیو ں میں گھری لڑکیاں/نرم لہروں کے چھینٹے اڑاتی ہوئی/بات بے بات ہنستی ہوئی/اپنے خوابوں کے شہزادوں کا تذکرہ کر رہی تھیں/جو خاموش تھیں ان کے ہونٹوں کو بھی/اَن کہے خواب کا ذائقہ چومتا تھا(۴۰)

اس نظم میں پروین نے اپنے شاعرانہ جمالیاتی احساس کے ساتھ عورت کے خواب ،احساس اور جذبات کو بیان کیا ہے۔انھوں نے کچی عمر کی ذہین اور حساس لڑکی کو فہمیدہ کی طرح اردو شاعری میں شامل کیا ہے۔پروین اور فہمیدہ ریاض کے موضوعاتی اور ہیئتی اشتراکات کے بارے میں ڈاکٹر ناہید قاسمی رقم طراز ہیں:

''جدید اردو شاعری میں خواتین اور مائیں تو پہلے سے تھیں۔پروین شاکر نے کچی عمر کی ذہین ،حساس اور بے حد معصوم لڑکی کو پہلی بااردو شاعری کی زبان دی اس سے پہلے فہمیدہ ریاض کی ابتدائی نظموں میں بھی ایک لڑکی ہے جو پختہ سوچ اور گہری نظر کی مالک ہے۔جب کہ پروین شاکر کی شاعری کے پہلے مجموعے''خوشبو'' میں ایک جاگتی آنکھوں خواب دیکھنے والی معصوم اور کسی حد تک شرمیلی وضع دار لڑکی چلتی پھرتی اور سوچتی نظر آتی ہے۔''(۳۱)

''صد برگ'' اور اس کے بعد کی شاعری میں درختوں اور پرندوں کا ذکر زیادہ ملتا ہے۔ کیوں پہلے وہ تنہائی میں یادوں سے محفل سجا لیتی تھیں اب اداس لمحوں میں فطرت کے مناظر سے احساس اداس کم کرتی ہیں،اس کی ایک مثال نظم''ساتھی'' ہے۔''صد برگ'' میں پروین شاکر فطرت نگاری سنجیدگی اور بامعنی دکھائی دیتی ہے ،وہ عورت کے دکھ اور مسائل کو مشاہدے سے نہیں بلکہ اپنے ذاتی تجربے سے بیان کرتی ہے۔انھیں محکومی اور سماجی پابندیوں میں جکڑی ہوئی عورت کا احساس ہے،اس لیے وہ تتلی بن جانا چاہتی ہے کیوں کہ تتلی اپنی مرضی سے جہاں چاہے جا سکتی ہے ۔تتلی آزاد فضا ؤں کی مالک ہوتی ہے ۔اس نظریے سے پروین شاکر جدید اردو نظم کی اہم شاعرات ،ادا جعفری،زہرانگاہ،کشور ناہیداور فہمیدہ ریاض سے میل کھاتی ہیں۔ ان کی ایک اہم نظم''میں تیتری رہنے میں خوش ہوں''دیکھیے:

اور مجھے یہ خبر ہے/کہ میں اک دفعہ/ہاتھ اس کے اگر لگ گئی /وہ مکھی بنا کے مجھے/اپنی دیوار خواہش سے تا عمر اس طرح چپکائے رکھے گا/کہ میں /روشنی اور ہوا اور خوشبو کا/ہرذائقہ اس طرح بھول جاؤں گی(۳۲)

پروین شاکرکی شاعری میں نسوانی جذبات بھی بدرجہ اتم موجود ہیں،وہ عورت کا ایک ماں ہونے پر فخر کرتی ہے کیوں کہ اسے ایک نئے انسان کو جنم دینے کا اعزاز حاصل ہے۔اسے ماں ہونے کا ذاتی تجربہ ہے اس لیے وہ دوسری ماں کے جذبات سچی ترجمانی کرتی ہیں۔ انھوں نے اپنے بیٹے کی پیدائش پر نظم''میرالال'' لکھی۔پروین نے اپنی نظموں میں نہ صرف رومانی کیفیات کو بیان کیا ہے بل کہ انسانیت کی بات بھی کی ہے۔وہ سماجی مسائل کو بھی شاعری کا موضوع بناتی ہیں،اس بارے میں راحت ملک لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ ''خوشبو''سے''انکار'' تک کا سفر خود شاعرہ کے فکروفن ،شعور وآگہی ،فرد سے سماج کے باہمی رشتوں اور تصادم سے ابھرنے والی تلخ حقیقتوں کے ادراک اور اظہار کا ارتقا بھی تھا اور سفر بھی----پروین محض نسوانیت کی شاعرہ پوری انسانیت کی شاعرہ ہے۔''(۳۳)

پروین نے اپنی نظموں میں عدل وانصاف اور سماجی واجتماعی شعور کی بات کی ہے۔انھوں نے مزاحمتی انداز بھی اپنایا ہے۔ ان کے یہاں مردانہ جرات وجسارت بھی ہے اور کبھی کبھی کشور اور فہمیدہ کی طرح تانیثی حد سے تجاوز بھی کر جاتی ہیں۔ انھوں نے لڑکیو ں کے اندر پنپنے والے جذبات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے معاشرے میں جو کچھ دیکھااور محسوس کیا اسے شعری پیکر عطا کر دیا اس لیے پروین کی شاعری ہر عورت اور لڑکی کو اپنی ہی کہانی معلوم ہوتی ہے ۔پروین نے بھی مردوں کی طرح اپنے جذبات کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ان کی نظم"ناٹک"علامتی انداز کی ہے۔ اس میں مشرقی لڑکیوں کو جن معاشرتی پابندیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ عکاسی کی گئی ہے۔پروین نے یہ بتایا ہے کہ ہمارے معاشرے میں لڑکیوں کے جذبات اور خیالات کی قدر نہیں کی جاتی اور نہ ہی انھیں کسی فیصلے کا حصہ بنایا جاتا ہے۔ یہ رویہ کسی بھی لڑکی کے والدین سے شروع ہو کر شوہر اور سسرال تک جاتا ہے۔پروین نے بھی اسے المیہ قرار دیا ہے۔ اور اس المیے کو بیان کرنے کے لیے لڑکیوں اور گڑیوں میں مماثلت پیدا کی ہے۔ اس حوالے سے ان کی نظم''نک نیم''میں اہم مثال ہے۔اس سلسلے کی ایک نظم''گڑیا''فہمیدہ نے بھی لکھی ہے۔

پروین شاکر نے اپنی نظموں میں شادی شدہ عورتوں کے زیورات اور گہنوں کا تذکرہ نہایت عمدگی سے کیا ہے کیوں کہ زیوارت عورتوں کو بہت پسند ہوتے ہیں،کنواری لڑکیوں میں سہاگنوں کے زیورات دیکھ کر ایک خاص قسم کا اضطراب پایا جاتا ہے۔ پروین نے اس جذبے کی بھی عکاسی کی ہے۔پروین نے عورت کو صرف جنسی آسودگی کا ساماں(Sex Object)سمجھنے پر مردانہ ذہنیت کے خلاف جو نظمیں لکھی ہیں ان میں ''کتوں کا سپاس نامہ''اور''پوسٹ ڈنرآئٹم'' خصوصی توجہ کی طالب ہیں۔پروین کی نظموں میں مجموعی طور پر ایک متوسط طبقے کی تعلیم یافتہ اور گھریلو عورت کے کرب اور گھٹن کا اظہار ملتا ہے۔

فاطمہ حسن کے یہاں عصری اور جنسی حسیت کا خوب صورت امتزاج اور توانا نسائی لہجہ ملتا ہے۔ان کی ابتدائی شاعری میں بنگال کے تالاب،جھیلیں،پٹ سن کےپودے،اور پرانی یادوں کے سائے لہرا رہے ہیں۔ فاطمہ حسن نے ایک لڑکی کے سینے میں جنم لینے والی معصوم خواہشوں اور درد کو الفاظ دیے ہیں۔ فاطمہ کی شاعری دراصل ان کے اندر کی کیفیت اور وجود کا اظہار ہے ان کی نظمیں ان کے ہونے کا پتا دیتی ہیں۔ان کی شاعری میں ان کا وجود ،ان کی روح اور ان کا عہد بولتا ہے۔فاطمہ حسن داخلی کیفیات ،نسائی احساسات اور جذبات کی شاعرہ ہیں۔ ان کی شاعری میں ادھوری لڑکیاں لان میں بچھی ہوئی کرسیوں کی طرح اوس میں بھیگ رہی ہیں۔ یہ لڑکیاں کسی کی پناہ میں آنا چاہتی ہیں،فاطمہ کی نسائی کیفیت نظم ''انتظار '' میں دیکھیے:

جب میں نے ہر چہرے پر
اُس کا دھوکا کھایا تھا
تب وہ کیوں نہیں آیا تھا

(۴۴)

فاطمہ حسن نے اپنی نظموں میں ایک ایسی لڑکی کی کیفیت بیان کی ہے جس کے خواب اس کی آنکھوں ہی میں زہر بن گئے ہیں اور وہ اندر ہی اندر گھٹتی رہتی ہےاپنی کسی خواہش کا اظہار بھی نہیں کر پاتی کیوں کہ اسے سماج کے ضابطے اچھی طرح یاد ہیں۔وہ پھولوں کی خواہش اپنے من میں ہی سجائے رکھتی ہے۔ نظم"دعا" میں یہ کیفیت بیان کی گئی ہے۔فاطمہ حسن نے مرد کے منافقانہ رویے کی عکاسی کی ہے۔ عورت اگر ایک بار کسی کی ہو جائے تو عمر بھر ساتھ نبھانے کی قسمیں کھا لیتی ہے جب کہ مرد اسے جنسی آسودگی کا ایک پل سمجھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ نظم''تعاقب''میں فاطمہ اپنے محبوب کے بے مروت رویے کا اظہار کیا ہے۔فاطمہ حسن اپنے ماضی کے دنوں کو بے حد یاد کرتی ہیں انھوں نے اپنے پہلے مجموعے ''بہتے ہوئے پھول'' میں بنگال کی سرزمین اور وہاں کے لوگوں کو جنھیں قیام بنگلہ دیش کے وقت چھوڑ آئیں تھیں بہت یاد کیا ہے۔ اس پس منظر میں لکھی ان کی ایک نظم''جس بستی کو چھوڑ آئی ہوں'' بڑی اہم ہے۔

فاطمہ نسائی لہجے اور تانیثی جذبے کی بھی شاعرہ ہیں انھوں نے ایک لڑکی کے جذبات کی عکاسی کی ہے جو اس مردانہ اور پدری نظام پر مبنی معاشرے سے خائف رہتی ہے اور کسی انجانے ڈر میں مبتلا رہتی ہے جو اسے اندر ہی اندر دیمک کی طرحب چاٹ رہا ہے ۔ہمارے معاشرے میں لڑکیوں کی شادیاں والدین کی مرضی سے ہوتی ہیں اور بسا اوقات لڑکی کو بتایا بھی نہیں جاتا کہ اس کا سسرال کیسا ہے ،اس کا شوہر کیسا ہے ،لڑکیوں کو ہمیشہ یہ دھڑکا لگا رہتاہے کہ وہ کس کے ساتھ بیاہی جائے گی ایسی ہی کیفیت سے سرشار نظم ''انجانا خوف'' دیکھیے:

سات جہانوں کی وسعت میں/اُس کی آنکھیں/سات سمندر کی گہرائی/اُس کی ذات /جس کی ہر اک لہر پہ لپکے/میرے خون کا اک اک قطرہ(۴۵)

پروین شاکر کی طرح فاطمہ حسن بھی لطیف رومانی لہجے کی شاعرہ ہیں اس لیے ان کے یہاں حقیقت کا رنگ زیادہ تلخ اور کڑوا نظر نہیں آتا۔فاطمہ کی شاعری میں محبت کے جیتے جاگتے جذبے ملتے ہیں۔ان کا انفراد یہ ہے کہ انھوں نے محبت کو لطیف اور روحانی انداز میں پیش کیا ہے۔فاطمہ چوں کہ بنگال سے کراچی آئی تھیں اس لیے ان کی اولین شاعری کی ہلکی ہلکی غنائیت اور رومانیت کی لہروں میں برہم پتر کے پانی میں لڑکیوں کے چہرے نظر آتے ہیں۔انھوں نے اپنی نظم''وہ چاہتاہے'' میں اس کی عکاسی کی ہے:

اک خط ایسا لکھوں
جس کو پڑھتے ہوئے
زندگی بیت جائے
سوچتی ہوں کہ

اپنی آنکھیں اُسے
کس طرح بھیج دوں

(۳۶)

فاطمہ حسن کو فطرت سے بھی بے پناہ محبت ہے۔اس کا اظہار ان کی متعدد نظموں میں ملتا ہے فاطمہ کی شاعری کچی عمر کی لڑکیوں کے جذبات سے لے کر ایک معاشرتی شعور کی حامل عورت کے سوچ کی آئینہ دار ہے۔ ان کی نظمیں ایک نوخیز لڑکی احساس جمال اور محبت سے لے کر ایک سنجیدہ عورت کے احساس رفاقت تک تمام مراحل میں محبت کےلطیف جذبات نمایاں ملتے ہیں۔وہ بھی مرد اور عورت کے جنسی رشتے سے آشنا ہیں لیکن انھوں نے اس پہلو کی بے باکانہ انداز میں منظر کشی نہیں کی۔ان کی اہم نظموں میں ''میں''،شی بدھا،ایک لڑکی،ہوا کی صورت زندہ رہ سکتی ہوں،زندگی خواب جیسی حقیقت ہے،ایک خواب اور''بہتے ہوئے پھول ''شامل ہیں۔فاطمہ نے پابند،آزاد اور نثری ہیئت میں نظم نگاری کی ہے۔انھوں نے بھی لڑکی کو گڑیا سے مماثلت دی ہے۔ کیوں کہ ہمارے مردانہ اور پدری نظام معاشرت میں لڑکی کو کوئی اہمیت نہیں اسے صرف ایک گڑیا ہی تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کی اپنی کوئی شناخت نہیں اور اسے یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ معاشرے کے لیے کوئی فعال کردار ادا نہیں کر سکتی،عورت کی اسی کیفیت کو فاطمہ نے دیگر شاعرات کی طرح اپنی نظم''گڑیا '' میں بیان کیا ہے۔

پروین شاکر کی طرح فاطمہ کی شاعری میں پھول،خوشبو،شبنم اور بارش کا خوب ذکر ملتا ہے۔ انھوں نے بھی مناظر فطرت کی تصویر کشی کی ہے۔ ان کی نظم''مناظر خوب صورت ہیں'' مناظر فطرت کی حامل ہے۔فاطمہ لطیف نسائی جذبات کی خوب صورت شاعرہ ہیں۔ان کی شاعری میں ایک لڑکی کی نومولودگی سے لے کر جوانی اور پھر پرایا گھر سدھارنے تک کی کہانی کو بیان کیا گیا ہے۔فاطمہ حسن نظریاتی طور پر ہی نہیں بل کہ جذباتی طور پر بھی نسائی لہجے کی(Feminist) شاعرہ ہیں۔

استخراجِ نتائج/موضوعاتی اشتراکات

جدید اردو نظم کی نمایندہ شاعرات ادا جعفری ،ساجدہ زیدی،زاہدہ زیدی ،شفیق فاطمہ شعریٰ ،زہرا نگاہ، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض ،نورجہاں ثروت،پروین شاکراورفاطمہ حسن کی نظمونمیں خاص طور پر موضوعاتی مماثلت نظر آتی ہے۔ان کی شاعری میں تانیثیت کی رو اور روایت مشترکہ انداز میں ملتی ہے۔ کچھ شاعرات کی نظموں میں مزاحمت اور احتجاجی عناصر بھی ملتے ہیں۔ شاعرات نے مرو اور عورت دونوں کے مسائل کو سنجیدگی سے بیان کیا ہے۔ جدید اردو نظم کی شاعرات کی شاعری میں بیک وقت تانیثی حسیت جلوہ گر ہے اور انھوں نے نسائی حقوق ضبط کرنے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ موسموں ،رتوں ،رنگوں اور خوشبوؤں کا ذکر بھی ان کی شاعری میں یکساں ملتا ہے۔ انھوں نے عورت کے

داخلی کرب اور نفسیاتی دباؤ کو شعری پیکر عطا کیا ہے۔کہیں انھوں نے مرد اور عورت کے معاشرتی کرداروں اور کہیں اپنے زنانہ تجربے کو بیان کیا ہے تو کہیں اپنی ذات کی الجھنوں کو موضوع بنایا ہے۔

شاعرات نے مشترکہ طور پر عورت کی محرومی،نارسائی،ناآسودگی ،نسائی باطن کےلطیف جذبات واحساسات کو شاعری کا موضوع بنایا ہے۔خواتین نظم نگاروں نے سماجی تعصبات ،محبت اور وفا کی خواہش ،انا کی تعمیر وشکستگی سے لے کر معاشرتی رویوں اور رجحانات کو موضوع بنایا ہے۔ شاعرات نے حب وطن کے علاوہ فطرت کے مناظر بھی بیان کیے ہیں۔ انھوں نے ذات ،کرب اور تنہائی جیسے موضوعات کو اجتماعی رویوں اور نسائی نقطۂ نظر کے ساتھ پیش کیا ہے۔ انھوں نے مشرقی عورت کی بے بسی ، لاچاری ،مجبوری اور گھٹن سے پیدا ہونے والے مسائل کو عوام طور پر اپنی نظموں کا حوالہ بنایا ہے۔ انھوں نے عورت کے اندر پائے جانے والے احساسِ کمتری کو کم کرنے اور اعتماد دلانے کی سعی کی ہے۔ تمام شاعرات نے یکساں طور پر عورت کے ساتھ کم عقلی اور کمزوری وابستہ رکھنے کی روایت کو یکسر مسترد کر دیا ہے۔

متعدد شاعرات نے عورت کے تشخص پر زور دیا ہے اور سیاسی اور معاشرتی مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے ناانصافی ،محرومی، استحصال،جبر ،ظلم،امن محبت ،رواداری اور ملک میں پھیلی ہوئی بد امنی اور انتشار کو موضوع بنایا ہے۔ ان کی شاعری میں عورت کے اندر پنپنے والی مامتا کے جذبات بھی نظر آتے ہیں۔ انھوں نے انسانی رنج والم کو بھی کسی نہ کسی صورت میں موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے عصری مسائل ،ہنگامی موضوعات اور ہندومسلم فسادات کے دوران مسلمانوں پر ہونے والے ظلم وستم کے خلاف بھی آواز اٹھائی ہے۔

خواتین نظم نگاروں نے متعدد سماجی مسائل کو بے نقاب کرتے ہوئے دور حاضر کے انسان کی بے بسی ،بے چارگی اور مجبور زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے ملکی حالات وواقعات کے ساتھ ساتھ مذہبی اور تاریخی موضوعات بھی شاعری میں شامل کیے ہیں۔ انھوں نے اکثر نظموں میں معاشرتی رویوں پر نکتہ چینی کی ہے اور روایتی عائلی اقدار کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے ۔ انھوں نے علامتی انداز میں معاشرتی جبر کا شکار متوسط گھرانے کی عورتوں کی داخلی گھٹن کی عکاسی کی ہے۔

جدید اردو نظم کی شاعرات میں بہت زیادہ یکسانیت ہے تقریباً سب کی شاعری میں مرد اور عورت کے باہمی رشتے اور تعلقات کا ذکر ملتا ہے ۔گھریلو ماحول ،شوہر اور بیوی کا جھگڑا وغیرہ کے موضوعات ملتے ہیں۔ معاصر شاعرات نے تمام ہیئتوں میں شاعری کی ہے لیکن آزاد ہیئت کا استعمال زیادہ کیا ہے۔ سب خواتین نظم نگاروں کے یہاں عصری اور جنسی حسیت کا خوب صورت امتزاج اور نسائی لہجہ ملتا ہے۔ان کی مشترک بات یہ ہے انھوں نے عورت کو صرف جنسی آسودگی (Sex Object) سمجھنے پر مردانہ ذہنیت کے خلاف نظمیں لکھی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ محسن نقوی،شاعرات کی شاعری ،مشمولہ،خواتین کا نظم و غزل میلہ،مرتب : ضیا ساجد،(لاہور: علیم پبلشرز،۱۹۹۱ء)،ص:۱۳

۲۔ رشید امجد،ڈاکٹر،پاکستانی اردو شاعرات،مشمولہ ،عبارت،مرتب : ڈاکٹر نوازش علی،(راولپنڈی: دھنک پبلی کیشنز،۱۹۹۷ء) ،ص: ۱۰۰

۳۔ خالدہ حسین ،زہرانگاہ،مشمولہ،خواتین کی شاعری میں عورتوں کے مسائل کی تصویر کشی،(اسلام آباد:وزارتِ ترقی خواتین ،۲۰۰۵ء) ،ص: ۶۶،۶۷

۴۔ رشید امجد،ڈاکٹر،پاکستانی اردو شاعرات،مشمولہ ،عبارت،مرتب : ڈاکٹر نوازش علی،(راولپنڈی: دھنک پبلی کیشنز،۱۹۹۷ء) ،ص:۱۲۱

۵۔ ادا جعفری،میں ساز ڈھونڈتی رہی،(لاہور: غالب پبلشرز،۱۹۸۲ء)،ص:۳۴

۶۔ ایضاً،ص: ۵۵

۷۔ عنبرین منیر ،ڈاکٹر،جدید اردو نظم میں نفسیاتی عناصر،(فیصل آباد: مثال پبلشرز،۲۰۱۷ء)،ص:۵۵۰

۸۔ ادا جعفری،میں ساز ڈھونڈتی رہی،(لاہور: غالب پبلشرز،۱۹۸۲ء)،ص:۹۷

۹۔ ایضاً،ص: ۱۰۳

۱۰۔ ساجدہ زیدی،پردہ ہے ساز کا ،(دہلی: تخلیق کار پبلشرز،۲۰۰۷ء)،ص: ۶۷

۱۱۔ ساجدہ زیدی،آتشِ سیال،(دہلی: مکتبہ جامعہ نگر۱۹۷۲)،ص:۲۴

۱۲۔ ساجدہ زیدی،پردہ ہے ساز کا ،(دہلی: تخلیق کار پبلشرز،۲۰۰۷ء)،ص: ۱۲۳

۱۳۔ ایضاً،ص: ۱۱۱

۱۴۔ وسیم بیگم ،ڈاکٹر ،آزادی کے بعداردو شاعری میں تانیثی حسیت،(دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۱۲ء)،ص: ۱۴۱

۱۵۔ زاہدہ زیدی،بہت دور تک رات ہو گی،(علی گڑھ: آبشار پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء)،ص:۴۳

۱۶۔ زاہدہ زیدی،سنگِ جاں،(علی گڑھ: آبشار،۱۹۸۹ء)،ص:۳۸

۱۷۔ زاہدہ زیدی،زہرِ حیات،(دہلی: مکتبہ جامعہ نگر،۱۹۷۰ء)،ص:۶۱

۱۸۔ زاہدہ زیدی،شعلۂ جاں،(علی گڑھ: آبشار،۲۰۰۰ء)،ص:۳۴

۱۹۔ شفیق فاطمہ شعریٰ،سلسلۂ مکالمات(کلیات)،(دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۰۶ء)،ص: ۳۵۰

۲۰۔ ایضاً،ص:۳۵۳

۲۱۔ زہرا نگاہ،شام کا پہلا تارا،(دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،۱۹۸۰ء)،ص:۳۲،۳۳

۲۲۔ ایضاً،ص: ۲۹۴،۲۹۶

۲۳۔ زہرا نگاہ،شام کا پہلا تارہ(لاہور: اساطیر ۱۹۹۸ء)،ص: ۶۸

۲۴۔ ایضاً،ص:۶۵

۲۵۔ ایضاً،ص:۷۶

۲۶۔ وسیم بیگم،ڈاکٹر،آزاد ی کے بعد اردو شاعری میں تانیثی حسیت،(دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۱۲ء)،ص: ۲۷۱

۲۷۔ کشور ناہید،دشتِ قیس میں لیلیٰ،(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۱ء)،ص:۴۷۵

۲۸۔ کشور ناہید،سیاہ حاشیہ میں گلابی رنگ،(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۸۶ء)،ص:۳۰

۲۹۔ کشور ناہید،دائروں میں پھیلی لکیر،(نئی دہلی: نئی آواز،۱۹۸۷ء)،ص:۷۴

۳۰۔ ایضاً،ص: ۴۲

۳۱۔ ایضاً،ص: ۵۵

۳۲۔ نجمہ رحمانی،ڈاکٹر،آزادی کے بعد اردو شاعرات، (دہلی: بھارت آفسیٹ پریس،۱۹۹۴ء)ص:۷۷،۷۸

۳۳۔ فہمیدہ ریاض، میں مٹی کی مورت ہوں، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۶ء)،ص: ۱۵۸

۳۴۔ ایضاً،ص: ۱۵۹

۳۵۔ ظفر اقبال،ہماری شاعرات ایک سرسری اور نا مکمل تذکرہ،مشمولہ،ادبیات،(اسلام آباد:اکادمی ادبیات ،شمارہ جنوری تا جون ،۲۰۰۷ء)،ص:۳۴۰

۳۶۔ فہمیدہ ریاض، میں مٹی کی مورت ہوں، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۶ء)،ص: ۲۸۵

۳۷۔ نور جہاں ثروت، بے نام شجر، (نئی دہلی: عزیز پرنٹنگ پریس،۱۹۹۵ء)،ص: ۸۵

۳۸۔ ایضاً،ص: ۱۳۳

۳۹۔ پروین شاکر، خوشبو، (اسلام آباد: مراد پبلی کیشنز،۲۰۰۲ء)،ص: ۳۳

۴۰۔ ایضاً،ص:۱۴۰

۴۱۔ ناہید قاسمی،ڈاکٹر ،جدید اردو شاعری میں فطرت نگاری،(کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان،۲۰۰۲ء)،،ص: ۶۶۹

۴۲۔ پروین شاکر، خود کلامی، (اسلام آباد: مرادپبلی کیشنز، س ن)،ص: ۵۵

۴۳۔ راحت ملک،مضمون،پروین شاکر معروضیت کی شاعرہ ،مشمولہ،پروین شاکر شخصیت ،فکروفن،(اسلام آباد: مراد پبلی کیشنز،۱۹۹۵ء) ،ص: ۴۳۳،۴۳۷

۴۴۔ فاطمہ حسن، یاد کی بارشیں،(لاہور: روش پبلی کیشنز،۲۰۰۵ء)،ص: ۵۵

۴۵۔ ایضاً،ص: ۸۶

۴۶۔ ایضاً،ص: ۴۵

باب ہشتم

نثری نظم نگاروں کے موضوعاتی وہیئتی اشتراکات

ہمارے اذہان اس قدر روایت پرست ہیں کہ کسی نئی بات کو تسلیم کرنے میں برسوں لگا دیتے ہیں۔اردو شاعری میں آزاد نظم کی ہیئت کو پنپنے میں کچھ وقت لگا لیکن اسے جلد ہی قبول کر لیا گیا کیوں کہ اس ہیئت کو آغاز ہی میں بڑے نظم نگاروں نے اپنے شعری اظہار کا ذریعہ بنا لیا تھا۔نثری نظم کو اس لیے تادیر مخالفت کا سامنا کرنا پڑا کہ اس ہیئت کو کل وقتی اور بڑا شاعر میسر نہ ہوا۔ آزادی کے بعد زندگی کے ہر شعبے میں برق رفتار تبدیلیاں رونما ہوئیں تو رائج ہیئتوں میں اس تیز رفتاری سے بدلتی زندگی کے تقاضوں کو ہم آہنگ کرنا ممکن نہ رہا۔ اس لیے معدودے چندنظم نگاروں نے اظہار کے نئے سانچے فروغ دیے جو بعد میں نثری نظم کی صورت اختیار کر گئے۔شاعری کے اس نئے تصور نے نثری نظم کو فروغ دیا ،نظم معرا سے نثری نظم تک کا شعری سفر ہر قسم کی پابندی سے ماورا ہے۔ نثری نظم نگاری ایک اہم تخلیقی تجربہ ہے جو دیگر اصناف سے مختلف نوعیت کا ہے۔

آزاد نظم کی ہیئت اور نام سے یہاں جو نظم نگاری ہو رہی ہے اسے میراجی اور معاصر شعرا نے پروان چڑھایا ہے اور اب تک اس کی تقلید ہو رہی ہے۔ اسے ''فری ورس'' سمجھا گیا ہے جب کہ نثری نظم کو یہاں''Prose Poem''جاتا ہے۔ مبارک احمد اس سے اختلاف کرتے ہیں وہ نثری نظم کو فری ورس کہتے ہیں۔ اس ضمن میں یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ''یہاں نثری نظم کے نام سے جو شاعری ہو رہی ہے وہ Prose Poemکی ذیل میں نہیں آتی اور مختلف چیز ہے ۔مغرب نے Prose Poemکی فریزCoinکر کے غلطی کی۔ اس کی چنداں ضرورت نہیں تھی ---اور اس سے ایک خرابی یہ بھی ہوئی کہ مشرق والے ،اس فریز کی وجہ سے شدید غلط فہمی کا شکار ہوئے ۔حیرت یہ ہے کہ ان میں وہ سبھی ،خاصے پڑھے لکھے شاعر اور نقاد بھی شامل ہیں جنھوں نے مغربی شاعری کا مطالعہ بظاہر خاصا کر رکھا ہے۔ یہاں جو واقعتاً جینوئن شاعری ''نثری نظم'' کے نام پر یا نام لیے بغیر ہو رہی ہے بعینہ ''فری ورس'' کی فارم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ نظم جو مغرب میں ''پروز پوئم'' کہلاتی ہے اصل میں وہ بھی سو فیصد ''فری ورس'' ہے۔''(۱)

شعری تجربے کے قدرتی اظہار نے اس آزادعروضی نظم میں ردم ،توازن،ڈسپلن اور آہنگ ہر کہیں دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس کو''فری ورس'' یا ''پروز ورس''کا نام دینااپنی جگہ ۔روایت کے مطابق نثری نظم کا آغاز پاکستان میں ساٹھ کی دہائی میں ہوا۔ نثری نظم کے حوالے سے مبارک احمد نے مضامین بھی لکھے اور ان کی نظم ''میں اپنی آنکھیں کھلی رکھتا ہوں'' ۱۹۶۳ء میں منصۂ شہود پر آئی۔ ۱۹۶۲-۶۳ء میں نثری نظم کا آغاز لاہور میں مبارک احمد اور محمد سلیم الرحمن نے کیا اور کراچی میں ۱۹۶۷-۶۸ء میں رئیس فروغ اور قمر جمیل نے اس ہیئت کو ذریعۂ اظہار بنایا۔ اب اس ہیئت میں شاعری کرنے والے اہم شعرا کی فہرست طویل ہے۔ مرد اور خواتین شعرا نے اس ہیئت میں اعلیٰ سطح کی شاعری تخلیق کی ہے۔ نثری نظم کا آہنگ قدرتی ہے اس نے اردو شاعری کے وقار ومعیار میں مزید اضافہ کیا ہے اور عروضی شاعری کی نسبت وسعت کے حامل Contentکو اپنایا ہے۔

بنے بنائے اصول اور قاعدے بسا اوقات کام نہیں آتے اس لیے مقصد کے حصول کے لیے روایت سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ اردو میں نثری نظم،آزاد نظم کے بعد متعارف ہوئی جب کہ مغرب میں یہ ہیئت آزاد نظم کا پیش خیمہ بنی۔ بودلیر نے سب سے پہلے اپنی شاعری میں نثری نظم کی اصطلاح استعمال کی ۔ اس سے قبل برتراں ایسی تحریریں لکھ چکے تھے جو نثری نظم سے قریب تر تھیں۔یہی وجہ ہے کہ خود بودلیر نے نثری نظم کا موجد برتراں کو قرار دیا ہے۔بودلیر نے پہلی بار اس ہیئت کو آرٹ فارم کی حیثیت سے برتا۔بودلیر کو اس عمل کی اشد

ضرورت تھی کیوں کہ وہ کسی طرح فرانسیسی شعریات کی سخت گیر عروضی پابندیوں سے آزادی چاہتے تھے۔ دوسرے شعرا نے بھی اسے پسند کیا۔ رین بو اور ملارمے وغیرہ نے بھی نثری ہیئت میں نظم نگاری کا آغاز کر دیا ۔ مغربی ادب میں نثری نظم نے آزاد نظم کے لیے راہ ہموار کی۔ اُردو میں نثری نظم کوئی خاص مقبولیت حاصل نہیں کر پائی اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے کان نامانوس طرزِ اظہار سے آشنا نہیں ہو سکے ہیں۔

آٹھویں دہائی کی نسل نے نثری نظم کی طرف توجہ کی ہے۔ جدید صنعتی ،شہری اور مادیت پرست زندگی نے جو موضوعات دیے ہیں ان کے اظہار کے لیے یہ ہیئت بہت مناسب ہے۔ نثری نظم کا تجربہ نظم کی ارتقائی کڑی ہےنظمِ معرا سے قبل غیر مقفیٰ نظمیں کہنے کا تصور نہیں تھا ،نظمِ آزاد سے قبل بحور کے ارکان کو تقسیم کرنے کا تصور نہیں تھا اس طرح نظم نے پہلے قافیہ سے چھٹکارا حاصل کیا اور پھر عروضی پیٹرن سے نجات پائی۔معرا اور آزاد نظم کی طرح اس کے خلاف بھی شدید ہنگامہ برپا ہوا اسی مخالفت کی وجہ سے نثری نظم کے تخلیقی وفور کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔کسی نے اس کی اصطلاح پر اختلاف کیا اور کسی نے اسے غیر شاعری قرار دیا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کی رائے دیکھیے:

> ’’مجھے دراصل نثری نظم کی اصطلاح پر اعتراض ہے ۔نثر اور نظم آپس میں متضاد چیزیں ہیں۔ میری رائے میں نثری نظم کہنے کے بجائے اسے نثری شاعری کہنا زیادہ بہتر ہو گا۔‘‘(۲)

نثری نظم کی مخالفت کے باوجود متعدد ناقدین نے اس نئی شعری صنف کے متعارف ہونے کو ایک خوش آئند ہیئتی تبدیلی قرار دیا۔انگریزی میں آزاد نظم(فری ورس) مختلف اوزان وبحور کے امتزاج سے بھی اوروزن کو یکسر نظر انداز کر کے بھی تخلیق کی جا سکتی ہے۔ یہی تجربہ اردو میں نثری نظم کی صورت میں نمودار ہوا ۔ یہ تجربہ نظم کی زندگی اور رفتار کی علامت ہے۔ اختلاف ہر ہیئت میں ہوتا ہے اور یہی اختلاف ہیئت کو الگ کرتا ہے۔ گذشتہ چار پانچ دہائیوں میں سے نثری نظم کے مجموعے منظر عام پر آرہے ہیں۔ اکیسویں صدی کے آغاز سے اس ہیئت کو نئے سرے سے فروغ دینے کی کوششیں تیز ہوئی ہیں۔ معاصر نثری نظم نگاروں سماجی ،معاشی ، نفسیاتی اور دیگر حوالے سے موضوعاتی اشتراکات پائے جاتے ہیں۔ نثری نظموں میں عصری حسیّت کا عنصر ایک انداز میں متشکل ہوا ہے۔ نثری نظم نگاروں نے سماجی ،سیاسی اور معاشی انتشار کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورت حال کاذکر کیا ہے۔ معاصر نثری نظم نگاروں نے تمثیلی،علامتی، استعاراتی اور حسّی پیکر ایک جیسے استعمال کیے ہیں۔ نصیر احمد ناصر نثری نظم سے متعلق لکھتے ہیں:

> ’’بیسویں صدی کی آخری دہائی اور اس کے بعد میں تخلیق ہونے والی اردو نثری نظم اپنی ہیئت ،اسلوب ،زبان وبیان ،موضوعات ،لفظیات ،کثیر معنویت ،حساسیت اور عصر آفرینی

کے اعتبار سے ارتقا اور خود انحصاری کی روشن دلیل ہے۔
(۳)''

نمایندہ نثری نظم نگاروں میں مبارک احمد اپنی ۱۸ نظموں پر مشتمل مجموعہ کلام''زمانہ عدالت نہیں''کا ۱۹۶۵ء میں اشاعت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ''زمانہ عدالت نہیں'' مبارک احمد کی طویل نثری نظم ہے۔ جو کلیات مبارک احمد میں شامل ہے۔ ان کے کلیات میں ایک نظم''میں اپنی آنکھیں کھلی رکھتا ہوں'' کا سن تخلیق ۱۹۶۳ء درج ہے اور'' ستائیس نظموں میں نظم'' ۱۹٦۷ء تا ۱۹۹۵ء کے دوران تخلیق کی ہے۔ سجاد ظہیر کا شعری مجموعہ''پگھلا نیلم'' ۱۹۶۴ء میں اشاعت پذیر ہوا ہے۔ یہاں خاص طور سے ان نثری نظم نگاروں کا ذکر کیا جاتا ہے جن کے یہاں موضوعاتی اشتراکات نظر آتے ہیں۔

اردو نثری نظم کی روایت میں ساٹھ کی دہائی می نثری نظم ایک تحریک کی صورت میں ابھرتی نظر آتی ہے ۔ اس تحریک کے آغاز مینمنظر عام پر آنے والے شعرا میں مبارک احمد کا نام زیادہ اہم ہے۔ اگرچہ انھوں نے عروضی نظمیں بھی تخلیق کیں ہیں لیکن ان کی زیادہ دل چسپی نثری نظم میں رہی۔ مبارک احمد نے نثری نظم کا عمدہ تجربہ کیا اور اس ہیئت کی راہ ہموار کرنے کے لیے مضامین بھی لکھے۔ نثری نظم لکھنے اور اس کی حمایت کرنے پر انھیں اپنے ہم عصروں کی دشنام طرازیاں بھی ب رداشت کرنا پڑیں ۔مبارک احمد کی کوششوں کے نتیجے میں شعرا نے آہستہ آہستہ نثری ہیئت میں طبع آزمائی شروع کر دی۔ ان کی قائم کی ہوئی روایت کا تسلسل اس طرح قائم ہوا کہ آج متعدد شعرا کے نثری نظموں پر مشتمل مجموعے شایع ہو رہے ہیں۔ اور نثری نظمیں کثرت سے ادبی رسائل میں اشاعت پذیر بھی ہو رہی ہیں۔ آج ایک ہی شاعر غزل،آزاد اور نثری نظم تخلیق کر رہا ہے۔ مبارک احمد کی نظم ''پانی کا رشتہ'' ملاحظہ کیجیے:

اس بار خوب بارشیں ہوئیں/اور میں نے سمندر کو اپنی گلی سے گزرتے کئی بار دیکھا /اور جانا/کہ کراچی کے ساحل پہ کھڑے ہو کر /تم جس سمندر کو دیکھتی ہو/اس میں ہمارے جسموں کی خوشبو/اور مٹی کی باس شامل ہے/سمندر ہماری ایکتا کا اظہار ہے/کشمیر سے کراچی تک /اور مشرقی پنجاب سے آخری پختون اور بلوچ علاقوں تک/ہم پانی کے رشتے میں بندھے ہیں /ہماری تاریخ وتہذیب/ثقافت اور شاعری ابھی پانیوں سے سیراب ہوتی ہے(۴)

مبارک احمد نے اس نظم میں انسانی رشتے کی بات کی ہے۔ پنجابی،بلوچی اور پختون ہونے کے باوجود ہمارے تاریخ اور تہذیب ایک ہے۔ اس نظم میں قومی یکجہتی اور باہمی اتحاد واتفاق کا عنصر نمایاں ہے۔۱۹٧۴ء میں اشاعت پذیر ہونے والاعبدالرشید کا شعری مجموعہ ''اپنے لیے اور دوستوں کے لیے نظمیں'' نثری نظم کا باقاعدہ پہلا مجموعہ ہے ۔ عبدالرشید کا شمار نثری نظم کے اولین شعرا میں ہوتا ہے ۔ انھوں نے اس ہیئت کو فروغ دینے کے لیے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا بھر پور استعمال کیا ہے۔ انھوں نے اپنے پہلے شعری مجموعے''انی کنت من الظالمین '' میں آزاد ہیئت میں نظم نگاری کی ہے۔

عبدالرشید نے نے اپنے عہد کے تمام سماجی جزرومد کو متن کا حصہ بنایا ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں خارجی عوامل ،داخلی کیفیات اور ذاتی تجربات کو بیان کیا ے ۔ان کی نظمیں مادیت پرست معاشرے میں ہونے والی روحانی اور اخلاقی اقدار کی پامالی کا بیانیہ ہیں۔انھوں نے مخصوص عصری صورت حال کی عکاسی کی ہے۔ انھوں نے تنہائی ،اجتماعی جبر اور تلاشِ محبت کو نئے ادراک کے ساتھ شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ عبدالرشید کی نظم ''پھٹا پرانا بادبان'' اس کی عمدہ مثال ہے۔ وہ معاشرےکی پیچیدہ صورت حال اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی خلفشاری کو نظم ''Poetry Evening'' میں بیان کرتے ہیں:

انتڑیاں بھیجے کھوپڑیاں/ختنے کے کاٹے ہوئے گوشت کی طرح /سننے والے انزال کے قطروں کے منتظر رہتے ہیں/پھرلعابِ دہن سے بھرے ہوئے منہ/سائیکل کے کتوں کی طرح بولنا شروع کر دیں گے/واجب الادا قرضوں کی صورت /پوری رفتار سے شہر کی سڑکوں کی طرف رواں دواں ہوں گے۔(۵)

عبدالرشید کی شاعری میں جنسی بے راہروی اور ناآسودگی کے حوالے بھی ملتے ہیں ''The Faithless Wife'' اور ''ہوٹلوں میں، قبحہ خانوں میں'' جیسی نظمیں اس کی مثال ہیں۔ ان کے یہاں فرائیڈ کے جنسی محرکات کی نا آسودگی کے علاوہ انسانی رویّوں سے پیدا ہونے والے اضطراب اور احساسِ نارسائی کو دیکھا جا سکتا ہے۔ عبدالرشید کی نظمیں خود اذیتی ،خود لذتی ،تنہائی اور ذات کی شکست وریخت کی عکاس ہیں کیوں کہ انھوں نے نظام زیست سے کوئی مفاہمت نہیں کی۔ انھوں نے اپنے داخلی کرب ،گمبھیر تنہائی اور احساسِ عدم تحفظ کو مختلف جنسی علامتوں کے ذریعے بیان کیا ہےنظم ''کنوارے پنے سے بوجھل ہوں''ان کے جنسی تجربوں کا عمدہ بیانیہ ہے:

کنوارے پنے سے بوجھل ہوں/سڑکوں پر پستان بناتا ہوں/اونچی اونچی بلڈنگیں فوٹو گرافک لڑکیاں ہیں /جن کے جسموں کے آرپار کھڑکیاں ہیں/ان کی رانوں پر ڈاکے کے ٹکٹ چپکاتا ہوں/ابھرے ہوئے کولہوں پر سڑپ ٹیز کرتا ہوں/باہوں کے حصار میں /ڈی ایچ لارنس کے ناول اور پکاسو کی نیوڈز لٹکاتا ہوں ان کے دہان لوکو شیڈ کی طرح بد ہیئت ہیں / گردنیں دریا پر بنے ہوئے پلوں کی طرح سبک/گالوں کی نرم روئیں(٦)

عبدالرشید کی نظموں میں بدھ ازم کی عبادت گاہوں کی تصویریں اور سانپ کی مختلف علامتیں ملتی ہیں۔ ان کی متعدد نظمیں نیم جنسی اور نیم نفسیاتی الجھنوں کی عکاس ہیں۔ افتخار جالب کی چھاپ کے باوجود ان کی ابتدائی شاعری تقلیدی نہیں بل کہ تخلیقی انداز لیے ہوئے ہے۔ عبدالرشید کی نظموں سے متعلق انیس ناگی رقم طراز ہیں:

> ''یہ اضطراب اور خواب محض فرائیڈ کی ''لبیڈو'' کا مسئلہ نہیں ہے اس کے محرکات اور مضمرات ایک ایسے نظامِ زیست میں موجود ہیں جو ہر لمحہ امتناعات کی نشاندہی کرتے ہوئے زیست کا حوصلہ چھین لیتا ہے۔ عبدالرشید اس نظام

زیست سے مفاہمت کرنے کو تیار نہیں ،چنانچہ وہ خود اذیتی
،خود لذتی اوت تنہائی کے سفر کو قبول کرتا ہے۔''(۷)

مبار ک احمد نے اپنے عہد کے نفسی اور پیچ در پیچ جذباتی مسائل اور تجربات کا تخلیقی اظہار کیا ہے۔ وہ مادہ پرست دنیا اور زندگی کی سچائیوں شعوری طور پر اجاگر کرتے ہیں۔ انھوں نے انسانی نفس کو میرا جی کی طرح ہندی اساطیری علامتوں کے ذریعے بیان کرنے کے بجائے جدید حسیّت سے پیش کیا ہے۔ ان کے احساسات کی ترجمان نظم ''چار سمندر اور طوفان'' ملاحظہ کیجیے:

سمندر کے مدوجزر سے چاند کو کیا غرض/چاند سمندر میں کب اترا ہے/کہ تم محبت کے اِس طوفان میں اترو(۸)

مبارک احمد کی نظموں میں نفسیاتی اور عصری حقیقتوں کے مضامین ملتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کے ایک نظم ''روایت سے'' اہم ہے۔ وہ نئے دور کی نئی سچائیوں کے لیے روایت کا لباس تنگ محسوس کرتے ہیں۔ انھوں نے مختلف علامتوں کے ذریعے عصری ،تہذیبی عناصر کو پیش کیا ہے۔ وہ انسانی اقدار کے شکست وریخت سے دل برداشتہ دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے عورت کی نفسیات کا ذکر کئی طرح سے کیا ہے۔ انھوں نے عورت کی تمام تر رعنائیاں بیان کی ہیں کہ وہ کسی طرح مردوں کے اندھے طوفانی جذبوں کا محرک بنتی ہے۔ وہ اپنے حسن سے خواہشوں کو ابھارتی ہے۔ اس ضمن میں مبارک احمد کی نظم ''مجھے نظم کر لو'' دیکھیے:

یہ سب کچھ تم نے/ابھرتی ڈوبتی ہانپتی آواز میں کہا تھا/تم ابھی جوان لڑکی بھی نہیں بنی تھیں/یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا/ تمھاری باتوں اور جذبوں میں اتنی بلوغت کہاں سے آ گئی /یہ تم نے بعد میں بتایا/ تمھاری آنکھوں نے ارد گرد کھیلے جانے والے زندگی کے کھیل کو گہری وابستگی سے دیکھا(۹)

مبارک احمد نے اپنی نظموں میں عورت کی نفسیات کا ذکر بھی کیا ہے وہ جسمانی کمزوری کی وجہ سے مغلوب رہتی ہے ۔انھوں نے حقوق نسواں کی بات کی ہے۔ وہ عصری مسائل سے بخوبی آگاہ تھے اور ملکی حالات پر کڑی نظر رکھتے تھے ۔ انھوں نے انسانی زندگی کے احساسات ،جذبات اور ذہن کے تاریک وہموں کو شعری اظہار کا موضوع بنایا ہے۔ اس حوالے سے ان کی نظمیں ''زمانہ عدالت نہیں''، ''چیخ'' چینی کتنی ڈالوں ''اور ''آؤ ہم روشنی بن جائیں'' خاص طور سے اہمیت کی حامل ہیں۔

عبدالرشید کی نظمیں بھی انسانی خصلتوں کی نشاندہی کرتی ہیں انھوں نے روحانی اور اخلاقی اقدار کی پامالی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورت حال کو مصرعوں میں بیان کیا ہے۔انھوں نے جدید دور میں صنعت اور مشین کی آمد سے شتربے مہار کی طرح دوڑتی ہوئی تہذیب کی بڑے خوب صورت انداز میں عکاسی کی ہے۔ اس حوالے سے ان کی نظمیں ''کیا

میں تھک چکا ہوں'' اور ''انور ادیب کے لیے چند نظمیں''اہم ہیں۔وہ مخصوص عصری حالات کی عکاسی بڑی عمدگی سے کرتے ہیں ۔انھوں نے سامراجی قوتوں کی حد سے بڑی ہوئی حرص وہوس کو بیان کیا ہے کہ یہ قوتیں کس طرح کمزور قوموں کے وسائل کو ہڑپ کرتی ہیں:

زمین تیل کے جلنے سے جوان ہو رہی ہے ،پانی کے کانوں میں/صور اسرافیل کی بھنک پڑ چکی ہے، زمین کے ان گنت دیوتاؤں کا جلوس/ناقوس منہ سے لگ چکا ہے/اب کوئی تسبیح پھیرنے والا ہاتھ پانی میٹھی یادوں کے ساتھ گھل مل نہیں سکے گا(۱۰)

انیس ناگی نے بھی نثری ہیئت میں نظم نگاری کی ہے۔ ان کا نثری نظم کے فروغ میں بڑا اہم Contribution ہے۔ انھوں نے نثری نظم کو آزاد نظم کی ہیئت سے ممیز کرنے لے لیے پیراگراف کی صورت میں لکھنے پر اصرار کیا۔ انیس ناگی کی نظموں میں اپنے عہد کے مسائل کا بیانیہ ملتا ہے۔ ان کی نظموں سے تنہائی اور بیگانگی کا احساس ابھرتا ہے۔ انیس انگی ابتدا میں افتخار جالب کے مقلد رہے لیکن بعد میں انھوں نے اپنا الگ اسلوب وضع کیا۔ انھوں نے بیسویں صدی کے انسان کو درپیش وجودی مسائل کو شاعری کا موضوع بنایا۔ ان کی نثری اور آزاد نظموں پر مشتمل کلیات''بیگانگی کی نظمیں'' کے نام سے اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔ ان کی نظموں عصری اور نفسیاتی شعور نمایاں ملتا ہے۔ انھوں نے نئے دور کے انسانی تجربات اور واقعات کو انفرادی اور شخصی سطح پر محسوس کیا ہے۔ وہ انسان کو صنعتی زندگی کے تنوع اور انتشار سے محفوظ رکھنے کی بات کرتے ہیں۔وہ آسیب زدگی اور ناآسودگی کی وجہ سے انسان کے کائناتی حسن سے لطف اندوز نہ ہونے کی حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں۔ اس ضمن میں انیس ناگی کا ایک شعری اقتباس ملاحظہ کیجیے:

پریشانی مرا پیچھا /نہ چھوڑے گی/مرا مقدر ہے یہی/مضطرب پیہم رہوں/شاید پریشانی مری ہے /اک علامت زندگی کی/جو مری اعصاب سے ہے (۱۱)

انیس ناگی کو معاشرے کی مادیت پسندی کی وجہ سے عورت کی محبت بھی بے رنگ لگتی ہے۔ وہ زندگی کی محرومیوں اور الجھنوں کے باعث عورت ذات سے بھی متنفر دکھائی دیتے ہیں۔انیس کہتے ہیں کہ مادیت پسندی کی وجہ سے عورت کا کردار بھی مادہ پرستی کا شکار ہے ۔ ان کی نظم ''اجڑتی جا رہی ہے''دیکھیے:

احساس کی دنیا اجڑتی جا رہی /پھول بھی بے رنگ خوشبو سے تہی/ہر سمت ویرانی/مکاں ٹوٹے اور مکیں بدحال---/غصے میں نچڑتی عورتیں/خاوندوں کو گالیاں بکتی گھریلو عورتیں/جو ہمیشہ مال وزر کی منتظر ہیں---/اسی طرح کی ابتری میں/سارے قصے عشق کے اور حسن کے ہیں(۱۲)

خوف اور اضطراب کی کیفیتوں انسانی جبلت میں بدذائقگی پیدا کر دی ہے۔ اس صنعتی اور مشینی برق رفتاری نے انسان کو اعصابی مریض بنا دیاہے۔ اس ضمن میں انیس ناگی کی

نظم ''ایک علالت'' اہمیت کی حامل ہے۔ ان کی نظموں میں ماضی کی تلخ یادوں کا تذکرہ بھی ہے جب وہ اپنے ماضی کو پلٹ کر دیکھتے ہیں تو ان کے اندر خود رحمی،افسردگی اور راندگی کے احساسات جنم لیتے ہیں۔ جسے وہ اپنی نظم ''دوزخی باپ'' میں بیان کرتے ہیں:

ہمیں محبت کا راستہ مت دکھا/کہ ہم تو ڈرے ہوئے ہیں/ہمیں تو اپنے گھروں سے بھی خوف آتا ہے/ خوف جتنے تھے جھوٹ نکلے/یہ گھر ہمیشہ عذاب ہوتے ہیں/لوگ سارے لہو کے رشتوں کا نام لے کر/کبھی محبت، کبھی حقارت،کبھی مصیبت کے درمیان ہیں(۱۳)

ثروت حسین کا نام معاصر غزل نگاروں میں اہمیت کا حامل ہے لیکن ان کی شاعری کی ایک نمایاں جہت نثری نظمیں بھی ہیں۔انھوں نے معاصر شعرا کی طرح اپنی داخلی کیفیات کو استعاروں ،علامتوں اور تمثالوں کے ذریعے شعری پیکر عطا کیا ہے۔ انھوں نے چھوٹی چھوٹی تصویروں اور اپنے اندر کی احساساتی اشاریت سے شعری دائرے بنائے ہیں۔ انھوں نے اپنے مضامین کی تفہیم کے لیے ایک مخصوص زبان استعمال کی ہے۔ ثروت حسین کی نظمیں ایک عام انسانکے جذبات واحساسات کی عکاسی کرتی ہیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے ایک عام آدمی کی زندگی کا نوحہ لکھا ہے ۔انھوں نے روایتی موضوعات میں طبع آزمائی کرتے ہوئے جاگیرداری نظام کی جبریت کی مذمت کی ہے جس سے ایک عام آدمی کی شخصی آزادی اور وجودی شناخت معدوم ہو گئی ہے۔ انھوں نے اپنی متعدد نظموں میں معاشی ناہمواری اور طبقاتی تقسیم کی طرف اشارے بھی کیے۔ ان کی نظم ''ایک انسان کی موت''میں سقط ڈھاکہ کے سانحے کی عکاسی کی گئی ہے۔ثروت حسین کی نظموں کے بارے میں ڈاکٹر سہیل احمد خاں رقم طراز ہیں:

> ''ثروت حسین کی نظمیں اور غزلیں پڑھتے ہوئے فوراً یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم ایسی کائنات میں سانس لے رہے ہیں جس میں مظاہر اپنی اولین اور شفاف صورت میں موجود ہیں۔ اپنا آشوب بھی برحق کہ کون اس سے آزاد ہو سکتا ہے۔ گردوپیش کا غبار آلود ہونا بھی مسلم کہ ہماری سانسیں ہر لمحہ اس کی گواہی دیتی ہیں مگر شاعر نے اپنی شاعری میں اپنے رویاء کائنات کو کسی اور ہی آن میں دیکھا ہے اور تاروں ،پھولوں ،درختوں اور بستیوں اور انسانوں سے عاشق کا رشتہ جوڑ لیا ہے۔ ''(۱۴)

ثروت حسین نے نفسیاتی الجھنوں کا کا کتھارسس مظاہر فطرت میں تلاش کرتے ہیں۔ کائنات کے مظاہر سے لگاؤ ان کی نظموں میں نمایاں ہے۔ان کی تمثیلیں صرف کائناتی نہیں بل کہ نفسیاتی بھی ہیں۔ ان کی نظم ''ایک نظم کہیں سے بھی شروع ہو سکتی ہے'' ملاحظہ کیجیے:

ایک نظم کہیں سے بھی شروع ہو سکتی ہے/جوتوں کی جوڑی سے/یا قبر سے جو بارشوں میں بیٹھ گئی/یا اس پھول سے جو قبر کی پائینتی پرکھلا/ہر ایک کو کہیں نہ کہیں پناہ مل گئی/چیونٹیوں کو جائے نماز کے نیچے/اور لڑکیوں کو میری آواز میں(۱۵)

ثروت حسین نے زندگی کے اتار چڑھاؤ اور تضادات کو اپنی نظموں میں بیان کیا ہے۔ان کی نظموں ''دن نکلتا ہے'' ،'' میں ایک آدمی کی موت مرنا چاہتا ہوں''،''صبح ہوتے ہی''اور'' زمین کا آہنگ ''میں عصری حسیّت ملتی ہے۔ان کے دوسرے مجموعے''خاکداں '' کی نظمیں داخلی تنہائی،شکستِ ذات سے مملو ہیں۔ ان کی نظموں میں متعدد حسّی تجربات ملتے ہیں۔ انھوں نے معاشرے کے پست اور محروم طبقے کی نمایندگی کی ہے۔ وہ صنعتی اور مشینی زندگی کے ہاتھوں پسے ہوئے طبقے کی ترجمانی کرتے ہیں۔ وہ مادیت پرست زندگی سے بیزار ہیں جس نے انسانی اعصاب کو کمزور کر دیا ہے۔

افضال احمد سیّد اردو نثری نظم کے اہم شاعر ہیں۔انھوں نے ابتدائی دور میں اس ہیئت کو فروغ دینے اور استحکام بخشنے میں اپنی بساط کے مطابق کوشش کی ہے۔انھوں نے نثری نظم کو نئے انداز میں متشکل تو کیا لیکن موضوعات اور نظریے روایتی ہی رکھے اور نظم کی فطرت کو بھی مغربیت کے قریب تر ہی رہنے دیا۔ افضا احمد سیّد آزاد نظم کے کسی بھی بڑے شاعر سے کم نہیں ۔ان کی نثری نظموں کا پہلا مجموعہ''چھینی ہوئی تاریخ'' ۱۹۸۴ء میں اشاعت پذیر ہوا ۔ان کے دو شعری مجموعے ''دوزبانوں میں سزائے موت'' اور''روکوکواور دوسری دنیائیں''بھی نثری نظموں پر مشتمل ہیں۔ان کی نظموں میں معاصر سیاسی ادراک اور فکری لَے دکھائی دیتی ہے۔

افضا ل احمد سیّد کی نثری نظم میں ایک عام آدمی کی زندگی کا بیانیہ پیش کیا ہے۔ انھوں نے ایک ایسے معاشرے کی عکاسی کی ہے جس کی بنیاد مادیت پرستی پر رکھی گئی ہے۔ انھوں نے طبقاتی تقسیم اور دولت کی غیر مساوی تقسیم کو بھی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ ان کی نظمیں ایک عام آدمی کے کرب کی صورت گری کر رہی ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ مزدور طبقے کی چھوٹی چھوٹی آسائشیں اور آسانیاں کسی نعمت سے کم نہیں لیکن یہ مزدور پیشہ طبقہ استحصالی نظام کے جال میں پھنسا ہوا ہے۔ آج کا مزدور بھیک کی صورت میں اپنا حق حاصل کر رہا ہے۔افضال احمد سیّد نے اس موضوع کی نظموں کو طنزیہ اسلوب کی آمیزش سے تخلیق کیا ہے۔افضال احمد سیّد کی نثری نظموں کے بارے میں شمیم حنفی رقم طراز ہیں:

> ''افضال احمد کی نظموں کی کتاب''چھینی ہوئی تاریخ'' کی نظموں نے نئی شاعری کا سرا سیاسی ادراک اور فکری مزاحمت اور احتجاج کی اس لہر سے جوڑنے کی کوشش کی جو جدیدیت کے میلان کا ناگزیر حصہ تھی لیکن جدیدیت کے

رسمی اور ادھورے تصور کے ملبے میں دب کر رہ گئی تھی۔''(۱٦)

افضا ل احمد سیّد نے معاشرے کے ایک عام آدمی کی زندگی کا بیانیہ انتہائی عمدہگی سے پیش کیا ہے۔ آج کا انسان اپنے خوابوں کے تعاقب میں بہت دور نکل جاتا ہے جہاں سے اس کی واپسی مشکل ہو جاتی ہے۔ انھوں نے معاشرے میں پھیلی ہوئی مادیت پرستی اور دولت کی غیر مساوی تقسیم پر بھی نظر رکھی ہوئی ہے۔ وہ انسان کی اندرونی شکست وریخت اور ذہنی انتشار اور سماجی الجھنوں کو موضوع بناتے ہیں۔ ان کی نظم ''چھین ہوئی تاریخ'' کا نمونہ ملاحظہ کیجیے:

ہم نے کسی سفارتخانے میں پناہ نہیں لی/اور نہ کسی گرتے ہوئے جھنڈے کے نیچے/یہ ثابت کرنے کی کوشش کی/کہ ہمارے دونوں ہاتھ خالی ہیں/ہم نے کسی حادثے پر/کسی بیمے والے سے کوئی امداد نہیں لی/موت اور دیگر مراعات/ہماری تنخواہ میں شامل ہیں(۱۷)

افضال احمد سیّد نے روایتی انداز میں انحطاط پذیر معاشرے کی عکاسی کی ہے۔ انھوں نے سیاسی اور مذہبی گروہوں کا اس طرح سے غریب آدمی کا خون چوسنے کی مذمت کی ہے۔ انھوں نے روشنیوں کے شہر کو سج طرح تاریکی میں تبدیل ہوتے دیکھا ہے اس کو اپنی نظموں میں بیان کر دیا ہے۔ ان کی نظموں میں خارجی آشوب کا بیانیہ عصری حسیّت کی وجہ سے ہے۔ انھوں نے معاشرے میں پائی جانے والی بدامنی ،بے چینی اور ابتری کو شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ اس حوالے سے ان کی نظمیں''ہمیں بہت سارے پھول چاہیں ''،''ایک نئی زبان سیکھنا''اور ''جنگل کے پاس ایک عورت تھی''عمدہ مثالیں ہیں۔ افضال احمد سیّد اپنی نثری نظموں میں ا س عام آدمی کی بات کرتے ہیں جو کسی ترقی پذیر ملک میں پیدا ہونے کی پاداش میں بنیادی ضروریات اور سہولتوں سے محروم ہے۔ آج کے انسان کو اپنا حق بھی بھیک کی صورت میں ملتا ہے۔ اسے زندگی کی آسائشیں اور آسانیاں بھی کسی نعمت سے کم نہیں لگتیں۔ اس ضمن میں افضال احمد سیّد کا یہ نظم دیکھیے:

ہم کسی رعایتی فروخت میں/کتابیں/ کپڑے جوتے /حاصل کر سکتے ہیں/جیسا کہ گندم ہمیں امدادی قیمت پر مہیا کی جاتی ہے/اگر ہم چاہیں /کسی بھی کارخانے کے دروازے سے/بچوں کے لیے/رد کردہ بسکٹ خرید سکتے ہیں/تمام طیاروں، ریل گاڑیوں ،بسوں میں ہمارے لیے/.سستی نشستیں رکھی جاتی ہیں(۱۸)

افضال احمد سیّد عصری مسائل کی بات کرتے ہیں کہ کچھ طاقتوں نے اپنے ذاتی مفادات اور مقاصد کے لیے اور کچھ سیاسی عناصر نے عام آدمی کا خون چوسا ہے۔ اس ساری صورت حال کا انسان کی سائیکی پر بڑا منفی اثر پڑا ہے۔ اس بات کے واضح نقوش ان کی نظموں میں نظر آتے ہیں۔ وہ مخصوص حسّی رویوں اور خارجی آشوب اور معاشرے میں پائی جانے والی ابتری ،بدامنی ،بے چینی ،نارسائی اور ناآسودگی کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کی اس نوع کی نظموں میں '' ہمیں بہت سارے پھول چاہیں'' زیادہ اہم ہے۔

احمد ہمیش نثری نظم کا ایک بڑا اہم شاعر ہے۔ انھوں نے معاصرین کی طرح دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کی لیکن نثری نظم ہی ان کی پہچان کا بنیادی حوالہ بنی۔ ان کی لسانی ساخت پر افتخار جالب اور نظم کی ہیئت پر مبارک احمد کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی نثری نظم کی زبان عروضی نظم کے تجربے سے یکسر مختلف ہے۔ احمد ہمیش کی شاعری تجرید اور ابہام کے امتزاج سے تخلیق ہوئی ہے۔ ان کی شاعری میں فرائڈ کے نظریات کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ان کے یہاں عورت اور جنس سے متعلق موضوعات بھی پائے جاتے ہیں۔انھوں نے ذات اور دنیاوہ دھندلکوں کو ایک ساتھ بیان کیا ہے۔ انھیں بدامنی ،بے گانگی ،انتشار اور سڑکوں کا شور سخت ناگوار گزرتا ہے۔ احمد ہمیش کی نظم ''دھند کے رشتے '' ملاحظہ کیجیے:

دھند کے رشتے گہرے ہوتے جاتے ہیں/آواز نہیں جو آئے /اور کانوں کی بے کار ہوس پر/جلتے پانی کے چھینٹے دے/سوچ سکو تو سوچو/اور اس ڈولتے پل کی راکھ پر/اپنے اُلٹے سیدھے نام لکھو(۱۹)

ذی شان ساحل اپنے عہد نے ایک اہم نثری نظم نگار ہیں ۔''شب نامہ اور دوسری نظمیں'' اور''ای میل اور دوسری نظمیں'' ان کی نظموں کے اہم مجموعے ہیں۔ پرندہ، رات، باغ ،ستارہ اور آئینہ ان کی شاعری کے استعارے ہیں۔ ان کی نظم تمثال کاری ،نئی لفظیات اور نئی مصراعی ساخت سے ترتیب پاتی ہے۔ان کی نظموں میں قدیم اور روایتی موضوعات عام ملتے ہیں۔ ان کی نظمیں مظاہر فطرت سے عبارت ہیں۔ ذی شان ساحل کی نظموں میں شاخوں پہ کھلنے والے پھول،شام کے ستارے ،اڑتے ہوئے پرندے ،اوس میں بھیگی کلیاں اور شہر کی ویران سڑکوں پر بیٹھے کبوتر کے مناظر دکھائے گئے ہیں۔ انھوں نے داخلی تنہائی سے آمیز کر کے نظمیں تخلیق کی ہیں۔ اس ضمن میں ان کی ایک نظم ''دوست'' دیکھیے:

میں بہت اکیلا ہوں/تم مجھ سے دوستی کر لو/شہر آتا ہے/اور اپنے ہاتھ ہماری طرف پھیلا دیتا ہے/ہم اس کے ہاتھوں کو دیکھتے ہیں/اور ڈر جاتے ہیں /شہر کے ہاتھ کہنیوں تک/جلے ہوئے ہیں(۲۰)

اس نظم میں ذی شان ساحل نے ایک داخلی انتشار اور تنہائی کی کیفیت کو بیان کیا ہے۔ انھوں نے بھی دولت کی غیر مساوی تقسیم کی مذمت کی ہے اور مقتدر طبقے کو لوگوں کی زندگیوں کا مالک بنانے کی مذمت کی ہے۔ انھوں نے پسے ہوئے طبقے اور اپنے عہد کی مخصوص حسیّت کا ذکر کیا ہے۔ ذی شان ساحل کی نظمیں عالمی تناظر میں عصری صورت حال کا بیانیہ ہیں۔ سامراجی طاقتوں نے اپنے مفادات کی خاطر چھوٹی اقوام کو تباہ وبرباد کر دیا ہے۔ انھوں نے اپنی طاقت کے بل بوتے پر کمزور ممالک کے وسائل پر قبضہ جما لیا ہے۔ انھوں نے معاصر ہنگامی حالات کو بھی موضوع بنایا ہے۔ ۲۰۰۱ء کے بعد دوسروں کے مفادات کی جنگ نے ہمارے گلی کوچے آگ اور خون میں نہلا دیے ہیں۔ ان کی عصری حسیّت کی حامل نظم ''سینٹ اسامہ'' دیکھیے:

یہ بھی یاد نہیں کہ بچے آخری بار /کب اسکول گئے/قدم قدم پہ کانٹے اور بارودی سرنگیں بچھیں ہوئی ہیں/جن کو ناکارہ کرنے کےسارے منتر /ہاتھوں میں بندوق اٹھاکے /سینٹ اسامہ بھول گئے (۲۱)

ڈاکٹر جواز جعفری معاصر نثری نظم کے بڑے اہم شاعر ہیں ۔ان کی نظموں میں عصری مسائل کے موضوعات ملتے ہیں۔ انھوں نے متعدد نظمیں عصری حسیّت کے تناظر میں تخلیق کی ہیں۔ وہ ملکی اور عالمی حالات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ خاص طور سے ان کا جنگ مخالف اور حب الوطنی کا تصور اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے اپنی نثری نظموں میں جنگ مخالف شاعری کی درخشاں روایت قائم کی ہےڈاکٹر جواز جعفری اس حوالے سے ذی شان ساحل سے موضوعاتی اشتراکات رکھتے ہیں ان کی نظم ''علم ہمیں ہلاک کر دے گا'' جنگی تباہ کاریوں سے متعلق ہے:

ایک پھٹے پرانے خواب کا کونا تھامے/ہم فٹ پاتھ تک آ پہنچے /شورزدہ شہر کی /بے حس گلیوں میں /ہم ایٹم بم/آدھانیچے/اور آدھا اوپر اوڑھے/اپنے کشکول بدست بازو پر سر رکھے/بے خبر سو رہے ہیں/چاروں اور لہلہاتی بھوک کے درمیان/ہمارے بلکتے بچے /روزانہ دورمار میزائل چاٹ کر/حب الوطنی کے بوسیدہ ٹاٹ پر/اپنی آنکھوں میں تیرتا نمک چکھ کر/سو جاتے ہیں!(۲۲)

ڈاکٹر جواز جعفری کے شعری مجموعہ ''موت کا ہاتھ کلائی پرہے'' میں شامل نظموں میں جنگ کی تباہ کاریوں پر روایتی انداز میں لکھنے کے بجائے نگ کے خلاف لکھا ہے۔ انھیں جنگی آلات اور اس قدر بڑھتی ہوئی جنگی سرگرمیوں کے نتیجے میں زمین کا مستقبل انتہائی تاریک دکھائی دیتا ہے۔ جواز جعفری کہتے ہیں کہ جوہری ہتھیاروں کی ایجاد کے بعد اور ایک ملک کی دوسرے ملک کے خلاف بڑھتی ہوئی نفرت کو دیکھتے ہوئے ہم بحیثیت نوع اگلی ہزاری میں شاید موجود نہ ہوں۔

ذی شان ساحل نے عصری آشوب کو اپنی شاعری میں ابھارا ہے۔ انھوں نے صرف کراچی کے حالات کی منظر کشی نہیں کی بل کہ ہمارے پورے معاشرے اور تہذیب کی عکاسی کی ہے۔ انھوں نے ظلم وبربریت کا شکار ہونے والے افراد کے لیے آواز اٹھائی ہے۔ دولت کی غیر مساوی تقسیم اور پسماندہ علاقوں کے مکینوں کے استحصال کی مذمت کی ہے۔ انھوں نے خوف کی شدید تر کیفیات کو بھی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ اس حوالے سے ذی شان ساحل نے معاصر حالات اور تخریب وفساد کا نشانہ بننے والے شہروں کا ذکر کیا ہے۔ ذی شان ساحل کے یہ مصرعے ملاحظہ کیجیے:

ایک گھر کے لوگ/دوسرے گھر کے لوگوں کو/دیکھ رہے تھے/دریا میں رہنے والی مچھلیاں /کہیں غائب ہو گئیں تھیں/کنویں کے مینڈک/ہر طرف ٹرارہے تھے/رات کی خاموشی/جھینگروں کے شور سے بھری تھی/تتلی کے پروں کا غم/سیاہ پتھر کے فرش میں/جذب ہو چکا تھا(۲۳)

ذی شان ساحل نے ظلم وجبر میں جکڑے ہوئے آدمی کی نمایندگی کی ہے اور ایک چھوٹے سے مقتدر طبقے کو اس کا مالک بنانے پر تحفظات ظاہر کیے ہیں۔ ذی شان ساحل کی نثری نظموں میں مخصوص عالمی عصری حالات اور ان سامراجی طاقتوں کی عکاسی کی گئی ہے جنھوں نے اپنے مفادات کی خاطر چھوٹی اقوام کو تباہی کے دہانے پر پہنچا یا ہے۔ ان کی نظمیں گردپیش کے حالات کی آئینہ دار بھی ہیں اور داخلی تنہائی کو بھی عصری رویوں کے تناظر میں بیان کیا گیا ہے۔ ذی شان ساحل کی نظم ''خوشی کی موت'' ملاحظہ کیجیے:

میں اسے مرنے نہیں دوں گا/جب یہ ڈوبے گی/پُل کے نیچے دریا میں/میں پھینکوں گا ایک تنکا/یا کوئی بڑا سا پتا/گھنٹوں گھنٹوں پانی میں اتر کر/لے آؤ ں گا اسے کنارے تک(۲۴)

ذی شان نے اپنے نظموں میں جدید انسان کی بے حسی اور صنعتی ومشینی زندگی کی برق رفتاری اور مادیت پسندی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس حوالے سے ان کی نظمیں ''جنھیں کوئی نہیں جانتا'' اور''جلے ہوئے لوگ''اہمیت کی حامل ہیں۔ ذی شان کی شاعری فطرت کے متفرق رنگوں اور زندگی کی باس میں گندھی ہوئی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ آج کا انسان فطرت سے دور ہونے کی وجہ سے سکون،اعتماد اور خوشی سے محروم ہو گیا ہے۔انھوں نے جدید زندگی کو شور ،ہنگامہ ،بے چینی اور انتشار قرار دیا ہے۔ ان کی نظمیں جدید دور میں ابھرنے والے انسانی رویوں، نفسیاتی دباؤ اور پریشانیوں کی آئینہ دار ہیں۔ انسان کو اعصابی تناؤ کی وجہ سے جسمانی عارضے لاحق ہو سکتے ہیں۔ ذی شان ساحل کی نظم ''بلڈ پریشر'' اس کی اہم مثال ہے۔ آج کا انسان شدید ذہنی تناؤ کا شکار نظر آتا ہے۔ ان کی نظموں میں معاشرے کے افراد کی بے حسّی دکھائی دیتی ہے۔ ذی شان ساحل کی نظمیں خارجی اور داخلی دونوں عناصر سے آمیز ہے۔

ڈاکٹر جواز جعفری کی نظمیں ہمارے اردگرد کی حقیقت پسندانہ ترجمانی کر رہی ہیں۔آج کے انسان کا المیہ یہ ہے کہ یہاں لوگ دنیا میں سیر کرنے کے لیے نکلتے ہیں تو ان کے طیارے اغوا کر لیے جاتے ہیں ۔ایسے دور میں جواز جعفری امن اور انصاف کی بات کرتے ہیں۔تتلی اور فاختہ ان کی شاعری کا بنیادی استعارہ ہے جو دراصل امن اور محبت کی علامت ہے۔ آج کا انسان اپنے وسائل کا غلط استعمال کرنے میں لگا ہوا ہے۔ ہمارا معیار زندگی انتہائی پست ہے،غریب غربت کی چکّی میں پس رہا ہے اور ہم بھوک اور جہالت کو شکست دینے کے بجائے اپنی دفاعی صلاحیتیں بڑھانے میں لگے ہیں۔

ڈاکٹر جواز جعفری کی اساطیری آثار کی حامل نظموں کا کینوس بہت وسیع ہے۔انھوں نے ان نظموں میں جو انسانی کردار پیش کیا ہے۔وہ ایک آئیڈیل عورت کا ہے جو سراپا جو سراپا حسن وامن وخوشبو ہے۔ انھوں نے اس عورت سے متعلق جو لغت استعمال کی ہے وہ مائتھالوجیکل ہے اور بائبل میں اس کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کو حاصل کرنے کے لیے وہ کبھی بہادر جنگجو کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں تو کبھی شیراز کے مضافات میں جا کر ایک شاعر کا روپ دھار لیتے ہیں تو کبھی بادشاہ بن کر اسے حاصل کرتے ہوئے مختلف منطقوں

،ممالک اور تہذیبوں کے درمیان ملاقات کے آرزو مند ہیں۔ اس عورت سے ملنا ان کا وصل نہیں بل کہ انسانی امید کی حد ہے۔ ان کے شعری مجموعہ کا نام''وصل سے خالی دن'' دراصل ایک علامتی اظہار ہے۔ جواز جعفری کے یہاں وصل سے خالی دن اس تڑپ سے خالی دن ہے جس میں زندگی کا شیرازہ بکھرا ہوا ہے۔

ڈاکٹر جواز جعفری کے نثری نظموں کے مجموعے''چراغوں سے بھری گلیاں''میں نسوانی کرداروں کو علامتوں ،استعاروں اور تشبیہات کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔ کہیں انھوں نے عورت کو باغ سے تشبیہ دی ہے اور اس کی محبت کو لذیز پھل کی طرح کہا ہے کہیں انھوں نے عورت کو نایاب پودوں کی خوشبو کہا ہے جس کی بغل گیری سے چھونے کی قوت کو حظ اور تقویت ملتی ہے۔ جواز جعفری کی اساطیری عورت کی آنکھوں کاملاپ دلوں کا لوٹنا ہے اور اس کی آواز سے ذہن میں ارتعاش رواں ہوتا ہے۔ مثال کے لیے نظم''آئینے سے مکالمہ کرتی عورت'' ملاحظہ کیجیے:

آئینے سے مکالمہ کرتی عورت!/میں اس آگ میں جل کر/راکھ ہو چکا/جسے تیرے جسم کی ہری لکڑی/نہیں پہچانتی/اگر تو/اس آگ سے بپتسمہ لیتی /تو تیرے وجود کی خوشبودار مٹی کی /تاثیر بدل جاتی!(۲۵)

زاہد ڈار کا شمار نثری نظم کے اہم شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ جدید دور کے انسان کی لاحاصلی،ذہنی انتشار اورا س کے داخلی خلفشار کو شاعری کا موضوع بناتے ہیں۔ انھوں نے زندگی کی کرب ناک سچائیوں کو شعری پیکر عطا کیا ہے۔ انھوں نے اپنی نارسائیوں اور داخلی الجھنوں کا نفسیاتی رد عمل دیا ہے۔ ان کی یہی پریشانی نظم ''فقط موت مجھے بھاتی ہے'' میں واضح طور پر دیکھی اور محسوس کی جا سکتی ہے۔جب وہ جدید دور کی مادیت پسندی کو ذہنی طور پر قبول نہیں کرتے تو ان کے اندر ایک اجنبیت اور احساسِ بیگانگی پیدا ہونے لگتا ہے۔ جنگل ،دریا اور رات ان کی الجھنوں کی علامات ہیں۔ زاہد ڈار کے انسان کے داخلی کرب کو استعاروں میں مجسم کر کے پیش کیا ہے۔ ان کے یہاں جنس،محبت اور عشق کے موضوعات بھی ملتے ہیں۔ زاہد ڈار محبت کے رشتے میں جسمانی لذت اور اہمیت کا احساس قائم کرتے ہیں۔اس بارے میں ڈاکٹر عنبرین منیر لکھتی ہیں:

> ''زاہد ڈار اپنی نظموں کے کے مرکزی رجحانات کے بارے میں کسی ابہام کا شکار نہ رہے اور انھوں نے اپنے دوسرے شعری مجموعے کا نام ''محبت اور مایوسی کی نظمیں'' رکھ کر یہ واضح کر دیا کہ ان کے نزدیک جدید دور کی زائیدہ مایوسی ،شکستگی اور درماندگی کا علاج کسی نئی اَنا کی آدرشی تشکیل کے بجائے محبت کے قدیم جذبے میں جسم کی شمولیت کی اہمیت کو جان کر آگے بڑھنے میں ہے۔ یہاں محبت اگرچہ جسم سے شروع ہوتی ہے ۔ان کے یہاں جنسی طلب ہے

مگر پریشان نظری اور ہرجائی کے وتیروں سے پاک ۔ا ب
نظموں میں ''میں'' اگر شاعر کی ذات ہے تو ''تو'' محبوب کا
ایسا جسم ہے جو عاشق کو جذبوں کی سچائی اور اعتماد بخشتا
ہے۔ ''(۲٦)

زاہد ڈار نے اپنے شعری مجموعے''محبت اور مایوسی کی نظمیں'' کا ایک حصہ''میں اور عورت'' کے عنوان سے پیش کیا ہے۔ جو محبت اور محبوب عورت کے حوالے سے ہے۔ انھوں نے اس حصے میں جسم کی صداقت کا اعلان کیا ہے۔ لیکن انھوں نے اپنی تمام جذباتی سرگرمیاں محبوب کے وصل تک نہیں سمیٹیں۔ان کی نظموں میں محبت کرنے والا بھی اور وہ شخص جس سے محبت کی جاتی ہے اپنے پورے وجود کی خبر دیتے ہیں۔زاہد اپنی شخصی تنہائی،ناآسودگی ،محرومی اور جنسی تشنگی کو ایک عورت کی محبت میں ضم کر دیتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کے شعری مجموعے''محبت اور مایوسی کی نظمیں'' کے پہلے حصے ''عورت اور میں'' پہلی نظم ملاحظہ کیجیے:

کچھ دیر پہلے مَیں درختوں کے نیچے گھوم رہا تھا/مَیں اپنے ہی خوابوں کی خوبصورتی سے محبت کرتا ہوں/اگر لڑکیاں نہ ہوتیں تو میں مر جانا پسند کرتا/اگر کوئی لڑکی مجھے ہاتھ لگا دے تو میری موت واقع ہو جائے/بیزاری کی انتہا اور خوشی کی انتہا(۲۷)

زاہد ڈار انسان کی جنسی جبلّت اور دبی ہوئی خواہشات کا اظہار علامتی انداز میں کرتے ہیں۔وہ تما ڈراؤنے خوابوں،نفسیاتی الجھنوں کا علاج محبت کی آغوش میں تلاش کرتے ہیں۔ ان کے مطابق جنسی گھٹن سماج میں الجھنیں پیدا کرتی ہے۔ انسان پر کیا جانے والا سماجی جبر جنسی ناآسودگی کا باعث بنتا ہے۔ زاہد ڈار کی جنسی ناآسودگی کے بارے میں یہ نظم دیکھیے:

کیا تم نے ایک عورت کو دیکھا ہے؟/اُس کی چھاتیوں کے درمیان ایک سانپ رینگ رہا ہے/اُس کی رانوں کے درمیان سفید پانی کا چشمہ ہے/میں پیاس سے مر رہا ہوں/لیکن میں اسے ہاتھ نہیں لگا سکتا /میں ایک درخت کے اندر قید ہوں (۲۸)

زاہد ڈار کی اسی نوعیت کی ایک اور نظم کے یہ مصرعے ملاحظہ کیجیے:

میرے خیال میں وہ عورت/دنیا کی لذیز ترین عورت ہے/میں اس کے اندر غرق ہو جاؤں گا/وہ مجھے دور دور سے/اپنا آپ دکھاتی ہے/میرے اندر بھوک اور پیا س کو بیدار کرتی ہے/اور جب میں خواہش کی آگ میں جلنے لگتا ہوں/وہ اطمینان سے ہنسنے لگتی ہے(۲۹)

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا اولین شعری مجموعہ''تمثال'' فلسفیانہ تموج کا حامل ہے۔ ان کی شاعری کا دائرہ ان کے اپنے گرد گھومتا ہے۔ ان کی نظموں میں انشراح کے باوجود ابہام پایا جاتا ہے۔ وہ خود کو معاشرے کا حصہ سمجھ کر اجتماعی جرم کی عکاسی کرتے ہیں۔ان کی شاعری میں علامتیں اور تمثالیں باطنی عوامل کی تجسیم کرتی ہیں۔ انسان اور کائنات ان کی

شاعری کا محور ہیں۔ معاشرتی ،ناانصافی اور حیاتیاتی بے ہستی سے وہ متنفر ہیں۔ احساس جرم، عدم تحفظ ،تنہائی،اور بیگانگی کا کرب ان کی نظموں میں پھیلا ہوا ہے،وہ جدید تہذیب سے اداس ہو کر ''شہروں کے لیے ایک نظم''لکھتے ہیں:

مجھے ان خون میں جلتے ہوئے شہروں سے الفت ہے/مجھے اس شہر کے چہرے پہ اگتی زرد کائی سے محبت ہے/کہ میں خود زرد کائی ہوں،کہ میں خود تار آنگن ہوں/کہ میں خود زرد چہرہ ہوں(۳۰)

تبسم کاشمیری کو جدید زندگی کسی عذاب سے کم نہیں لگتی ،وہ اس دور کے ہر انسان کو احساسِ گناہ میں مبتلا محسوس کرتے ہوئے نظم ''غضب وہ شب تھی'' میں لکھتے ہیں:

اب کہ طغیانیوں نے گھیرا، کہ سمت بے سمت ہو گئی/نہ کوئی ناؤ،نہ کوئی چپو،نہ کوئی ساحل/کہ آج ہر سمت بہہ گئی ہے/ہماری بستی پہ چھا گئی ہے(۳۱)

تبسم کاشمیری محسوس کرتے ہیں کہ دور جدید کی ترقی نے آج کے انسان کو اس کے آدرش اور منزلوں سے دور کر دیا ہے۔ اس مشینی دور نے انسان کو مزاج اور اعصاب دونوں اعتبار سے تناؤ کا شکار کر دیا ہے معاشرے میں بے سکونی ،انتشار اور ناانصافی اسی تیز رفتاری کی وجہ سے ہے۔ تبسم کاشمیری کی شاعری کے بارے میں احتشام علی لکھتے ہیں:

> ''تبسم کاشمیری کی نظموں میں عصری حسیت اس عہد کے دوسرے نظم نگاروں کی نظموں پر اس لیے تفوق رکھتی ہے کہ ان کے ہاں خارجی حقائق کی بازیافت کا عمل اپنی ذات کو مقمدد رکھ کر کیا گیا ہے۔''(۳۲)

تبسم کاشمیری نے اپنے عہد کی تمام آوازوں کو اپنی نظموں میں سمنے کی سعی کی ہے۔انھوں نے "نوحے تخت لہورکے" کے نام سے ایک طویل نظم لکھی ہے جس میں جدید طرز زندگی کے بے حاصلی ،انتشار اور بے معنویت پر نوحہ خواں ہیں۔ اس میں لاہور شہر کا گزرا ہوا کل اور آج ہے جو مشرقی تہذیب کا کل اور آج ۔تمام روایات اس مشینی اور برق رفتار دور کی بھینٹ چڑھ گئی ہیں۔ اس نظم میں ماضی اور حال نمایاں ہو رہے ہیں۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نثری نظم کے بڑے عمدہ شاعر ہیں۔ ان کے فکری زاویے بھی معاصر نثری نظم نگاروں سے مماثلت رکھتے ہیں۔ وہ بھی ذات وکائنات کو یکساں اہمیت دیتے ہیں۔انھوں نےاپنی نظمیں انفرادی اور اجتماعی نفسیاتی تجربوں سے مزین کی ہیں۔انھوں نے چند علامات اور تمثالیں بھی استعمال کی ہیں۔وہ کائنات کی ہر چیز کو اپنی ذات کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔ انھوں نے کائنات اور انسان کو خصوصی طور پر اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی نثری نظموں سے ڈاکٹر عنبرین منیر رقم طراز ہیں:

''تبسم کاشمیری کی ذات خصوصی اور انسان وکائنات عمومی طور پر اُن کی شاعری کا محور ہیں۔ ذات آشنائی توسیع ذات کا وسیلہ ہوا کرتی ہے۔تبسم اس توسیع کے راستے میں موجود معاشرتی منافقت ،ناانصافی اور حیاتیاتی بے ہستی اور لایعنیت کی دیواروں سے سخت متنفر ہیں۔ وہ جب جب ان دیواروں کے زیرِ سایہ جینے پر مجبور ہوتے ہیں ،احساسِ جرم ،عدم تحفظ اور تنہائی وبیگانگی کا کرب اُن کی نظموں کی معنوی جہت میں اترنے لگتا ہے جو جدید دور کے ہر احساس اور صاحبِ شعور انسان کا المیہ ہے۔''(۳۳)

تبسم کاشمیری کی نظموں میں مختلف النوع نفسیاتی عناصر ملتے ہیں۔ انسان کے باطن میں ہونے والے تصادم ،انتشار اور اذیت پسندی سے کئی طرح کی نفسیاتی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس جدید دور کی مشینی اور صنعتی زندگی کی وجہ سے آج کا انسان اپنے آدرش اور منزلوں سے ہٹ گیا ہے اور اس برق رفتار زندگی نے اس کے مزاج اور اعصاب میں تناؤ پیدا کر دیا ہے۔ اس مصروف زندگی سے انسان کی جنسی لذت ادھوری اور تشنہ کام رہنے سے نا آسودگی اور نفسیاتی دباؤ اور الجھنیں جنم لیتی ہیں۔ اس ضمن میں تبسم کاشمیری کی ایک نظم ''اعصاب کی چرچراہٹ'' ملاحظہ کیجیے:

ایش ٹرے میں بجھے ہوئے سگریٹ ،کٹے پھٹے سست چہرے/اعصاب کی چرچراہٹ ،بے زور اعضا ،بے رنگ چیزیں /بدی کی خوشبو ،جھیل میں سب اتر رہے ہیں/ریلنگ پر ہجوم ،سیٹیاں/سیاہ لڑکی کی کالی چھاتی پہ روشنی ہے/بھوری لڑکی کے سرخ لب پر گلاب کیسے کھلا ہوا ہے/سلکی بانہیں، چاکلیٹی آنکھیں ،جیلی جیسے بدن(۳۴)

تبسم کاشمیری کے یہاں امیجری،شعور اور لاشعور کی آمیز کیفیات ہیں۔ انھوں نے اساطیری علامات کا استعمال بڑے نمایاں انداز میں کیا ہے۔ انھوں نے مجہول ذات،خواف،مایوسی،گھٹن اور لجھن کو اساطیری علامتوں سے بیان کیا ہے۔ اس حوالے سے ان کا یہ شعری ٹکڑا ملاحظہ کیجیے:

میں رات بھر وہیل کے پیٹ میں تھا/جہاں چند پودے کھڑے تھے کہ جن کی جڑیں گل چکی تھیں/اور روشنی تھی جو کیچڑ سے لتھڑی ہوئی/گلے اور سڑے موسموں کی نشانی /اور میں زنگ آلود پانی کو پیتے ہوئے وہیل کے پیٹ میں تھا /رات بھر ہڈیوں کا برادہ اڑا /شاہراہوں پہ میں ریزہ ریزہ پڑا تھا(۳۵)

تبسم کاشمیری کی نظموں میں معاشرتی بے سکونی، برف رفتاری کی وجہ سے انتشار، نا انصافی اور دیگر عصری مسائل جیسے موضوعات ملتے ہیں۔ یہ موضوعات دیگر نثری نظم نگاروں کی نظموں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ان کی نظم''خواب کیا ہوں گے'' میں رات کے وقت دیکھے جانے والے ایک وحشت ناک خواب کو موضوع بنایا گیا ہے۔ وہ اپنے اندرونی

کتھارسس کے لیے نظموں میں بے یقینی ،بے ذائقہ سچائیوں ،نفرتوں اور قنوطیت جیسے عناصر کوشامل کرتے ہیں۔ مختلف خواب دیکھنا اور پھر کرچیاں چننے کی اذیت سہنا ان کی شاعری کا اہم موضوع ہے۔ انھوں نے معاصر نفسیاتی کرب ،ذاتی محرومیوں اور تنہائیوں کو بھی موضوع بنایا ہے۔

ڈاکٹر سعادت سعید ایک نمایندہ نثری نظم نگار ہیں ان کی نظموں میں انسانی نفسیاتی عناصر،ہیجان وتشویش کی تما تر کیفیات،انانیت اور عصری حسیّت ملتی ہے۔ وہ معاشرے میں مادہ پرستی،ریاکاری ،خوف اور غیرانسانی رویوں کو بھی موضوع بناتے ہیں۔ وہ سماجی حالات وواقعات ،بے اطمینانی اور داخلی انتشار سے گزر کر تخلیق کرتے ہیں۔ طاہر منصورقاضی اس بارے میں لکھتے ہیں:

> ''سعادت سعید نے خارجی تجربے کو بھی داخلی خوردبین سے دیکھا ہے،جہاں شعور کی تہ میں لاشعور اور محسوسات کا دفن شدہ خزینہ ہے جسے میں ادراکات اور جبلّتوں کا اوائل شور بہ یا ملغوبہ (Primordial Soup of Insticts and Perceptions) کہتا ہوں۔یہ وہ گوہر ہے جس کے لیے انسانی زبان ابھی تک کوئی بھی موزوں لفظ ایجاد نہیں کر سکی۔لہٰذا استعارے اور تماثیل کے ضعیف سہارے کی ضرورت ہوتی ہے جسے سعادت سعید اپنی ضرورت کے مطابق وضع کرتا رہتا ہے۔''(۳٦)

سعادت سعید کی نثری نظموں میں انسان کی نفسیاتی کشاکش اور معاشرتی شکست وریخت کا اجتماعی شعور ملتا ہے۔ وہ داخل اور خارج کی ملی جلی کیفیت اور انفرادی واجتماعی تجربے سے کو شعری پیکر عطا کرتے ہیں،ان کی ایک نظم ''جھینگرو آؤ''ملاحظہ کیجیے:

ہم کہ کابوس میں محبوس/شرائین کے ناسوروں کی دلدل میں/ضمیروں کے جنازے ڈوبے/معدنِ گنجِ شہیداں کی دراڑوں میں تو/ہیبت کے سوا کچھ بھی نہیں/کچھ بھی نہیں(۳۷)

سعادت سعید کی نثری نظموں کا مجموعہ''شناخت'' اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے اس مجموعے کی متعدد نظموں میں اپنے احساسات سے عصری مسائل کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے ایک فرد کی لاحاصلی اور معاشرتی زندگی کے بنجر پن کو موضوع بنایا ہے۔انھوں نے اجتماعی الجھنوں، اضطراب اور بے چینی کی کیفیات کو شعری پیکر دیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ہمارا معاشرہ اجتماعی خود کشی اور اذیت پرستی میں غرق ہو رہا ہے۔ ان کی ایک نظم ''ہماری خودکشی کی لذت'' کا یہ ٹکرا ملاحظہ کیجیے:

خود کشی کی لذت میں/کھلتی، بند ہوتی آنکھوں میں/مضطرب ،گرفتار آنسوؤں کے ذائقے /اور زنجیروں کے جالے بنتی چنگاریاں/تاریک ،پتھریلی تمناؤں کو/جگمگانے/جگانے سے خوفزدہ ہیں(۳۸)

سعادت سعید کی نثری نظموں میں فلسفیانہ،سائنسی شعور،تہذیبی اقدار،اساطیری اور نفسیاتی نوعیت کے مضامین ملتے ہیں۔ وہ معاشرے کے نبض شناس ہیں اور یوں انھوں نے نئے سائنسی شعور ،نفسیاتی،تمدنی اور فلسفیانہ موضوعات کو اپنی شاعری کا مرکزی موضوع بنایا ہے۔سعید الدین نثری نظم کے بڑے عمدہ شاعر ہیں۔ ان کی نثری نظموں کا مجموعہ''رات'' تازہ تمثالوں اور نت نئی صورتوں سے متشکل ہوا ہے۔ انھوں نے شاعری میں اپنے انفرادی اور داخلی احساسات بھی بیان کیے ہیں اور معاصر ہنگامی موضوعات کو نظم میں شامل کیا ہے۔ سعید الدین کی ایک نظم''کتنے بے اختیار ہو تم'' کا یہ ٹکڑا ملاحظہ کیجیے:

پرمیلی ہیں تمھاری آنکھیں/جو گھورتی ہیں/میرے ننگے پیروں کو/میرے ننگے کپڑوں کو/میرے ننگے دن اور مٹی کو/میں اپنی آنکھیں جمائے ہوئے ہوں/صاف اور نیلے آسمان پر/جہاں دھول نہیں پہنچتی(۳۹)

سعید الدین نے ''دستانے''،''تابوت''،''گالی''،''تمھارے درمیان سے''،''معدوم''آہنی ہنسی،پرسنل فائل اور دیمک جیسی نظموں اپنے عہد کے سماجی مسائل کا ذکر کیا ہے۔ان کی نظموں میں کارپوریٹ ثقافت کو نا پسندکیا ہے جو انسان کی وجودیاتی شناخت کو مسخ کر رہی ہے۔ سعید الدین کی نظموں میں افضال احمد سیّد اور ذی شان ساحل کی طرح کے متعدد ٹکڑے تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ ان کا رشنیوں کے شہر کی بدامنی اور انتشار کا بیانیہ ایک جیسا ہے۔ انھوں نے داخلی کرب کو نظموں میں بیان کیا ہے۔ انھوں نے عصری صورت حال کی عکاسی کے لیے خون کی علامت کا استعمال کیا ہے۔ سعید الدین کہتے ہیں ہمارے اوپر مخصوص قوتیں مسلط ہیں جو اپنے مفادات کی خاطر شہر یوں کو ایسی جکڑبندیوں میں قید کر رہی ہیں۔پورے شہر میں ایک خوف کی فضا قائم کر دی گئی ہے۔ سعید کا یہ شعری ٹکڑا ملاحظہ کیجیے:

یہ خون ہے/سرخ اور دوڑتا ہوا/شریانوں میں یہ/دل کی طرف دوڑتا ہے شہر میں/شاہراہوں سے ہوتا ہوا/قلبِ شہر تک جاتا ہے/خون سے کھڑکیوں کے شیشے /رنگین کیے جا سکتے ہیں/اس کی چہچہاہٹ سے(۴۰)

نثری نظم کو فروغ دینے میں جہاں شاعروں نے سنجیدہ کوششیں کی ہیں وہیں شاعرات نے بھی اپنی اپنی بساط کے مطابق اس ہیئت کو اعتبار واستحکام عطا کیا ہے۔ کچھ شاعرات نے اس ہیئت کو انتہائی دل جمی کے ساتھ اپنے شعری اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔شاعرات کی نثری نظم نگاری سے متعلق ڈاکٹر سلیم اختر رقم طراز ہیں:

> ''شاعرات کی نثری نظمیں نسوانی سائیکی کا دلکش مرقع پیش کرتی ہیں۔ان کی فرسٹریشن، اعصابی تناؤ ،رشتوں پر عدم

اعتماد ،مرد کا مسئلہ ،تشخص کا بحران ،خوف ،احتجاج ،خود
اذیتی اور ان کے علاوہ بھی بہت کچھ ملتا ہے۔ ''(۴۱)

نثری نظم کی شاعرات میں سرِ فہرست سارا شگفتہ کا نام نظر آتا ہے۔سارہ شگفتہ نے اس صنف کو فیمنزم کی تحریک کے وسیع تناظر میں استعمال کیا ہے۔ سارا شگفتہ کی الم ناک موت ان کا شعری مجموعہ ''آنکھیں'' منظر عام پر آیا ۔اس مجموعے کی نظمیں شاعرہ کی داخلی کیفیات اور ذات کے بکھراؤ کی عمدہ عکاس ہیں۔ سارا شگفتہ کی ذات کا کرب محض ان کی ذات تک محدود نہیں بل کہ اس سے ان کے عہد کی شکست وریخت ،معاشرتی اقدار ،خانگی نظام کی بے وقعتی اور رشتوں کی کم مائیگی جیسے پہلو نظر آتے ہیں۔ ان کی نظمیں نہ صرف فرد کے داخلی آشوب کی آئینہ دار ہیں بل کہ ان میں صنعتی ومشینی تہذیب سے بے حس ہونے والے معاشرے کی عکاسی بھی کی گئی ہے۔سارا کی نظم ''سنگِ میل پہروں چلتا ہے'' کا یہ ٹکڑا ملاحظہ کیجیے:

میرے لہو کو تنہائیاں چاٹ رہی ہیں/شہر کی منڈیر سے تنکے چرائے تھے/سورج نے دکھ بنا دیے/میرے سینوں کا داغ آنکھیں / میری قبر مجھے چھپ کر دیکھ رہی ہے(۴۲)

یہ نظم نئے عہد کے انسان کے داخلی آشوب کی آئینہ دار ہی نہیں بل کہ صنعتی ومشینی زندگی کی وجہ سے الجھنوں کا شکار ہونے والے معاشرے میں رہنے والے انسان کے داخلی کرب کو بیان کرتی ہے۔ ان کی نظموں ''میرے تینوں پھول پیاسے ہیں'' اور ''کانٹوں پر کوئی موسم نہیں آتا''عصری حسیّت کی عمدہ مثالیں ہیں۔سارا شگفتہ کا نسائی لہجہ دیگر شاعرات سے ذرا مختلف ہے ۔وہ مشکلات اور جذباتی دھچکوں کا مقابلہ کرتی ہیں۔ انھوں نے اپنے اعصابی خلل ،جنونی وہیجانی کیفیات کا بڑا کھل کر اظہار کیا ہے۔ پروین شاکر نے سارا کی زندگی اور شخصیت پر ایک نثری نظم ''ٹماٹر کیچپ'' کے عنوان سے لکھی ہے ۔اس نظم میں انھوں نے سارا شگفتہ کی کیس ہسٹری بیان کی ہے۔ سارا شگفتہ کی نظموں میں موت ایک مسحور کن ،سکون بخش اور باعزت لمحہ ہے۔موت کے سائے بھی اس کے لیے آسودگی کی علامت بن جاتے ہیں۔ ان کی نظموں میں عورت کے ماں بننے کے مسائل، جنسی مسائل ،نفسیاتی اور شکستِ ذات کے مسائل کا خصوصی اظہار ملتا ہے۔ سارا شگفتہ موت اور قبر کو کتھارسس کا ذریعہ سمجھتی ہیں۔ان کی ایک نظم دیکھیے:

جنگل چراغوں سے نہیں بستا/اور نہ رات سے کوئی مرتا ہے/ہنسی میں انسان دفن ہونے لگے/تو چاند آسمان سے بین کرتا ہے/میں ٹھہری مٹی کا کفن(۴۳)

سارا شگفتہ کی نظموں میں عصری حسیّت اور نفسیاتی مضامین ملتے ہیں۔ ان کی نظموں میں جنسی تموج، دکھ ،نارسائی ،محرومی، ذات کا کرب ،تنہائی اور جذباتیت ملتی ہے۔ سارا شگفتہ کے بارے میں امرتا پریتم رقم طراز ہیں:

''وہ (ساراشگفتہ) ضمیر سے جاگ چکی تھی ۔ہر اس دنیا میں جس کے پاس ضمیر ہے اس کے ضمیر کے کان ضرور ہوں گے اور وہ ہمیشہ اس کی آواز سن پائیں گے کہ میں تلاوت کے لیے انسانی صحیفہ چاہتی ہوں ۔میں نہیں جانتی کہ یہ انسانی صحیفہ کب لکھا جائے گاپر یہ ضرور جانتی ہوں کہ اگر آج کا اتہاس خاموش ہے تو آنے والا کل کا اتہاس ضرور گواہی دے گا کہ انسنای صحیفہ لکھنے کا الہام صرف سارا کو ہوا تھا۔ (۴۴)''

ساراشگفتہ کی نظموں میں فرسٹریشن،محرومی،اور جنس کا اظہار ملتا ہے۔ وہ انفرادی اور اجتماعی الجھنوں، اعصابی خلل اور جنونی وہیجانی احساسات کو بھی بیان کرتی ہیں۔سارا نے عورت کے نفسیاتی مسائل،جنسی مسائل اور ماں بنے کے مسائل ،موت کی خواہش اور ذاتی شکست کا ذکر کیا ہے۔ ان کی نظم ''رات کی دو آنکھیں'' ملاحظہ کیجیے:

عورت تو انسان کو جنم دینے کے بعد بھی/کھری نہیں ہوتی/رات انسانی سرائے میں خرچ ہو گئی /اپنے اپنے بس کی بات ہے/یا اپنے اپنے روگ کی/اپنی اپنی سطح کا سمندر ہے/تنہائی اتنے حرام کے بچے جنتی ہے/کہ ایک ایک کو بیاہنے کے لیے/وقت کو ہلاک کرنا پڑتا ہے(۴۵)

سارا شگفتہ زندگی سے بیزار نظر آتی ہیں۔ وہ جسم اور جسمانی ضرورت کے لیے بھگتنے والی رسوائیوں کی وجہ سے زندگی سے نفرت کرتی ہیں۔ انھیں مشرقی معاشرے پر بھی چند تحفظات ہیں جس نے عورت پر بے جا پابندیاں قدغنیں لگائی ہوئی ہے۔ وہ ان پابندیوں کی وجہ سے پسنے والی عورت کا بھی ذکر کرتی ہیں۔ وہ عورت سے ساتھ امتیازی سلوک اور ظلم وستم کو اپنے دل میں برا سمجھتی ہیں۔ خیر اور شر کی انسانی زندگی میں بڑی اہمیت ہے سارا اس کا اظہار اساطیری پیرائیہ اظہار میں کرتی ہیں۔ اس ضمن میں ان کی نظم ''قید خانہ شروع ہوتا ہے'' ملاحظہ کیجیے:

انسان وہ ہے جو بدی کو بھی ایمانداری سے خرچ کرے/ہمارا آدھادھڑ نیکی ہے اور آدھا دھڑ بدی ہے/بتانے والوں نے بتایا/تیری کوکھ سے پیدا ہونےوالے تیرے صبر سے مر گئے/بتانے والوں نے بتایا/تمھاری ماں کھانس رہی ہے/اور دوا اسے خالی شیشی تک چار آنے میں آتی ہے/اس کا دکھ یا تو میں ہوں/یا کسی بھی علاقے کی کوئی قبر(۴٦)

سارا شگفتہ کی نظمیں ''آنکھیں سانس لے رہی ہیں'' ،''رسیاں''،''کانٹے پہ کوئی موسم نہیں آتا''،''بے وطن بدن کو موت نہیں آتی''اور ''انسانی گارے'' نفسیاتی خوف،تنہائی اور ابہام کو استعارے میں بیان کیا گیا ہے۔ سارا کی تمثالیں بڑے ننگی ہیں اور مشرقی معاشرتی کی اخلاقی اقدار سے گری ہوئی ہیں۔ انھوں نے یہ فحاشی سننے والے ذہنوں کے لیے تخلیق نہیں کی بل کہ وہ سچ نفسیاتی دباؤ کا شکار تھیں شاید اس سے نکلنے کے لیے انھوں نے یہ

زبان استعمال کی ہے۔ سارا کی مختلف نظموں میں خود رحمی،ذات کا کرب،احتجاج،جنونی اور ہیجانی کیفیات،ذات اور نفسیات کا اظہار،کتھارسس اور زندگی کے مختلف مراحل اور حادثوں کا ذکر ملتا ہے۔ یہی موضوعات نثری نظم کی دیگر شاعرات کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں۔

عذرا عباس نے نثری نظم کی ہیئت کو پوری توانائی سے فروغ دیا ہے۔ وہ مغربی تانیثیت کی تحریک سے بے حدا متاثر ہیں۔ ان کا لہجہ احتجاجی ہے انھوں نے عورت کی جنس اور جنس کے ذریعے شکست وپامالی کو موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے نئے شعور کی عورت کی عکاسی کی ہے۔ انھوں نے عورت کے کرب اورد اخلی خلفشار کو بیان کیا ہے۔ انھوں نے مرد کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنی ہوئی عورت کے ذہنی تناؤ کی ترجمانی کی ہے۔ انھوں نے عورت کی فرسٹریشن ،خوف اور جذباتی گھٹن کو شعری موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے اپنی ذات کے کرب ،محرومی اور آشوب کو نسائی کیفیات کے ساتھ شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ ان کی نثری نظم کے دو مجموعے''نیند کی مسافتیں'' اور''میز پر رکھے ہاتھ'' زندگی کے متعدد شعری تجربات ملتے ہیں۔ ان کی نثری نظموں کے تیسرے مجموعے ''میں لائنیں کھینچتی ہوں'' میں جنسی موضوعات کا بیان زیادہ ملتا ہے۔

عصری حسیّت کی بات کریں تو عذراعباس کی نظموں میں معاشرتی ،مادی اقدار اور انسانی رویوں کو موضوع بنایا ہوا ہے۔ اس ضمن میں ان کی ایک نظم ''یہ میں ہوں'' اہمیت کی حامل ہے۔ ان کی نسائی کیفیت کی مظہر ایک نظم ''میں لائنیں کھینچتی ہوں'' ملاحظہ کیجیے:

کہ کیا میں/صرف ایک ایڈیٹ ہاؤس وائف رہ گئی ہوں/یا ایک تھکی ہوئی ورکنگ وومن/لیکن میں تو ہر وقت سوچتی رہتی ہوں/ہر وقت /کھانا پکاتے ہوئے/بسوں میں دھکے کھاتے ہوئے/آفیشل میٹنگز کے دوران/جہاں مجھے نہیں سوچنا چاہیئے(۴۷)

عذرا عباس نے اپنی ایک نظم ''یہ میں ہوں'' میں مادی معاشرے کے رویوں کا ذکر کیا ہے۔ شاعرہ کے مطابق اس مادی معاشرے میں لوف کسی فرد کی عزت اس کے ہنر،جوہر،علم اور ادب وشاعری سے نہیں کرتے بل کہ آدمی کی دولت سے اس کی عزت وتکریم کیا جاتی ہے۔ ملازمت کے دوران عہدے ،منصب اور گریڈ کو دیکھا جاتا ہے۔ کسی کی شخصی قابلیت اور علم وجوہر کی کوئی قدر نہیں کی جاتی یہاں انسان نے معاشی جدول بنا کر انسان کی وقعت کا اندازہ لگایا ہوا ہے اس معاشی جدول اور گریڈ سسٹم کے مطانق کسی فرد کی وقعت پرکھی جاتی اس پر عذرا کی نظم کا یہ ٹکڑا دیکھیے:

مرے ساتھ پڑھانے والے/صرف مرے انیسویں گریڈ کو دیکھتے ہیں/میں اُن سے کہتی ہوں/میں شاعرہ ہوں/میں رائٹر ہوں/میں کتابیں لکھتی ہوں/میں بہت سوچتی ہوں/مرے اوراُن کے درمیان ایک خلاہے(۴۸)

عذرا عباس کے مجموعہ''حیرت کے اس پار'' میں جنسی بیانیے کے بجائے نئے دور کی صنعتی ومشینی زندگی کو موضو ع بنایا گیا ہے جس نے ایک فرد کو داخلی تنہائی اور

ناسٹلجیائی کیفیات کا شکار کر دیا ہے۔ آج کا انسان ایک حرکی وقت کی طرح ایک برقی مشین کی طرح ہو گیا ہے۔ اس کے احساسات اور جذبات بنجر ہو گئے ہیں۔ اس مجموعے میں عذرا نے انسان کے اندر کیا داسی کو تازہ تمثالوں اور علامات کے ذریعے بیان کیا ہے۔ اس ضمن میں عذرا عباس کی نظم ''دنیا اداس ہے'' کے یہ مصرعے دیکھیے:

تم میری اداس دنیا سے باہر/منفی درجۂ حرارت کے ساتھ/بہت سے گرم کپڑوں میں لدے/کسی ٹرین پر سفر کر رہے ہو گے/یا کسی بس میں/اور اپنے گھر کو یاد کر رہے ہو گے/جہاں /بالکونی میں ایک تیتر/اپنے پرانے پنجرے /میں/کبوتروں کی ڈار کو دیکھ کر چیخ رہا ہے(۴۹)

عذرا عباس نے اپنی نثری نظموں میں ایک عورت کے اندرونی خلفشار کو بیان کیا ہے۔ انھوں نے عورت کے کرب اور محرومیوں کا بہت ذکر کیا ہے۔ انھوں نے عورت کی حیثیت اور انفرادی نفسیات کو موضوع بنایا ہے۔ اس بارے میں عنبرین حسیب عنبر رقم طراز ہیں:

> ''عذرا عباس مغربی نسائی تحریک سے متاثر ہیں اور عورت کے جذبات ،احساسات اور مسائل کو لکھتی ہیں۔''(۵۰)

عذرا عباس ایک عورت کے کرب اور محرومیوں کا بیان کرتی ہیں اس حوالے سے ان کی نظمیں ''میز پر رکھے ہاتھ'' ،''یہ صد'' اور''ایک نظم''اہمیت کی حامل ہیں۔ عذرا عباس صرف ایک عورت کی حسیّت تک محدود نہیں بل کہ انھوں نے جدید زندگی میں تمام انسانی خواہشات ،بے یقینی،جذبات کی میکانکی اور خوف کو بھی موضوع بنایا ہے۔ ان کے دوسے شعری مجموعہ''نیند کی مسافتیں'' کانتو پر مشتمل ہیں۔انھوں نے گردوپیش کی بے حسی اور معاشرے میں پھیلنے والے اندھیرے اور اضطراب کی عکاسی کی گئی ہے۔ انھوں نے انسانی نفسیات کی تمثیلی تصویر کشی نہایت عمدگی سے کی ہے۔

نسرین انجم بھٹی اہم نثری نظم نگار ہیں۔ انھوں نے اپنی نظموں میں ہندی،پنجابی اور انگریزی کے الفاظ ایک نئے اسلوب کے ساتھ استعمال کیے ہیں۔ وہ بروکن امیجز کی شاعرہ ہیں۔ ان کی نظموں میں زیادہ حریت فکر،سماجی اور انسانی مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ انھوں نے ایک عورت کی داخلی کیفیات کی تجسیم ایک نئے آہنگ میں کی ہے۔ ان کی نظمیں مارکسی نظریے کی ترویج اور سرخ انقلاب کی راہ ہموار کرتی ہیں۔ نسرین انجم بھٹی کے لحن میں جوش ملیح آبادی اور علی سردار جعفری کی گہری چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ ان کی شاعری میں ترقی پسند شعرا کے اکہرے مضامین کا مکرر پن موجود ہے۔ انھوں نے ایک مخصوص عصری رجحان کو اپنی داخلی کیفیات سے آمیز کر کے شاعری تخلیق کی ہے۔ نسرین انجم بھٹی نے اپنی نظموں میں مختلف امیجز کے ذریعے رات اور دن کی نفاقت کو ابھارا ہے۔ انھوں نے رات اور دن کے تخالفِ باہمی کو ظلم اور انصاف کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ان کی بہت سی نظمیں دیگر نثری نظم نگاروں سے موضوعاتی وہیئتی اشتراکات کی حامل ہیں۔

نسرین انجم بھٹی نے اپنی نظموں میں نت نئے حسّی پیکرتراشے ہیں۔ انھوں نے داخلی کیفیات کو ایک نئے انداز میں تجسیم کیا ہے۔انھوں نے معاشرے کے تمام کمزور طبقوں کی ترجمانی کی ہے۔ جو دو وقت کی روٹی اور چند گھونٹ پانی کو ہی زندگی سمجھتے ہیں۔ نسرین کی نظم ''رشتے سر رشتے''اور''عین الیقین'' ان کے عصری حسیّ تجربے اور ادارک کی عمدہ مثالیں ہیں۔ شاعرہ نے ان نظموں میں اپنے جذبات واحساسات کو نظم کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ ان کے شعری مجموعہ''بن باس'' میں نسائی نفسیات میں تسلیم واحتجاج کے عناصر ملتے ہیں۔ وہ اپنے اندر کی ٹوٹ پھوٹ اور دنیا کے خارجی مسائل دونوں کو بیان کرتی ہیں۔ وہ مرد کی بالادستی کو ناپسند کرتی ہیں ۔مرد نے عورت پر چند معاشرتی پابندیاں اور قدغنیں لگائی ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں عصری حالات،تصادم،کشمکش اور کھینچاتانی کو موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے مرد اور عورت کے آپسی تعلقات کو بڑے تلخ لہجے میں بیان کیا ہے۔ ان کی نظم''ایک سازش جو میرے اندر پکڑی گئی''ملاحظہ کیجیے:

اس رات سب چہروں پر سائے تھے/چپ بولتی نہیں تھی ڈراتی تھی/انگلیوں کی گرہوں میں ایک ایک بچھوتھا/میز کے گرد جمع سب لوگ یکلخت اٹھ کر کھڑے ہوئے/میں نے یہ بھی غلط کہا/میں نے وہ بھی غلط کہا/میں نے کیا سچ کہا کچھ وہ بھی تو کہو(۵۱)

مشرقی معاشرے کی عورت کی بے بسی کو نسرین نے اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔ کہ مشرقی عورت مرد کی ضرورت اور حکم کے مطابق ڈھلتی جاتی ہے جہاں تک کہ اس کا اپنا کوئی تشخص نہیں بچتا ۔ محرومی کد دکھ،پچھتاوا اور ذہنی الجھنوں کو شاعرہ نے اپنی نظم ''اپنا اپنا ستم'' میں بڑے خوب صورت انداز میں بیان کیا ہے:

میری بخشش کے دن سے میری رات توڑ لی گئی/میں اس کی کمان کے لیے ٹوٹا ہوا تیر ثابت ہوئی/اور اس کے قدموں میں آ گری/ورنہ وہ مجھے اپنی فتح سمجھ کر چھوڑ دیتا اور ہمارے درمیاں/ہوا بھی گواہ نہ رہتی/میں نے اس کا نشانہ خطا نہیں کیا /اس کے ہاتھوں سے ٹوٹ کر میں اس کے ہاتھوں میں رہی/کفِ افسوس بن کر(۵۲)

نسرین انجم بھٹی کی نظموں مشرقی مرد کی نفسیات اور رویے کی عکاسی کی گئی ہے جو اپنی محرومی کا غصہ بھی اپنی گھریلو عورت پر نکالتا ہے۔ وہ محبت خرید تو سکتا ہے لیکن محبت میں بِک نہیں سکتا۔ وہ اپنی مرضی اور شرائط کی شبِ وصل چاہتا ہے۔ اس موضوع کی حامل نظموں میں ''محبت کی سب سے پہلی نظم'' اور''اب تک''زیادہ اہم ہیں۔ مشرقی عورت ایسے گھبرائی ہوئی ہوتی ہے کہ بسااوقات اسے اپنے ناکردہ گناہوں پر بھی معافی مانگنا پڑتی ہے۔ اسے بے اعتباری اور شک کی اذیت سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ اسے کم عقل اور کمزور سمجھا جاتا ہے۔ نسرین نے عورت کو خوشبو سے تشبیہ دی ہے اور اس کی نفسیاتی اور لاشعوری خواہشات کو جنگل کی علامت سے پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں ایک نظم ''باس متی'' ملاحظہ کیجیے:

باس متی!بن باس متی/رب کی بیٹی/مٹی کی طرح بے شرم بے قصور/نالی کے دوسرے سر ے پر نہریں صاف کرنے والے/آدھے دھڑ سے اپنے آپ کو پورا کر رہے ہیں/باس متی ! من پیر کی نیاز دلا!/جنگلی پر،سانپ کے پھن پر اور اپنی آزاد پر(۵۳)

نسرین انجم بھٹی ترقی پسند نثری نظم نگار ہیںSocio-Politicalان کی شاعری کا بنیادی حوالہ ہے۔ ان کی نظمیں موضوع اور اسلوب ہر دوسطح پر قابل توجہ ہیں۔ ان کی نظموں میں پنجاب کی ثقافت نظر آتی ہے ۔انھوں نے نسائی جذبات کی شاعری میں مزاحمتی لحن اختیار کیا ہے۔ ان کی شاعری کا نسائی فکری پیرائیہ نہایت عمدہ ہے۔نسرین انجم بھٹی کی نظموں میں عورت جبر ،صبر اور برداشت کا پیکر ہے۔

نثری نظم کی روایت میں کشور ناہید بڑی اہم شاعرہ کے طور پر اپنا مقام رکھتی ہیں۔ غزل اور آزاد نظم کی وجہ سے ان کی نثری نظمیں اس طرح سے سامنے نہیں لائی گئیں ۔کشور ناہید کی آزاد نظموں کی نسبت ان کی نثری نظمیں سماجی مسائل کی زیادہ ترجمان ہیں۔ ان کی نظم ''خوف کی دستک''اس حوالے سے اہم ہے۔ اگرچہ کشور ناہید کی نثری نظموں کا دائرہ ان کی ہم عصر شاعرات کی نسبت محدود ہے لیکن اپنے شعری موضوعات کی وجہ سے ان سے اشتراکات رکھتا ہے۔ انھوں نے دیگر شاعرات کی طرح صدیوں سے رائج خانگی نظام کی مذمت کی ہے۔ وہ معاشرتی حقیقتوں اور سفاک سچائیوں کو آمیز کر کے نظمیں تخلیق کرتی ہیں۔ انھوں نے دور حاضر کے انسان کی خود غرضی اور بے حسی کا نوحہ لکھا ہے اور معاشرے میں لگی اس دولت کی دوڑ کو نا پسندبھی کیا ہے۔ جس نے رشتوں کے تقدس اور اقدار کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ ان کی نظم ''التماس'' اس موضوع کی اہم نظم ہے۔

کشور ناہید کی نظموں میں اپنے عہد کی حسّیت سے انسلاک کا عمل بڑا واضح ملتا ہے۔ ان کی نظم''خوف کی دستک'' کا یہ ٹکڑا ملاحظہ کیجیے:

انسان کیا ہوتا ہے/یہ بتانے کے لیے بچھلے زمانے کی تاریخ پڑھنی ہو گی/دہشتوں کے نگر میں تو نیند نہیں آتی ہے/بھلا خواب کیسے آئیں گے/بے موت مرنے والوں کے نام تو/بے نام سپاہیوں کہ فہرست میں بھی درج نہیں ہوتے(۵۴)

کشور ناہید نے ہمارے عہد کے متعد رویوں اور سفاک سچائیوں کو موضوع بنایا ہے۔ یہ ایسی تلخ حقیقتیں ہیں جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ انھوں نے اپنی نظموں میں مروجہ خانگی نظام کی شکست وریخت کا عمل بھی دکھایا ہے۔ اس ضمن میں ان کی ایک نظم ''پہاڑ مسکراتے نہیں ہیں'' ملاحظہ کیجیے:

پچاس سال سے پہلے یہ بھی ممکن نہیں تھا/کہ ماں باپ کی انشورنس اور پنشن کی/رقم ہاتھ لگنے کے انتظار میں جوان ہوتی/اولادوں کو ماں باپ بھی برے لگنے لگتے /رتبے کی اڑانوں میں گرفتار بیٹوں کو/ماں باپ کوسرونٹ کواٹرز میں رکھنا پڑا/اور خواہش کی دیوانگی میں

آشفتہ اولاد کو/تعویزوں اور حکیموں کے ذریعے /ماں باپ کی زندگیوں کی گھڑیاں کم کرنے کے/طریقے تلاش کرنے پڑے(۵۵)

کشور ناہید کی یہ نظم ہمارے معاشرے کے کرداروں کا اعلامیہ ہیں۔ انھوں نے مادیت پرستی زندگی کی ہولناکیوں کو بیان کرتے ہوئےاس کی شدید مذمت کی ہےہمارے معاشرے میں دولٹ کی لگی ہوئی دوڑ نے اس طرح کا طرز زندگی پیدا کیا ہے۔ انسان کے اندر رشتوں کا تقدس اور خلوص اور احساس ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ اس مادیت پرستی نے انسان کا خون سفید کر دیا ہے۔ اسے خونی رشتوں سے بھی پہلے والی ہمدردی نہیں رہی ۔دراصل کشور ناہید کی یہ نظم ہمارے معاشرے کے اندر پنپنے والے ایسے مردہ ضمیر وں کا نوحہ ہیں۔

کشور ناہید کی کچھ شاعری روایتی انداز کی ہے اور کچھ مغرب سے درآمد ہ فیمنزم سے متاثر ہے۔ انھوں نے ہم عصر شاعرات سے کچھ زیادہ مردانہ تسلط کا شکار عورت کی آزادی کا مطالبہ کیا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے مشرقی نظام میں جکڑی عورت کی آزادی اور مقام ومرتبے کے لیے جدوجہد کی۔ کئی نظموں میں تو انھوں نے مرد کے مقام کو بھی چیلنج کر دیا ہے۔ وہ ہر سطح پر مرد سے برابری چاہتی ہیں۔ کشور ناہید دراصل مغرب پرست ہیں وہ مادر سری نظام کی علمبردار ہیں اور اس نظام کے نفاذ کے لیے جدوجہد کرنے والی شاعرات میں ہر اوّل دستہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کے شعری مجموعے ''بے نام سمافت''،''نظمیں''،''گلیاں دھوپ دروازے''اور''ملامتوں کے درمیاں'' کی نظمیں نثری نظم کی روایت کا ایک اہم حصہ ہیں۔ کشور ناہید کی شاعری مرداساس معاشرے کے خلاف احتجاج ہے۔ انھوں نے مشرقی عورت کی نفسیات کو Exploreکیا ہے۔ جذباتی گھٹن، جنسی تشنگی اور عدم تحفظ کی وجہ سے پیدا ہونے والے ذہنی تناؤ کوکشور ناہید کی شاعری میں دیکھا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اپنی ذات سے باہر نکل کر کمزور طبقے کی عورتوں کے کرب کو محسوس کیا ہے اور اسے شعری زبان دی ہے۔

تنویر انجم بھی نثر نظم کی اہم شاعرہ ہیں۔ ان کے یہاں عصری حسیّت کے بڑے واضح نقوش ملتے ہیں۔ ان کی اپنے گردوپیش کے تمام مسائل پر نظر رہتی ہے وہ ماحول سے جڑی ہوئی شاعرہ ہیں۔ ''ان دیکھی لہروں''،''سفر اور قید میں نظمیں'' ،''طوفانی بارشوں میں رقصاں ستارے ''اور''زندگی میرے پیروں سے لپٹ جائے گی''ان کی نظموں کے مجموعے ہیں۔ ان کے یہاں موضوعات سے لے کر اسلوب تک تنوّع پایا جاتا ہے۔ ان کی ایک نظم کا ٹکڑا ملاحظہ کیجیے:

سڑکوں کی بے رحمی برداشت کیے ہوئے/بچوں کے بدن /ہالی وڈ میں پور نو فلموں کے نئے مقبول رجحان کے لیے/استعمال کا بوجھ/شاید برداشت کر لیں/ایک ہزار ڈالر میں بکے ہوئے بدن سے/مکمل ہونے والی مقبول پورنو فلم کی کاپی/پوشیدہ طور پر/خصوصی ڈاک کے ذریعے /ایک ہزار ڈالر میں حاصل کی جا سکے گی(۵٦)

اس نظم میں دراصل شاعرہ نے اس مخصوص عصری صورت حال کی عکاسی کی ہے جس کی وجہ سے زمانے زوال پذیر ہوا ہے۔ عالمی صارفی معاشرہ اس قدر تیز رفتاری سے سفر کر رہا ہے کہ اس میں محض جنس ہی نہیں بل کہ غیر فطری جنسی عمل بھی دیکھنے کو مل رہا ہے۔ اس سارے عمل نے انسان کو نفسیاتی طور پر بیمار کر دیا ہے۔ اس طرح کے طرز عمل سے مختلف نفسیاتی عوارض لاحق ہو رہے ہیں اور بیمار ذہنوں کی تعداد میں بھی روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ تنویرانجم نے معاصر عہد کی اقدار،میڈیا اور جددی تر ذرائع ابلاغ کے زیر اثر معاشرے کے عوامل کو موضوع بنایا ہے۔ ان کی تانیثی کرداروں کی حامل نظموں میں فاخرہ کی کمزوریاں، سلطانہ کا غیر محفوظ سرکس،غیر پاکستانی نوابزادی آمنہ کا خواب، تم کبھی ہماری نہیں ہو سکتی،ننھی لڑکیوں کے تھالوں میں ناکامی شہزادی کی آزادی اور فوراً ہی مر جاناہے '' شامل ہیں۔

یاسمین حمید آزاد اور نثری دونوں ہیئتوں میں نظم نگاری کرتی ہیں۔ وہ نسائی شعور کی حامل شاعرہ ہیں۔ وہ اپنی نظموں عورت کے شعور اور لاشعور کو کھول کر بیا ن کرتی ہیں ۔ان کی نظموں میں عورت کے خواب،اندر اکے اضطراب ،بے چینی اور بے خوابی جیسے عوامل کا ذکر ملتا ہے۔ وہ نئی تمثالوں اور علامتوں کے ذریعے نسائی رویوں،احساسات،جذبات اور نفسیاتی الجھنوں کو بڑے عمدہ پیرائیہ اظہار میں بیان کرتی ہیں۔یاسمین حمید اپنی نظموں''سفر کا آغاز کرنا تھا''،''عجب الجھن ہے''، '' کیسی کیسی لکیریں ہیں''اور ''کوئی بات اس کے وجود میں در آئی''میں اپنے تخلیقی عمل سے انسانی نفسیاتی محرکات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ یاسمین کی کا ایک نظم ''سفر کا آغازکرنا تھا''کا ٹکڑا ملاحظہ کیجیے:

مجھے ترتیب دینا تھا/گزرتے وقت کو/لمحوں کی بندش سے کہیں آزاد ہوناتھا/کہیں زنجیر ہونا تھا مجھے ان میں/کہیں دن رات کے بہتے سمندر پر مجھے/تخلیق کرنے تھے سفینے/مجھے ترتیب دینا تھا/دل بے جہت کی بے انت بے چینی کو/مجھے ترتیب دینا تھا/سرابی وسعتوں کو/راستے تجویز کرنے تھے/مجھے قدموں کو اک لمبی مسافت کا یقین دنیا تھا/پیروں میں بگولے اور ہاتھوں پر ستارے باندھنے تھے(۵۷)

ڈاکٹر صائمہ ارم کا شمار بھی نمایندہ معاصر نثری نظم نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے افسانے بھی اردو ادب کا سرمایہ ہیں۔ انھوں نے ''داغ دار'' جیسا عمدہ افسانہ لکھ کر جدید افسانہ نگاری میں اپنی الگ شناخت بنانے کے بعد نثری نظم میں بھی ایک پختہ گو شاعر کا ثبوت دیا ہے۔ صائمہ ارم کی نثری نظمیں موضوع اور ہیئت دونوں اعتبار سے معاصر شعرا اور شاعرات سے اشتراکات رکھتی ہیں۔ انھوں نےسماجی موضوعات بیان کرتے ہوئے بھی نسائی لہجہ برقرار رکھا ہے۔ صائمہ ارم ایسی نظم نگار ہیں جنھوں نے اپنی ذات کے کرب اور دیگر موضوعات کے ساتھ ساتھ انفرادی واجتماعی رویوں کونئے نسائی نقطہ نظر سے دیکھا ہے۔ انھوں نے افکار ذات اور معاشرے کے باہمی تال میل اور عصری سچائیوں کو نظموں میں بیان کیا ہے۔ انھوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ عصری صورت حال کو نظم کے قالب میں ڈھالا ہے۔ صائمہ ارم کی ایک اہم نثری نظم ''امّید'' ملاحظہ کیجیے:

بے اعتناء مسلسل بارشوں نے

میرا اگھر اور میرا بدن سیلن زدہ کر دیا ہے۔

نم آلود دیواروں پر کوئی بھی رنگ نہیں ٹھیرتا

اور تمھاری یاد میرے بدن سے جھڑ رہی ہے

پلستر شدہ عمارت برہنہ ہے

اور میں بے لبادہ ہو رہی ہوں۔

برسات کا موسم گزر جائے تو

دُھلی ہوئی دھوپ کی سرخ سنہری کرنیں دیواروں کو سُکھا دیں گی۔

اور میں تیز رنگوں کا اک نیا لبادہ بُن لوں گی۔

برسات کا موسم گزر جائے تو۔(۵۸)

ڈاکٹر صائمہ ارم پر امید رویوں کی شاعرہ ہیں۔ ان کی محرومیوں اور نارسائیوں سے مجروح انا شکست وریخت کی تلافی کے لیے وہ راستے نکال لیتی ہے جو اس کو دکھوں سے ٹوٹنے نہیں دیتے بل کہ دکھوں کو سہنے کاحوصلہ عطا کرتے ہیں۔صائمہ ارم کبھی نا امید نہیں ہوتیں بل کہ عمل ،حرکت اور زندگی کے تسلسل پر یقین رکھتی ہیں۔وہ صحت مند جہت اور مثبت رویوں کی شاعرہ ہیں۔ وہ انسان کے اندر پنپنے والے احساسِ رائیگانی کو اس سوچ کے ساتھ رد کردیتی ہیں کہ کوئی نقصان ہمیشہ نہیں رہتا۔ وہ دل میں سر اٹھانے والے خوف اور اندیشوں میں مبتلا نہیں ہوتیں بل کہ مثبت انداز میں ایک تخلیقی نسائی لہجے سے نفسیاتی الجھنوں اور احساسات کو بیان کرتی ہیں۔

مندرجہ بالا نثری نظم نگاروں کی نظموں کا جائزہ لینے کے بعد یہ بات سامنے آئی ہے کہ ان تمام شعرا اور شاعرات نے اپنی نظموں میں عصری حالات کا تذکرہ کیا ہے۔ انھوں نے یکساں طور پر ہمارے معاشرے کے سیاسی،سماجی اور ثقافتی صورت حال کو شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے صنعتی ومشینی زندگی کی اس برق رفتاری کی تباہ کاریوں کا ذکر بھی کیا ہے اور داخلی کیفیات کا پیرائیہ اظہار میں عمدہ ہے۔ ان سب میں اپنے عصر کی مخصوص حسیّت کا عنصر مشترک ہے۔ ان کے یہاں جنس کے جدید نفسیاتی تصور بھی ملتے ہیں۔ کچھ شاعر مناظر فطرت کو عورت کے جسمانی اعضا میں مجسم کرکے دکھاتے ہیں اور کچھ جنس کے نئے پیچیدہ پہلوؤں کو زندگی میں ضم کرتے ہیں۔ تمام نثری نظم نگاروں نے فرد اور معاشرے کا انتشار باہم شیروشکر کر کے پیش کیا ہے۔ شاعرات نے اپنے داخلی خوف ،منفی تعصبات،محبت،وفا کی خواہش اور دیگر معاشرتی رویوں کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے عورت کے ساتھ روا رکھے جانے والے امتیازی سلوک ،منفی تفاوت اور منافقانہ رویے کی

مذمت کی ہے۔ انھوں نے انسان کی دوچہرگی،بے حسی اور خالی پن کو مختلف علامتوں سے بیان کیا ہے۔ ان سب کے یہاں ذات کی نفسیاتی الجھنوں کا کتھارسس ملتا ہے۔

استخراج نتائج /موضوعاتی اشتراکات

نمایندہ نثری نظم نگاروں مبارک احمد، عبدالرشید، انیس ناگی، ثروت حسین، افضال احمد سیّد، احمد ہمیش، ذی شان ساحل،ڈاکٹر جواز جعفری، زاہد ڈار، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ڈاکٹر سعادت سعید، سعید الدین، سارا شگفتہ، عذرا عباس، نسرین انجم بھٹی، کشور ناہید، تنویر انجم، یاسمین حمید اور ڈاکٹر صائمہ ارم کی نظمونمیں موضوعاتی وہیئتی اشتراکات ملتے ہیں۔نثری نظم نگاروں نے سماجی ،سیاسی اور معاشی انتشار کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورت حال کاذکر کیا ہے۔ معاصر نثری نظم نگاروں نے تمثیلی،علامتی، استعاراتی اور حسّی پیکر ایک جیسے استعمال کیے ہیں۔ تمام نظم نگاروں نے اپنے عہد کے تمام سماجی جزرومد کو متن کا حصہ بنایا ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں خارجی عوامل ،داخلی کیفیات اور ذاتی تجربات کو بیان کیا ے ۔ان کی نظمیں مادیت پرست معاشرے میں ہونے والی روحانی اور اخلاقی اقدار کی پامالی کا بیانیہ ہیں۔انھوں نے مخصوص عصری صورت حال کی عکاسی کی ہے۔ انھوں نے تنہائی ،اجتماعی جبر اور تلاشِ محبت کو نئے ادراک کے ساتھ شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ وہ معاشرےکی پیچیدہ صورت حال اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی خلفشاری کوبیان کرتے ہیں۔ان کی شاعری میں جنسی بے راہروی اور ناآسودگی کے حوالے بھی ملتے ہیں۔ان کی نظمیں خود اذیتی ،خود لذتی ،تنہائی اور ذات کی شکست وریخت کی عکاس ہیں کیوں کہ انھوں نے نظام زیست سے کوئی مفاہمت نہیں کی۔ انھوں نے اپنے داخلی کرب ،گمبھیر تنہائی اور احساسِ عدم تحفظ کو مختلف جنسی علامتوں کے ذریعے بیان کیا ہے۔

نثری نظم نگارمشترکہ طور پرانسان کو صنعتی زندگی کے تنوع اور انتشار سے محفوظ رکھنے کی بات کرتے ہیں۔وہ آسیب زدگی اور ناآسودگی کی وجہ سے انسان کے کائناتی حسن سے لطف اندوز نہ ہونے کی حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں۔ ان کی نظموں میں متعدد حسّی تجربات ملتے ہیں۔ انھوں نے معاشرے کے پست اور محروم طبقے کی نمایندگی کی ہے۔ وہ صنعتی اور مشینی زندگی کے ہاتھوں پسے ہوئے طبقے کی ترجمانی کرتے ہیں۔ وہ مادیت پرست زندگی سے بیزار ہیں جس نے انسانی اعصاب کو کمزور کر دیا ہے۔ انھوں نے طبقاتی تقسیم اور دولت کی غیر مساوی تقسیم کو بھی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ ان کی نظمیں ایک عام آدمی کے کرب کی صورت گری کر رہی ہیں۔وہ مخصوص حسّی رویوں اور خارجی آشوب اور معاشرے میں پائی جانے والی ابتری ،بدامنی ،بے چینی ،نارسائی اور ناآسودگی کا ذکر کرتے ہیں۔ نثری نظموں میں انسان کی نفسیاتی کشاکش اور معاشرتی شکست وریخت کا اجتماعی شعور ملتا ہے۔نثری نظموں میں فلسفیانہ،سائنسی شعور،تہذیبی اقدار،اساطیری اور نفسیاتی نوعیت کے مضامین ملتے ہیں۔

شاعرات کی نظموں میں عورت کے ماں بننے کے مسائل، جنسی مسائل ،نفسیاتی اور شکستِ ذات کے مسائل کا خصوصی اظہار ملتا ہے۔ ان کی نظموں میں جنسی تموج، دکھ ،نارسائی ،محرومی، ذات کا کرب ،تنہائی اور جذباتیت ملتی ہے۔ وہ انفرادی اور اجتماعی الجھنوں، اعصابی خلل اور جنونی وہیجانی احساسات کو بھی بیان کرتی ہیں۔مختلف نظموں میں خود رحمی،ذات کا کرب،احتجاج،جنونی اور ہیجانی کیفیات،ذات اور نفسیات کا اظہار،کتھارسس اور زندگی کے مختلف مراحل اور حادثوں کا ذکر ملتا ہے۔انھوں نے جدید زندگی میں تمام انسانی خواہشات ،بے یقینی،جذبات کی میکانکی اور خوف کو بھی موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے گردوپیش کی بے حسی اور معاشرے میں پھیلنے والے اندھیرے اور اضطراب کی عکاسی کی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ مبارک احمد،دیباچہ دوم،کلیاتِ مبارک احمد،(لاہور: مبارک پبلشرز،جنوری ۱۹۹۹ء)،ص:۱۸

۲۔ سجاد باقر رضوی،ڈاکٹر،نثری نظم کیوں، (لاہور: ادب لطیف،شمارہ نمبر۱۱۔۱۲،۱۹۷۵ء)،ص:۱۸

۳۔ نصیر احمد ناصر،نثری نظم کا تخلیقی جواز، مشمولہ،ادبیات نثری نظم نمبر،شمارہ ۷۷۔۷۸،اکتوبر ۲۰۰۷ء تا مارچ ۲۰۰۸ء)،ص:

۲۵۴

۴۔ مبارک احمد، کلیاتِ مبارک احمد، (لاہور: مبارک پبلشرز،جنوری ۱۹۹۹ء)،ص:۴۷

۵۔ عبدالرشید،انی کنت الظالمین(کلیات)،(لاہور: سانجھ پبلی کیشنز،بار اول ۱۹۷۳ء،بار دوم ۲۰۱۱ء)،ص: ۲۳۳

٦۔ ایضاً،ص: ۳۱۴

۷۔ انیس ناگی،عبدالرشید،مشمولہ،نیا شعری افق،(لاہور: جمالیات،۱۹٦۹ء)،ص:۱۵۴

۸۔ مبارک احمد، کلیاتِ مبارک احمد، (لاہور: مبارک پبلشرز،جنوری ۱۹۹۹ء)،ص:۵۰

۹۔ ایضاً،ص:۱۷۳

۱۰۔ عبدالرشید، نیند ،موت اور بارش کے لیے نظمیں،(لاہور: طفیل آرٹ پرنٹرز،۱۹۹۳ء)،ص:۱۹۰

۱۱۔ انیس ناگی، درخت مرے وجود کا،(لاہور: جمالیات، س ن)،ص:٦۸

۱۲۔ انیس ناگی،صداؤں کا جہاں،(لاہور: جمالیات،۱۹۹۵ء)،ص:۱۰

۱۳۔ انیس ناگر،بیابانی کا دن،(لاہور: جمالیات،۱۹۹۴ء)،ص:۹

۱۴۔ سہیل احمد خاں،ہم عصر تارا،مشمولہ،آدھے سیارے پر،(لاہور: قوسین،۱۹۸۷ء)،ص:۱۱،۱۰

۱۵۔ ثروت حسین،آدھے سیارے پر،(لاہور: قوسین،۱۹۸۷ء)،ص:۲۱

۱٦۔ شمیم حنفی،اردو شاعری میں نئے رجحانات(معاصر نظم کے پس منظر میں) مشمولہ نقاط جدید نظم نمبر،شمارہ ۱۰،اکتوبر ۲۰۱۱ء،ص:

۲۸

۱۷۔ افضال احمد سیّد ،مٹی کی کان(کلیات)،(کراچی: آج کی کتابیں،۲۰۰۹)،ص:۱۷۰

۱۸۔ ایضاً،ص:۲۹۲

۱۹۔ احمد ہمیش،مشمولہ،کراچی: تشکیل سہ ماہی، جلد ۲،شمارہ ۳-۵-٦اجون ۱۹۹۲ء،ص: ۷۲،۷۳

۲۰۔ ذی شان ساحل،کراچی اور دوسری نظمیں، (کراچی: آج کی کتابیں، ۱۹۹۵ء)،ص:۳۴

۲۱۔ ذی شان ساحل، ای میل اور دوسری نظمیں ،(کراچی: آج کی کتابیں،۲۰۰۳ء)،ص:۱۰٦

۲۲۔ جواز جعفری،ڈاکٹر،موت کا ہاتھ کلائی پر ہے(لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۵ء)،ص:۲٦

۲۳۔ ذی شان ساحل،کراچی اور دوسری نظمیں، (کراچی: آج کی کتابیں، ۱۹۹۵ء)،ص:۷٦

۲۴۔ ذی شان ساحل،ساری نظمیں،(کراچی: مدینہ سٹی مال،۲۰۱۱ء)،ص:۸۱

۲۵۔ جواز جعفری،چراغوں سے بھری گلیاں،(لاہور: فکشن ہاؤس،س ن)،ص:۱۱

۲٦۔ عنبرین منیر،ڈاکٹر،جدید اردو نظم میں نفسیاتی عناصر،(فیصل آباد: مثال پبلشرز،۲۰۱۷ء)،ص:۳۵۴

۲۷۔ زاہد ڈار،محبت اور مایوسی کی نظمیں،(لاہور: اظہار سنز،سن ندارد)،ص:۹

۲۸۔ ایضاً،ص:۳۳

۲۹۔ ایضاً،ص: ٦۷

۳۰۔ تبسم کاشمیری،تمثال،(لاہور: ارسلان پبلی کیشنز،بار اوّل،۱۹۷۵ء)،ص:۱۷

۳۱۔ ایضاً،ص: ۱۹

۳۲۔ احتشام علی، جدید اردو نظم میں عصری حسیت، مشمولہ،(فیصل آباد: نقاط نظم نمبر،اکتوبر ۲۰۱۰ء) ص:۲۲۷

۳۳۔ عنبرین منیر،ڈاکٹر،جدید اردو نظم میں نفسیاتی عناصر،(فیصل آباد: مثال پبلشرز،۲۰۱۷ء)،ص:۳۷۱

۳۴۔ تبسم کاشمیری،ڈاکٹر،پرندے، پھول ،تالاب،(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۹٦ء)،ص:۳۰،۳۱

۳۵۔ ایضاً ،ص: ۳۴

۳٦۔ طاہر منصور قاضی،سعادت سعید____نظم میں امکانات کا شاعر،مشمولہ، ماہنامہ،فانوس،لاہور،جلد ۵۱،شمارہ ۷،٦،۵مارچ ،اپریل، مئی، ۲۰۱۲ء،ص:۲۸۸

۳۷۔ سعادت سعید، کجلی بن،(لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز،۱۹۸۸ء)، ص:۵۷

۳۸۔ سعادت سعید،شناخت،(لاہور: مکتبہ نسیم،۲۰۰۷ء)،ص:۱۷

۳۹۔ سعادت سعید،رات،(کراچی: آج کی کتابیں،۱۹۹۷ء)،ص:۲٦

۴۰۔ ایضاً،ص: ٦۱

۴۱۔ سلیم اختر ،ڈاکٹر، نثری نظم:نفسیاتی تناظر میں تخلیقی عمل،مشولہ،ادبیات(نثری نظم نمبر)،ص:۲۸۳

۴۲۔ سارا شگفتہ،آنکھیں،(لاہور: فکشن ہاؤس، ۱۹۹۷ء)،ص:۲۴

۴۳۔ ایضاً،ص: ۱۷۹

۴۴۔ امرتا پریتم، براکیتوای اے صاحبان،مشمولہ،آنکھیں،از سارا شگفتہ،(کراچی: شکیل پبلشرز،۱۹۸۵ء)،ص:۱۰

۴۵۔ ساراشگفتہ،آنکھیں،(کراچی: شکیل پبلشرز،۱۹۸۵ء)،ص:۴۳

۴٦۔ ایضاً،ص:۷۷،۷٦

۴۷۔ عذرا عباس،میں لائنیں کھینچتی ہوں،(کراچی: جدید کلاسک پبلشرز،۱۹۹٦ء)،ص:۱۵

۴۸۔ ایضاً،ص:۵۱

۴۹۔ عذرا عباس،حیرت کے اُس پار،(کراچی: شہرزار،۲۰۰٦ء)،ص:۱۵

۵۰۔ عنبرین حسیب عنبر،جدید نظم نگاری____ایک جائزہ،مشمولہ،ادبیات سہ ماہی،اسلام آباد،۲۰۰۵ء،ص:۲۸۹

۵۱۔ نسرین انجم بھٹی،بن باس، (لاہور: پلس کمیونی کیشنز،۱۹۹۴ء)،ص:۱۱۲

۵۲۔ ایضاً،ص:۱۱۹

۵۳۔ ایضاً،ص:۲٦۲

۵۴۔ کشور ناہید،دشتِ قیس میں لیلیٰ (کلیات)،(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۱ء)،ص:۱۱۹۳

۵۵۔ ایضاً،ص:۱۱٦۱

۵٦۔ تنویرانجم ،زندگی میرے پیروں سے لپٹ جائے گی،(کراچی: آج کی کتابیں،۲۰۱۰ء)،ص:۵۷

۵۷۔ یاسمین حمید، فنا بھی ایک سراب،(لاہور: الحمدپبلی کیشنز،۲۰۰۱ء)،ص:۷۳

۵۸۔ صائمہ ارم،ڈاکٹر،امّید، مشمولہ ،سویرا،شمارہ ۹۳،قوسین ،لاہور،ص:۳۱۴

ماحصل

تمام تحریکوں اور ادوار کے جدید اردو نظم نگاروں کے یہاں موضوعاتی وہیئتی اشتراکات اور نظری مباحث کسی نہ کسی طرح موجود ہیں۔اُردو نظم میں انیسویں صدی کے وسط کے بعد محمد حسین آزاد،الطاف حسین حالی اور شبلی نعمانی نے منظر نگاری کرتے ہوئے تخیل کے بجائے محکات نگاری سے کام لینے پر زور دیا۔ان تینوں اکابرین نے حب وطن اور منظر نگاری پر رائے زنی کی تو جدید اردو نظم میں فطرت نگاری کی ایک روایت جڑ پکڑنے لگی۔جدید اردو نظم کے بنیاد گزاروں نے نیچرل شاعری کے تحت فطرت نگاری اور مناظر کشی کا باقاعدہ آغاز کیا۔ انھوں نے دہلی کے سادہ طرز اظہار اور لکھنو ی انداز بیاں کے پر تکلف طریق کار کے حسین امتزاج کو مغربی نیچرل شاعری کے آئینے میں دیکھنے کی کامیاب سعی کی ہے۔انجمن پنجاب (جدید نظم) کی تحریک ۱۸۷۴ء تک دیکھا جائے تو مثنویوں ،قصیدوں اور مرثیوں کے ناپختہ اور دھندلائے ہوئے تصور ملتے ہیں۔انیسویں صدی کی آخری تین دہائیوں میں آزاد وحالی نے قدیم اردو شاعری میں پائے جانے والی ناپختگی اور دھندلے تصور کو پختگی اور شفافیت عطا کی۔ انھوں نے جدید اردو نظم میں فطرت نگاری اور جذبہ حب الوطنی کا نیا انداز اور نیا آہنگ متعارف کرایا۔

انجمن پنجاب کی نئی طرز کی نظموں کی تحریک نے اردو شاعری میں ترجمہ نگاری کے ساتھ طبع زاد نظمیں تخلیق کرنے کا رجحان پید اکیا ۔اس دور کی نظموں میں اسلوب اور سانچے فارسی اور ہندی طرز کے تھے اور مضامین وخیالات انگریزی سے ماخوذ کیے گئے۔ نظم جدید میں فطرت سے محبت ،بلآخر حب وطن اور قوم کی آزادی کی محبت میں بدل گئی جسے رومانوی دور کے شعرا نے فروغ دیا۔ اولین دور کے شعرا نے آزادی اور بنیادی حقوق کی بات کی۔انھوں نے اپنے وطن کی بہاروں،اپنے وطن کے موسموں اور اپنے وطن کی سرزمین کا بہت ذکر کیا ۔اس عہد میں انگریز ہندوستان میں پوری طرح قابض ہو گیا تھا اس لیے جدید اردو نظم کے اولین شعرا کو اپنے وطن کا ذرہ ذرہ بے حد پیارا لگنے لگا اور انھیں سر زمین ہند پہلے سے زیادہ حسین لگنے لگی۔انھوں نے پہاڑوں،دریاؤں،سمندروں،آبشاروں،ندیوں اور موسموں کی کروٹوں کا ذکر بڑی خوب صورتی کے ساتھ کیا ہے۔انجمن پنجاب نے روایتی مشاعروں کے بجائے "مناظمے" کا آغاز کیا ،اس طرز جدید کے مشاعروں میں نظم کا عنوان دیا جاتا۔جس کی وجہ سے نظم کی ہیئت ،اسلوب اور موضوعات میں یکسانیت پیدا ہونے لگی۔

تحریک انجمن پنجاب کی نظم جدید میں قدرتی مناظر،وقت،موسموں اور فطرت کے موضوعات کی تکرار اور یکسانیت پائی جاتی ہے۔اس حصار کے شعرا میں موضوعاتی وہیئتی اشتراکات بدرجہ اتم موجود ہیں۔آزاد ،حالی ،اسماعیل اور دیگر شعرا کی شاعری میں موضوعاتی وہیئتی یکسانیت نمایاں نظر آتی ہے۔ چوں کہ یہ شاعری خاص عہد ،خاص مقاصد کے لیے لکھی گئی اس لیے متعدد یکساں رویوں اور میلانات کا شکار رہی۔ آزاد اور ان کے معاصر شعرا نیچرل شاعری کے ذریعے کائنات کا راز جاننا چاہتے تھے ۔وہ فطرت کے بے حد قریب ہونا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے متعدد نظمیں مناظر فطرت ،موسم اور وقت کی بدلی کیفیت پر کہیں۔جدید اردو نظم کے اولین دور کے نظم نگاروں نے اسلامی تہذیب وتمدن کے انحطاط اور پستی کا انتہائی خلوص اور درد کے خلاف اورعوام کے معاشی استحصال ،ظلم وجبر،سیاسی ،سماجی اور وطنی نوعیت کی نظمیں پیش کیں۔ اولین شعرا زیادہ تر ماضی پرست تھے وہ مغربی اثرات کی مخالفت کرتے تھے انھوں نے طنز ومزاح کے انداز میں انگریزی تہذیب وتمدن کی برائیوں کا احتساب کیا ہے۔انھوں نے جدید اردو نظم میں فطری آثار ومناظر کو نئے انداز میں موضوع بنایا۔انھوں نے موسموں ،پہاڑی مناظر ،دریاؤں ،چرند و پرند،پھل، نباتات ،پھولوں ،باغات اور ہندوستان کے مقامات کی عکاسی کی ہے۔

اولین دور کے نمایندہ شعرا کی فکر،ہیئت اور صنف میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اس دور کے شعرا کی شاعری حسن وعشق کی قید سے آزاد ہو کر داخلی کیفیات کے بجائے خارجی عناصر کا بیانیہ معلوم ہوتی ہے۔اولین دور کی جدید اردو نظم مناظر فطرت اور حب وطن کے عناصر طبع زاد اور انگریزی تراجم سے پیدا کیے گئے۔ نظم میں انگریزی تراجم کا یہ سلسلۂ اشتراک رومانوی دور اور ازاں بعد ترقی پسند شعرا کے یہاں بھی دیکھنے میں ملتا ہے۔ انجمنِ پنجاب و اولین دور کے نظم نگاروں نے رومانوی اور ترقی پسند شعرا پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس لیے ان تینوں تحریکوں اور ادوار میں اشتراکات کڑی سے کڑی ملا تے دکھائی دیتے ہیں۔ حالی،آزاد اور نظم جدید کی اس تحریک کے دوسرے شعرا قدیم اسلوب اور طرز احساس سے اپنادامن نہ بچا سکے،ان نظم نگاروں نے کہیں کہیں شعور ی طور پر اس قدیم شاعری سے بچاؤ کی سعی کی ہے۔آزاد ،حالی اور ان کے معاصرین کی نظموں میں قومیت، وطنیت کے جذبے ،فطرت کے علاوہ اخلاقی اور اصلاحی مضامین کا بیان تو ہے لیکن ان سب پر مقصدی اور نصابی ضرورت کی چھاپ نظر آتی ہے۔آزاد وحالی کے علاوہ بھی انجمن پنجاب کے مشاعروں میں پڑھی جانےو الی نظمیں ۱۸۵۷ء کے پیدا ہونے والے حالات اور تہذیبی وملی آشوب کی آئینہ دار ہیں۔ اس دور کی نظمیں ایک طرف فطرت اور موجودات کی عکاسی کرتی ہیں تو دوسری طرف ان میں تہذیب اور ملی آشوب کا تذکرہ ملتا ہے۔

رومانوی جدید اردو نظم کے فروغ میں شیخ عبدالقادر کے رسالہ’’مخزن‘‘ کا کردار قابل ستائش ہے کیوں کہ اس رسالے میں رومانوی انداز کی شاعری کو شایع کیا جاتا تھا۔’’مخزن ‘‘ کا اجرا ایک طرح سے سر سید کی ٹھوس مادیت اور جامد عقلیت کا رد عمل معلوم ہوتا ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں جب ہندوستانی ادیبوں کو انگریزی ادب پڑھنے کا موقع ملا تو اردو شعر وادب میں رومانوی انداز کو فروغ حاصل ہوا۔اس دور کے اردو نظم

نگاروں نے غزل کی روایتی کلاسیکیت کا غلبہ ختم کر کے شاعری میں رومانوی طرز احساس پیدا کیا ۔حالی نظم جدید کے بانی تو ہیں لیکن رومانی طرز احساس کا سرخیل اقبال ہے۔ رومانوی دور کے اولین نظم نگاروں میں اقبال سرفہرست دکھائی دیتے ہیں۔ رومانیت کے جس زاویے کی ترویج اقبال نے کی تھی اس کے واضح اثرات جدید اردو نظم پر مرتب ہوئے ۔رومانوی تحریک سے وابستہ شعرا کے کلام میں موضوعاتی وہیئتی اشتراکات نمایاں نظر آتے ہیں۔ ایک عہد اور ایک سماج سے تعلق ہونے کی بنا پر تمام شعرا میں یکسانیت اور تکرار کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ شعرا کے یکساں رویوں کا ادراک بھی ان کی نظموں سے لگایا جا سکتا ہے۔ رومانوی دور کے شعرا نے اولین دور کے شعرا سے بھی اثر ات قبول کیے اور انگریزی شعرا کی تقلید میں بھی نظمیں لکھیں۔اس دور کے شعرا میں زیادہ تر فطرت ،حب وطن،سیاسی وسماجی شعور ،ماضی پرستی،قوم پرستی اور حسن وعشق کے موضوعات میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ ہیئتی اعتبار سے اس تحریک سے وابستہ شعرا نے پابند،معرا اورآزاد ہیئت میں اپنی تخلیقات پیش کیں۔ انھوں نے مثنوی ،مسدس،مخمس،مثلث ،غزل مسلسل ،ترجیح بند ،ترکیب بند،قطعات اور دیگر سانچوں میں اپنی نظموں کو ڈھالا ہے۔

اقبال سے لے کر اختر انصاری تک رومانوی تحریک سے وابستہ شعرا ہر دواعتبار سے گہری مماثلت اور اشتراک پایا جاتا ہے۔بیسویں صدی کے شعرو ادب میں جب بھی کوئی نیا رجحان پیدا ہوا تو فطرت نگاری معنی خیز انداز میں نظر آئی۔ علی گڑھ تحریک اور نجمن پنجاب کے حصار سے نکل کر جب جدید اردو نظم رومانوی رجحان میں داخل ہوئی تو فطرت نگاری اور منظر کشی بھی اس کے دامن گیر رہی۔ رومانوی شعرا نے سیاسی ہنگامہ آرائیوں سمیت زندگی کے ہر پہلو کو شعری پیکر عطا کیا۔ اس دور کے شعرا نے زمانے کے واضح رجحانات اور عصری میلانات کو نظر انداز نہ کیا ۔جدید اردو نظم ۱۹۳۵ء کے بعد ترقی پسند تحریک کی صورت میں نمودار ہوئی۔ اس سے قبل کے شعرا میں بھی اشتراکی رجحانات پائے جاتے ہیں مگر ترقی پسند تحریک کے زیر اثر لکھنے والے شعرا نے شعروادب میں زندگی کی جدلیاتی اور مادی حرکت کو موضوع بنایا۔ شعرا نے اپنے افکار وخیالات میں خارجی عناصر کو شامل کیا اور معاشرتی واقعات وحالات پر قلم اٹھایا۔ترقی پسند نظریات کے حامل شعرا نے شاعری کا رشتہ بنی نوع انسان سے جوڑنے کو اپنا نصب العین بنایا۔ انھوں نے شاعری کو ایک آلۂ کار کے طور پر استعمال کر کے طبقاتی ،سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام کے خاتمے کی کوششیں کیں اور ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل پر زور دیا۔

ترقی پسند نظم گو شعرا نے شاعری میں نئے موضوعات شامل کیے اور مقصدیت،افادیت،خارجیت،واقعیت،صداقت اور حقیقت پسندی کی ایک مضبوط اور نئی روایت کا آغاز کیا جو بعد میں آنے والے شعرا کے لیے مشعلِ راہ بنی۔ ان شعرا نے موضوع اور مضامین کو ہیئت ،اسلوب اور فن پر فوقیت دی۔انھوں نے مقصدی اور شعوری عمل کے دوران کئی جگہوں پر شاعری کی جمالیاتی اقدار کو بھی نظر انداز کردیا۔ ترقی پسند قبیل کے شعرا نے اس اعتبار سے شاعری کو خطابت ،صحافت اور پروپیگنڈا کے قریب تر کھڑا کر دیا ۔انھوں نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے نظم کے ہیئتی نظام ،مروجہ خیالات اور جذبات کو کافی حد

تک تبدیل کر دیا اور نظم میں اشارے وکنائے ،صنائع بدائع ،اصطلاحیں اور رموز وعلائم بھی نئے وضع کیے۔اس دور کے متعدد شعرا میں رومانی ترقی پسند فکر کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ ان شعرا کے یہاں موضوع،ہیئت ،اسلوب،افادیت اور خارجیت میں جمالیات کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ غالب کے تفکر اور اقبال کے فلسفہ نے ترقی پسند نظم نگاروں کی عشقیہ حقیقت نگاری کو رومان اور انقلاب کا حسین امتزاج بنا دیا۔

ترقی پسند شعرا نے ان مروجہ ہیئتوں اور اظہاروبیان کے مروجہ اسلوب کو غیر ضروری سمجھا اور شاعری کی اس قدیم روایت دے بغاوت پر اتر آئے ۔جس کے نتیجے میں زبان وبیان ،طرز ادا،اسلوب اور نئی ہیئتوں کے تجربات ہوئے۔ اس کام کے لیے بعض شعرا نے انگریزی اصنافِ شاعری کو بھی اپنایا۔ بعض نے انگریزی کے تراجم ہندی کے مترنم الفاظ اور بحروں کو مستعار لے کر عشقیہ حقیقت نگاری اور واقعہ نگاری کی روایت قائم کی ۔ترقی پسند تحریک کا اثر جدید نظم پر یہ ہوا کہ پہلی مرتبہ شعوری طور پر آزاد اور نظم معرا کا آغاز ہوا اگرچہ میراجی،راشد اور خالد سے پہلے شرر اور اسماعیل میرٹھی ان ہیئتوں کی ابتدا کر چکے تھے مگر ان ہیئتوں کو قبولیت عطا کرنے،انھیں فروغ دینے اور اس تجربے کو کامیاب بنانے میں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر نظم نگاروں کا کردار اہم ہے۔ یہ شعرا اگر نئے موضوعات کو نظم کے فرسودہ ومروجہ سانچوں میں ڈھالتے تو شاید اس قدر کامیابی حاصل نہ ہوتی۔انھوں نے اپنے فکر وفلسفہ کی بنیاد اشتراکی اصول ونظریہ پر رکھی۔ انقلاب روس کے بعد ہندوستان میں بھی اشتراکی اصولوں کو فروغ ملا ۔بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں ہندوستان کے شعرا نے مزدوروں اور کسانوں کو بیدار کیا اور انھیں مضبوط کیا تا کہ وہ استحصالی اور سامراجی طاقتوں سے نبرد آزما ہو سکیں۔

ترقی پسند تحریک موضوع اور ہیئت دونوں میں تبدیلی کے ساتھ واقع ہوئی کیوں کہ ترقی پسند تحریک سے جڑے ہوئے نظم نگاروں نے سماجی زندگی کی کیفیات اور واردات کو نئی ہیئت ،نیا اسلوب اور نیا آہنگ دیتے ہوئے ترتیب وتوازن کا خاص خیال رکھا۔اس تحریک کے اچھے اور اہم شعرا نے نظموں کی تخلیق میں جمالیاتی اقدار کا لحاظ بھی رکھا ۔جب رومانوی رجحان ترقی پسند فکر کے ہاتھوں زائل ہوا تو بھی فطرت نگاری معنی خیز علامتوں اور متاثر کن عنصر کے طور پر ہمراہ رہی۔ ۱۹۳۰ء کے بعد جدید اردو نظم میں سرسبز کھیتوں میں "درانتی" چمک دمک کے ساتھ دکھائی دیتی ہے۔ ترقی پسند شعرا نے کسان کی محنت ومزدوری کی مشقت کو ترقی وخوشحالی کا نشان فطری انداز میں پیش کیا۔یہ شعرا ماضی پرستی،وطن و قوم پرستی کے محدود تصور سے نکل کر حقیقت شناسی اور کائنات کی وسعتوں میں کھو گئے ۔۱۹۳۰ء سے ۱۹۳٦ء تک جہاں جدید اردو نظم نئے ہیئتی تجربوں سے آشنا ہوئی وہاں نئے موضوعات اور فطرت کے جھونپڑوں میں داخل ہوئی۔ترقی پسندوں نے اشارے ،کنائے میں فطرت کی منظر کشی کی۔ترقی پسند فکر سے قبل روحانی اور جمالیاتی طرز احساس رکھنے والے صرف مناظر فطرت میں ''حسن'' اور پراسراریت کو نمایاں کرنا ہی فطرت نگاری خیال کرتے رہے۔ ترقی پسند رجحان کے حامیوں نے فطرت نگاری کا تصور بھی نیا پیش کیا ۔ترقی پسند شعرا نے ظلم و ناانصافی ،جنگ وتباہ کاری اور مایوسی وناامیدی

کے لیے"رات" کے مناظر سے فطرت نگاری کی اور امید وخوشحالی اور امن وترقی کے لیے''صبح''کے مناظر پیش کیے۔

رومانوی شعرا نے عورت اور مظاہر قدرت کو حسن قرار دیا۔ جب کہ ترقی پسندوں نے عورت ہو یا قدرت کے مظاہر سب کے حسن کا استحصال ہوتا ہوا دکھایا۔ انھوں نے انسان کو انسان ہی بیان کیا فرشتہ یا کوئی ماورائی مخلوق بنا کر پیش نہ کیا۔انھوں نے عورت کے حسن کو ماورائی اور ناقابل حصول اور اس کے سراپا کو بیان کرنے کے بجائے اس کو عام انسان یاشریک زندگی اور دکھ سکھ کا ساتھی قرار دیا۔انھوں نے عورت کو بھی زندگی کے خوشگوار اور خوب صورت شرکا میں شمار کیا۔ترقی پسند تحریک کے زیر اثر جب موضوعات اور سوچ کے دھارے بدلے تو فطرت نگاری کے زاویے بھی واضح تبدیل ہوگئے۔ انھوں نے تشبیہات واستعارات سے فطرت نگاری میں جدت پیدا کی۔ترقی پسندوں نے حقیقت نگاری کے فن کے تقاضے پورے کیے،انھوں نے مظاہر فطرت کی مصوری کرتے ہوئے زندگی کے دونوں رخ پیش کیے۔ جدید اردو نظم کے اولین علم برداروں اور رومانوی دور کے شعرا کی طرح ترقی پسند فکرونظر یہ کے حامل شعرا بھی متعدد موضوعاتی اشتراکات ،یکسانیت اور تکرار پائی جاتی ہے۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ تمام شعرا میں ہیئت اور صنف کا اشتراک پایا جاتا ہے۔

ترقی پسند شعرا نے جہاں پابند نظم ،معرا اور آزاد نظم کی ہیئتیں استعمال کیں وہاں انھوں نے حقیقت کو فن کے پردوں چھپا کر استعاروں،کنایوں،پیکروں،تمثیل اور علامات میں بیان کیا ہے۔ ترقی پسند شعرا نے رومانی طرز احساس کو غیر روایتی طریقے سے اپنا کر اپنی نظمیں تخلیق کی ہیں۔ ترقی پسندوں نے رومانیت اور جمالیات کے عناصر کوفروغ دیتے ہوئے بھی حقوقِ انسانیت اور حریت وآزادی کا منصوبہ بند تجربہ کیا ۔حقوق انسانیت،حریت وآزادی ،خودمختاری اور آزادانہ فضا میں سانس لینے کا جو خواب رومانیت پسندوں نے دیکھا اسے آئندہ کی ہر تحریک نے تعبیر کرنے کی کوشش کی۔ترقی پسند تحریک اور رومانیت کے اس خوب صورت اشتراک سے لگتا ہے یہ دونوں نظریاتی تحریکیں الگ الگ فکر رکھنے کے باوجود ایک دوسرے سے متاثر نظر آتی ہیں۔

حلقہ اربا بِ ذوق کے جدید اردو نظم نگاروں کے یہاں متعدد موضوعاتی وہیئتی اشتراکات دکھائی دیتے ہیں۔ حلقےسے وابستہ شعرا کی شاعری میں یکسانیت اور تکرار کا عنصر نمایاں ہے۔ حلقہ ارباب ذوق کی تحریک نے رومانوی تحریک کے بیشتر اثرات کو قبول کیا ،داخلیت اور خارجیت ،مادیت اور روحانیت کے بنا پر حلقہ ارباب ذوق اور ترقی پسند تحریک میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ترقی پسند تحریک نے مادی وسائل کو بیان کیا جب کہ حلقے سے وابستہ شعرا نے زیادہ تر روحانی اور داخلی کیفیات کی ترجمانی کی۔ حلقے نے ترقی پسند تحریک کی مقصدیت اور موضوعاتی یکسانیت کو رد کر کے تنوع پیدا کرنے کی سعی کی۔حلقہ ارباب ذو ق کے شعرا موضوعات کے انتخاب میں آزاد تھے ۔ان کے عام رجحان فرد کے داخلی احساسات اور تاثرات کو پیش کرنا تھا۔انھوں نے فنکار کے ذاتی تجربے،احساسات اور مشاہدات

کو بیان کرنے کو ہی مناسب سمجھا ۔حلقے کے شعرا اظہار کی آزادی کے قائل نظر آتے ہیں ،وہ کسی خاص منشور ،نظریے اور نظام کی بات نہیں کرتے وہ شخص کی آزادانہ تعمیر چاہتے ہیں۔ حلقہ سے جڑے شعرا کا کوئی با ضابطہ منشور نہیں تھا ،اس لیے ان میں انتشار بھی رہا،حلقہ سے وابستہ ہر شاعر نے اپنی اپنی ڈفلی بجائی مگر پھر بھی متعدد پہلوؤں میں یکسانیت اور تکرار کی صورت قائم رہی۔ حلقہ کے شعرا ہر اعتبار سے کہیں نہ کہیں ایک دوسرے سے مماثل ہوتے ہیں مگر ان کے ڈکشن اور انداز میں واضح فرق دکھائی دیتا ہے۔

حلقہ ارباب ذوق کے شعرا نے روایت کو اہمیت دی انھوں نے قدما سے قوت کا خزینہ حاصل کیااور ایک جہت ماضی کی طرف رکھی، ان کی تخلیقات میں ماضی کے روشن نقوش اپنی جھلکیاں دکھاتے ہیں۔حلقہ کے شعرا نے دوسری جہت مستقبل کی طرف رکھی اور عہد بہ عہد نئی نسل کی طرف قدم بڑھایا۔حلقہ کی نظمیہ شاعری نیم کلاسیکی اور نیم رومانی ہے،اس میں سیاسی ،سماجی شعور اور مختلف نظریات سما گئے ہیں۔ حلقہ کی شاعری موضوع اور ہیئت دونوں اعتبار سے اشتراک کی کیفیت میں ڈوبی ہوئی ہے۔

غیر تحریکی شعرا بھی نئے مسائل اور نئے تقاضوں کے ساتھ سامنے آئے۔یہ شعرا رومانوی تحریک اور ترقی پسند تحریک کی درمیانی کڑی ہیں۔ان شعرا میں رومانوی،ترقی پسند اور حلقہ کی تحریکوں کے اثرات ہونے کی وجہ سے تینوں رجحانات کی جھلک نظر آتی ہے۔ان شعرا نے نئے موضوعات کےا ظہار کے لیے نئی ہیئتوں کو وسیلہ بنایا ۔ان شعرا نے جذبات واحساسات اور تمناؤں کے اظہار کے ساتھ ساتھ عقل وشعور سے تلخ سچائیوں اور عہد کے کڑے لمحوں کی عکاسی کرتے ہوئے تہذیبی وتمدنی اقدار کی شکست و ریخت کا احساس بھی دلایا ہے۔ ان غیر تحریکی شعرا کے یہاں حلقہ ارباب ذوق اور ترقی پسند شعرا سے مماثلتیں بھی ہیں اور متفرق موضوعات کے صد رنگ تجربے ملتے ہیں۔ ان شعرا نے جدید اردو نظم کو مخصوص موضوعات اور اسالیب کے دائرے سے نکال کر وسعت عطا کی۔

ستر کی دہائی کی نظم اقبال کے سطحی اثرات،تصدق حسین خالد ،میراجی اور ن م راشد کے فکری دھاروں اور اسالیب کو ایک دوسرے میں ضم کر کے ایک نیا لہجہ اور ایک نیاا ٓہنگ تشکیل دینے میں کام یاب ہوگئی۔اقبال سے مجید امجد اور اخترالایمان تک کے نظم نگاروں نے جن امکانا ت کو کھنگالا اس کے اثرات ہمیں ستر کے دہے کےنظم نگاروں پر ملتے ہیں لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ ستر کے بعد کے نظم نگاروں نے اندھی تقلید کرنے کے بجائے اپنے اپنے مزاج کے مطابق ماضی کی بازگشت کے ساتھ ساتھ گذشتہ پچاس سالوں میں پاکستان اور ہندوستان میں آمریت اور جمہوریت کے تسلسل کو بیان کیا ہے۔ پاکستان میں فوجی حکومت ایک تسلسل کے ساتھ رہی ہے جس کی وجہ سے اظہار کی آزادی کم کم ملتی رہی اور پھر استعماری قوتوں نے یہاں شکنجا کسنا شروع کر دیا ،اس دور کے شعرا نے نہ صرف اس سماجی صورت حال کو محسوس کیا ہے بل کہ اپنی نظموں میں پیش کر دیا ہے۔ انھوں نے اپنے پیش رو شعرا سے سیکھتے ہوئے تمثال ،تشبیہ اور استعارے کا برمحل استعمال کیا ہے اور اسلوبیاتی سطحی مماثلتیں پیدا کرنے کے بجائے زیادہ گہرے اسلوبیاتی اور تہذیبی عوامل کو

اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ انھوں نے اپنے مزاج ،ذوق اور تخلیقی ذات کے مطابق حوادث زمانہ کے کے اثرات قبول کرتے ہوئے لگے بندھے موضوعات اور اسالیب کو دہراتے ہوئے الگ شناخت اور انفرادیت قائم کی ہے۔

معاصر جدید اردو نظم نگاروں(۱۹۷۰ء تا حال) نے مجموعی طور پر اپنی نظموں میں مظاہر فطرت،معاشی ومعاشرتی مسائل،ذات اور کائنات، وقت اور موت کے نفسیاتی افعال اور رد اعمال کو بیان کیا ہے۔انھوں نے نفسیاتی افعال،باطنی دباؤ ،گھٹن اور ناآسودگی سے شروع ہو کر کائنات کی وسعتوں کے سامنے انسانی زندگی کی بے حیثیتی اور سائنسی ترقی کی وجہ سے پھیلنے والی بے یقینی اور لایعنیت کی فضا کی عکاسی کی ہے۔ شعرا نے اپنے ذاتی احساس ،واردات ،خودشناسی میں ڈوب کر معاشرتی انتشار سے نئی ترتیب اور نظام زندگی تراشنے کی سعی کی ہے۔ انھوں نے کچھ قدیم اساطیری علامتوں کے ذریعے مرد اور عورت کے آپسی رشتے کو اپنی محسوسات کے دائرے میں شامل کیا ہے۔ متعدد شعرا نے مناظر فطرت کو عورت کے جسمانی اعضا میں مجسم کر کے بیان کیا ہے۔۱۹۷۰ء کے بعد کی شاعری میں فرد اور معاشرے کے انتشار ہم آمیز دکھائی دیتے ہیں۔ انسان کا باطنی کھوکھلا پن اور معاشرتی نمائشی زندگی کے خالی پن سے جڑ کر مضمحل انا کا حوالہ بن گیا ہے۔ آزاد نظم کا دائرہ وسیع کرتے ہوئے اس عہد کے شعرا نے اپنی ذات کی بازیافت کے ساتھ ساتھ اجتماعی آشوب اور خلفشاری کو بھی شاعری کا حصہ بنایا ہے ۔

جدید اردو نظم کی شاعرات کی شاعری میں خاص طور پر مماثلت نظر آتی ہے کیوں کہ عورتوں کے دکھ اور سکھ یکساں ہوتے ہیں۔عورتوں کے خواب اور عذاب بھی مشترک ہوتے ہیں۔ شاعرات کے یہاں تانیثیت کی رو اور روایت نمایاں انداز میں ملتی ہے۔ انھوں نے تانیثیت کو بیان کرتے ہوئے تحریک سے زیادہ رویے پر زور دیا ہے۔ اسی لیے بیشتر شاعرات کے یہاں معتدل اور متوان انداز فکر ملتا ہے۔ کچھ شاعرات کی شاعری میں مزاحمتی فضا بھی ملتی ہے اور ان کے لہجے میں مردانہ جرات وجسارت کی جھلک نظر آتی ہے۔ متعدد شاعرات نے اس طرح کا مزاحمتی اور احتجاجی رویہ اختیار نہیں کیا کہ مرد اور مردانہ معاشرے کا وجود منہدم ہو جائے۔ انھوں نے مرد اور عورت دونوں کے مسائل کو سنجیدگی سے بیان کیا ہے اور مردانہ معاشرے سے مکالمہ کرتے ہوئے زیادہ درشتی اور کرختگی اختیار نہیں کی۔عورت پر جو بیتی اور وہ جس نفسیاتی دباؤ کا شکار ہوئی ،وہ سب استعاراتی شکل میں جدید اردو نظم کی شاعرات نے اپنی تخلیقات میں پیش کر دیا۔شاعرات نے مرد اور عورت کے معاشرتی کرداروں ،ان کی کشمکش اور محبت کے رنگ نمایاں ہیں ۔بہت سی شاعرات نے عورت کی محرومیوں اور احساسات کی عکاسی کی ہے اور نسائی باطن کے نازک اور لطیف احساسات کو شعری پیکر عطا کیا ۔خواتین نظم نگاروں نے سماجی تعصبات ،محبت اور وفا کی خواہش،انا کی تعمیروشکستگی سے لے کر معاشرت رویوں اور رجحانات کو موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے عورت ذات کے ساتھ روا رکھے جانے والے منفی تفاوت اور منافقانہ رویے کو بھی بے نقاب کیا ہے۔

نثری نظم نگاروں نے اپنی نظموں میں عصری حالات کا تذکرہ کیا ہے۔ انھوں نے یکساں طور پر ہمارے معاشرے کے سیاسی،سماجی اور ثقافتی صورت حال کو شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے صنعتی ومشینی زندگی کی اس برق رفتاری کی تباہ کاریوں کا ذکر بھی کیا ہے اور داخلی کیفیات کا پیرائیہ اظہار میں عمدہ ہے۔ ان سب میں اپنے عصر کی مخصوص حسیّت کا عنصر مشترک ہے۔ ان کے یہاں جنس کے جدید نفسیاتی تصور بھی ملتے ہیں۔ کچھ شاعر مناظر فطرت کو عورت کے جسمانی اعضا میں مجسم کرکے دکھاتے ہیں اور کچھ جنس کے نئے پیچیدہ پہلوؤں کو زندگی میں ضم کرتے ہیں۔ تمام نثری نظم نگاروں نے فرد اور معاشرے کا انتشار باہم شیروشکر کر کے پیش کیا ہے۔ شاعرات نے اپنے داخلی خوف ،منفی تعصبات،محبت،وفا کی خواہش اور دیگر معاشرتی رویوں کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے عورت کے ساتھ روا رکھے جانے والے امتیازی سلوک ،منفی تفاوت اور منافقانہ رویے کی مذمت کی ہے۔ انھوں نے انسان کی دوچہرگی،بے حسی اور خالی پن کو مختلف علامتوں سے بیان کیا ہے۔ ان سب کے یہاں ذات کی نفسیاتی الجھنوں کا کتھارسس ملتا ہے۔

جدید اردو نظم کے اولین اور انجمن پنجاب کے شعرا، رومانوی تحریک،ترقی پسند تحریک،حلقہ ارباب ذوق ،معاصر شعرا اور شاعرات اور نثری نظم نگاروں کے یہاں موضوع اور ہیئت کی سطح پر مماثلت اور یکسانیت پائی جاتی ہے۔ ایک عہد اور تحریک سے وابستگی کی وجہ سے ان کی سوچ کے دھارے بھی ملتے ہیں۔ متعدد نظم نگاروں نے اپنے پیش رو اور معاصر شعرا کا اثر قبول بھی کیا اور اپنے پس رو اور معاصر شعرا کو متاثر بھی کیا۔ جب کسی ایک شاعر کے موضوع اور اسلوب کو مقبولیت ملی تو معاصر شعرا نے بھی مقبولیت حاصل کرنے کے لیے اس کے موضوعات کی جگالی شروع کر دی جس سے ایک عہد کی نظم یکسانیت اور مماثلت کا شکار ہو گئی۔اگر کسی کی طویل نظم کو شہرت ملی تو متعدد شعرا نے اسے دیکھتے ہوئے طویل نظمیں تخلیق کیں۔ اسی سبب جدید اردو نظم میں موضوعاتی وہیئتی اشتراکات کا در وا ہوا۔

کتابیات

(الف) شعری مجموعے /کلیات

* ابنِ انشا۔اس بستی کے اک کوچے میں۔لاہور:اکیڈمی ،لاہور،۲۰۰۲ء۔

* ابنِ انشا۔چاند نگر۔لاہور:لاہوراکیڈمی، ۱۹۸۱ء۔

* ابنِ انشا۔چین نظمیں۔لاہور:لاہوراکیڈمی ،۱۹۶۰ء۔

* ابنِ انشا۔دل وحشی۔لاہور:لاہوراکیڈمی ،۱۹۸۵ء۔

* احسان ،محسن ۔ ناتمام۔ پشاور:ادارۂ علم و فن، ۱۹۸۱ء۔

* احمد،ابرار۔آخری دن سے پہلے۔لاہور: گورا پبلشرز،۱۹۹۷ء۔

* احمد،خالد ۔مٹھی بھر ہوا۔لاہور:الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء۔

* احمد،خالد ۔ ہتھیلیوں پر چراغ۔لاہور:پاکستان بکس، ۱۹۹۵ء۔

* احمد ،شہزاد۔اترے مری خاک پر ستارا۔لاہور:الحمد پبلی کیشنز،۱۹۹۷ء۔

* احمد ،شہزاد۔ٹوٹا ہوا پل۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۳ء۔

* احمد،شہزاد۔ خالی آسمان۔ لاہور: مطبوعات،۱۹۸۵ء۔

* احمد ،شہزاد۔ صدف۔ لاہور: نیاادارہ،س ن۔

* احمد،شہزاد ۔ بکھر جانے کی رُت۔لاہور: مطبوعات، ۱۹۸۵ء۔

* احمد،شہزاد ۔ جلتی بجھتی آنکھیں۔لاہور: مکتبۂ کارواں،۱۹۷۱ء۔

* احمد،شہزاد ۔ ادھ کھلا دریچہ۔لاہور: علی برادرز،۱۹۷۷ء۔

* احمد،شہزاد۔کون اسے جاتا دیکھے۔لاہور:الحمد پبلی کیشنز،۱۹۹۸ء۔

* احمد،شہزاد۔آنے والا کل۔ لاہور: ملٹی میڈیا افیئرز،۲۰۰۵ء۔

* اخترالایمان۔آب جو۔لاہور:نیا ادارہ، ۱۹۵۹ء۔

* اخترالایمان۔تاریک ستارہ۔ لاہور: نیاادارہ،۱۹۴۶ء۔

* اخترالایمان۔سب رنگ۔ بمبئی: کتب پبلشرز، ۱۹۴۸ء۔

* اخترالایمان۔گرداب۔ دہلی: ساقی بک ڈپو، ۱۹۴۳ء۔

* اخترالایمان۔ نیا آہنگ۔ بمبئی: رخشندہ کتاب گھر، ۱۹۷۷ء۔

* اخترالایمان۔یادیں۔ بمبئی:رخشندہ کتاب گھر، ۱۹۷۷ء۔

* اخترالایمان۔کلیات اخترالایمان۔مرتبہ،سلطانہ ایمان اور بیدار بخت،کراچی: آج ،۲۰۰۰ء،۲۰۱۴ء۔

* اختر،جاں نثار ۔کلیاتِ جا ں نثار اختر۔ لاہور: الحمد پبلی کیشنز،۲۰۰۳ء۔

* اختر،وحید۔پتھروں کا مغنی۔علی گڑھ: اردو کتاب گھر،۱۹۶۶ء۔

* اختر،وحید۔زنجیر کا نغمہ۔علی گڑھ:زرافشاں،۱۹۸۱ء۔

* اختر،وحید۔شب کا رزمیہ۔حیدر آباد: مکتبہ شعرو ادب،۱۹۷۳ء۔

* ارمان،سرور ۔ وہی آبلے مرے پاؤ ں کے۔ لاہور: کانٹی نینٹل سٹار پبلشرز،س ن

* ارمان،سرور ۔زنجیر بولتی ہے ۔لاہور: کانٹی نینٹل سٹار پبلشرز، بار سوم ۲۰۱۳ء۔

* اسمٰعیل میرٹھی۔ کلیاتِ اسمٰعیل۔لاہور :مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۰ء۔

* اطہر عباس۔آواز دے کے دیکھ لو۔لاہور: وقاس پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء۔

* اعظمی ،خلیل الرحمن۔نیا عہد نامہ۔علی گڑھ: انڈین بک ہاؤس،۱۹۶۵ء۔

* اعظمی ،خلیل الرحمن۔آئینہ خانے میں(طویل نظم)۔علی گڑھ: آرٹ اکیڈمی،۱۹۵۰ء۔

* اعظمی،خلیل الرحمن۔کاغذی پیرہن۔دہلی: آزاد کتاب گھر،۱۹۵۵ء۔

* اعظمی،خلیل الرحمن۔ آسماں اے آسماں(کلیات)۔ علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس،۲۰۰۰ء۔

* اعظمی ،خلیل الرحمن۔ زندگی اے زندگی۔لکھنو: اتر پردیش اردو اکادمی،۱۹۸۳ء۔

* اعظمی،کیفی۔ آخر شب۔ بمبئی: کتاب پبلشرز، ۱۹۴۷ء۔

* اعظمی ،کیفی۔کیفیات۔دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،اشاعت اول۲۰۰۳ء،دوم،۲۰۱۲ء،سوم۲۰۱۷ء۔

* افتخار جالب۔ماخذ۔لاہور:مکتبہ ادب جدید،سن ندارد۔

* افسر ،حامد اللہ،میرٹھی۔پیام روح

* افسر ،حامد اللہ،میرٹھی۔جوئے رواں

* اکبرآبادی،سیماب۔کارِ امروز۔آگرہ:مکتبۂ قصرالادب،۱۹۴۷ء۔

* امجد،امجد اسلام۔ساتواں در۔لاہور: ماورا پبلشرز،۱۹۷۸ء۔

* امجد،امجد اسلام۔فشار۔لاہور: ماورا پبلشرز،۱۹۸۴ء۔

* امجد،امجد اسلام۔خزاں کے آخری دن۔لاہور: ماورا پبلشرز،۱۹۹۱ء۔

* امجد،امجد اسلام۔برزخ۔لاہور: التحریر،۱۹۹۶ء۔

* امجد،مجید۔ کلیاتِ مجید امجد۔مرتبہ ،خواجہ محمد زکریا ، لاہور: ماورا پبلشرز، ۱۹۹۸ء۔

* امجد،مجید۔مرگ صدا۔ ملتان: کارواں ادب،۱۹۸۳ء۔

* انصاری،اختر۔آبگینے۔لاہور: مکتبہ اردو،سن ندارد۔

* انصاری،اختر۔روحِ عصر۔لاہور: ایم ثنا،۱۹۴۴ء۔

* انصاری،اختر۔شعلہ بجام۔علی گڑھ: ادارئہ شعر وادب،۱۹۶۸ء۔

* انصاری،اختر۔نغمۂ روح۔دہلی: مطبوعہ پرنٹنگ ورکس،۱۹۳۲ء۔

* انصاری،اختر۔خندئہ سحر۔دہلی: مکتبہ جہاں نما،۱۹۴۴ء۔

* انور،جاوید۔اشکوں میں دھنک۔لاہور: الحمد پبلی کیشنز،۱۹۹۴ء۔

* انور،جاوید۔بھیڑیے سوئے نہیں۔لاہور: قوسین،۲۰۰۹ء۔

* ایلیا،جون ۔ شاید۔لاہور: الرزاق پبلی کیشنز، بار اول ۱۹۹۰ء۔

* ایلیا،جون۔لیکن۔لاہور: الحمد پبلی کیشنز،بار چہارم۲۰۱۴ء۔

* آزاد،محمد حسین۔نظم آزاد(مرتبہ)تبسم کاشمیری۔لاہور:مکتبہ عالیہ ،۱۹۷۸ء۔

* آغا،وزیر ۔چہک اُٹھی لفظوں کی چھاگل(کلیات)۔لاہور:ماورا پبلشرز، ۱۹۹۲ء۔

* آزاد،محمد حسین۔کلیات نظمِ آزاد۔مرتبہ،ہارون قادر،لاہور:الوقار پبلی کیشنز،۲۰۱۰ء۔

* آنند،ستیہ پال ۔میری منتخب نظمیں۔دہلی: پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزر،۲۰۰۹ء۔

* آنند ،ستیہ پال ۔ستیہ پال آنند کی ساٹھ منتخب نظمیں۔انتخاب،فاطمہ حسن،کراچی: شہر زاد پبلشرز،۲۰۱۵ء۔

* پاشی،کمار۔خواب تماشا۔دہلی: نازش بک سنٹر،۱۹۶۸ء۔

* پاشی،کمار۔پرانے موسموں کی آواز۔دہلی: نازش بک سنٹر،۱۹۶۶ء۔

* پروین ،عذرا۔ بارہ قباؤں کی سہیلی۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۰ء۔

* پروین فناسید۔حرف وفا۔لاہور: مکتبہ فنون،۱۹۷۴ء۔

* تاثیر،محمد دین،ڈاکٹر۔آتش کدہ۔لاہور: مکتبۂ نوائے وقت،س ن۔

* ثروت حسین۔آدھے سیارے پر۔لاہور: قوسین،۱۹۸۷ء۔

* ثروت ،نور جہاں۔ بے نام شجر۔ نئی دہلی: عزیز پرنٹنگ پریس، ۱۹۹۵ء۔

* ثمینہ راجہ۔ کتابِ جاں (کلیات)۔ لاہور: خزینہ علم وادب، ۲۰۰۵ء۔

* جالب،حبیب ۔کلیاتِ حبیب جالب۔لاہور:ماورا پبلشرز، ۱۹۹۳ء۔

* جالب،حبیب۔برگ آوارہ۔ لاہور: مکتبہ کارواں،س ن۔

* جالب،حبیب۔حرف حق۔کراچی:مکتبہ دانیال،۱۹۸۳ء۔

* جالب،حبیب۔حرف سردار۔ لاہور: وینگوارڈ بکس لمیٹڈ،۱۹۸۷ء۔

* جذبی،معین احسن۔فروزاں۔لاہور: ادارہ آئینہ ادب،۱۹۶۰ء۔

* جذبی،معین احسن۔سخن مختصر۔علی گڑھ:انجمن ترقی اردو،۱۹۶۰ء۔

* جذبی،معین احسن۔گداز شب۔نئی دہلی:مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ،۱۹۵۸ء۔

* جعفری،اختر حسین ۔ آئینہ خانہ۔لاہور: التحریر، ۱۹۸۱ء۔

* جعفری،اختر حسین۔جہاں دریا اترتا ہے۔لاہور:فردا پبلشنگ ہاؤس،۱۹۹۳ء۔

* جعفری،ادا ۔ میں ساز ڈھونڈتی رہی۔ لاہور:نیا ادارہ، ۱۹۴۷ء۔

* جعفری،ادا۔غزالاں تم تو وقف ہو۔لاہور:مکتبہ فنون،۱۹۷۴ء۔

* جعفری،ادا۔شہر درد۔کراچی:گلڈ اشاعت،۱۹۶۷ء۔

* جعفری،ادا۔ساز سخن بہانہ کروں۔ لاہور:غالب پبلشرز،۱۹۸۲ء۔

* جعفری،علی سردار۔ کلیات علی سردار جعفری جلد اول۔نئی دہلی:قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان،جولائی ،ستمبر۲۰۰۴ء۔

* جعفری،علی سردار۔ کلیات علی سردار جعفری جلد دوم۔نئی دہلی:قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان،جولائی ،ستمبر۲۰۰۵ء۔

* جوش ،ملیح آبادی۔ حرف و حکایات۔دہلی: مکتب خانہ رشیدیہ،سن ن۔

* جوش ،ملیح آبادی۔ شعلہ و شبنم۔ لاہور: مکتبہ اردو،۱۹۴۳ء۔

* جوش ،ملیح آبادی۔ فکرونشاط دہلی: مکتبہ جامعہ،۱۹۳۷ء۔

* جوش ،ملیح آبادی۔ نقش ونگار۔دہلی: مکتبہ جامعہ،۱۹۳۶ء۔

* جوش ،ملیح آبادی۔ آیات و نغمات۔لاہور:شیخ نذیر احمد بھٹی،س ن۔

* جوش ،ملیح آبادی۔ جنون وحکمت۔دہلی:کلیم بک ڈپو،۱۹۳۷ء۔

* جوش ،ملیح آبادی۔ روح ادب۔بمبئی:شیخ نذیر احمد مالک کتب خانہ،۱۹۶۰ء۔

* جوش ،ملیح آبادی۔ الہام و افکار۔کراچی: جوش اکیڈمی،۱۹۶۶ء۔

* جوش ،ملیح آبادی۔نجوم وجواہر۔ کراچی: جوش اکیڈمی،۱۹۶۷ء۔

* جوش ملیح آبادی۔سیف و سبو۔لاہور:نیا ادارہ،س ن۔

* جوش ملیح آبادی۔محراب و مضراب۔لاہور:نیا ادارہ،س ن۔

* چکبست۔کلیاتِ چکبست۔بمبئی:ساکار پبلشرز،۱۹۸۱ء۔

* حالی،الطاف حسین ،خواجہ۔مسدس حالی۔ لاہور: ٹیکنیکل پبلشرز، ۱۹۹۳ء۔

* حالی،الطاف حسین۔دیوان حالی۔لاہور: مجلس ترقی ادب،۱۹۶۲ء۔

* حالی،الطاف حسین۔کلیات نظم حالی۔لاہور: مجلس ترقی ادب،۱۹۷۰ء۔

* حسن،فاطمہ ۔یاد کی بارشیں۔ لاہور:روش پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء۔

* ۱حسن ،ممتاز،مقدمہ۔کلیات نادر کاکوروی:جذباتِ نادر۔کراچی:اردو اکیڈمی سندھ،۱۹۶۱ء۔

* حفیظ،جالندھری۔تلخابۂ شیریں،لاہور: مجلس اردو،۱۹۴۶ء۔

* حفیظ،جالندھری۔نغمۂ زار۔لاہور:القرآن ،۱۹۴۷ء۔

* حفیظ،جالندھری۔کلیات(تحقیق وترتیب خواجہ محمد زکریا)۔لاہور:الحمد پبلی کیشنز،۲۰۰۵ء۔

* حنفی،عمیق۔سند باد۔

* حنفی،عمیق۔شب گشت۔الہ آباد: شب خون،۱۹۶۹ء۔

* خالد ،تصدق حسین ۔لا مکاں تا لامکاں ۔کراچی:مکتبۂ نصرت، ۱۹۷۶ء۔

* خالد،تصدق حسین۔سرود نو۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۰ء۔

* خالد،عبدالعزیز۔برگ خزاں۔ کراچی: مطبوعات مشرق،۱۹۶۲ء۔

* خالد ،عبدالعزیز۔پرواز عقاب۔ لاہور: آئینہ ادب، ۱۹۷۳ء۔

* خالد،عبدالعزیز۔ سلومی۔ لاہور:شیخ غلام علی سنز،۱۹۷۳ء۔

* دانش،احسان۔زنجیر بہاراں۔لاہور:خزینہ علم وادب،۲۰۰۰ء۔

* دانش،احسان ۔نوائے کارگر۔لاہور: مکتبہ دانش،۱۹۶۲ء۔

* دانش،احسان۔جادہ نو۔ لاہور: مکتبہ دانش،س ن۔

* دانش۔احسان۔فصل سلاسل۔لاہور:دانش آباد،۱۹۸۰ء۔

* دانش،احسان۔نفیر فطرت۔لاہور:مکتبۂ دانش،س ن۔

* راشد،ن۔ م۔ کلیاتِ راشد۔ لاہور،:ماورا پبلشرز، ۱۹۸۸ء۔

* راشد،ن،م۔گماں کا ممکن۔ لاہور: نیاادارہ،س ن۔

* راشد،ن،م۔لاانسان،لاہور: المثال،۱۹۶۸ء۔

* راشد،ن،م۔یراں میں اجنبی۔ لاہور: کوثر ادب،۱۹۵۷ء۔

* رضوی ،زبیر۔ مسافتِ شب۔ نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند،۱۹۷۷ء۔

* رضوی ،زبیر۔پورے قد کا آئینہ(کلیات)۔دہلی: ذہن جدید ،۲۰۰۴ء۔

* ریاض ،ترنم۔ پرانی کتابوں کی خوشبو۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ، ۲۰۰۵ء۔

* ریاض،فہمیدہ۔بدن دریدہ۔ کراچی:مکتبۂ دانیال،۱۹۷۴ء۔

* ریاض،فہمیدہ۔پتھر کی زبان۔لاہور:کتاب نما،۱۹۶۷ء۔

* زاہد ڈار۔محبت اور مایوسی کی نظمیں۔لاہور: اظہار سنز،۱۹۸۲ء۔

* زاہد ڈار۔شام کا پہلا تارا۔لاہور: اساطیر،۱۹۹۸ء۔

* زاہد ڈار۔درد کا شہر۔لاہور: نئی مطبوعات،۱۹۶۵ء۔

* زمان،فخر۔راستے کی دھول۔لاہور: ادارۂ اشاعتِ ادب،۱۹۷۸ء۔
* زہرا نگاہ۔ورق۔لاہور:اساطیر،اشاعت دوم،۲۰۰۶ء۔
* زہرا نگاہ۔شام کا پہلا تارانئی دہلی: مکتبۂ جامعہ، ۱۹۸۰ء۔
* زیدی،زاہدہ۔ بہت دور تک رات ہو گی۔ علی گڑھ: آبشار پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء۔
* زیدی،زاہدہ۔ دھرتی کا لمس۔ علی گڑھ: ذاکر باغ مسلم یونی ورسٹی، ۱۹۷۵ء۔
* زیدی،زاہدہ۔ زہر حیات۔ علی گڑھ : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۷۰ء۔
* زیدی،زاہدہ۔ سنگ جاں۔ علی گڑھ : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۹ء۔
* زیدی،زاہدہ۔ شعلہ جاں۔ علی گڑھ : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۰۰ء۔
* زیدی،زاہدہ۔ شام تنہائی۔ علی گڑھ : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۰۸ء۔
* زیدی،ساجدہ۔آتشِ زیرپا۔ نئی دہلی: سیمانت پرکاش ،۱۹۹۵ء۔
* زیدی،ساجدہ۔آتشِ سیال۔ الہ آباد: اسرار کریمی پریس،۱۹۷۲ء۔
* زیدی،ساجدہ۔ پردہ ہے ساز کا۔ دہلی: تخلیق کار پبلشرز، ۲۰۰۷ء۔
* زیدی،ساجدہ۔ جوئے نغمہ۔ نئی دہلی: انڈین اکیڈمی، ۱۹۶۳ء۔
* زیدی،ساجدہ۔ سیلِ وجور۔ لکھنو: نصرت پبلشرز،۱۹۷۹ء۔
* زیدی،مصطفی ۔کلیاتِ مصطفی زیدی۔ لاہور:الحمد پبلی کیشنز،۲۰۱۱ء۔
* ساحر،لدھیانوی ۔ کلیاتِ ساحر۔ لاہور: سجادپبلی کیشنز، س ن۔
* سارا شگفتہ۔آنکھیں۔کراچی: شکیل پبلشرز،۱۹۸۵ء۔
* سحر،صادقہ نواب ۔انگاروں کے پھول۔بمبئی: سرودیا اسٹوڈیو، ۱۹۹۲ء۔
* سرور جہاں آبادی۔خُم کدہ۔ اعظم گڑھ؛اعظم اسٹیم پریس،س ن۔
* سعید،سعادت،ڈاکٹر۔کجلی بن۔لاہور: سنگ میل،۱۹۸۸ء۔
* سعید،سعادت،ڈاکٹر۔بانسری چپ ہے۔لاہور: دستاویز مطبوعات،۲۰۰۲ء۔
* سعید،سعادت،ڈاکٹر۔فنون آشوب۔لاہور: نیشنل بک ہاؤس،۲۰۰۲ء۔
* سلام مچھلی شہری۔پائل۔دہلی:مطبوعہ علیمی پریس،س ن۔

* سلیم الرحمن۔شام کی دہلیز۔لاہور: مکتبۂ ادب جدید،۱۹۶۲ء۔
* سندیلوی،رفیق۔ غار میں بیٹھا شخص۔ لاہور: کاغذی پیرہن،۲۰۰۷ء۔
* سید،کاشف رضا۔ممنوع موسموں کی کتاب۔ کراچی: شہر زاد ،۲۰۱۲ء۔
* سیف ،الدین سیف۔خم کاکل،۔لاہور:نیا ادارہ، س ن۔
* شاہدی،پرویز۔تثلیث حیات۔کلکتہ:ادارہ لوح و قلم،۱۹۶۸ء۔
* شاکر،پروین ۔خوشبو۔اسلام آباد:مراد پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء۔
* شاکر،پروین ۔ ماہِ تمام(کلیات)۔اسلام آباد: مراد پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء۔
* شاہین ،حمیدہ۔زندہ ہوں۔لاہور: ملٹی میڈیا افیئر،۲۰۱۰ء۔
* شعریٰ ،شفیق فاطمہ۔ آفاق نو۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۹ء۔
* شعریٰ ،شفیق فاطمہ۔ سلسلۂ مکالمات(کلیات)۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۶ء۔
* شعریٰ ،شفیق فاطمہ۔ کرن کرن یادداشت۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۶ء۔
* شفائی،قتیل۔ گجر۔لاہور:الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء۔
* شفائی،قتیل۔ چھتنار۔ لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۷۵ء۔
* شفائی،قتیل۔گفتگو۔ لاہور: مکتبۂ عالیہ، ۱۹۷۳ء۔
* شفائی،قتیل ۔بر شگال۔ لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء۔
* شمیم،آفتاب اقبال۔فردا نژاد۔اسلام آباد:ثبات پبلی کیشنز،۱۹۸۵ء۔
* شمیم،آفتاب اقبال۔زید سے مکالمہ۔اسلام آباد:ثبات پبلی کیشنز،۱۹۸۹ء۔
* شمیم،آفتاب اقبال۔میں نظم لکھتا ہوں۔اسلام آباد: پورب اکادمی،۲۰۰۹ء۔
* شمیم،آفتاب اقبال۔گم سمندر۔اسلام آباد: ثبات پبلی کیشنز،۲۰۰۰ء۔
* شمیم ،احمد۔ اجنبی موسم میں ابابیل۔ اسلام آباد: عکسی پبلی کیشنز: ۱۹۸۳ء۔
* شہریار۔کلیاتِ شہریار۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء۔
* شیرانی،اختر۔ اختر ستان۔ لاہور: کتاب منزل،۱۹۴۹ء۔
* شیرانی ،اختر۔شہرود۔ لاہور: آئینہ ادب،۱۹۶۹ء۔

* شیرانی،اختر۔ شہناز۔ لاہور: کتاب منزل۔ ۱۹۴۸ء۔

* شیرانی ،اختر۔صبح بہار۔ لاہور: کتاب منزل،۱۹۴۶ء۔

* شیرانی،اختر۔طیور آوارہ۔لاہور: کتاب منزل،۱۹۴۶ء۔

* شیرانی ،اختر۔کلیات اختر شیرانی۔مرتبہ،ڈاکٹر یونس حسنی ۔لاہور: الحمد پبلی کیشنز۲۰۱۷ء۔

* صدیقی،باقی۔ دارورسن۔ راولپنڈی:قومی کتاب خانہ،س ن۔

* صدیقی ،مختار ۔ آثار۔ لاہور: ماورا پبلشرز، ۱۹۸۸ء۔

* صدیقی ،مختار ۔ منزل شب۔لاہور: نیا ادارہ،۱۹۵۵ء۔

* صدیقی ،عرش ۔ دیدۂ یعقوب۔لاہور:جدید ناشران، ۱۹۶۶ء۔

* صدیقی ،عرش۔کلیاتِ عرش صدیقی۔اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان،۲۰۱۲ء۔

* صہبائی،سرمد۔اَن کہی باتوں کی تھکن۔ لاہور: دارالاشاعت،۱۹۷۶ء۔

* صہبائی،سرمد۔پل بھر کا بہشت۔ لاہور: دستاویز،۲۰۱۲ء۔

* ضیا،جالندھری۔خواب سراب۔ راولپنڈی:مکتوبات حرمت،۱۹۸۵ء۔

* ضیا،جالندھری۔سر شام۔ لاہور:نیا ادارہ،۱۹۸۵ء۔

* ضیا،جالندھری۔نارسا۔ لاہور:نیا ادارہ،س ن۔

* ضیاالحسن۔آدھی بھوک اورپوری گالیاں۔لاہور: ملٹی میڈیا افیئر،۲۰۰۷ء۔

* ظفر ،احمد۔ دو نیم۔ راولپنڈی: مکتبۂ نور،۱۹۶۸ء۔

* ظفر،احمد۔لامحدود۔ الحمد پبلی کیشنز،۱۹۹۸ء۔

* ظفر،یوسف۔زنداں۔لاہور:اردو بک اسٹال ،۱۹۴۴ء۔

* ظفر،یوسف۔زہر خند۔لاہور: مکتبہ اردو،۱۹۴۴ء۔

* ظفر،یوسف۔نوائے ساز۔راولپنڈی،مکتبۂ نو،۱۹۶۲ء۔

* عارف،افتخار۔حرف باریاب۔کراچی: مکتبۂ دانیال،۱۹۹۶ء۔

* عبدالرشید۔انی کنت الظالمین۔لاہور:سانجھ پبلی کیشنز،۱۹۷۳ء۔

* عبدالرشید۔اپنے لیے اور دوستوں کے لیے نظمیں۔لاہور:سانجھ پبلی کیشنز،۱۹۷۴ء۔
* عبدالرشید۔پھٹا پرانا بادبان۔لاہور:سویرا آرٹ پریس،۱۹۷۷ء۔
* عبدالرشید۔خزاں اور میں ۔لاہور:سانجھ پبلی کیشنز،۱۹۸۷ء۔
* عبدالرشید۔صبح کا پہلا کبوتر۔لاہور:سانجھ پبلی کیشنز،۱۹۹۰ء۔
* عبدالرشید۔نیند،موت اور بارش کے لیے۔ لاہور:ناشر عبدالرشید،۱۹۹۳ء۔
* عبدالرشید۔ انور ادیب کے لیے نظمیں ۔لاہور:سانجھ پبلی کیشنز،۲۰۰۲ء۔
* عبدالرشید۔بنکاک میں اجنبی۔ لاہور:سانجھ پبلی کیشنز،۲۰۰۵ء۔
* عبدالرشید۔ افتخار جالب کے لیے نوحہ۔ لاہور:ملٹی میڈیا پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء۔
* عبدالرشید۔ چار پرندے۔لاہور: سانجھ پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء۔
* عبدالرشید۔ پیرس میں سال کا آخری دن۔ لاہور: سانجھ پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء۔
* عبدالرشید۔ سمیع آہوجا کے لیے نظمیں۔ لاہور: سانجھ پبلی کیشنز،۲۰۱۴ء۔
* عبدالرشید۔ حبس موسم ٹھہر گیا ہے۔ لاہور:سانجھ پبلی کیشنز،۲۰۱۲ء۔
* عبدالمتین،عارف ۔موج در موج۔ لاہور:جدید ناشران، ۱۹۶۱ء۔
* عبدالمتین،عارف ۔دیدہ و دل ۔لاہور:جمہور پبلشرز،۱۹۸۷ء۔
* عبدالمتین،عارف ۔آتشِ سیال۔ لاہور: بک ورلڈ،۱۹۶۲ء۔
* عبدالمتین،عارف ۔سفر کی عطا۔لاہور:ٹیکنیکل پبلشرز،۱۹۷۶ء۔
* عبدالمتین،عارف ۔دریچے اور صحرا۔لاہور: ٹیکنیکل پبلشرز،۱۹۷۶ء۔
* عبدالمتین،عار ف۔دھوپ کی چادر۔لاہور: عارف عبدالمتین اکیڈمی،۱۹۸۹ء۔
* عزیز،عرفانہ۔کفِ بہار۔کراچی: مکتبۂ افکار،۱۹۸۵ء۔
* عشائی ،شبنم۔ کتھارسیس۔ دہلی: استعارہ پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء۔
* عشائی ،شبنم۔ من بانی۔ دہلی: مکتبہ استعارہ، ۲۰۰۸ء۔
* عظمت اللہ خان۔سریلے بول۔ کراچی:اردو اکیڈمی سندھ،۱۹۵۹ء۔
* علوی،محمد۔ آخری دن کی تلاش۔ الہ آباد: شب خون کتاب گھر،س ن

* علومی،محمد۔رات ادھر اُدھر روشن۔ گجرات: ساہتیہ اکیڈمی،۱۹۹۵ء۔
* علوی،محمد۔چوتھا آسمان۔نئی دہلی: اے ون آفیسٹ پریس،۱۹۹۲ء۔
* علیم،عبید اللہ ۔چاند چہرہ ستارہ آنکھیں۔کراچی: سیپ پبلی کیشنز، ۱۹۷۴ء۔
* فاروقی،اعجاز۔آدھی رات کا سورج۔لاہور: جدید ناشران،۱۹۶۷ء۔
* فاروقی،ساقی۔ پیاس کا صحرا۔راولپنڈی:کتاب نما، ۱۹۶۷ء۔
* فاروقی،ساقی۔ رادار۔لاہور: قوسین،۱۹۷۸ء۔
* فاروقی،ساقی۔ رازوں سے بھرا رستہ۔لاہور: قوسین،۱۹۸۰ء۔
* فاروقی،ساقی۔ سرخ گلاب اور بدر منیر۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۵ء۔
* فاضلی ،ندا۔شہر میں گاؤں(کلیات)۔کراچی :رنگ ادب پبلی کیشنز،۲۰۱۶ء۔
* فاضلی،ندا۔ شہر میرے ساتھ تو چل۔نئی دہلی: نئی آواز،۲۰۰۴ء۔
* فاطمہ ،حسن۔بہتے ہوئے پھول۔کراچی: ناشر شیخ شوکت علی،۱۹۷۷ء۔
* فراز،احمد ۔جاناں جاناں ۔ اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، س ن۔
* فراز،احمد ۔نابینا شہر میں آئینہ۔اسلام آباد:دوست پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء۔
* فراز ،احمد ۔شہر سخن آراستہ ہے(کلیات)۔اسلام آباد:دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء۔
* فرشی،علی محمد۔ علینہ۔مقام اشاعت ندارد: حرف اکادمی،سنہ ندارد،۔
* فرشی،علی محمد۔ غاشیہ۔ اسلام آباد: پورب اکادمی،۲۰۱۴ء۔
* فطرت ،انوار۔ آبِ قدیم کے ساحلوں پر۔ راولپنڈی: حرف اکادمی،۲۰۰۳ء۔
* فیض، احمدفیض۔ دست ِتہ سنگ۔ لاہور: مکتبۂ کارواں، س ن۔
* فیض، احمدفیض۔ نقش فریادی۔ لاہور: مکتبۂ کارواں، س ن۔
* فیض ،احمد فیض ۔نسخہ ہائے وفا(کلیات)۔ لاہور: مکتبہ کارواں،۱۹۸۵ء۔
* فیض ،احمد فیض۔ مرے دل مرے مسافر۔ کراچی: مکتبۂ دانیال،۱۹۸۶ء۔
* فیض،احمد فیض۔ سروادی سینا ۔کراچی: پاکستان پبلشرز،۱۹۷۱ء۔
* قاسمی ،احمد ندیم ۔ دشت وفا۔ لاہور: کتاب نما، ۱۹۶۰ء۔

* قاسمی،احمد ندیم ۔ندیم کی نظمیں حصہ اول و دوم۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۱ء۔

* قاسمی،احمد ندیم۔جلال وجمال۔لاہور: اساطیر، ۲۰۰۰ء۔

* قاسمی،احمد ندیم۔محیط۔لاہور: اساطیر، ۲۰۰۰ء۔

* قدوائی،شوق۔دیوانِ شوق۔گونڈہ(ابد):مقبول المطابع،۱۳۴۷ھ

* کاشمیری،تبسم ،ڈاکٹر۔لا: راشد۔ لاہور:بازگشتوں کے پل پر۔لاہور:دستاویز،۱۹۹۵ء۔

* کاشمیری،تبسم ،ڈاکٹر۔پرندے ،پھول،تالاب۔لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۴ء۔

* کاشمیری،تبسم ،ڈاکٹر۔کاسنی بارش میں دھوپ۔لاہور: نگارشات،۱۹۹۰ء۔

* کاشمیری،تبسم ،ڈاکٹر۔نوحے تخت لاہور کے۔لاہور: مصباح سنز،۱۹۸۵ء۔

* کاشمیری،تبسم ،ڈاکٹر۔تمثال۔لاہور:ارسلان پبلی کیشنز،۱۹۷۵ء۔

* کاشمیری ،ظہیر۔ رقص جنوں۔ لاہور:مکتبہ عالیہ، ۱۹۸۲ء۔

* کاشمیری ،ظہیر۔ عشق وانقلاب۔ لاہور: الحمدپبلی کیشنز،۱۹۹۴ء۔

* کاشمیری ،ظہیر۔ عظمت آدم۔لاہور: نیا ادارہ،۱۹۵۵ء۔

* کاظمی،جہانگیر رضا،مرتبہ۔کلیات جمیل مظہری حصہ اول نظمیں۔دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،اشاعت اول ۲۰۰۸ء۔

* کاظمی،فہیم شناس۔راہداری میں گونجتی نظم۔کراچی: دنیا زاد پبلی کیشنز،۲۰۱۳ء۔

* کامران،جیلانی۔استانزے۔لاہور: مکتبہ جدید،۱۹۷۵ء۔

* کامران،جیلانی۔ نقش کف پا۔ لاہور: مکتبہ ادب جدید،۱۹۶۱ء۔

* کامرن،جیلانی۔جیلانی کی نظمیں۔ لاہور:کتابیات،۱۹۴۷ء۔

* کلام مخدوم،کراچی:مکتب پرنٹرپبلشرز،س ن۔

* کوثر،سلیم ۔خالی ہاتھوں میں ارض و سما۔ کراچی:تہذیب پبلی کیشنز، ۱۹۸۱ء۔

* کومل،بلراج۔میری نظمیں۔دہلی: مکتبہ فنکار۱۹۵۴ء۔

* کومل،بلراج۔سفر مدام سفر۔الہ آباد: شب خون کتاب گھر،۱۹۶۹ء۔

* کومل،بلراج۔رشتہِ دل۔لاہور: ادارئہ ادبی دنیا،۱۹۶۳ء۔

* کومل ،بلراج۔لمبی بارش(منتخب کلام)۔ نئی دہلی: ساہتیہ اکادمی،۲۰۰۲ء۔

* گلزار۔چاند پکھراج کا۔ لاہور: تسطیر،۱۹۹۲ء۔

* مجاز،اسرارالحق۔آہنگ۔لاہور:مکتبۂ اردو،طبع ثانی جنوری ۱۹۴۳ء۔

* مجاز،اسرارالحق۔شب تاب۔دلی :ہند ستانی پبلشرز، ۱۹۴۵ء۔

* مجاز،اسرارالحق۔ساز نو۔لکھنو:کتابی دنیا، جنوری ۱۹۴۹ء۔

* محروم،تلوک چند۔گنجِ معانی۔نئی دہلی:محروم میموریل لٹریری سوسائٹی،پہلا ایڈیشن،لاہور،۱۹۳۲ء،دوسرا،دہلی۱۹۵۷ء۔

* محمد اقبال،علامہ،ڈاکٹر۔کلیات اقبال اردو۔لاہور:الحمد پبلی کیشنز،مارچ۱۹۹۹ء۔

* محمد سلیم الرحمن۔نظمیں۔لاہور: قوسین پبلشرز،۲۰۰۲ء۔

* محمد صفدر میر۔درد کے پھول۔ لاہور: آئینہ ادب،۱۹۶۴ء۔

* مخدوم محی الدین۔گل تر۔ حیدر آباد دکن:مکتبہ صبا،۱۹۶۱ء۔

* مخدوم محی الدین۔بساط رقص۔ حیدر آبادادبی اسڑیٹ ،۱۹۷۶ء۔

* مدنی ،عزیز حامد۔نخل گماں۔ کراچی: مکتبۂ دانیال، ۱۹۸۳ء۔

* معراج ،ارشد۔کتھا نیلے پانی کی۔ راول پنڈی: بہزاد پبلشرز،۲۰۰۶ء۔

* معراج ،ارشد۔دوستوں کے درمیاں۔ راول پنڈی: رُمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز،جنوری ۲۰۱۹ء۔

* منیب الرحمن۔بازدید۔علی گڑھ: انجمن ترقیِ اردو(ہند)،۱۹۶۵ء۔

* منیب الرحمن۔سڑکوں کے چراغ۔ کراچی: شہرزاد،۲۰۰۵ء۔

* منیب الرحمن۔نقطۂ موہوم۔دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۱۹۸۳ء۔

* منیب الرحمن۔شہرِ گمنام۔دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۱۹۸۳ء۔

* میراجی۔کلیاتِ میراجی۔مرتبہ،ڈاکٹر جمیل جالبی،لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء۔

* میراجی۔پابند نظمیں۔ راولپنڈی:کتاب نما،۱۹۶۸ء۔

* میرا جی،مرتبہ۔اس نظم میں۔کراچی:آج کی کتابیں،۲۰۰۲ء۔پہلی اشاعت ساقی بک ڈپو دہلی،۱۹۴۴ء

* نادر،کاکوروی۔جذبات نادر۔ کراچی: سندھ اردو اکیڈمی،۱۹۶۱ء۔
* ناصر،نصیر احمد۔دسمبر اب مت آنا۔ اسلام آباد: لیو بکس،۱۹۹۳ء۔
* ناصر،نصیر احمد۔پانی میں گم خواب۔راولپنڈی: تسطیرپبلشرز،۲۰۰۲ء۔
* ناصر،نصیر احمد۔عرابچی سو گیا ہے۔ لاہور: سانجھ پبلی کیشنز،۲۰۱۳ء۔
* ناصر،نصیر احمد۔تیسرے قدم کا خمیازہ۔ لاہور: سانجھ پبلی کیشنز،۲۰۱۳ء۔
* ناگی،انیس۔ بشارت کی رات۔ لاہور: مکتبہ جدید،س ن۔
* ناگی،انیس۔بے خوابی کی نظمیں۔ لاہور: جمالیات،۱۹۸۷ء۔
* ناگی،انیس۔بیگانگی کی نظمیں۔ لاہور: تخلیقات، ۲۰۰۰ء۔
* ناگی،انیس۔زرد آسماں۔ لاہور: جمالیات،۱۹۸۵ء۔
* ناہید،کشور ۔ لب گویا۔لاہور :مکتبۂ کارواں، ۱۹۶۸ء۔
* ناہید،کشور ۔بے نام مسافت۔لاہور:مکتبہ ءچلمن،۱۹۷۱ء۔
* ناہید،کشور ۔ نظمیں۔کراچی:مکتبہ دانیال،۱۹۷۵ء۔
* نظامی،ساغر۔بادۂ مشرق۔لاہور؛مکتبۂ اردو،س ن۔
* نظامی،معین۔تجسیم۔لاہور: خواب پبلشرز،۱۹۹۶ء۔
* نظامی،معین۔متروک۔لاہور: نگارز پبلشرز،۲۰۱۰ء۔
* نظر،ظہور ۔ریزہ ریزہ۔ لاہور:کتاب نما،س ن۔
* نظر،ظہور ۔وفا کا سفر۔ لاہور:مطبوعات۔س ن۔
* نظر،قیوم ۔ پون جھکولے۔ لاہور: کتاب خانہ، ۱۹۷۲ء۔
* نظر،قیوم ۔ قلب و نظر کے سلسلے(کلیات)۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۸۷ء۔
* نظیر اکبر آبادی۔کلیات نظیر۔لکھنو:تیج کمار بک ڈپو،۱۹۵۱ء۔
* نعمانی،شبلی۔کلیاتِ شبلی۔اعظم گڑھ: معارف پریس،۱۹۴۰ء۔
* نقوی،محسن ۔ برگِ صحرا۔ لاہور:ماورا پبلشرز، س ن۔
* نقوی،محسن ۔رختِ شب۔لاہور:ماوراپبلشرز، ۲۰۰۲ء۔

* نواز ،بشر۔اجنبی سمندر۔علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ڈپو،۱۹۹۷ء۔
* نواز ،بشر۔رایگاں۔اورنگ آباد: دکن پبلشرز،۱۹۷۲ء۔
* نیازی،منیر۔ اس بے وفا کا شہر۔ لاہور: ماورا، پبلشرز، ۱۹۹۳ء۔
* نیازی،منیر۔کلیات منیر نیازی۔ لاہور: گورا پبلشرز، ۱۹۹۸ء۔
* نیر،شہزاد۔برفاب۔لاہور: سانجھ پبلشرز،اشاعت اول ۲۰۰۶ء،چہارم۲۰۱۸ء۔
* نیر،شہزاد۔چاک سے اترے وجود۔لاہور: جہانگیر بکس،سن ندارد
* نیر،شہزاد۔گرہ کھلنے تک۔لاہور: الحمد پبلی کیشنز،اشاعت اوّل۲۰۱۳ء،دوم ۲۰۱۶ء۔
* وسیم عباس گل،مرتبہ۔جوش کی انقلابی نظمیں۔اسلام آباد:پورب اکادمی،اگست ۲۰۱۵ء۔
* ہاشمی،عدیم ۔ ترکش۔ لاہور: ماورا پبلشرز، ۱۹۹۲ء۔
* ہریانوی،فاخر۔موجِ صبا۔لاہور: ایوانِ ادب،۱۹۶۶ء۔
* یار ،فرخ۔مٹی کا مضمون۔ کراچی: آج پبلشرز،۲۰۰۶ء۔
* یاسمین حمید۔فنا بھی ایک سراب۔ الحمد پبلی کیشنز،۲۰۰۱ء۔

انتخاب

* مرتبہ :حلقہ ارباب ذوق۔۱۹۴۱ءکی بہترین نظمیں۔لاہور:مکتبۂ اردو،۱۹۴۲ء۔
* مرتبہ :حلقہ ارباب ذوق۔۱۹۴۲ءءکی بہترین نظمیں۔لاہور:مکتبۂ اردو۔
* مرتبہ :حلقہ ارباب ذوق۔۱۹۴۳ءکی بہترین نظمیں۔لاہور:مکتبۂ اردو،۱۹۴۴ء۔
* مرتبہ :حلقہ ارباب ذوق۔۱۹۴۴ءکی بہترین نظمیں۔لاہور:اردو بک اسٹال،۱۹۴۵ء۔
* مرتبہ :حلقہ ارباب ذوق۔۱۹۴۵ءکی بہترین نظمیں۔لاہور:سنگم پبلشرز لمیٹڈ،طبع اول۔
* مرتبہ :حلقہ ارباب ذوق۔۱۹۴۶ءکی بہترین نظمیں۔لاہور:مکتبۂ اردو،طبع اول۔
* مرتبہ :حلقہ ارباب ذوق۔۱۹۴۷ءکی بہترین نظمیں۔لاہور:نیا ادارہ طبع اول۔
* مرتبہ :حلقہ ارباب ذوق۔۱۹۴۸ءکی بہترین نظمیں۔لاہور:گوشہ ادب طبع اول۔
* مرتبہ :حلقہ ارباب ذوق۔۱۹۴۹ءکی بہترین نظمیں۔لاہور:گوشہ ادب طبع اول۔
* مرتبہ: ناصر کاظمی۔۱۹۵۰ءکی بہترین نظمیں۔لاہور: آئینہ ادب،طبع اول

* مرتبہ: قیوم نظر۔۱۹۶۲ءکی بہترین نظمیں۔لاہور: مکتبہ ءجدید،طبع اول

(ب) تنقیدی وتحقیقی کتب

* ابو الخیر کشفی۔اردو شاعری سیاسی اور تاریخی پس منظر۔لاہور:نشریات،۲۰۰۷ء۔

* ابوالاعجاز، حفیظ صدیقی ۔تفہیم و تحسین شعر۔لاہور: سنگت پبلشرز،۲۰۰۶ء۔

* ابوالاعجازحفیظ صدیقی ۔کشاف تنقیدی اصطلاحات ۔اسلام آباد:مقتدرہ قومی زبان،۱۹۸۵ء۔

* ابواللیث صدیقی،ڈاکٹر۔آج کا اردو ادب۔لاہور:فیروز سنز،۱۹۷۰ء۔

* ابواللیث صدیقی ،ڈاکٹر۔تجربے اور روایت۔کراچی:غضنفر اکیڈمی،۱۹۵۹ء۔

* ابواللیث صدیقی ،ڈاکٹر۔جدید اردو ادبیات۔کراچی:غضنفر اکیڈمی،۱۹۵۹ء۔

* اجمل،محمد،ڈاکٹر۔مقالاتِ اجمل۔لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ،۱۹۸۷ء۔

* احتشام حسین،سید۔اعتبار نظر۔لکھنو:کتاب پبلشرز،۱۹۶۰ء۔

* احتشام حسین،سید۔تنقیدی نظریات۔لاہور:عشرت پبلشنگ ہاؤس،۱۹۶۶ء۔

* احمد ،عزیز۔ترقی پسند ادب۔علی گڑھ: ترقی اردو ہند،۱۹۵۷ء۔

* احمد،کلیم الدین ۔اردو تنقید پر ایک نظر۔لاہور: عشرت پبلشنگ ہاؤس، س ن۔

* احمد ،سہیل ،مرتبہ۔ مقالاتِ حلقہ ارباب ذوق۔ ملتان: بیکن بکس ،۱۹۹۵ء۔

* احمد ،اوصاف۔ بیسویں صدی کی اردو شاعری۔لاہور:بک ہوم،۲۰۰۳ء۔

* احمد،بشیر۔مطالعہ اختر انصاری۔دہلی: دنیا پبلی کیشنز،۱۹۹۵ء۔

* اختر،سلیم ۔ تنقیدی دبستان۔لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۷ء۔

* اختر،حسن ، ڈاکٹر۔ تنقیدی اور تحقیقی جائزے۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۳ء۔

* اختر،سلیم ،ڈاکٹر۔پاکستان میں اردو ادب سال بہ سال۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۸۸ء۔

* اختر،سلیم ،ڈاکٹر۔اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۳ء۔

* ادیب،حکمت ،مرتب ۔مجید امجد ایک مطالعہ۔جھنگ:جھنگ ادبی اکیڈمی،۱۹۹۴ء۔

* اشتیاق احمد،مرتبہ۔علامت نگاری۔ لاہور:بیت الحکمت،س ن۔

* اشتیاق احمد،مرتبہ۔جدیدیت کا تنقیدی تناظر۔ لاہور:بیت الحکمت،۲۰۰۶ء۔

* اشرف،اے بی،ڈاکٹر۔کچھ نئے اور پرانے شاعر۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۸۹ء۔

* اشرف ،محمد خان ،ڈاکٹر۔اردوتنقید کا رومانوی دبستان۔لاہور:اقبال اکادمی،۱۹۹۶ء۔

* اعظمی،خلیل الرحمن۔ نئی نظم کا سفر۔دہلی:مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،۱۹۷۲ء۔

* اعظمی،خلیل الرحمن ۔اُردو میں ترقی پسند تحریک۔ علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۷۶ء۔

* اعظمی،منظر۔اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ۔لکھنو:اتر پردیش اردو اکادمی،۱۹۹۶ء۔

* افسر ،حامد اللہ،میرٹھی۔نقد الادب۔مقامِ اشاعت ندارد،سنہ ندارد

* امجد،رشید ، ڈاکٹر،۔پاکستانی اردو ادب(رویے اور رجحانات)۔ اسلام آباد:پورب اکادمی، ۲۰۱۰ء۔

* امجد،رشید ،ڈاکٹر۔مزاحمتی ادب۔اسلام آباد:اکادمی ادبیات پاکستان،۱۹۹۵ء۔

* انجم خلیق،مرتب۔اختر انصاری شخص اور شاعر۔دہلی: انجمن ترقی اردو ہند،۱۹۹۰ء۔

* انجم ،نائیلہ،ڈاکٹر۔جدید اُردو نظم میں تصورِ دعا۔لاہور: دستاویز مطبوعات،۲۰۱۷ء۔

* انصاری،اختر۔افادی ادب۔دہلی:آزاد کتاب گھر،۱۹۵۵ء۔

* انصاری،اسلوب احمد۔ادب اور تنقید۔اسلام آباد:سنگم پبلی کیشنز،۱۹۶۸ء۔

* انصاری،اسلوب احمد۔تنقیدی تبصرے۔علی گڑھ :یونیورسل بک ہاؤس،۲۰۰۴ء۔

* انصاری ،ظ ، ڈاکٹر۔ ترجمے کے بنیادی اصول ۔ لاہور :مطبوعہ ادب لطیف،۱۹۸۹ء۔

* ایوبی منظر،پروفیسر۔اردو شاعری میں نئے موضوعات کی تلاش۔کراچی:انجمن ترقی اردو پاکستان،۲۰۱۰ء۔

* آزاد،محمد حسین۔آب حیات۔لکھنو:یو پی اردو اکیڈمی،۱۹۹۳ء۔

* آغا ،محمد باقر۔تاریخ نظم نثر اردو ۔لاہور:آزاد بک ڈپو،۱۹۵۸ء۔

* آغا،وزیر،ڈاکٹر۔نظم جدید کی کروٹیں۔لاہور:مجلس ترقی ادب ،۱۹۷۸ء۔

* آغا،وزیر،ڈاکٹر۔اردو شاعری کامزاج۔لاہور:مکتبہ دانیال،۱۹۸۴ء۔

* آغا ،وزیر،ڈاکٹر۔ تنقید و احتساب۔ علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس ،۱۹۷۶ء۔

* آغا ،سہیل۔ادب اور عصری حسیت۔لاہور:مکتبہ عالیہ،۱۹۹۱ء۔

* بالی،کنول کرشن ۔آزاد نظم اُردو شاعری میں۔لکھنو :کتاب پبلشرز،س ن۔

* بخش ،سلطانہ ،ڈاکٹر۔اردو میں اصول تحقیق ۔لاہور:مغربی پاکستان اردو اکیڈمی،۲۰۰۹ء۔

* بدر منیر الدین ۔بیسویں صدی کا شعری ادب ۔لاہور:پولیمر پبلی کیشنز،۱۹۸۸ء۔

* بریلوی،عبادت ،ڈاکٹر۔جدیدشاعری۔کراچی: اُردو دنیا،۱۹۶۱ء۔

* بریلوی،عبادت ،ڈاکٹر۔تنقیدی زاویے۔لاہور:مکتبۂ اُردو،۱۹۵۱ء۔

* بریلوی ،عبادت ، ڈاکٹر۔اردو تنقید کا ارتقاء۔کراچی:انجمن ترقی اردو ،۱۹۹۴ء۔

* بیگم ،وسیم،ڈاکٹر۔ آزاد کے بعد اردو شاعری میں تانیثی حسیّت۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۱۲ء۔

* تصدق حسین راجا،ڈاکٹر۔یوسف ظفر شخصیت اور فن۔اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان،۲۰۰۶ء۔

* تقی ،یوسف،ڈاکٹر۔ ترقی پسند تحریک اور اردو نظم۔ کلکتہ: دیارِ فکروفن،۱۹۸۰ء۔

* تونسوی،طاہر ،ڈاکٹر،مرتبہ ۔فیض کی تخلیقی شخصیت تنقیدی مطالعہ۔لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۸۹ء۔

* جابر علی،سید۔استعارے کے چار شہر۔ملتان:بیکن بکس،۱۹۹۴ء۔

* جابر علی،سید۔جدید شعری تنقید۔ملتان:بیکن بکس،۲۰۰۲ء۔

* جابر علی،سید۔تنقید وتحقیق۔کارواں ادب،۱۹۸۷ء۔

* جالب ،افتخار۔مآخذ۔لاہور: مکتبہ ادب جدید،۱۹۶۳ء۔

* جالب ،افتخار۔نئی شاعری۔آصف جمال جمالیات،۱۹۸۸ء۔

* جالبی،جمیل ،ڈاکٹر۔ادبی تحقیق ۔لاہور:مجلس ترقی ادب،۱۹۹۴ء۔

* جالبی،جمیل ، ڈاکٹر۔تاریخ ادب اردو ۔ لاہور :مجلس ترقی ادب ، ۱۹۸۸ء۔

* جالبی،جمیل،ڈاکٹر۔ تنقید اور تجربہ۔ لاہور: یونیورسل بکس،۱۹۸۸ء۔

* جالبی،جمیل،ڈاکٹر۔ معاصر ادب۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۱ء۔

* جالبی،جمیل،ڈاکٹر۔ میراجی:ایک مطالعہ۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۰ء۔

* جالبی،جمیل،ڈاکٹر۔ ن م۔راشد:ایک مطالعہ۔ کراچی:مکتبہ اسلوب،۱۹۸۶ء۔

* جالب،افتخار ،مرتب ۔نئی شاعری ۔۔۔ایک تنقیدی مطالعہ ۔لاہور:نئی مطبوعات، ۱۹۶۶ء۔

* جاوید ،سرفراز،ڈاکٹر۔حامد اللہ افسر میرٹھی ایک مطالعہ۔دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۱۶ء۔

* جاوید،یونس ۔حلقہ ارباب ذوق۔ لاہور :مجلس ترقی ادب،۱۹۸۴ء۔

* جذبی،معین احسن۔حالی کا سیاسی شعور۔لاہور: آئینہ ادب،۱۹۶۳ء۔

* جعفری،ایس اختر۔ اختر شیرانی اور اس کی شاعری۔ لاہور:آئینہ ادب،۱۹۶۴ء۔

* جعفری،علی سردار۔ ترقی پسند ادب۔ علی گڑھ :انجمن ترقی اُردوہند،۱۹۵۷ء۔

* جعفری ،علی سردار۔ترقی پسند تحریک کی نصف صدی۔ دہلی: شعبہءاردو دہلی یونیورسٹی،۱۹۸۷ء۔

* حنفی،شمیم ۔نئی شعری روایت۔دہلی: مکتبۂ جامعہ،۱۹۷۸ء۔

* چشتی ،عنوان ،ڈاکٹر۔اُردو شاعری میں ہیئت کے تجربے۔دلی:انجمن ترقی اُردوہند،۱۹۷۵ء۔

* چشتی،عنوان ،ڈاکٹر۔اُردو شاعری میں جدیدیت کی روایت۔لاہور:تخلیق مرکز،س ن۔

* حالی ،الطاف حسین ۔ مقدمہ شعر و شاعری۔ لاہو:،جدید بک ڈپو، ۱۹۷۶ء۔

* حسن ،محمد ،ڈاکٹر۔معاصر ادب کے پیش رو۔کراچی: غضنفر اکیڈمی،۱۹۸۸ء۔

* حسن،محمد ، ڈاکٹر۔ مشرق ومغرب کے تنقیدی تصورات کی تاریخ ۔ نئی دہلی:ترقی اردو بیورو،۱۹۹۱ء۔

* حسن،محمد ، ڈاکٹر۔ادبی سماجیات ۔نئی دہلی:مکتبہ جامعہ لمٹیڈ ،۱۹۸۳ء۔

* حسن،محمد ، ڈاکٹر۔اردو ادب میں رومانوی تحریک۔ملتان:کاروان ادب،۱۹۸۶ء۔

* حسن،محمد۔اردو شاعری کا تہذیبی اور فکری پس منظر۔دہلی:ادارہ تصنیف،۱۹۸۳ء۔

* حسن،مقصود،ڈاکٹر۔حامد اللہ افسر میرٹھی:حیات ،شخصیت اور کارنامے۔میرٹھ:۷۷۶۰،شاہ نتھی،لسانی گیٹ،۱۹۸۸ء۔

* حسنی ،یونس،ڈاکٹر۔اختر شیرانی اور جدید اردو ادب۔کراچی:انجمن ترقی اردو پاکستان،اشاعت اول۱۹۷۶ء،اشاعت ثانی۲۰۰۹ء۔

* حسین ،اعجاز،ڈاکٹر۔ادبی رجحانات۔ حیدر آباد دکن:نفیس اکیڈمی،۱۹۶۴ء۔

* حسین ،اعجاز۔اردو ادب آزادی کے بعد۔الہ آباد:کارواں پبلی کیشنز،۱۹۶۰ء۔

* حسین،مجتبیٰ ۔تہذیب وتحریر ۔کراچی: مکتبہ افکار ،۱۹۵۹ء۔

* حسین،اعجاز، ڈاکٹر۔اُردو ادب آزادی کے بعد۔الہ آباد:کارواں پبلشرز،۱۹۶۰ء۔

* حسین،ممتاز ، پروفیسر۔ادب اور شعور۔ کراچی:ادارہ نقد ادب ،۱۹۹۲ء ۔

* حسین،ممتاز ، پروفیسر۔ادبی مسائل ۔لاہور: مکتبہ اردو ،۱۹۵۵ء۔

* حسین ،اشفاق۔فیض ایک جائزہ۔لاہور:ادارہ یادگار غالب،۱۹۸۷ء۔

* خان،سہیل احمد ،ڈاکٹر،مرتب۔مقالات حلقہ ارباب ذوق۔لاہور:پولیمر پبلی کیشنز،۱۹۹۰ء۔

* ذوالفقار،غلام حسین ،ڈاکٹر۔ اُردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء۔

* زکریا، محمد،خواجہ،ڈاکٹر۔چند اہم جدید شاعر۔لاہور:سنگت پبلشرز،۲۰۰۳ء۔

* زکریا، محمد،خواجہ،ڈاکٹر۔نئے پرانے خیالات۔لاہور:لاہور اکیڈمی،۱۹۷۰ء۔

* زکریا، محمد،خواجہ،ڈاکٹر۔اکبر الہ آبادی۔لاہور: مجلس ترقی ادب،۱۹۸۰ء۔

* سجاد،سید ،مرتب ۔نئی نظمیں۔لاہور:نئی مطبوعات،۱۹۶۷ء۔

* سدید،انور،ڈاکٹر۔اردو ادب کی تحریکیں۔ کراچی: انجمن ترقی اردو،۱۹۸۳ء۔

* سدید،انور ، ڈاکٹر،۔جدید نظم کے ارباب اربعہ ۔لاہور:مقبول اکیڈمی، ۲۰۰۶ء۔

* سدید ،انور،ڈاکٹر۔۱۹۷۵ءکی بہترین نظمیں۔ سرگودھا:مکتبہ اردو زبان،۱۹۷۶ء۔

* سدید ،انور،ڈاکٹر۔مزید ادبی جائزے۔ لاہور: مغربی پاکستان اردو ایکڈمی،۲۰۰۳ء۔

* سرور،آل احمد ۔ادب اور نظریہ۔ لکھنو: ادارہ فروغ اُردو، ۱۹۵۴ء۔

* سروری،عبدالقادر ۔ جدید اردو شاعری ۔لاہور:شیخ غلام علی سنز پبلشرز،۱۹۶۷ء۔

* سلام سندیلوی۔اردو شاعری میں خودداری۔دہلی:انجمن ترقی اردو،۱۹۷۹ء۔

* سکسینہ ،رام بابو۔تاریخ ادب اردو ،مترجم محمد عسکری مرزا۔لکھنو:نولکشور پریس،س ن۔

* سندیلوی،رفیق۔ڈاکٹر وزیر آغا شخصیت اور فن۔ اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان ،۲۰۰۶ء۔

* سیدہ ناصرہ۔حفیظ فن اور شخصیت ۔لاہور:نیا زمانہ پبلشرز،۲۰۱۱ء۔

* شاہد،ایس ایم ۔تحقیقی مقالہ نویسی کا فن ۔ لاہور:مجید بک ڈپو،۲۰۰۱ء۔

* شاہین ،صابرہ ،ڈاکٹر۔ مختار صدیقی حیات و خدمات۔لاہور: الوقار پبلی کیشنز،۲۰۱۴ء۔

* شائستہ نوشین،ڈاکٹر۔آزادی اور جمہوریت کا تصور اردو نظموں میں۔دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۰۸ء۔

* شہزاد،عارفہ۔جدید اردو شاعری میں کرداری نظمیں۔لاہور:الاشراق پبلی کیشنز،فروری ۲۰۰۷ء۔

* صابر،ایوب،اقبال کی فکری تشکیل۔ اسلام آباد :نیشنل بک فاؤنڈیشن،۲۰۰۷ء۔

* صدیقی ،ابواللیث ،ڈاکٹر۔تجربے اور روایت۔ لاہور:اردو مرکز ،۱۹۵۹ء۔

* صدیقی،ابواللیث ،ڈاکٹر ۔آج کااُ ردو ادب۔ کراچی:فیروز سنز لمیٹڈ،۱۹۷۰ء۔

* صدیقی،ابواللیث،ڈاکٹر۔لکھنو کادبستان شاعری،۔کراچی: اُردو اکادمی سندھ،۱۹۶۷ء۔

* صدیقی ،ابواللیث،ڈاکٹر۔نظیر اکبر آبادی اور اس کا عہد۔کراچی :اُردو اکیڈمی سندھ،۱۹۵۷ء۔

* صدیقی ،ابواللیث،ڈاکٹر۔جدید اردو ادبیات۔کراچی:غضنفر اکیڈمی،۱۹۹۵ء۔

* صدیقی صائم الدین۔مطالعہ معین احسن جذبی۔دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،اپریل۲۰۱۷ء۔

* طفیل ،امجد۔منیر نیازی شخصیت اور فن۔ اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان،۲۰۰۶ء۔

* ظہیر،سجاد ۔روشنائی۔ کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۷۶ء۔

* عابد ،عابدعلی ، سید ۔اصول انتقادیات ادبیات ۔لاہور:مجلس ترقی ادب ،۱۹۸۷ء۔

* عابد، علی عابد،سید۔البیان۔لاہور:مجلس ترقی ادب ،۱۹۸۹ء۔

* عابد ،علی عابد ، سید ،۔اسلوب ۔لاہور مجلس ترقی ادب ،۱۹۹۶ء۔

* عبداللہ ،سید ،ڈاکٹر۔بحث و نظر۔لاہور:مکتبۂ اُردو،۱۹۵۲ء۔

* عبداللہ،سید ،ڈاکٹر۔مباحث،لاہور:مجلس ترقی ادب،۱۹۶۵ء۔

* عبداللہ،سید ،ڈاکٹر۔مطالعہ اقبال کے چند رخ۔لاہور:بزم اقبال۱۹۸۴ء۔

* عبداللہ،سید ،ڈاکٹر۔سخنور(نئے پرانے)حصہ اول۔لاہور:مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی،۱۹۸۱ء۔

* عبداللہ،سید،ڈاکٹر ۔اشاراتِ تنقید۔اسلام آباد:مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء۔

* عبدالشکور۔ تنقیدی سرمایہ اردومیں۔الہ آباد:کتاب محل ،۱۹۴۶ء۔

* عبداللہ ، ڈاکٹر ، سید۔ادب وفن و مغربی پاکستان۔ لاہور:اردو اکیڈمی ،۱۹۸۷ء۔

* عبداللہ،ڈاکٹر سید۔ولی سے اقبال تک۔لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۷ء۔

* عبدالغنی،ڈاکٹر۔علی سردار جعفری بحیثیت ترقی پسند شاعر۔دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،جنوری ۲۰۱۳ء۔

* عبد القوی دسنوی۔اردو شاعری کی گیارہ آوازیں۔نئی دہلی:قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،۲۰۱۱ء۔

* عبدالمتین ،عارف ۔امکانات ۔لاہور: ٹیکنیکل پبلشرز ،۱۹۷۵ء۔

* عتیق اللہ،ڈاکٹر۔آزادی کے بعد دہلی میں اردو نظم۔دہلی: اردو اکادمی،۱۹۵۵ء۔

* عشرت ،اسلام،ڈاکٹر۔خلیل الرحمن اعظمی ترقی پسند ی سے جدیدت تک۔پٹنہ: دانش پبلی کیشنز،۱۹۸۸ء۔

* عظیم،وقار ،سید۔فن اور فنکار۔لاہور:اُردو مرکز،۱۹۶۶ء۔

* عقیل،معین الدین۔تحریک آزادی میں اردو کا حصہ۔کراچی:انجمن ترقی اردو،۱۹۷۶ء۔

* علی،نوازش ،ڈاکٹر۔پاکستان میں اُردو ادب کے پچاس سال۔راولپنڈی:گندھارا،۲۰۰۲ء۔

* علی،احتشام۔جدید اردو نظم میں عصری حسیّت۔لاہور: سانجھ پبلی کیشنز،۲۰۱۵ء۔

* عنبرین منیر،ڈاکٹر۔جدید اردو نظم میں نفسیاتی عناصر۔فیصل آباد:مثال پبلشرز،۲۰۱۷ء۔

* غزنوی،خاطر ۔جدید اُردو ادب ۔لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز،۱۹۸۵ء۔

* فاروقی،احسن ،ڈاکٹر۔اُردو میں تنقید۔کراچی:مشتاق بک ڈپو، ۱۹۶۶ء۔

* فاطمہ،تنویر۔اردو شاعری میں انسان دوستی۔دہلی: بھارت آفسٹ گلی قائم جان،۱۹۹۴ء۔

* فتح پوری،فرمان ،ڈاکٹر۔اردو شاعری کا فنی ارتقا۔لاہور:الوقار پبلی کیشنز،۱۹۹۷ء۔

* فتح پوری،فرمان ، ڈاکٹر۔اردوشعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔ لاہور: مجلس ترقی ادب،۱۹۷۲ء۔

* فرخی،اسلم،ڈاکٹر۔محمد حسین آزاد(حیات و تصانیف)۔کراچی:انجمن ترقی اردو پاکستان،۱۹۵۵ء۔

* فرشی،علی محمد۔ضیا جالندھری شخصیت اور فن۔ اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان،۲۰۰۷ء۔

* فیروز ،محمد،ڈاکٹر،مرتبہ۔ اخترالایمان مقام اور کلام۔دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ،۱۹۹۸ء۔

* فیض ،احمد فیض۔میزان ۔لاہور:لاہور اکیڈمی ،۱۹۸۹ء۔

* قاسمی،ابوالکلام۔شاعری کی تنقید۔علی گڑھ:ایجوکیشنل بک ہاؤس،پہلا ایڈیشن۲۰۰۱ء،دوسرا االضافہ شدہ ایڈیشن۲۰۰۸ء۔

* قاسمی،ابوالکلام۔مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت۔لاہور:مغربی پاکستان اکیڈمی،۲۰۰۰ء۔

* قاسمی،احمد ندیم ۔معنی کی تلاش۔ لاہور:اساطیر،۲۰۰۳ء۔

* احمد ندیم قاسمی۔تہذیب و فن۔لاہور:مکتبہ فنون ،۱۹۸۶ء۔

* قریشی،وحید ، ڈاکٹر۔تنقیدی مطالعے۔لاہور: مکتبہ کارواں،۱۹۶۷ء۔

* کاشمیری،تبسم ،ڈاکٹر۔نئے شعری تجزیے۔لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۱۹۷۸ء۔

* کاشمیری،تبسم ،ڈاکٹر۔جدید اُردو شاعری میں علامت نگاری۔لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۱۹۷۵ء۔

* کاشمیری،تبسم ،ڈاکٹر۔اُردو ادب کی تاریخ(ابتدا سے ۱۸۵۷ء)۔لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۳ء۔

* کاشمیری،تبسم ،ڈاکٹر۔لا: راشد۔ لاہور: نگارشات،۱۹۹۴ء۔

* کاشمیری،ظہیر ۔ادب کے مادی نظریے۔لاہور:کلاسیک ،۱۹۷۵ء۔

* کاشمیری،حامدی،پروفیسر۔جدید اردو نظم اور یورپی اثرات۔نئی دہلی:موڈرن پبلشنگ ہاؤس،اشاعت اول ۱۹۶۸ء،دوم۲۰۱۰ء۔

* کامران ،جیلانی ،ڈاکٹر۔نئی نظم کے تقاضے۔لاہور:کتابیات،۱۹۶۷ء۔

* کامران،جیلانی، ہمارا ادبی اور فکری سفر۔ لاہور،:ادارہ ثقافت اسلامیہ،۱۹۸۷ء۔

* کاسگنجوی،حسرت ،ڈاکٹر۔بیسویں صدی میں اُردو ادب۔کراچی: اُردو اکیڈمی سندھ،۱۹۸۶ء۔

* کرن رباب نقوی۔پاکستانی ادب کے معمار،انجم رومانی:شخصیت اور فن۔اسلام آباد:اکادمی ادبیات پاکستان،۲۰۱۷ء۔

* کومل ،بلراج،مرتبہ۔ستیہ پال آنند کی تیس نظمیں عملی تنقید۔کراچی: بزم تخلیق ادب پاکستان،۲۰۱۳ء۔

* کیفی ،حنیف ،ڈاکٹر۔اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم ۔لاہور:الوقار پبلی کیشنز،۱۹۹۵ء۔

* محبوب ظفر۔احمد فراز:شخصیت اور فن۔اسلام آباد:اکادمی ادبیات پاکستان،اشاعت اول،دوم ۲۰۱۶ء۔

* محسن،اختر یزداں۔حامد اللہ افسر میرٹھی:حیات اور کارنامے۔لکھنو:یونائیٹڈ انڈیا پریس،۱۹۷۴ء۔

* مجنوں ،گورکھپوری ۔ادب اور زندگی ۔کراچی:مکتبہ ادنیال ، ۱۹۶۹ء۔

* مظہری،کوثر۔جدید نظم حالی سے میرا جی تک۔دہلی:عرشیہ پبلی کیشنز،اشاعت سوم۲۰۱۳ء۔

* مظہری،کوثر۔ہندوستانی ادب کے معمار: وحید اختر۔دہلی: ساہتیہ اکادمی،۲۰۰۸ء۔

* مفتی ،شاہین،ڈاکٹر۔ کشور ناہید شخصیت اور فن۔ اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان،۲۰۰۸ء۔

* منظر،شہزاد۔مشرق ومغرب کے مشاہیرادبا۔ کراچی:مکتبہ دانیال،۱۹۹۴ء۔

* میرا جی ۔اس نظم میں۔ کراچی:آج پبلشرز،دوسری اشاعت ۲۰۰۲ء۔

* نارنگ،گوپی چند،ڈاکٹر۔ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری۔نئی دہلی:قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،۲۰۰۳ء۔

* ناگی،انیس ،ڈاکٹر۔میرا جی بھٹکا ہوا شاعر۔لاہور:پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز،۱۹۹۱ء۔

* ناگی،انیس ،ڈاکٹر۔نیا شعری افق۔لاہور:جمالیات،۱۹۸۸ء۔

* ناگی،انیس ،ڈاکٹر۔تنقید شعر۔لاہور:مکتبہ میری لائبریری،۱۹۶۴ء۔

* ناگی ،انیس۔تصورات۔لاہور:جمالیات،س ن۔

* ناگی ،انیس ۔ شعری لسانیات۔ لاہور:کتابیات۔، ۱۹۷۶ء۔

* ناگی،انیس ،ڈاکٹر۔صداؤں کا جہاں۔لاہور:جمالیات،۱۹۹۵ء۔

* ناگی ،انیس۔معاصر ادب۔لاہور:جمالیات،۱۹۹۷ء۔

* ناگی ،انیس۔مکالمات۔لاہور:مکتبہ جمالیات،۱۹۸۸ء۔

* ناہید قاسمی،ڈاکٹر۔جدید اردو شاعری میں فطرت نگاری۔کراچی:انجمن ترقی اردو پاکستان،۲۰۰۲ء۔

* متین طارق باغپتی۔اردو شاعری کے روشن چراغ۔دہلی:تخلیق کار پبلشرز،۲۰۰۱ء۔

* محمد،علی ،ڈاکٹر۔لاہور کا دبستان شاعری۔لاہور:مقبول اکیڈمی،۱۹۹۲ء۔

* میرا جی۔مشرق و مغرب کے نغمے۔لاہور: پنجاب اکادمی،۱۹۵۸ء۔

* نسیم ،حمید۔پانچ جدید شاعر۔لاہور:دارالشعور،۲۰۱۵ء۔

* نقوی،نورالحسن ۔ تنقید اور جدید اردو تنقید نگاری ۔علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۰ء۔

* نقوی،مہتاب حیدر۔ہندوستانی ادب کے معمار: خلیل الرحمن اعظمی۔دہلی: ساہتیہ اکادمی،۲۰۰۱ء۔

* نگرامی،سید خاور رضوی۔مولوی اسمٰعیل میرٹھی ایک مطالعہ۔لاہور:مکتبہ میری لائبریری،س ن۔

* نگہت ناہید ظفر۔انگریزی رومانوی شعرا کے اردو شاعری پر اثرات۔لاہور:پاکستان کوآپریٹو سوسائٹی۔۲۰۱۵ء۔

* نوشاہی،گوہر ،ڈاکٹر۔تحقیقی زاویے۔اسلام آباد:مجلس فروغ تحقیق،۱۹۹۱ء۔

* ہاشمی،رفیع الدین ،ڈاکٹر۔اصناف ادب۔لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۸ء۔

* ہاشمی ،طارق،ڈاکٹر۔جدید نظم کی تیسری جہت۔ لاہور: دستاویز مطبوعات،۲۰۰۳ء۔

* ہاشمی،نورالحسن،دلیکا دبستان شاعری۔کراچی ،:اُردو اکادمی سندھ،۱۹۶۶ء۔

* ھلال نقوی،ڈاکٹر۔پاکستانی ادب کے معمار:جوش ملیح آبادی شخصیت اور فن۔اسلام آباد:اکادمی ادبیات پاکستان،۲۰۰۷ء۔

* ہمدانی ،احمد۔قصہ نئی شاعری کا۔کراچی:سیپ پبلی کیشنز،۱۹۷۹ء۔

* یٰسین،محمد ، ڈاکٹر۔انگریزی ادب کی مختصر تاریخ۔لاہور:بک چینل،۱۹۹۲ء۔

* یعقوب ،قاسم۔اردو شاعری پر جنگوں کے اثرات۔کراچی :سٹی بک پوائنٹ،۲۰۱۵ء۔

(ج) رسائل و جراید

* ادب لطیف،لاہور،نومبر،۱۹۴۱ء،نومبر ،دسمبر۲۰۱۰ء

* ادب دوست،لاہور،شمارہ ۴،۵،جلد۱،۱۹۹۵ء۔

* ادبیات،اسلام آباد،منیر نیازی نمبر،۲۰۰۹ء۔

* اردو نامہ،پٹنہ،۲۰۰۴ء۔

* اردو،امراؤتی،ندا فاضلی نمبر،اکتوبر تا مارچ ۲۰۱۴ء،۲۰۱۵ء۔

* استعارہ،دہلی،شمارہ،۱۶،اپریل تا جون،۲۰۰۴ء۔

* افکار،کراچی:فیض نمبر۱۹۶۵ء، ندیم نمبر ۱۹۷۵ء،علی سردار جعفری نمبر،۱۹۹۱ء۔

* اوراق، لاہور، جدید نظم نمبر اگست، ۱۹۷۷ء۔

* آج کل ،دہلی،شعروشاعری نمبر،۱۹۵۲ء۔

* بیاض، لاہور

* پربت،ماہنامہ،کوئٹہ ،دانیال طریر نمبر،جنوری ۲۰۱۴ء

* تخلیق،لاہور

* تسطیر،لاہور،اکتوبر تا مارچ،۲۰۰۳ء۔

* دبستان،لاہور

* دنیائے ادب، کراچی

* سوغات، بنگلور، جدید نظم نمبر،۱۹۷۸ء

* شاعر، بمبئی،جولائی، ۲۰۰۴ء

* شب خون،الہ آباد،جون تا دسمبر ۲۰۰۵ء۔

* صحیفہ،لاہور،اپریل،جون ۲۰۰۶ء۔

* فنون،لاہور،شمارہ۱۹۸۵،۲۲ء ،۱۹۹۲ء،۲۰۰۳ء۔

* کتاب نما،دہلی،نئی نظم کا خصوصی نمبر،دسمبر ۱۹۷۲ء۔

* ماہ نو،لاہور،۱۹۹۷ء،۱۹۸۷ء،۲۰۰۸ء۔

* مخزن،لاہور،اپریل ۱۹۴۰ء۔

* معاصر شاعری۔شمارہ،نومبر۲۰۰۶ء

* مفیض،گوجرانوالہ، عارف عبدالمتین نمبر

* نگار ، کراچی، جدید شاعری نمبر، ۱۹۶۵ء،جدید ادب نمبر،۱۹۴۴ء۔

* نیا دور،کراچی ،ن۔م۔راشد نمبر

* نقاط نظم نمبر،فیصل آباد،اکتوبر ،۲۰۱۰ء

(د) قلمی آثار/تحقیقی مقالے

* احمد، سرور۔ اردو اور ہندی شاعری میں رومانوی علامتوں کا مطالعہ۔دہلی:مملوکہ جواہر لعل یونیورسٹی ،۱۹۷۹ء۔

* جمشید احمد۔ترقی پسند عہد میں اردو نظم کے متوازی میلانات۔دہلی:مملوکہ جواہر لعل یونیورسٹی ،۲۰۰۸ء۔

* جاں نثار عالم۔ترقی پسند اردو نظم میں احتجاج کی جہتیں ۱۹۳۶ءکے بعد۔دہلی:مملوکہ جواہر لعل یونیورسٹی ،۲۰۰۸ء۔

* حسین،اقبال۔ جدید اردو نظم میں اساطیری علامات کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ۔ملتان:مملوکہ بہاالدین زکریا یونیورسٹی ،۲۰۰۶ء۔

* نعیم احمد۔کیفی اعظمی حیات و شاعری۔ جونپور (اترپردیش):مملوکہ ویربہادر سنگھ پراونچل یونیورسٹی،س ن۔

* منظور حسین۔ارشد معراج کی نظمیں۔ اسلام آباد: مملوکہ نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز،۲۰۱۴ء۔

* منہاس،علی ظہیر۔آزاد نظم کا ارتقا۔ لاہور:مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری،۱۹۹۰ء۔

* نوری،محمد فخر الحق۔ن۔م۔راشد:تحقیقی و تنقیدی مطالعہ۔لاہور:مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری،۱۹۹۹ء۔